مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۂ الشعرآء —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الشعرآء —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور
زیرِ اہتمام	....	ادارہ طلوعِ اسلام 25بی2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	مئی 2008ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراج انسانیت ص ۴۷ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الشعراء

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 19

پہلا باب: **سورة الشعرآء** (آیات 1 تا 6)

حروفِ مقطعات کی کیفیت 23

خدا تعالیٰ کی صفات پر مبنی حروف 24

قرآنِ حکیم کتابِ مبین ہے، اس کے لیے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں 25

سیرتِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند وضعی گوشے!! 26

سیرتِ رسول ﷺ کی صحیح صورتِ حال 26

نبی اکرم ﷺ کا قلبِ حساس 27

پھر آخر برائی بھی اچھائی نظر آنے لگ جاتی ہے 28

مذہبی شعائر اور رسومات کی کیفیت اور حقیقت 29

صلوٰۃ کا صحیح مقصد نظر انداز کرنے کا نتیجہ 30

لفظ یصنعون کا قرآنی مفہوم 30

عربوں کے ہاں لفظ حسرت کا مفہوم 32

خدا تعالیٰ کی صفت جبار اور قہار کے متعلق پایا جانے والا تصور 32

خدا بھی انسان سے اس کی انسانیت الگ نہیں کرتا 34

وفورِ جذبات اور تقاضائے عدل کے وقت عظمتِ رسول ﷺ 34

ذاتِ رسول اس قسم کی صفات سے کیوں مزین تھی؟ 36

نبوت کا فریضہ صرف آگاہ کرنا ہے، صحیح راستے کے لیے زبردستی چلانا نہیں ہے 36

حضور ﷺ کے قرابت داروں کے لیے بھی حصولِ ہدایت کا اصول 37

میری عمر بھر کی تمناؤں کا مرکزی نکتہ اور کوشش: قلب و دماغ کی تبدیلی 39

مایوس ہو جانے کا اصل سبب 39

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کی آخری خواہش پر خدا تعالیٰ کا جواب 40

قانون قانون ہوتا ہے، اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا 40

معجزوں کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تعلیم 41

معجزوں کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد 42

صداقتیں جذباتی تسکین کی خاطر نہیں آیا کرتیں 43

یہ سب کچھ کرامتوں کو منوانے کے بہانے ہیں 43

تقلید پرستی کے تحت قوم کے اندر سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دینے والی چال کہ کیا یہ پہلے بھی کسی نے کہا؟ 44

مذہب کا سارا دارومدار ہر بات آنکھ بند کر کے ماننے پر ہوتا ہے 45

دنیا بھر کے مذاہب کی سوچ ہمیشہ یہی رہی ہے 47

تقلید پرستی کا نتیجہ حقیقت کے استہزا کی شکل میں نکلتا ہے 48

دوسرا باب: **سورة الشعرآء** (آیات 7 تا 31 اور 34 تا 35)

ظہورِ اسلام کے وقت قریش کی معاشرتی زندگی اور کعبہ کی تولیت کا نشہ 50

کفار کے مقابلے میں آپ ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی 53

قرآن کے نزدیک کھیتی کی مثال انسانی غور و فکر کو جلا بخشنے کے لیے ہے 55

فکرِ قرآن تک رسائی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ میرے ایک عظیم محسن تھے 56

علامہ اقبالؒ کے اعتراض کے باوجود قوم نے انہیں شاعر ہی تصور کیا 57

قرآنِ حکیم بیج کی مثال کے بعد انسانی توجہ تاریخی شہادت کی طرف مبذول کراتا ہے 57

داستانِ موسیٰ علیہ السلام میں جلال کے ساتھ جمال کی اہمیت 59

شمشیرِ خارہ شگاف کا مقام دلائل و براہین کے بعد آتا ہے 60

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پہلی زندگی کا دور 61

فرعون کے ساتھ بغرضِ مذاکرات ایک اور ساتھی کے لیے درخواست 62

فرعون کی داڑھی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں: زیبِ داستان کا ایک قصہ 63

قاصد کی حیثیت سے فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ 64

حاکم کی حاکمیت محکوم قوم سے ہی وابستہ ہوتی ہے 65

انسانی سوچ کی زبوں حالی: ملوکیت کی بجائے جمہوریت 65

اپنی ہی قوم اپنے ہی ہاتھوں محکوم 66

مغربی جمہوریت کے سدا زہریلے اثرات 66

اپنی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لیے ملوکیت کے خطرناک حربے 67

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے کیے گئے احسانات کا جواب 68

کیا ان احسانات کے بدلے، میں اپنی پوری قوم کو تمہاری غلامی میں رہنے دوں؟ 69

یہ داستانیں نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک سبق آموز حقائق ہیں 69

فرعون کا کہنا تھا کہ رزق کے یہ سارے سرچشمے میرے ہیں 70

فرعون خود ایک دیوتا کی پرستش کرتا تھا 71

وحی ہمیشہ انسان کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھتی ہے 72

حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق فرعون کی بدکلامی اور آپؑ کی بلند نگہی 73

کائنات کا ایک ایک ذرہ صرف خدا تعالیٰ ہی کا تخلیق کردہ ہے 73

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ اپنے آپ کو حاکم منوانے کا تھا 74

ہمارے ہاں کے تراجم کا معیار اور عقل کے برعکس معجزوں کا تصور 75

عقل و فکر کو بالاتر رکھ کر کسی بات کو منوانا وحی کی شان کے شایان ہی نہیں 76

پرویز کی عمر کا آدھا حصہ گزرا 76

اس غیر قرآنی تصور کا نتیجہ 77

نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کی وفات کا سورج کے گرہن سے کوئی تعلق نہیں ہے 78

وحی عقلِ انسانی کو جلا بخشتی ہے، اُسے پامال نہیں کرتی 78

لفظ سحر کا قرآنی مفہوم جادو نہیں 79

دراصل فرعون کو اپنی شخصی حکومت کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا 79

تیسرا باب: **سورة الشعرآء** (آیات 36 تا 43 اور 46 تا 49)

داستانِ بنی اسرائیل فرعون، ہامان اور قارون کی چابک دستیوں ہی کی ترجمان ہے 82

پروہتوں کی فریب کاری کا دوسرا نام سحر ہے 83

نظامِ زندگی کے لیے اقدارِ خداوندی کو عملی طور پر نافذ کرنے کا نام دین ہے 84

کافرگری کی بنا پر قتل کا فتویٰ 86

مذہب کی دنیا میں جان کا خطرہ 86

قرآنِ حکیم نے دینِ اسلام کو قرآنی نظام کے الفاظ میں متعین کیا ہے 87

فی سبیل اللہ کی اصطلاح نوعِ انسانی کے مفاد میں کیے جانے والے عمل کے ساتھ مشروط ہے 88

کسی بات کو بغیر سوچے اپنائے چلے جانا جہالت کا عمل ہے 89

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات کسی صورت میں بھی پیوندکاری قبول نہیں کرتا 90

قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا جہنم یہ ہے کہ قوم تو ہو لیکن وہ عادلانہ نظام سے محروم ہو 92

امیر المومنین کا فریضۂ حیات لائن آف ایکشن کا ہے 92

مذہبی دنیا میں دین کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے	93	ایک سجدہ قابلِ تحسین اور لائقِ سزائے موت	110
دورِ ملوکیت میں، سب سے پہلے انسان، جاں بخشی کا طلب گار رہتا ہے	94	مردِ مومن دنیا میں فرعونیت کا سب سے بڑا باغی ہوتا ہے	111
فرعون کی چابک دستی کی سیاست	95	آزاد قوم کے افراد شاہ کے منظورِ نظر تو ہو سکتے ہیں لیکن	
شکم پروری کے پیشِ نظر فرعون کی مذہبی پیشوائیت کا پہلا مطالبہ	95	غلام قوم کی مانند جوہرِ خودی سے عاری نہیں ہوتے	112
جادو کے سلسلہ میں ہماری کتب احادیث وتفاسیر کے بیانات	96	اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنے کی بجائے سیاستِ فرعونی کی عمل پیرائی	112
مذہبی پیشوائیت کا وقار اور اُس کی اہمیت	97	فرعون کے سامنے ایمان کی پختگی کا اظہار	113
دورِ ملوکیت میں قوموں کی تعلیم وتربیت کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے	99	فرعون اپنے ساحرین پر جرم عائد کرنے کے سلسلہ میں	
کچھ بھی ہو آزاد قوم میں غیرت ومردانگی کا عنصر پھر بھی باقی رہتا ہے	99	کشادہ ظرف واقع ہوا تھا	114
محکوم، آزاد اور بندہ مومن کا ایک تقابلی جائزہ	101	فرعون کی عدالت کے مجرم اور خدا کی عدالت کے مجرم میں فرق	114
تزکیہ نفس کا مقصد خودی کی نشوونما کرنا ہے	101	ساحرین کا یہ سجدہ ان کا ذہنی اور نفسیاتی انقلاب تھا	115
حضور ﷺ کا فرمان کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کرلیا ہے	102	سجدے کے معنی، اس کا مفہوم، اور اس کا انداز	115
ابلیس کو کنٹرول کرنے کا طریق صرف تعلیم وتربیت ہے	103	سجدے کے قبول ہونے اور نہ ہونے کا معیار	116
اصل کام نوجوان نسل کی صلاحیتوں کے سیلاب کو ساحلوں		مومن کا ایک سجدہ اسے دنیا کی ہر طاغوتی قوت سے	
کے اندر محفوظ کرنے کا تھا	104	آزادی دلانے کا موجب بنتا ہے	117
محکوم کو ذاتی عقیدہ بدلنے کے لیے بھی فرعون کی اجازت مطلوب ہوتی ہے	104	کافر اور مومن کے درمیان حدِ فاصل صرف خدا کا قانون ہے	119
چوتھا باب **سورۃ الشعرآء** (آیات 46 تا49 اور 50 تا51)		ہمارے ہاں حاشیہ میں لکھے گئے "السجدہ" کی تکمیل کا انداز اور مفہوم	119
قرآنِ حکیم میں امم سابقہ کے بیان کردہ واقعات، کہانیاں نہیں ہیں	106	علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات میں اس سجدے کا ذکر	120
مذہبی پیشوائیت کی تھپکیوں کا نتیجہ	107	نفع ونقصان کے پیشِ نظر ہماری حالتِ زار	122
داستانِ بنی اسرائیل کا مرکزی نکتہ فرعون، ہامان اور قارون		اُمتوں کی کبریائی مردِ حر کی پیشانی کی رہینِ منت ہوتی ہے	123
کے کردار کی وضاحت پر مبنی ہے	107	سکراتِ موت کی کیفیت	124
ہمارے ہاں قرآن کو سمجھنے کا انداز	108	اُخروی زندگی کی متاعِ حیات	130
ساحرین کا سجدہ میں گر جانے کا مفہوم اور فرعون کا کردار	108	کوئی پیدائشی بچہ نہ مسلمان ہوتا ہے نہ کافر	130
ہمارے ہاں انگریزوں کی حکومت کا پہلا اعلان	109	جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں	131
محسوسات کی خوگر قوم کی نفسیاتی کیفیات؛	110	اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی	132

پانچواں باب: **سورۃ الشعرآء** (عصا' ید بیضا اور سحر: آیات 32 تا 33 اور 44 تا 45)

داستانِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں عصا کی حقیقت اور اس کی اہمیت 135
عربی مبین کی اہمیت 136
ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق 137
نزول قرآن کے وقت کی زبان پر عجمی عربی کے اثرات 138
قرآنِ حکیم کو نثر کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے 138
عصا کے بنیادی معنی اجتماعیت' جامعیت اور گرفت میں لینے کے ہیں 139
عصائے موسیٰ کا یہ سارا ذکر تورات کا بیان کردہ ہے 140
حدیث کے علاوہ خود تورات میں عصا کے معنی ''قوت اور حکومت'' کے دیئے گئے ہیں 140
تشبیہات اور استعارات میں مجازی معنی کا استعمال 141
یدِ بیضا کا حقیقی مفہوم 141
فرعون کے دربار میں فریقین کے درمیان کوئی جادوگری کا تماشہ نہ تھا 142
سحر کے معنی جادو نہیں بلکہ فریب کاری کے ہیں 142
حضرت موسیٰ کے ذمہ ایک کٹھن منزل کو سر کرنے کا پروگرام ہے 144
اس انقلاب کی اصل منزل' اس کا مدعا اور اس کا ماحصل 145
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے اس انقلاب کو ثمر بار بنانے کے لیے چند ایک ہدایات 145
عصا کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر 145
انبیائے کرام کی تعلیم کے دو اہم گوشے 147
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی وحی کا پیغام فرعون کے نام 147
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام 148
یہ تو وحی کا پیغام تھا کوئی پھلبھڑی نہیں تھی 148
یہ جادوگروں کا کوئی دنگل نہ تھا بلکہ یہ یدِ بیضا تھا' روشن تعلیم تھی جو پیش کی جارہی تھی 149
قرآنِ حکیم کی تعلیم کو اپنے خیالات و تصورات کے تابع کرنا شرکِ عظیم ہے 150
لفظ افک کا' افترا کا' قرآنی مفہوم 151
جادوگر یعنی فریب کار کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا 151
قرآنِ حکیم کی یہ ایک ہی آیت سحر کے تصور کو باطل کر کے رکھ دیتی ہے 152
سحر اور کلمۃ اللہ ایک دوسرے کی ضد ہیں 152
یہاں حبل سے مراد ساحرین کی اپنی مذہبی تعلیم تھی 153
فرعون کی سمندر میں غرق ہونے کی روئداد اور عصا کی افادیت 153
یہاں ذکر راستے کا ہے' سمندر کا نہیں 153
خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی مدوجزر کے راستے کی طرف کی 154
سمندر کے پھٹ جانے کی یہ ساری کہانی تورات کی بیان کردہ ہے' یہ قرآنی حقائق نہیں ہیں 156
آج کے دور کی ہسٹری' ان قرآنی حقائق کی شہادت فراہم کررہی ہے 157
علمی طور پر ہماری زبوں حالی کی کیفیت کی ایک دو مثالیں 158
''ضرب فی الارض'' کا مفہوم 159

چھٹا باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 52 تا 74)

سابقہ درس کی یاددہانی 162
قرآن کی آواز کو بلند کرنا اگر مشکل ہوجائے تو اس کا علاج 163
فرعون کا پروگرام اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا تھا 164
مومن ہجرت تو قبول کرلیتا ہے مگر فساد Create (پیدا) نہیں کرتا 164
کبریائی کا الحق ہونا لازم ہے 166
متکبر کس کو کہتے ہیں؟ 167

فرعون کے دربار کا ایک مردِ مومن قرآنِ حکیم کے آئینہ میں 168
ہزار ذلتوں کی ایک ذلت کسی کا محکوم ہونا ہے 169
قرآنِ حکیم کے تحریری انداز کے متعلق ہماری کوتاہ نگہی 170
خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف راستے کی نشاندہی کی تھی 172
قرآنِ حکیم زندگی کی گزرگاہوں کی نشاندہی کرتا ہے
معجزوں سے کام نہیں چلاتا 173
متقی کا قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات 173
سُبُل کا قرآنی مفہوم 175
قرآنِ حکیم میں نبی اکرمؐ کے ہمراہ غارِ ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
کی رفاقت کا ایک دلکش پہلو 175
ہمارے ہاں عصا کا ترجمہ سوٹا اور ''اضرب'' کا ترجمہ مارنا
کیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے 176
خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ''رھوا'' کی طرف جانے کی رہنمائی دی 177
فانفلق کا قرآنی مفہوم 178
معجزے کی شکل میں تو غور و فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 178
ذاتِ خداوندی متکبر کے لیے صاحب غلبہ اور دوسروں کے لیے رحمت ہے 179
رحمانیت کے لیے انسان کو عرقِ انفعال کے قطرات پیش کرنا ہوں گے 180
ظہورِ نتائج کے وقت پھر مہلت کہاں؟ 180
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی اس داستان کے بعد ایک نئے سفر کا آغاز 181
حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کعبے کا مقام اور اس کی فضیلت 183
حکومت میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل 182
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد سے وجہ مخالفت 183
مذہبی سوچ پر کسی کے جذبات کی توہین بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے 184
نبوت کا اندازِ بیان ہمیشہ دلائل پر مبنی ہوتا ہے 186
ایمان بزورِ شمشیر کسی کے دل میں داخل نہیں کیا جا سکتا 186
عقل و شعور کے سامنے اسلاف پرستی انسان کو ہمیشہ لاجواب کر دیتی ہے 187

ساتواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 75 تا 104)

خاندانِ نبوت کی دو عظیم ہستیوں کے ذکرِ خیر کی خصوصیات 189
کیا ماں باپ کی اطاعت فرض ہے؟ 189
کیا اسلاف کا مسلک دوسروں کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے؟ 190
حقیقی زندگی کے حصول کے لیے غور و فکر کا عمل بڑی اہمیت کا حامل ہے 191
ہمارے ہاں تصوف کی ساری عمارت ''توکل'' کے غلط
مفہوم پر استوار ہوتی ہے 192
وہابی کی شرک سے بیزاری مگر تعویذ گنڈا جاری 194
انسانی کوتاہیوں کا علاج بھی قانون کے مطابق حسنات سے ہوگا 195
ایک نبی کی مملکت اور نمرود کی مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے 195
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک فکر انگیز دعا 196
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے مشرک باپ کو صحیح راستے کی
طرف راغب کرنے کی کوشش 196
ہمارے ہاں لفظ ''استغفار'' کے غلط ترجمے کے اثرات 197
تمنا کی برومندی کے لیے الفاظ 'لب پر دعا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں 199
روزِ قیامت کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی دعا 199
آج کا دور تکریم آدمیت کی اہمیت سے نابلد واقع ہوا ہے 199
دوسروں کو ذلیل کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت 200
کشادہ ظرفی قلب و نظر کی فراخ دلی سے پیدا ہوتی ہے 200
تکریم آدمیت کے متعلق حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی ایک سبق آموز مثال 201
روزِ محشر انسان کے ساتھ سوائے قلبِ سلیم کے کچھ نہیں جائے گا 202
جنت اور جہنم کی حقیقت اور ماہیت 202

غلط نظام کے تباہ کن نتائج غیر مرئی شکل میں ساتھ ساتھ
مرتب ہو رہے ہوتے ہیں 203
کیا آج پوری نوع انسانی چاروں طرف سے جہنم میں نہیں گھری ہوئی؟ 204
اقبالؒ کی نظر میں ایک واعظ کا وعظ 205
جہنم میں جہنمیوں کے باہمی معاملہ کی روداد 206
ابلیس کا کردار پراپیگنڈا کے زور پر بڑا کارگر ہوتا ہے 207
لیڈروں کی پیروی کرنے والوں کا اعتراف 207
زندگی کا ایک لمحہ بھی واپس نہیں پلٹ سکتا 208
لفظ آیت کا قرآنی مفہوم 209
قرآنِ حکیم کی یہ بیان کردہ آیات حقیقت تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں 209

آٹھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی زندگی کے اہم نکات)

وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قانون تو بدل سکتا ہے،
آئین خداوندی نہیں بدلتا 213
ماں باپ کی اطاعت کو فرض قرار دے لیا گیا 213
ہندوؤں کے ہاں رامائن کی کہانی کی سرگشت 213
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بہترین نمونہ قرار پائی 215
ماں باپ کے لیے بچوں کی تربیت کا اصول اور اس کا نتیجہ 215
سورج کی ہر کرن انسان کو ایک نئی منزل کی طرف ترغیب دیتی ہے 216
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا پہلا واقعہ 217
بچوں کی زندگی کے لیے ایک سنہری اصول 217
انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق 218
غیر محسوس دلیلوں کے بعد بتوں کو توڑنے والی محسوس دلیل 219
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوری قوم کی مخالفت کا سامنا تھا 220
خدا کے پیغام کی خاطر میرے لیے کارِ جہاں دراز ہے:
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ عظیم 220
بت کدوں کی اس دنیا میں کعبہ کی تعمیر کا عظیم مقصد اور
اس کے حصول کے لیے زندگی بھر کی قربانی 222
مُردوں کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی تشویش اور اس کا تفسیری حل 222
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوعِ انسانی کی امامت کے لیے چن لیا گیا 223
پیغمبری کے لیے خدا کے معیار پر پورا اترنا ہوتا تھا 224
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے حدیث کا معیار 225
ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا خدا کا کوئی نبی تین تین جھوٹ
بول کر خدا کا نبی کہلانے کا مجاز ہے؟ 228
اس کے برعکس ایک دوسری حدیث 228
انسان کا کردار باہر کی بجائے گھر کے اندر زیادہ بے نقاب ہوتا ہے 229
بی بی ہاجرہ کے متعلق حضرت ابراہیم کے سامنے سارہ کا تکرار 230
ہمارے ہاں کی معاشرتی زندگی میں عورت کے ساتھ کیا جانے والا سلوک 231
حضرت ابراہیم کا لق و دق صحرا میں اپنی بیوی کو چھ ماہ کے بچے
کے ساتھ چھوڑ کر چلے آنے کا قصہ وغیرہ 232
اپنی بیوی کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ کا اپنی بہو کے ساتھ کیے جانے والا سلوک 233
ہمارے ہاں ازدواجی رشتوں کی الجھنیں، عورت کے ساتھ
کی جانے والی زیادتیاں اور شریعت کے فتوے 235
علامہ پرویزؒ کی طرف سے سیرت پر لکھی ہوئی کتب پر تبصرہ 237

نواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 105 تا 122)

حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی رسول آئے تھے 241
مذہب میں انبیائے کرام کو ایک واعظ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے 241

مذاہبِ عالم میں عالمگیر صداقتوں کی حقیقت کی وضاحت 242
اصل بات تو نظامِ استحصال کو مٹانے کی ہوتی ہے 242
دین اصولوں کا نام ہے جو اب صرف قرآنِ حکیم میں محفوظ ہیں 243
قومیت طبقاتی تقسیم اور نسلی امتیاز کے مسائل 244
قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات دراصل دین کی ہی دعوت ہے 244
آئیڈیالوجی کے اشتراک کی ایک ٹھوس مثال 245
آئیڈیالوجی کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک سنہری قول 245
مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیوں کا وجود ہو وہ شرک ہوگا 246
آج پوری دنیا طبقاتی تقسیم کے جہنم میں بری طرح گرفتار ہے 246
آئیڈیالوجی کے تحت آج کے مسلمانوں کی حالت زار 247
''تتقون'' کا قرآنی مفہوم 248
انسانیت کی عزیز ترین متاع سکونِ قلب کا حصول ہے 248
مرکزِ ملت کا قرآنی مفہوم 249
بغیر کسی تحقیق کے پرویز کے خلاف الزام تراشی کی انتہا 250
دنیائے تصوف کو نظام سے کیا تعلق؟ 251
زندگی تو تمنا کے سہارے سے ہی زندہ رہتی ہے 251
نظام کی کامیابی کا راز 252
خلافت علیٰ منہاج نبوت کا نظام قرآنِ حکیم کی مستقل
اقدار کے سہارے ہی قائم ہوسکتا ہے 252
دوسروں کی نظر میں غلام قوم کی قدر و قیمت کوئی معنی نہیں رکھتی 253
طبقاتی کشمکش میں انسانوں کی تفریقی نوعیت 254
اصل سوال تو حق کے نظام کی صداقتوں پر عمل کرنا ہے 256
تفریقِ انسانیت کے یہ تصورات ہم نے ہندو دھرم سے لیے ہیں 257
جنابِ پرویزؒ کا خاندانی تعارف 257
ہمارے ہاں ذاتوں کے بعد گوتوں کا پایا جانے والا تصور 258
کمیونزم کی ناکامی کی وجہ 258
کارل مارکس کا اپنی ناکامی کے متعلق کھلے بندوں اعتراف
اور لینن کی سوشلزم کی تجویز 259
Wages (اجرت) کا تعین طبقاتی کشمکش کے مسئلے کا حل پیش نہیں کر سکا 259
نبی اکرم ﷺ نے مالِ غنیمت کی اقدار کو بدل دیا:
معاشی نظام وحی کی روشنی میں 260
بصیرتِ قرآنی کے تحت حضرت صدیق اکبر کا فیصلہ
یعنی وظائف کا تعین اور وضاحت 260
جہاں کارل مارکس ناکام رہ گیا' اس سے آگے 261
اگر معاشی نظام کی بنیاد Wages (اجرتوں) پر ہے
تو ان کے تعین کا معیار کیا ہے؟ 262
داستانِ نوح علیہ السلام کا مآل وانجام 263
کیا قوموں کی موت وحیات کا مداران کے اجتماعی اعمال
اور اختیار کردہ نظام سے وابستہ ہوتا ہے؟ 264
دسواں باب: **سورۃ الشعرآء** (خارجی حوادث اور قوم
کے داخلی کردار میں تعلق)
قوموں پر عذاب نازل ہونے کی بنیادی وجہ 266
قوموں کی بدنہادیوں کے نتائج کی مختلف شکلیں 266
ارضی وسماوی حوادثات سے محفوظ رہنے کے لیے محکمہ انتظامات
کی ضرورت اور ان کی اہمیت 268
سیلاب سے بچنے کے لیے حضرت نوحؑ کی طرف سے کشتی بنانے کی تیاری 269
سیلاب سے بچنے کے سلسلہ میں کشتی بنانے پر تمسخر اڑانے والوں کا انجام 270
خارجی کائنات کے اندر طبعی قوانین کا یہ سلسلہ دراز کا فراور

مومن سب کے لیے یکساں ہیں 271
عذاب کے مروجہ غلط تصور کے برعکس قرآن حکیم کا پیش کردہ تصور 272
مغفرت کا قرآنی مفہوم 273
قومِ سبا کی معیشت اور اس کے ظلم پر مبنی معاشرتی نظام کی
بربادی کی وجوہات 273
عذاب اور میسرہ کا قرآنی مفہوم 275
کیا آج ہماری قوم کی حالت یہی نہیں ہے؟ 275
حضور نبی اکرمؐ کا عہدِ قدیم اور جدید میں ایک حدِ فاصل ہے 276
دورِ حاضر کے انسان کی تباہی خود انسان کے ہاتھوں کی ہی رہینِ منت ہے 276
آج کے دور میں قوموں کی تباہی اور بربادی کی نوعیت اور کیفیت 277
اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی لکھی گئی تاریخ میں
مافوق الفطرت چیزیں 278
جنگِ احد میں شکست سے دوچار ہونے کے اسباب 278
1965ء میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہونے والی
جنگ کے حوالے سے کرامتوں کے کچھ افسانوں کا ذکر 280
جس قوم میں جوہر انسانیت نہ رہے تو پھر مال و دولت کی
فراوانی کے باوجود وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے 281
سہاروں کے بل بوتے پر تباہ حال معاشرے میں نہ زندگی
ہوتی ہے اور نہ ہی موت 281
مسکنت کا ذلت آمیز عذاب انسانی ذات کے وقار کو
پامال و پژمردہ کر دیتا ہے 282
پوری انسانیت کے لیے نظامِ خداوندی کی مثال انسانی
جسم کی طرح ایک وحدت ہے 282
قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات تمام حوادثِ ارضی و سماوی
کی نوعیت کو بدل کر رکھ دیتا ہے 284
معاشرتی طور پر تمام مصائب و آلام انسانوں کے خود ساختہ
نظام کا ہی نتیجہ ہیں 284
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ لفظ ''ذکر'' کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک مثال 284
غلط نظام کے بدنتائج کے سلسلہ میں مصائب و آلام کی مختلف شکلیں 285
معاشرتی عذاب کی آخری کڑی انتہائی مشکل ہوتی ہے 286
اقتدار سے محروم اور عزت و تکریم سے ناآشنا قوم آخر کار انسانی 286
معاشرے میں ریت کے ذروں کی طرح بکھر کر رہ جاتی ہے 287
مسلط ہونے والی قوم کا محکوم قوم کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی نوعیت 287
خارجی حوادث اور قوموں کے داخلی کردار میں باہمی ربط کی
بنا پر پیدا ہونے والے اثرات کی شکل و صورت 288
فطری حوادث سے بچنے کے لیے فطری قانون کو ہی اپنانا پڑے گا 288
خدا اپنی مخلوق پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ یہ عمل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے 289

گیارھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیت 123 تا 140)

نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نئی اصطلاح کا مفہوم
اور اس کے نفاذ کا معیار 292
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں نظام کے بجائے الدین کا لفظ استعمال کیا ہے 292
احکامِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے
قوانین کا نفاذ شرک ہے 293
دین نظامِ زندگی کے نظریاتی اصول ہیں۔ انہیں عملی شکل دینے
کا نام اسلام بھی ہے اور توحید بھی 294
دین کے معاملہ میں نبیوں کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا 294
انبیائے سابقہ کے ہاں دین کے اصول پیش کرنے کا طریق 295
آج نوعِ انسانی کو زندگی کے وہ بنیادی غیر متبدل اور مکمل

دینی اصول کہاں سے حاصل ہوں گے؟	296
اپنے اپنے معاشی حالات کو نظامِ خداوندی کے ترازو میں تولنا ہوگا	297
فرقوں کی موجودگی میں دین کا نفاذ تو ممکن ہی نہیں	297
افطار پارٹی کے بعد نماز کے سلسلہ میں ' یک جہتی' کا منظر	297
مولانا نورانی کا جنرل ضیاء الحق سے ایک ملاقات میں وضاحتی بیان	298
ملتِ اسلامیہ میں دین اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جس وقت تک ہماری مساجد میں اذان اور نماز کی یکجہتی نہیں ہوتی	299
مجموعی شکل میں نظامِ دین کو عملی طور پر سمجھنے کا طریق	299
حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں قومیت کا مدار خون کا رشتہ تصور کیا جاتا تھا	300
قرآنِ حکیم کے نزدیک قومیت کا مدار رنگ' نسل' علاقہ' ذات' زبان' دولت یا پیشہ نہیں ہوتا	300
دین میں مدارج کا معیار کردار اور اخلاق ہے	301
ہر رسول کی زندگی دوسروں کے لیے شہادت ہوتی تھی	302
دین کے نفاذ کے لیے مرکزِ ملت کی اہمیت اور اس کا کردار	303
دین میں اس خدمت گزاری کا صلہ یا اس کے اجر کی نوعیت	303
دین متشکل کرنے کے برعکس چٹانوں پر اپنی اپنی تحریروں کی نمود کا لا حاصل نتیجہ	303
حیاتِ جاوید کے حصول کا راز نوع انسانی کی خاطر زندہ رہنے میں ہے	304
سنگ وخشت کے ان مضبوط قلعوں کے اندر تو انسانی ذات دفن ہو کر رہ جاتی ہے	304
ظہورِ اسلام سے قبل بھی کئی قومیں بصیرت اور تمدن کے لحاظ سے بڑی ثمر بار واقعہ ہوئی تھیں	305
فطرت کے علوم کے حصول میں بصارت' سماعت اور افئدہ کی اہمیت	306
ترقی یافتہ قوموں کی سیاسی اور معاشرتی جان لیوا زندگی کے خدوخال	307
قرآنی مفہوم کے اعتبار سے لفظ جبر کے دو پہلو ہیں	308
جبر واستبداد کے اس نظام میں قوم کا فریضہ اور اس کی کوتاہی	308
قوموں کی سب سے بڑی تباہی ان کا محکوم ہو جانا ہے	309
اہل یورپ کی حالت زار	310
تنہا فطرت کی قوتوں پر کنٹرول کا ماحصل قوموں کی ہلاکت کا مداوا نہیں کرسکتا	311
بارھواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 141 تا 159)	
حضرتِ نوح علیہ السلام کی پیش کردہ تعلیم کے دو اہم گوشے	312
قومِ عاد میں طبقاتی کشمکش	313
ہر نبی کو قوموں کی طرف سے تکذیب کا سامنا کرنا پڑا	314
دین تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جبکہ انفرادی نجات کا تصور مذہب کا پیدا کردہ ہے	316
نظامِ حکومت کے قیام کے لیے سربراہِ مملکت کا ہونا لازم ہے	316
دین صرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کسی نبی کا نہیں ہوتا	316
تصوف کی دنیا دل کی شگفتگی سے محروم ہوتی ہے	317
صدرِ اول میں انبیائے کرام یا سربراہِ مملکت کا ذریعہ معاش کیا تھا؟	317
افرادِ مملکت کے ہر فرد کے فرائض اور حقوق کو پورا کرنے کا ایک غیر متبدل اصول	318
صلہ یا معاوضہ کی متمنی سوچ انسانی زندگی کے وقار کا گلا گھونٹ دیتی ہے	319
محلات کی تعمیر ضرورت پوری کرنے کے خیال سے نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو اونچا دکھانے کے لیے کرتے ہیں	319
غلط نظام کا ساتھ دینے والے بھی مجرم ہیں	320
اسراف کا مفہوم اور سربراہانِ مملکت کا فریضہ	320
عملِ صالح اور لفظِ ''ملآ'' کا مفہوم	321
قومِ ثمود کے دور کا معاشی نظام اور اللہ کی اونٹنی کا تذکرہ	322

فسادفی الارض کے سلسلہ میں زمین پر ذاتی ملکیت کے
متعلق قرآن حکیم کا پیش کردہ دائمی حل 323
ہر باطل نظام کی فساد انگیزیوں کا علاج برسر اقتدار لوگوں کی
اصطلاح پر ہی منحصر ہے 325
معاشرتی طور پر رسول باوقار حیثیت کا حامل ہوتا تھا 326
قرآن حکیم کی ہر بات ہر اصول منطق کی بجائے دلیل پر مبنی ہوتا ہے 327
خدا کا قانون انسان کے ہر عمل کے پیچھے ایک کھوجی کی طرح
پیچھا کر رہا ہوتا ہے 328
لفظ عذاب کا قرآنی مفہوم جس کے تحت قومیں رسوا ہو جاتی ہیں 328
خدا کے قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا 329
ظالم کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے 330
قصص الانبیاء سے دین کے مختلف گوشوں کا اُبھر کر سامنے
آنا اور قانون مکافات کا دَمدمہ 331
تیرھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 160 تا 176)
حضرت نوح علیہ السلام کے دور سے ہی انسانیت کو قومیت اور
تکریم آدمیت کے اصولوں سے آگاہ کر دیا گیا تھا 333
چار ہزار سال قبل قوموں کے تمدن پر جنسی بدنہادی کے
اثرات سے آگاہی کی تعلیم 333
جنسی بدنہادی میں گرفتار قوم تین نسلوں کے بعد بالکل تباہ ہو جاتی ہے 335
اصل مسئلہ جنسی توانائی کی اہمیت کا ہے 336
قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر کسی سے معاوضہ کا طالب ہونا
قرآنی تعلیم کے خلاف ہے 336
قومِ لوط کی روشِ زندگی 337
قرآن حکیم کی تعلیم ضد کی بجائے دلیل و براہین کا درس دیتی ہے 338
صاحبِ بصیرت ہونے کے باوجود سرکشی اور جہالت کے
عمل کو اپنائے چلے جانا' ایک خطرناک مرض ہے 338
ہمارے ہاں کے گزرے ہوئے دور کی ایک باوقار ریت 339
قرآنِ حکیم نے جنسی بدنہادی کے مرض کو اجتماعی جرم کیوں قرار دیا گیا؟ 340
جنسی معاملے میں آج کے ترقی یافتہ ممالک کی ذلت آمیز حالت 341
قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل وعیال کی تعریف 341
قوموں کے تباہ و برباد ہونے کی انتہائی شکل یونان اور
اٹلی کی مثال ہمارے سامنے ہے 342
جنسیات کے شعبہ پر J.D.Unwin کی تحقیق اپنی مثال آپ ہے 343
قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر نہایت ہی غور و خوض کا متقاضی ہے 344
جنسی بدنہادی کے باعث تخلیقی توانائیاں پامال ہو جاتی ہیں 345
وحدتِ زوج کا اصول تمدن کی شان و شوکت کا ضامن ہے 345
نتائج اور عمل کے لحاظ سے مجرد کی زندگی اور ازدواجی زندگی میں فرق 346
اختیار و ارادہ کے سلسلہ میں حیوان اور انسان میں فرق 346
جنسی اختلاط کے لیے نکاح کی شرط کیوں؟ 347
چار چار بیویوں کی اجازت کے سلسلہ میں ہماری مصلحت کوشی اور اس کا نتیجہ 347
جنسی آلودگی اقوام سے علم و شعور اور فہم و فراست کی
دولت چھین لیتی ہے 348
تقلید جیسی مہلک بیماری انسان کو مردہ پرست بنا دیتی ہے 349
ابلیس کی دوکان داری کا سارا راز چانس کی بنیاد پر ہے 350
وحدتِ زوج کی زندگی بسر کرنے والی قوم کے نزدیک
جنسی اختلاط کا مقصد اور اس کا نتیجہ 350
انسان کی یہ Preserve (محفوظ) کردہ توانائی کی
قوت قوموں کو بامِ عروج پہ لے جاتی ہے 351

قرآن حکیم کی روشنی میں جنسی بدنہادی کا مکمل علاج عقیدے
کی بنا پر ہی ممکن ہے 351
مومنہ عورتوں اور مومن مردوں کا باہمی رشتہ بھائی بہن کا ہی ہے 352
سیکس کے معاملے میں قرآنِ حکیم کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ 353
چودھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 177 تا 191)
شروع سے آخر تک پیش کردہ دینِ خداوندی کی وضاحت 356
قرآنی نظام کے تحت زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا 356
ہر رسول کی پہلی دعوت قوموں کے خودساختہ نظام کے
نتائج سے آگاہ کرنا تھا 357
دینِ خداوندی کے نظام کا نفاذ مرکزِ ملت کے تحت ہی ہوسکتا ہے 358
معاوضے کا طلب گار تو نبی بھی ہوتا ہے لیکن وہ کسی انسان سے نہیں مانگتا 358
حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالے سے دنیا کی موجودہ حالتِ زار 358
معاشرتی طور پر سب سے پہلی چیز ناپ اور تول کا صحیح ہونا ہوتا ہے 359
فساد کا اور مطففین کا قرآنی مفہوم اور اس کے نتائج 359
مطففین کا معاشرہ تباہ ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا 360
انسانوں کی صلاحیتوں کے سلسلہ میں ماپ تول کے فرق کا ذکر 360
انسانی تاریخ میں منحوس ترین دن 361
نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد دوسروں کی محنت کے استحصال
کے لیے مزدوری کی مزدوری مقرر کرنے میں ہے 362
سرمائے کے ماحصل کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظام کی کیفیت 362
دنیا بھر کی پسماندگی اور اذیت ناکی کی بنیاد ماپ تول
کے غلط نظام پر ہے 363
Wages (اجرت) مقرر کرنے کے سلسلہ میں سپلائی
اور ڈیمانڈ (رسد وطلب) کا حربہ 364
پرائیویٹ اسکول میں بچوں پر اٹھنے والے اخراجات 364
معاشرے کی خاطر کھولے جانے والے اسکولوں کا
معیار اور ان کی حالتِ زار 365
نظامِ سرمایہ داری کے لیے Wages (اجرتوں)
کی خاطر مزدوروں اور غلاموں کی پیداوار کا طریق 365
قرآنِ حکیم Wages (اجرتیں) مقرر کرنے والا
معاشرہ تشکیل ہی نہیں کرتا 366
کارل مارکس کی ناکامی کے بعد لینن کا اعتراف 366
کمیونزم کی جگہ سوشلزم کی بنیاد 367
کوئی سرمایہ دار Wages (اجرتوں) کے نظام کو غلط قرار نہیں دیتا 367
Wages (اجرتوں) کے سسٹم کو ختم کرنے کے
طریق کے بعد قرآن کے معاشی نظام کے لیے جذبہ محرکہ 367
انسانیت کے راستے کی یہ تمام رکاوٹیں یقیناً ختم ہو جائیں گی 368
قرآنِ حکیم کا عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم ہو کر رہے گا 369
ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانے کا طریق 369
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے صرف زبان کا سمجھنا ہی ضروری نہیں 370
رسول ہمیشہ معزز خاندان سے ہوا کرتے تھے 370
انسان کے لیے اس کی اصل طاقت اس کا جتھہ نہیں ہوتا بلکہ
خدا کا قانون ہوتا ہے 371
خدا کے نام کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سطحی طور پر تسلیم کرنا
قبول نہیں کیا جائے گا 371
ہم نے بھی قومِ شعیب کی طرح قدر کے نام کو ایک
اکسٹرا (Extra) خدا کے طور پر مان رکھا ہے 372
تحریکِ پاکستان کے دوران مذہبی پیشوائیت کے ساتھ

طلوع اسلام (مجلّہ) کا تنازعہ اس سسٹم کی بنیاد پر ہی تھا 373
قرآن حکیم کے ہاں صلوٰۃ کا مفہوم قرآنی نظام کو عملاً قائم کرنا ہے 374
حضرت شعیبؑ کی صلوٰۃ معاشی نظام کو بھی احاطہ کیے ہوئے تھی 374
نظامِ صلوٰۃ کی ساری کی ساری مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے 375
سرمایہ دار کے نزدیک کوئی غریب تو عقلمند ہوتا ہی نہیں 375
روپے کے بل بوتے پر کسی غریب کو کوئی بلند مرتبہ نصیب ہی نہیں ہوتا 376
آج باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے 51 فی صد ووٹ کافی ہوتے ہیں 377
قرآنی اقتدار کو نہ ماننے والوں پر عذاب کی نوعیت 377
پندرھواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 192 تا 199)
علمِ انسانی اور علمِ وحی میں ایک بنیادی فرق ہے 380
کشف اور الہام کے تصورات خالصتاً عجمی تصورات ہیں 380
تنزیل کا قرآنی مفہوم 381
غیر از نبی وحی کی لذت سے ہی محروم ہوتا ہے 382
''روح'' کے مروجہ معانی و تصور غیر قرآنی ہیں 382
''روح'' سے قرآنی معانی توانائی کے ہیں اور قرآنِ انسان
کے لیے روح کا ذکر نہیں کرتا 382
جبرائیل، میکائیل الوہیاتی توانائی کے معنوں میں بھی
استعمال ہوتا ہے 384
تصوف تو سراپا غیر قرآنی تصور ہے 384
مقامِ نبوت تو ایک انقلابی پروگرام کا داعی ہوتا ہے 385
خیالات و الفاظ کا ایک دوسرے کو جنم دینے کا مسئلہ
ایک پیچیدہ سوال ہے 386
الفاظ و معنی کے باہمی تعلق کا تجزیہ 387
قلبِ نبوی پر عربی مبین کے الفاظ کی شکل میں وحی کا نزول 388
قرآنِ حکیم کی تعلیم ایک نصابی تعلیم ہے 389
بعد میں وحی کی دو قسمیں جنم لینے والے خود ساختہ غیر قرآنی عقائد و تصورات 389
قرآن کی عربی کے علاوہ مختلف ممالک میں عربی زبان کی کیفیت 390
قرآنِ حکیم کو عربی زبان کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے 391
قرآنی الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے معنی کو بھی محفوظ کرنا ضروری تھا 391
لغات القرآن مرتب کرنے کے دوران میری سعی و کاوش
اور قرآن کی عربی زبان کے الفاظ و معانی کا تحفظ 392
قرآن کے مختلف تراجم اور تفاسیر میں تضاد کی وجہ الفاظ
قرآن کے عجمی معنی ہیں 394
مصر کے سفیر عبدالوہاب عزّامؒ کی علمی شخصیت سے ملاقاتوں کا ذکر 395
قرآنِ حکیم نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی خود قرآن کے
اندر واضح کر رکھا ہے 397
قرآن فہمی کے سلسلہ میں آج عربی بولنے والے بھی عجمی ہو چکے ہیں 398
قرآنِ حکیم کا نہ تو ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے
مرادفات کہیں مل سکتے ہیں 398
قرآنِ حکیم کی انسانیت ساز تعلیم، فرقہ واریت کی
اندھیری غار کی نذر ہو گئی ہے 398
قرآنِ حکیم کا ترجمہ نہیں ہو سکتا 399
تفسیر جلالین کی کیفیت 400
قرآنی آیات کا مفہوم تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ترجمہ نہیں کیا جا سکتا 400
قرآن مجید میں سابقہ انبیائے کرام کی پیش کردہ
اصل تعلیم کو جمع کر دیا گیا ہے 401

قرآنِ حکیم کے الفاظ کا محفوظ ہو جانا ہی قرآن کا اعجاز ہے 401
سولھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 200 تا 202)
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں میرا اندازِ فکر اور لفظ ''سلک'' کا مفہوم 404
قرآنِ حکیم کے تراجم نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے 405
لِسانِ عربی مبین میں لفظ جرم کا قرآنی مفہوم 406
خیرات کے لفظ کی طرح، جرم کا لفظ بھی ایک نظام کی ترجمانی کرتا ہے 407
جرم کے قرآنی مفہوم کے سلسلہ میں، مترفین قرآن کی
ایک دوسری اصطلاح 408
مجرمین کی اسکیمیں قانونی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں 409
آج کی تجارت قانونی چوری ہے 409
مختلف شکلوں میں نظامِ سرمایہ داری کو قانونی بالادستی کے
تحت قائم کر دیا جاتا ہے 410
قرآنِ حکیم کے نزدیک صاحبِ عقل وشعور ہونے کا معیار 411
مترفین کا قائم کردہ معاشرتی نظام جہنمی زندگی کا پیش خیمہ ہوتا ہے 411
لاٹھی والے کی بھینس کی بجائے، بھینس والے کی بھینس
والا نظام ثمر بار ہوگا 411
الحق والا یہ نظام کیسے قائم ہوگا؟ فساد سے نہیں بلکہ کلمات سے 412
قرآنِ حکیم فساد کی جگہ فساد کی اجازت نہیں دیتا بلکہ حق کا نظام قائم کرتا ہے 413
انسانیت کی چیخ وپکار اور افسردگی کا علاج نفسیاتی تبدیلی میں ہے 413
قوم کی نفسیاتی تبدیلی کے بعد کسی سپاہی کی ضرورت ہی نہیں رہتی 414
قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا سنکھیا، انسانی ذات کو
ہلاک کرتا ہے ''میں'' کو مارتا ہے 415
خدا کا قانون نوعِ انسانی کو یتیمی حالت میں نہیں رہنے دے گا 415
علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی نے نظامِ سرمایہ داری کو
مداری کا تماشہ قرار دیا 416
ہمارے ہاں کے مفسرین نے ربوٰ کا نقشہ ہی بدل دیا ہے 417
قرآنِ حکیم کی روشنی میں ربوٰ کا مفہوم 418
ربوٰ کے نظام کے ہاتھوں ستائے ہوئے مجرمین کی حالتِ زار 419
زندگی بھر کے اعمالنامہ کی نوعیت 419
اعمالنامہ میں تو دل میں گزرنے والے خیالات بھی درج ہوں گے 420
انسان اپنی شکل میں انسان بھی ہے اور حیوان بھی 420
حق کے نظام میں مجرمین کو الگ کر دیا جائے گا 421
آخرت میں بچنے کا طریق اور اس کا بندوبست 422
دوسروں کی کمائی پر علما اور مشائخ کی خوش حال زندگی 422
سرمایہ داروں کی نجی زندگی ایک الم انگیز داستان لیے ہوتی ہے 423
مسلمان کی تعریف کے سلسلہ میں علمائے کرام کے منیر کمیٹی کے سامنے بیانات 424
سترھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 203 تا اختتام)
نظامِ کائنات میں مہلت کے وقفے کو بڑی اہمیت حاصل ہے 427
ذاتِ خداوندی کسی کو بھی آگاہی کے بغیر تباہ نہیں کرتی 229
توحید یہ ہے کہ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں
بھی خدا کا ہی قانون رائج ہو 430
ہمارے ہاں دین مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے 431
ہزار برس سے عبادت کی جگہ پرستش کے فریب میں اسیر قوم کی حالت 431
نبوت کا فریضہ نظامِ زندگی میں عملی طور پر ایک انقلاب
پیدا کرنا ہوتا ہے 432
اپنے اپنے گھروں کو قبلہ بنا لینے کا حکم 432
خطرے کے وقت رسولؐ خدا کا مومنین کو اپنے سایۂ عاطفت

میں لینے کا انداز	433
رسولِ خدا کی بارگاہ میں صاحبِ ایمان کا فریضہ اور ان کی کیفیت	434
قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابہ کرام کا مقامِ بلند	435
ہماری تاریخ ہی تو قرآنِ حکیم کی بڑی حد تک نقیض ہے	438
صحابہ کرام کا تذکرہ تاریخ کے آئینہ میں	438
حضور ﷺ کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد	439
انسان کے بچے اور حیوان کے بچے میں فرق	440
انسانی بچے کو علم حاصل کرنے کی نعمت سے نوازا گیا ہے	441
انسانی علم کا تمام تر دارومدار حواس خمسہ کا رہین منت ہے	441
دل و دماغ کے ذریعے فیصلہ کرنے والی قوت کو قرآنِ حکیم	
فواد سے تعبیر کرتا ہے	442
حواسِ خمسہ کے تحت حاصل کردہ علم کے علاوہ ایک اور خاص علم بھی ہے	442
عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا انجام جہنم ہے	443
علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں انسان کے مختلف دعوے	
اور پھر نبی کے متعلق ان کے تصورات	444
وحی کی زبان منفرد انداز کی حامل ہے	444
لفظ شیطان اور ابلیس کا قرآنی مفہوم	445
علامہ اقبالؒ کا مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق تجزیہ	446
عربوں کے ہاں شاعری کی اہمیت	446
شاعری کو زمانے کی گردشیں خود ہی مٹا دیتی ہیں	447
رسول ﷺ اکرم کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد	447
قرآن کی نظر میں شاعروں کی کیفیت	448
ایمان والوں کی معاشرتی زندگی	449
قرآنِ حکیم کے نزدیک شاعری کی تعریف	450
حیاتِ انسانی کی حقیقتوں کو نثر (Prose) کے انداز	
میں ہی بیان کرنا چاہیے	450
علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو شاعر کہلوانا اپنی توہین سمجھتے تھے	451
اقبالؒ بارگاہِ رسالت میں	452
اقبالؒ جیسے مفکرِ قرآن اور انقلابی شخصیت کو قوم نے	
شاعری کے قبرستان میں دفن کر دیا	452
قرآن حکیم کے سلسلہ میں اقبالؒ کا مجھ پہ ذاتی احسان بھی ہے	453
ذاتِ اقبالؒ کا پروگرام ایک کتاب لکھنے کا بھی تھا جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا	453

❁ , ❁ , ❁ , ❁ , , ❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

علامہ پرویزؒ کی قرآنی خدمات

قارئین کرام اس حقیقت ثابتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ قرآنِ حکیم کے سلسلہ میں محترم علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی بھر کا سرمایۂ حیات ان کی عظیم کتب ''مفہوم القرآن'' اور ''لغات القرآن'' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً چالیس پچتالیس کتب پر مبنی مایہ ناز قرآنی تعلیم پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا قرآنِ حکیم کے جاں نثاروں کے لیے علم و شعور کا ایک لازوال سرمایہ تصور کیا جاتا ہے۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے دیے گئے دروس قرآن کی تفصیل

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی مذکورہ بالا شب و روز عرق ریزی کے علاوہ قرآنِ حکیم کو خود قرآنِ حکیم سے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ان کی طرف سے دروسِ قرآن کا ایک طویل سلسلہ بھی تاحیات جاری رہا۔ چنانچہ ان دروسِ قرآنی کا پہلا دور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۷ء تک (۸ سال) اور دوسرا دور مارچ ۱۹۶۸ء سے تین اکتوبر تک (۱۷ سال) سورہ مطففین تک جاری رہ سکا۔ فکرِ قرآنی کی اس کٹھن منزل تک پہنچنے کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحبؒ نے علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں اپنے طور پر تو یہی کہوں گا کہ وہ میرے ذاتی محسن ہیں اور قرآنِ حکیم کو سمجھنا میں نے ان سے سیکھا ہے اور پھر یہ کہ انہوںؒ نے ہی ہمیں قرآن حکیم کے نظام سے شناسا کرایا۔''

علامہ پرویزؒ کے دروسِ قرآن کو محفوظ کرنے کی کوشش

عزیزانِ من! محترم پرویز صاحبؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں سینکڑوں کی تعداد میں محفوظ کیے جا چکے تھے، چنانچہ اس لازوال علمی خزینہ کی اہمیت کے پیش نظر بزمِ طلوع اسلام لاہور نے انہیں باقاعدہ طور پر اکتوبر ۲۰۰۳ء سے قرطاس پر منتقل کرنے کا اہتمام کیا لہٰذا اس پروگرام کے تحت اب تک سورۃ نحل سے سورۃ الفرقان تک اور پارہ ۲۹ اور ۳۰ کے علاوہ

سورۃ فاتحہ سمیت بارہ جلدیں قارئین کی خدمت میں پیش کی جاچکی ہیں۔ جب کہ خدا کے فضل وکرم سے اس وقت اسی سلسلہ کی تیرہویں کڑی جوسورۃ شعراء کے دروس پر مشتمل ہے۔طالبانِ فکرِقرآن کے استفادہ کے لیے حاضرِ خدمت ہے۔

فہرست میں دیئے گئے عنوانات کے مطابق زیرِنظر جلد میں دیگر کئی امور کے علاوہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنسی بدنہادی قوموں کے کریکٹر پر کس قسم کے نقوش مرتب کرتی ہے اور پھر اس بدعملی کے نتائج سے بچنے کا طریق کیا ہے۔

عزیزانِ من! ذاتِ خداوندی نے قدم قدم پر خارجی کائنات کی مثال دیتے ہوئے نوعِ انسانی کو قندیلِ آسمانی میں بڑے واضح انداز میں یہ باور کرارکھا ہے کہ قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا جرم یہ ہوتا ہے کہ قوم تو ہو لیکن وہ عادلانہ نظام سے محروم ہو۔ چنانچہ خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کی برومندی کے لیے قرآنی نظامِ حیات کے بنیادی خدوخال بڑے واضح، سہل اور دوٹوک انداز میں اس نسخۂ کیمیا کے اندر متعین طور پر محفوظ کرر کھے ہیں یعنی یہ ایک ایسا نظامِ زندگی ہے کہ جس کے تحت انسان پر انسان کی حکومت کی بجائے قانونِ خداوندی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس دورِ ملوکیت میں تو قوموں کی تعلیم وتربیت اور عقل وشعور کی نشوونما کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ نظامِ ملوکیت میں تو محکوم قوم کو اپنا عقیدہ بدلنے کے لیے بھی فرعون کی اجازت حاصل کرنا ہوتی ہے حتیٰ کہ انسانوں کی اس اجارہ داری میں انسان بتدریج اپنی جان بخشی کا ہی طلب گار ہو کر رہ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ شعرآء میں داستانِ بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد انسان کو مذکورہ بالا حقائق سے آگاہ کرنا ہے اور یہ بھی واضح کرنا ہے کہ سرمایہ داری نظام کے دامن میں الجھی ہوئی یہ انسانی زندگی ہمیشہ ایک الم انگیز داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کرۂ ارض پر نظامِ سرمایہ داری کی بارود سے بھری بنیادوں پر استوار ہونے والا یہ فلک بوس Global Village نوعِ انسانی کے لیے ہر سُو ایک جہنم کا نقشہ پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انسانی زندگی کا یہی وہ جہنم ہے جس سے محفوظ رہنے کی خاطر ستر سال پیشتر علامہ اقبالؒ نے قرآنِ حکیم کی روشنی میں اس عقلِ خود بیں کی راہنمائی کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ یاد رکھو!

تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

لیکن افسوس کہ ہم نے اس دیدہ ور کی اس قرآنی بلند فکری کو ڈھولک کی نذر کرتے ہوئے اسے شاعری کے قبرستان میں دفن کر دیا اور ان کے حیات بخش اور علم وفراست سے مالا مال پیغام کو آگے بڑھنے ہی نہ دیا جب کہ وہ بارگاہِ رسالت میں فریاد کناں رہا کہ

من اے میر اممؐ! داد از تو خواہم

مرا یاراں غزل خوانے شمر دند

(ارمغانِ حجاز)

(اے رسول اکرمؐ! مین تیری بارگاہ میں فریاد کرنے آیا ہوں کہ وہ مجھے شاعر کہہ رہے ہیں، میں شاعر نہیں ہوں ❶۔ ''ساری عمر وہ یہی چلاتا ہوا مر گیا۔

''وہ اتنا بڑا فلاسفر ہے کہ یورپ اس کا سکہ مان رہا ہے۔ وہ اتنے سے سارے چھ لیکچرنز میں ان کے سامنے گئے تو یورپ میں ان کے تصورِ اسلامی فکر کی جو انہوں نے قرآنِ کریم سے لیا تھا، وسیع پیمانے پر تشہیر ہوئی۔ قرآن کا اتنا بڑا جاننے والا ہے کہ ہزار برس میں یہ مفکر پہلا بتانے والا ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور قرآن ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ہزار برس میں میری نگاہ میں پہلا شخص ہے جس نے اس طرح بتایا ہے۔ اتنا بڑا انقلابی ہے کہ آپ کو اتنی بڑی مملکت کا تصور دے گیا۔ یہ سب کچھ اس نے کیا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا تعارف صرف شاعرِ مشرق کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ ستیاناس!! وہ چیختا ہوا مر گیا، وہ ایسا کہنے والوں کو ''مردِ فرودست'' کہہ رہا ہے۔ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں جا کے چیخ رہا ہے کہ دیکھنا! یہ مجھ پہ کیا الزام دھر رہے ہیں لیکن قوم نے نہ اسے فلاسفر کہا' نہ اسے مفسرِ قرآن کہا' نہ حکیم کہا' بلکہ شاعرِ مشرق کہا اور ساری دنیا میں شاعرِ مشرق ہے۔ آج اس کا نتیجہ یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جس قدر انقلابی پروگرام وہ شخص دے کر گیا' وہ سارے کا سارا قوم نے نظر انداز کر دیا' پسِ پشت ڈال دیا اور اس کی وہ چند غزلیں باقی رہ گئیں جو ڈھولک کے اوپر گائی جاتی ہیں اور ریڈیو پہ سنائی جاتی ہیں۔'' (بحوالہ درسِ قرآن حکیم' مورخہ 11 اگست 1978ء)

علامہ اقبالؒ ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی قوم سے مایوس نہیں لہٰذا اس صورت حال کے پیشِ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کی شخصیت ہم سے یہ کہہ رہی ہے کہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا

جسے آگئی میسر میری شوخیٔ نظارہ

---

❶ حضرت علامہ اقبالؒ نے خود سید سلیمان ندوی مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا:
''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔'' (حوالہ طلوعِ اسلام، مئی 1985' ص 63)

علامہ اقبالؒ کی شوخیٔ نظارہ قرآنِ کریم کے ماہِ تمام کی مرہونِ منت ہے اور جب یہ روشنی میسر ہو جائے تو سوزِ سخن بھی عینِ حیات بن جاتا ہے اور یہ میسر نہ ہو تو مرگِ دوام انسانیت کا نصیب بن کر رہ جاتی ہے بقول اقبالؒ:

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن، روسخن مرگِ دوام اے ساقی!
تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

آخر تک حسبِ سابقہ بزمِ طلوع اسلام لاہور محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی ان علمی کاوشوں کی دلی طور پر معترف ہے کہ جنہوں نے ان دروس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آنے والا دور یقیناً آپ کی اس جانفشانی کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ نیز محمد علی فارق صاحب کی محققانہ کاوش کہ جنہوں نے ان تمام دروس کے ایک ایک لفظ کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی علمی راہنمائی سے شرف بخشا۔ کمپوزنگ کا طویل مرحلہ آڈیو وڈیو کیسٹ سے محترم ہارون ریاض صاحب، رضا اللہ ساجد صاحب کی رہین منت ہے جن کا ہم دلی طور پر احسان مند ہیں۔

والسلام

اشرف ظفر

پہلا باب: سورۃ الشعرآء (آیات 1 تا 6)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1978ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء سے ہوتا ہے (26:1)۔

یہ 26 ویں سورۃ اور 19 واں پارہ ہے:

حروفِ مقطعات کی کیفیت

ابتدا ہی اس سورۃ کی طٰسٓمٓ سے ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے حروف آ چکے ہیں۔ قرآنِ کریم کی بہت سی سورتیں ایسی ہیں جن کے ابتدا میں اس قسم کے حروف آتے ہیں۔ یہ لفظ نہیں ہوتے بلکہ حروف ہوتے ہیں یا حرف ہوتا ہے اور ان کو پڑھنا بھی حرف ہی کی طرح ہوتا ہے مثلاً ''طٰ س م''۔ یہ اس طرح سے پڑھا جائے گا' یہ طٰسٓمٓ نہیں پڑھا جائے گا۔ خود قرآن میں یہ ہے کہ یہ عربی مبین میں نازل ہوا۔ عربوں کا جو اسلوب و اندازِ بیان تھا' اس کے مطابق نازل ہوا۔ عربوں کا جو انداز تھا بلکہ اس سے پہلے عبرانی میں بھی یہ بات تھی' تورات میں بھی یہ چیزیں ملتی ہیں' ان کے ہاں انداز یہ تھا کہ جس طرح ہمارے ہاں انگریزی زبان میں Abbreviations (مخففات) ہوتے ہیں یعنی الفاظ کے مخففات ہوتے ہیں جیسے میں وہ مثال دیا کرتا ہوں کہ چٹھی کے بعد جب

کچھ اور Add (اضافہ) کرنا ہو تو نیچے آپ لکھا کرتے ہیں: ps (post script) اور میں کہا کرتا ہوں کہ دراصل وہ پنجابی زبان کے دو حروف ہیں بلکہ دو الفاظ ہیں' انگریزی کے نہیں ہیں یعنی ps کے معنی ہیں ''پچھوں سُجّی'' ❶ ۔ تو وہ یہ Abbreviations (مخففات) ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ انگریزی زبان میں تو اس کا یہ عام استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وقت لکھ کر یہ pm اور am لکھتے ہیں۔ اس قسم کی یہ چیزیں عبرانی میں بھی تھیں اور عربی زبان میں بھی یہ بات تھی' عربوں کے ہاں بھی یہ چیز تھی اور ان کے ہاں تو اسلام سے پہلے کا لٹریچر شعر میں ہی ملتا ہے۔ عربی زبان میں نثر کی سب سے پہلی کتاب قرآنِ کریم ہے۔ ان کی شاعری کے اندر تو عام طور پہ یہ Abbreviations یا مخففات ملتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم انہی کے انداز و اسلوبِ بیان کے مطابق نازل ہوا۔ اس لیے اس انداز کے مطابق اس میں بھی یہ جو مخففات ہیں' وہ اس کے اندر رکھے گئے ہیں۔ اصطلاح میں ان کو مقطعات کہتے ہیں مثلاً یہ لکھا تو جائے گا ''الم''۔ اکٹھا ہو تو الٓـمٓ بنتا ہے لیکن مقطعات کے معنی ہیں کہ یہ حروف قطع کیے ہوئے ہیں۔ یہ Words (الفاظ) نہیں' یہ Letters (حروف) ہیں اور الگ الگ پڑھے جائیں گے اسی لیے ان کو مقطعات کہتے ہیں: حروفِ مقطعات' یعنی قطع کیے ہوئے حروف۔

خدا تعالیٰ کی صفات پر مبنی حروف

ان مقطعات کے متعلق بہت سی بحثیں چلی آتی ہیں کہ ان کے معنی کیا ہیں' کس طرح سے ہیں۔ بہرحال میں ان بحثوں میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے اپنے ہاں انداز یہ رکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے' جو الفاظ قرآن میں آئے ہیں' ان الفاظ میں سے کوئی ایک حرف لے کر اکٹھے لکھے گئے ہیں ❷ ۔ میں نے کم از کم ان سے یہی مفہوم لیا ہے اور آپ میرے ''مفہوم القرآن'' میں دیکھیں گے کہ میں نے پھر ان کا ترجمہ یا مفہوم بھی یوں ہی کہا ہے مثلاً طٰ ہے قرآنِ کریم میں خدا کی ایک صفت ذی الطّول (40:3) بھی کہی گئی ہے۔ ''طول'' کے معنی ہوتا ہے لمبا ہاتھ' جیسے کہتے ہیں اقتدار کی وسعتیں' اختیارات کی پہنائیاں۔ تو ذی الطّول خدا کی ایک صفت ہے اور یہ قرآن میں آئی ہے۔ اسی طرح یہاں طٰسٓمٓ سے اس سورۃ الشعراء کا آغاز ہوتا ہے اور ''س'' تو سمیع ہے اور

---

❶ بعد بھی سوجھی

❷ قرآن کریم میں حسبِ ذیل حروفِ مقطعات آئے ہیں: آلٓمٓ (2:1) خدائے علیم وحکیم' آلٓمٓصٓ (7:1) خدائے علیم وحکیم وبصیر' آلٓرا (10:1) خدائے علیم ورحیم' کٓھٰیٰعٓصٓ (19:1) اللہ الکریم الہادی' الحی' العلیم' البصیر' طٰہٰ (20:1) طٰسٓمٓ خدائے ذی الطّول وسمیع وعلیم' طٰسٓ (7:1) خدائے ذی الطّول وسمیع' یٰسٓ (36:1)' الصّٰفّٰت (37:1)، صٓ (38:1)' حٰمٓ (40:1) خدائے حکیم وعلیم' قٓ (50:1)' نٓ (68:1)

''م''، علیم ہے۔ یہ اس قسم کی صفات کے الفاظ کے حروف ہیں' جنہیں اس طرح سے لکھا جاتا ہے اور میں **طٰسٓمّٓ** (26:1) کا ترجمہ کیا کرتا ہوں کہ ''خدائے ذی الطّول وسمیع وبصیر یا علیم کا ارشاد ہے کہ۔ اس سے اگلی آیت ہے کہ **تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ** (26:2) تو اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ یہ ہے کہ یہ جو بیان ہو رہی ہیں' یہ اس کتاب کے قوانین ہیں جو مبین ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات کو بینات کہا گیا ہے اور اس پوری کتاب کے متعلق متعدد مقامات میں اسے کتابِ مبین کہا گیا ہے یعنی نہایت واضح۔ اول تو خود عربی کے معنی ہی ''واضح'' ہیں پھر قرآن میں یہ ہے کہ یہ لسانِ عربی مبین کے اندر نازل ہوا ہے۔ یعنی نہایت واضح ہے' اپنے مطالب کے بیان کرنے میں بڑا ہی فصیح ہے' بڑا ہی واضح ہے۔ کتاب کے متعلق کہا کہ **کِتٰبِ الْمُبِیْنِ** یعنی بڑی واضح کتاب۔ اس کتاب کو ہونا ہی یہ چاہیے تھا۔ جس کتاب نے قیامت تک کے لیے تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ حیات بننا ہے وہ اگر واضح نہ ہو تو اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کتابِ مبین ہے' اس کے لیے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں

اب مجھے آگے چلنا ہے' ورنہ میں یہ عرض کرتا کہ قرآنِ کریم کے اور اللہ تعالیٰ کے اس قسم کے دعاوی یا شہادات کے باوجود قرآن کے متعلق ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ یہ بہت مجمل ہے (معاذ اللہ)' مبہم ہے' اس سے بات صاف نہیں ہوتی' اسے واضح کرنے کیلیے خارج از قرآن اٹھارہ اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے۔ وہ کیا کتاب ہوئی جسے سمجھنے کے لیے اٹھارہ اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے!! اور پھر ان علوم سے ہی بات نہیں چلی تو اس کے بعد یہ ہوا کہ خدا کی طرف سے مامور من اللہ آیا کریں گے۔ کاہے کے لیے؟ اس کی کتاب کو سمجھانے کے لیے (معاذ اللہ)۔ سوچیے' عزیزانِ من! اگر کسی مصنف کی کتاب کے متعلق یہ کہا جائے کہ بڑی مبہم ہے' بڑی مجمل ہے' سمجھ میں نہیں آتی اور اس کے ساتھ یہ ہو کہ مصنف کتاب کو چھاپے' شائع کرے اور جہاں وہ کتاب جائے وہاں اپنا ایک شاگرد بھیجا کرے کہ جاؤ بھئی' وہاں جا کر ان کو سمجھاؤ' ورنہ بات کسی کے پلے نہیں پڑے گی۔ کتاب کا مصنف خدا ہے' وہ اس کو کتابِ مبین کہہ رہا ہے مگر معاذ اللہ' یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اس کتاب کے متعلق کیا پتہ ہے' یہ بڑی مبہم کتاب ہے' بڑی مجمل کتاب ہے' اس کو تو سمجھنے کے لیے اتنے علوم کی ضرورت ہے اور سمجھانے کے لیے پھر آسمان سے آنے والے کی ضرورت ہے جسے وہ مامور من اللہ کہتے ہیں۔ بہرحال یہاں آیا ہے کہ **تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ** [1] (26:2)۔ عزیزانِ من!

---

[1] طٰسٓمّٓ (26:1) خدائے ذی الطّول وسمیع وعلیم کا ارشاد ہے کہ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ (26:2) یہ اس ضابطۂ خداوندی کے احکام ہیں جو ہر بات کو وضاحت سے بیان کرتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 833)۔

اگر قرآنِ کریم کو قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سمجھا جائے تو اس کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں، جو غیر واضح رہ جائے۔ اس قدر مبین ہے یہ ہے الکتاب المبین مگر!

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ❶

سیرتِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند وضعی گوشے!!

اب بات آگے شروع ہوتی ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (26:3)۔ یہ عجیب حقیقت بیان ہوئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے متعلق عام طور پہ یہ چیز مشہور ہے کہ حضور ﷺ کی پہلی تیرہ سال کی، مکے کی زندگی، ایک واعظ کی، مبلغ کی، استاد کی تھی جیسے صوفیائے کرام ہوتے ہیں، جیسے درویشوں کی سی زندگی ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی قوت، کوئی طاقت، کوئی مملکت وغیرہ، کا تصور ہی نہیں تھا۔ وہ زندگی تو آپ ﷺ نے اس طرح سے گزاری۔ اور اس کے لیے پھر ہم ہی مستشرقین کو مواد دیتے ہیں تو اس میں ان کا کچھ قصور ہی نہیں ہے، ہماری تاریخوں سے ہی وہ یہ سب کچھ لیتے ہیں کہ اس زندگی میں آپ ﷺ کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اسلام کی کوئی مملکت بھی ہونی چاہیے، سلطنت ہونی چاہیے، اپنی حکومت ہونی چاہیے۔ اور پھر جب اس کے بعد مدینے گئے، آپ ﷺ نے جا کر دیکھا کہ ماحول بڑا سازگار ہے، یہاں تھوڑی سی کوشش کی جائے تو اپنی حکومت قائم ہوسکتی ہے تو وہاں پھر آپ ﷺ کے ذہن میں مملکت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جب یہ خیال پیدا ہوا تو اس کی مخالفت ہوئی، مخالفت ہوئی تو پھر اس کے بعد آپ ﷺ کی باقی ساری زندگی جنگوں اور لڑائیوں میں صرف ہوگئی۔ خاص طور پہ یہ قریش اور عرب کے دوسرے قبائل یہ سارے مخالف فوجیں لے کر آتے تھے، یہ ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ یعنی تصور یہ قائم کیا جاتا ہے کہ پہلی زندگی اس قسم کی تھی جیسے وہ ترکِ آرائش اور ترکِ دنیا کی درویشانہ سی زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کا اگلا حصہ، جسے مدنی زندگی کہتے ہیں، ساری زندگی ایک فوج کشی کی زندگی، نبرد آزمائی کی زندگی، میدانِ جنگ کی زندگی، قتل و غارت گری کی (معاذ اللہ) زندگی، وہ باقی ساری زندگی یہ زندگی تھی: جس کسی نے مخالفت کی آپ ﷺ اٹھے، اس کے خلاف تلوار ہاتھ میں لی۔ یہ دونوں ہی تصورات غلط ہیں۔

سیرتِ رسول ﷺ کی صحیح صورتِ حال

یہ صحیح ہے کہ زندگی کے اس حصے میں، جو بعد میں شروع ہوا، آپ ﷺ کو واقعی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ ان لڑائیوں میں کہیں حملہ نہیں کیا، فوج کشی نہیں کی۔ وہاں سے آپ ﷺ اپنی جماعت کو لے کر دور مدینے چلے آئے۔ آج تو خیر مکے اور مدینے کے فاصلے میں

---

❶ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا (غالب)

وہ بُعد نہیں' Communication (مواصلات) اتنی زیادہ عام ہوگئی ہے۔ اس زمانے میں آپ دیکھیے کہ یہ تین سو میل کا سفر تھا اس کے لیے نہ کوئی سواری' نہ کوئی سڑک' نہ کوئی راستہ تھا' آپ ﷺ کتنے فاصلے کے اوپر چلے گئے' ان کا باہمی کوئی تعلق ہی نہیں تھا' لیکن قریش نے اس پہ بھی چین نہیں لینے دیا۔ ابھی یہاں آ کر بیٹھے ہوئے دوسرا ہی سال تھا' ہماری آج کی اصطلاح میں پناہ گزینوں کی حیثیت سے یہاں آ کر بیٹھے تھے: نہ گھر' نہ در' نہ رہنے کو ٹھکانہ' نہ کھانے کو کوئی روٹی۔ یہ کیفیت تھی یہاں۔ جن کے ہاں مہمان بن کر آئے ہیں' وہ بھی کوئی سلطنت کے مالک نہیں تھے۔ وہ بھی وہی غریب آدمی تھے۔ دوسرے ہی سال اس زمانے کے اعتبار سے ایک عظیم لشکر لے کر' ساز و یراق کے ساتھ' وہ مدینے پر آ کر حملہ آور ہوئے ہیں اور یہاں سے وہ لڑائیاں شروع ہوئیں۔ آپ ان لڑائیوں کو دیکھیے وہ ساری لڑائیاں یہاں مدینے اور اس کے قرب و جوار میں ہی ہوئی ہیں۔ آپ ﷺ نے مکے میں جا کر کوئی حملہ نہیں کیا ہے۔ وہ تو جب یہ سلسلہ اتنا لمبا بڑھ گیا اور آخری چیز یہ تھی کہ انہوں نے مکے میں ان کے حج کرنے کے راستے میں بھی رکاوٹیں ڈال دیں' حدیبیہ کے مقام سے انہیں حج کیے بغیر واپس آنا پڑا' جب مخالفت یہاں تک بڑھ گئی تو اس کے بعد مکے کو فتح کیا گیا اور وہاں بھی کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے لیکن بہرحال یہ ساری ہی لڑائیاں' اس انداز کی ہی لڑائیاں تھیں۔

نبی اکرم ﷺ کا قلبِ حساس

عزیزانِ من! یہ جو ان لڑائیوں کا' ان کی طرف سے نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس میں یہی نظر آتا ہے اور پھر اس کے بعد تو آپ کے ہاں بڑے فخر سے یہ کچھ کہا جاتا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ اندازہ لگایئے۔ مستشرقین کو ہم کیا کہیں گے۔ بتایا ہی یہ جاتا ہے کہ بس نبی اکرم ﷺ ایک ہاتھ میں قرآن' ایک ہاتھ میں تلوار رکھتے تھے اور اس کے بعد بڑے فخر سے ہر ایک کو کہا جاتا تھا کہ اسلام لاتے ہو یا نہیں؟ مسلمان ہوتے ہو یا نہیں؟ یا مسلمان ہو جاؤ یا تلوار کا گھاؤ کھاؤ یا کلمہ پڑھا تو چھوڑ دیا' نہیں پڑھا تو سر کاٹ دیا۔ یہ تصور پیش کیا جاتا ہے۔ ایک طرف اس تصور کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف خود خدا کی اس شہادت کو سامنے رکھیے' بات صاف ہو جاتی ہے۔ یہ کہا کہ **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ** (26:3) اے رسول! تو اس صدمے' اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ صحیح راستہ کیوں نہیں اختیار کرتے۔ جو کسی کی خاطر جان گھلایا کرتا ہے' کیا وہ شمشیر بدست اس کے سرہانے کھڑا ہوا کرتا ہے؟ اس سے زیادہ مشفق طبیب تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ عام طور پہ طبیب یا ڈاکٹر بھی یہ کچھ Mechanically (میکانکی طریقے سے) کرتے ہیں۔ مریضوں کے علاج میں ان کا تعلق مرض اور دوائی سے ہوتا ہے۔ مریض کا غم اس کا درد اور چیز ہے مگر یہاں اس درد کی دردمندی اور غمگساری ہے۔ اس کے لیے آپ سوچیے تو سہی کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں' جنہیں واقعی اتنی

لڑائیاں لڑنی بھی پڑیں' کس مجبوری کے عالم میں یہ کچھ کرنا پڑا۔ قرآن ان کی یہ کیفیت بتاتا ہے کہ تُو تو اس غم میں' اس صدمے میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ اپنی تباہی پہ کیوں تلے ہوئے ہیں' کیوں اپنی ہلاکت سے باز نہیں آتے' کیوں صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے۔ اس میں تُو اپنی جان گھلا لے گا۔ دوسرے کے غم میں جان گھلانے والا' کسی کو قتل کرنے کے لیے تو خنجر بدست نہیں ہوتا۔ وہ تو جسے آپ لڑائی کہتے ہیں' وہ بھی ایسی ہے جیسے وہ ماں بچے کو چولہے کے قریب آنے سے روکنے کے لیے' راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے اور اس پہ بھی اگر باز نہیں آتا تو بعض اوقات اس کو طمانچہ بھی مارنا پڑتا ہے' زور سے بھی کھینچنا پڑتا ہے۔ یہ مقامات تو وہ تھے لیکن حضور ﷺ کے قلبِ نبوی کی کیفیت تو یہ تھی کہ **بَاخِعٌ نَّفْسَکَ** (26:3)۔ خدا کو یہ کہنا پڑا کہ اتنا غم! تو تو اپنی جان گھلا لے گا۔ اور یہ ایک مقام پہ نہیں ہے' متعدد مقامات میں یہ چیز قرآن نے کہی ہے۔ یہاں تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ **اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ** (26:3)۔ یہ صداقتوں کو کیوں نہیں مانتے۔ خدا کے قوانین کے نتائج پر کیوں یقین نہیں رکھتے کہ جس روش پہ یہ چل رہے ہیں اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ یہ اسے کیوں نہیں مان رہے۔ سنکھیے کی پڑیا ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں' یہ کیوں اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے ان کی جان چلی جائے گی' اس سے ہلاک ہو جائیں گے' تباہ ہو جائیں گے۔ وہ تباہ ہونے کے لیے اس قدر مصر ہیں اور یہ ان کے غم میں جان گھلا رہے ہیں کہ یہ کیوں تباہ ہو رہا ہے اور کیوں اپنے آپ کو ستیاناس کر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہے حضور ﷺ کی۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ **فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا** (18:6)۔ یہاں اضافہ ہے کہ اس تاسف کے مارے یہ جان گھلا رہے ہیں۔ یہ اسف وہی ہے جس کو آپ افسوس کہتے ہیں' تاسف کہتے ہیں کہ یہ جو اس طرح سے اپنی تباہی اور اپنی بربادی پر تلے ہوئے ہیں۔ اس سے تمہیں اس قدر تاسف ہو رہا ہے' اس قدر افسوس ہو رہا ہے کہ تُو اس تاسف کے مارے اپنی جان گھلا رہا ہے۔ یہ تھی نبی اکرم ﷺ کی کیفیت۔ تاسف اس پہ ہو رہا ہے کہ یہ کیوں اپنی جان گنوا رہے ہیں' کیوں تباہ ہو رہے ہیں۔ اس غم کے مارے تاسف کی بنا پر تُو اپنی جان گھلا رہا ہے۔ یہاں تاسف کہا ہے۔ ایک اور مقام ہے جہاں' تاسف سے بھی گہرا دردمندانہ لفظ ہے جو قرآن نے استعمال کیا ہے۔

پھر آخر برائی بھی اچھائی نظر آنے لگ جاتی ہے

پہلے بات یہ کی ہے کہ ان کی کیفیت کیا ہے' یہ لوگ کون ہیں' جن کی تباہی اور بربادی کے تاسف کے صدمے سے' رسول اپنی جان گھلا رہا تھا کہ یہ کیوں تباہ ہو رہے ہیں؟ دراصل ان کی کیفیت یہ ہو گئی تھی۔ **اَفَمَنْ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا** (35:8)۔ عزیزانِ من! عجیب چیز ہے جو قرآنِ کریم نے بتائی ہے۔ کہا ہے کہ غلط راستے' برائیاں' غلط کاریاں' تخریبات اور دھاندلی کی ان چیزوں میں' جب انسان بڑھتا چلا جاتا ہے تو پھر قرآن بتاتا ہے کہ آگے چل کر انسان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ پھر

برائی اسے برائی نظر نہیں آتی بلکہ وہ اچھائی نظر آتی ہے اور انسان کی عقلِ فریب کار کی تو یہ بہت بڑی ابلیسیت ہے کہ وہ انسان کے غلط کاموں کے متعلق کچھ ایسے جواز کے دلائل دیدیتی ہے کہ وہ مطمئن ہوجاتا ہے کہ نہیں' بہت ٹھیک ہے جو کچھ میں کر رہا ہوں' یہ بالکل اچھا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ جو اس مقام پہ پہنچ جائے کہ اس کو اپنی دھاندلی بھی انصاف نظر آئے' جو اپنے استبداد اور زیادتی کو بھی اپنے حق میں اچھائی کہہ کر پکارے' جو اپنے غلط کاموں کو اچھا کام سمجھنے لگ جائے' جسے اپنے وہ غلط کام مزین بن کر دکھائی دیں' خوشنما بن کر دکھائی دیں اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ تو بڑے اچھے کام ہیں' کہا کہ جو انسان اس اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے' اس کے لیے واپس آنا بڑا مشکل ہوا کرتا ہے۔ان کی کیفیت تو یہاں تک پہنچ چکی ہے اس لیے **فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ** ❶ (35:8)۔عزیزانِ من! کیا بات ہے الفاظِ قرآن کی! پہلے تو یہ "**یَصۡنَعُوۡنَ**" کہا۔وہ جو اوپر بات تھی کہ غلط کام ہیں اور اچھے بن کر دکھائی دے رہے ہیں' یہاں ایک لفظ نے اس کی تشریح کر دی کہ یہ برے کام کیا ہوتے ہیں' جو اچھے بن کر دکھائی دیتے ہیں۔اچھائی وہ ہے جو دل کے ارادے سے' حسنات کے لیے' تعمیری کاموں کے لیے' بھلائیوں کے لیے' بہبود کے لیے' یہ کچھ کیا جائے۔ان کا مقصد یہ ہو اور اس کے لیے کیا جائے۔

مذہبی شعائر اور رسومات کی کیفیت اور حقیقت

عزیزانِ من! اس کے مقابلے میں یہ جو مذہبی شعائر اور رسوم ہیں' اگر انہیں Mechanically (میکانکی طور پر) ادا کرتے چلے جائیں' مگر دل کے ساتھ ان کا تعلق نہ ہو' مقصد کے ساتھ تعلق نہ ہو' یہ ساری چیزیں یونہی Mechanically (میکانکی طور پر) ادا کرتے چلے جائیں اور مطمئن ہوجائیں کہ صاحب! جو فریضہ خداوندی مجھ پہ عائد ہو رہا تھا وہ تو پورا ہو رہا ہے' ادھر سے تو وہ مطمئن ہوگئے باقی رہا یہ کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں' یہ دنیا داری کے معاملے ہیں' وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ دنیا داری کی طرح ہونے چاہئیں۔اب خدا کا معاملہ تو وہ ہوگیا کہ وقت کے اوپر جا کر نماز پڑھ لی' پورے ارکان اور تعدیل کے ساتھ صحیح صحیح وضو کیا اور اس طرح سے کانوں تک ہاتھ اٹھائے' یہاں ہاتھ باندھے' پاؤں میں اتنا فاصلہ کیا' جو الفاظ ہیں' جو تلفظ ہے' وہ تو بڑے صحیح ادا کیے' وہ سارا کچھ کر کے مطمئن ہوگئے کہ وہ جو فریضہ ہے وہ تو ادا ہوگیا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ فریضہ جس مقصد کے لیے عائد کیا گیا تھا' کیا وہ مقصد اور نتیجہ بھی مذہبی شعائر و رسومات کے ادا کرنے سے برآمد ہوا؟

---

❶ اے رسول! تم ان لوگوں کی خاطر اپنی جان کیوں گھلاتے ہو جو غلط راستے پر چل کر اپنے لیے تباہیاں مول لیتے ہیں۔اللہ ان کے ساختہ پرداختہ سے خوب واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔(ان کے خود وضع کردہ نظام سے انہیں زندگی نہیں مل سکتی)۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1005)

صلٰوۃ کا صحیح مقصد نظر انداز کرنے کا نتیجہ

اس مقصد اور فریضہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے میں نماز کی بات بار بار کہہ رہا ہوں۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ** (29:45)۔ جو صلٰوۃ ہے' وہ تمہیں فحش کاریوں اور منکرات سے روک دے گی۔ کبھی یہ کھڑے ہو کر دیکھا کہ یہ جو ہماری نماز ہے' کیا یہ واقعی ان چیزوں سے روکتی ہے۔ روکتی ہے تو وہ صلٰوۃ ٹھیک ہوئی' نہیں روکتی تو وہ صلٰوۃ صحیح نہیں ہے۔ لیکن صلٰوۃ کے صحیح ہونے کے متعلق جو آپ کے ہاں شرائط ہیں' وہ ان شرائط کے اوپر پوری اتر رہی ہے۔ وہ تو وہاں سپروائزر' نگران' مولوی صاحب جو بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' ان کی تو یہ کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ ہمارے ایک دوست اخبار میں ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ میں بھولے سے نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا' نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور وہاں سے جھٹ وہ مولوی صاحب آئے' میری پتلون ٹخنوں سے ذرا نیچے تھی' خود ہی آ کے پتلون کو یوں یوں کر کے نیکر نما بنا دی اور اس کے بعد کہا کہ پھر دوبارہ نماز پڑھو یہ نماز نہیں ہوئی۔ یہ جو چیزیں ہیں' ان کے اوپر تو اتنی سخت نگاہ ہے لیکن ساری عمر یہ کبھی نہیں پوچھا کہ اس صلٰوۃ سے وہ فحشا اور منکر بھی ختم ہوئے ہیں یا نہیں؟

لفظ یصنعون کا قرآنی مفہوم

یہ سارا کچھ جو میں نے بیان کیا ہے' آپ کو پتہ ہے کہ یہ کس چیز کی تفسیر ہے۔ اس آیت میں قرآن کا ایک لفظ ہے: **اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ** (35:8)۔ یہ لفظ **یَصْنَعُوْنَ** ہے جسے آپ مصنوعی کہتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو سارے اعمال اس طرح سے ان کو مزین بن کر دکھائی دے رہے ہیں درحقیقت وہ یوں نہیں ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ سب کچھ مکینکلی ہو رہا ہے۔ یہ **یَصْنَعُوْنَ** ہے۔ یہاں سے آپ کے ہاں یہ لفظ صنعت ہے۔ مصنوعی تو ہمارے ہاں لفظ ہے۔ **یَصْنَعُوْنَ** کے معنی ہیں مکینکلی کسی چیز کو بنانا' انڈسٹری ہوتی وہی ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو مشینیں لگائی جاتی ہیں۔ کہا یہ جو کچھ مکینکلی کرتے ہیں' یہ ہم جانتے ہیں۔ یہ کہیں گے کہ نہیں صاحب! ہم تو وہ فریضہ ادا کر رہے ہیں جبکہ یہ تو **یَصْنَعُوْنَ** ہے اور کیفیت یہ ہے کہ یہ جو ان کے غلط کام ہیں وہ ان کو مزین بن کر دکھا رہے ہیں کہ یہ تو صاحب! دنیا داروں کے جھگڑے ہیں! وہ اس میں کاروبار دوکانداری ہو رہی ہے۔ تین تین گناہ منافع رکھ کر اس کی قیمت متعین کی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد گاہک کے ساتھ جھگڑا کیا جاتا ہے۔ جب تک خون پسینہ نہ ہو جائے اس وقت تک (وہ یہ ایک روایت بیان کرتے ہیں) یہ سارا کچھ اس سے لیا جاتا ہے۔ پوچھا جائے تو کہا کہ صاحب! تجارت میں جو منافع ہے اس کے اوپر تو شریعتِ حقہ نے کوئی حد بندی نہیں لگائی۔ یعنی یہ ان کی بالکل حلال وطیّب کمائی ہوگئی۔ یہ

ہے کہ جو غلط کام مزین بن کر دکھائی دے رہے ہیں ۔ یہ کام مکینکلی کیے جاتے ہیں اور اطمینان ہوجاتا ہے ۔

وہ واقعہ آپ کو یاد ہے' پہلے بھی میں کہا کرتا ہوں کہ کہیں سے باپ سودا کرکے آ گیا' دکان پہ آیا تو بیٹے نے کہا کہ آپ کیا کر کے آ گئے' اس میں تو ہمیں آخر میں بڑا نقصان ہوگا ۔ کہنے لگے: بیٹا گھبرانے کی بات نہیں ہے' ٹھیک ہوجائے گا۔ بیٹا کہنے لگا: وہ ٹھیک کس طرح سے ہوجائے گا ؟ وہ باپ کہنے لگے:''کوئی گل نئیں' اسی جھگڑا پاں گے ایہدے وچ ۔ او کہن لگا کہ ابا فیر جھگڑنا ہیگا تے فیر ہونی جاؤ' ہونی تسی کرکے آئے ہیگے او تے' جلدی نالے معاملہ طے ہوجائے ۔کہن لگا: نہ بھائی! میری عصر دی نماز دے وقت نوں دیر ہورہی ہے۔ پہلاں میں نماز پڑھ لاں ۔ اے فریضہ صلوٰۃ ادا ہو ریا ہے۔عصر دا وقت تنگ ہو ریا اے' اے مینوں پہلاں کر لین دے'اوہدے بعد اوکم کرلاں گا جیہڑا توں کہنا ہیگا ایں ❶ . **زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ** (35:8) قرآن کی وہ کیا بات ہے کہ''غلط کام مزین بن کر دکھائی دیں''لیکن **اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ** (35:8)۔ یہ نیک کام جنہیں کہتے ہیں' وہ سارے مصنوعی ہوتے ہیں ہم جانتے ہیں اور رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَیْهِمْ حَسَرٰتٍ** (35:8) تُو ان کی بربادی کے اوپر کیوں خون کے آنسو رو رہا ہے' یہ تو اس مقام تک پہنچ چکے ہوئے ہیں ۔

یہاں لفظ حسرٰت آ گیا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ طبیبِ مشفق' یہ اس قسم کا راہنما ہے۔ اندازہ لگایئے کہ اس کا قلب کس قدر رقیق ہے' کس قدر ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے کہ وہ اس قدر مخالفتوں کے اوپر اترے ہوئے کہ ساٹھ سال انہوں نے ایک دن چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور بجائے اس کے کہ اس کے دل کے اندر انتقام کے جذبات ابھریں' کیفیت یہ ہے کہ ان کی تباہی کے اوپر یہ خون کے آنسو رو رہا ہے' انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح یہ بچ جائیں ۔ خدا کو یہ کہنا پڑا ہے کہ او بابا! ان کی تو یہ کیفیت ہو چکی ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ جانتے نہیں کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے بلکہ یہ جانتے ہیں کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے لیکن اس جاننے کے باوجود جو اس چیز پہ تلا ہوا ہو تو تُو کیا کرلے گا ۔ اور یہ جو وہاں **اسفًا** (18:6) تھا' تاسف تھا' یہاں **حسرٰت** (35:8) کا لفظ آیا ہے۔ کیا بات ہے ان الفاظ کی ! عزیزانِ من ! ان کی کیا کیفیت ہوگئی کہ جسے دیکھ کر تمہارا دل اس قدر غم آلود ہوگیا ہے کہ تُو خون کے آنسو رو رہا ہے!

---

❶ کوئی بات نہیں ۔ ہم اس معاملے میں جھگڑا برپا کردیں گے ۔ وہ کہنے لگا کہ ابا جان ! اگر جھگڑنا ہی ہے تو ابھی جاؤ ابھی تو آپ معاملہ طے کر کے آئے ہیں تاکہ جلد ہی یہ معاملہ ختم ہوجائے ۔ باپ کہنے لگا: نہیں بھئی! میری نمازِ عصر کو دیر ہو رہی ہے' پہلے میں یہ نماز ادا کرلوں ۔ یہ فریضہ صلوٰۃ ادا ہو رہا ہے ۔ نمازِ عصر کا وقت کم ہو رہا ہے ۔ یہ مجھے پہلے ادا کر لینے دو اس کے بعد وہ کرلوں گا جو تم کہتے ہو۔

عربوں کے ہاں لفظ حسرت کا مفہوم

حسرت کا لفظ تو ہمارے ہاں عام ہے لیکن ان چیزوں کے وہ معنی ہمارے ہاں نہیں ہوتے جو عربی مبین سے معنی آتے ہیں۔ بعض پرندوں کو کچھ بیماری ہو جاتی ہے۔ اس سے ان کے بال و پر بالکل جھڑ جاتے ہیں اور اس کے بعد' جنوں کیندے نیں بوٹ رہ جاندا اے ❶' بال و پر ختم ہو جاتے ہیں' اس میں اڑنے کی بھی کوئی سکت نہیں رہتی۔ ان کو کبھی ذہن میں سامنے لائیے۔ یعنی بے بسی' بے کسی' عجز اور ناتوانی کی انتہائی شکل وہ ہوتی ہے' جس میں اس کے سارے بال و پر جھڑ جائیں اور اس میں اڑنے کی سکت باقی نہ رہے۔ عرب اس قسم کے پرندے کو' جس کی یہ کیفیت ہو' اَلتَّحسِیرُ ❷ کہتے ہیں کہ یہ حسرت آلود ہے۔ اس کے ہاں کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اسی لیے ان کے ہاں یہ جو اَلْمِحْسَرَۃً لفظ ہے' جھاڑو کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جھاڑو پھر گیا۔ بہاری پھر گئی جنوں اسی کینے آں ❸ یعنی جس کے ہاں کچھ نہ رہے۔ اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے کہتے ہیں کہ کسی کے بال و پر نہ رہیں' پھر خطرے سے بچنے کی سکت اور ہمت ہی نہ رہے۔ وہ کبوتر' بلی کو دیکھ کر کیا اڑے گا' جس کے بال و پر ہی باقی نہ رہیں۔ کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل بڑا پسیج رہا ہے' تو خون کے آنسو رو رہا ہے کہ ابھی کوئی جانور آیا اور وہ ان کو جھپٹ کر لے جائے گا' یہ ختم ہو جائیں گے' تباہ ہو جائیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل کس قدر خون کے آنسو روتا ہے لیکن تیری اس دردمندی سے کیا بنے گا' یہ تو سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے لیے یہ کر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی صفت جبار اور قہار کے متعلق پایا جانے والا تصور

یہاں ایک اور بات سامنے آئی۔ یہ جو رسول اللہؐ کے متعلق ہے خود خدا کے متعلق بھی ہمارے ہاں جو تصور عام طور پہ دیا جاتا ہے کہ یہ قہار اور جبار اور متکبر ہے۔ یہ کیفیت ہے کہ غضب آلود آنکھیں ہیں' اور وہ ہر وقت اس فکر میں ہے کہ اسے مار دو' اسے یہ کر دو: اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (85:12)۔ اس کی گرفت گردن توڑ دیتی ہے' ہڈیاں چیخ جاتی ہیں۔ یہ خدا کا ایسا تصور دیا ہوا ہے۔ خدا کے اصل تصور کے متعلق کچھ اور وقت چاہیے' یہ لمبی بات ہے۔ یہاں یہ جو بات آ گئی ہے' اسی ضمن میں ایک لفظ سے اور ایک آیت سے ایک بات کہتا ہوں' دیکھیے گا کہ اس سے خدا کا کیا تصور آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہے کہ تُو ان کی تباہی کے اوپر یہ کہتا ہے کہ اوہو' تمہیں کیا ہو گیا۔ آیات (36:29-30) میں ذرا اوپر سے بات شروع کروں۔ کہا کہ جب قوموں کی

---

❶ جسے کہتے ہیں کہ وہ پرندہ "نوزائدہ بے بال و پر کا بچہ" رہ جاتا ہے۔ ❸ تاج العروس

❷ جسے ہم جھاڑو پھر گیا کہتے ہیں۔

حالت یہاں تک پہنچ جائے کہ ان کو اپنی ہر برائی، اچھائی بن کر نظر آنے لگ جائے اور وہ اس پر خوش ہوں تو اس کے بعد جب تباہی آتی ہے تو کیا حالت ہوتی ہے۔ یہ جاننے سے پہلے (36:28) کو دیکھیے کہا کہ **وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا کُنَّا مُنۡزِلِیۡنَ** (36:28) ایسی حالت میں جب وہ قوم تباہ ہوتی ہے تو ہم آسمان سے ان کو تباہ کرنے کے لیے فوجیں نہیں اتارا کرتے، ہم نے اس قوم پہ بھی یہ نہیں اتاری تھیں: **وَمَا کُنَّا مُنۡزِلِیۡنَ**. ہم یہ کیا ہی نہیں کرتے کہ قوموں کی تباہی کے لیے آسمان سے فوجیں آئیں۔ آسمان سے فوجیں لانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سنکھیا پھانکنے والا تو ملک الموت کا بھی انتظار نہیں کرتا۔ اوہدے آن توں پہلاں ای مک مکا جاندا اے او تے ❶۔ کیا بات ہے قرآن کی کہ قومیں جب اس حالت پر پہنچ جاتی ہیں تو پھر آسمان سے فوجیں نہیں بھیجا کرتے، یہ صورت نہیں ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر ہوتا کیا ہے؟ **اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً** (36:29) ان کے سینے سے ایک چیخ نکلتی ہے اور اس کے بعد **فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ** (36:29) تم دیکھو کہ وہ بجھے ہوئے شعلے کی طرح، خاکستر کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہیں۔ آسمان سے فوجیں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

عزیزانِ من! اس سے زیادہ تشریح کی 'لب کشائی کی' جرأت نہیں ہے، ورنہ بہت کچھ سینے سے ابل رہا ہے۔ کیا ایک چیز، ایک نالہ شب وروز، ایک آہ وفغاں کی کیفیت، اور اس کے بعد خٰمِدُون، بجھا ہوا شعلہ، خاک کا ڈھیر! اب دیکھیے وہ بات۔ کہا کہ اگر قوم کی یہ صورت ہو کہ وہ جیتی جاگتی ایسی زندہِ جاوید ہو کہ جس میں یہ حرارتیں بھی ہیں، اور یہ سرگرمیاں بھی۔ اب غور سے سنیے، عزیزانِ من! عجیب مقام آتا ہے۔ اب ذہن میں یہ ہے کہ خدا اس قسم کا ہے کہ وہ انتقام لیتا ہے اور وہ قہار بھی ہے اور اس نے یہ کچھ کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خدا کہتا کہ پتہ چلیا ہن، تہاڈی ایسی دی تیسی، ہور ابھرو اگاں ہور آؤ اگاں ❷۔ یہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس قوم کی یہ صورت ہوتی تو وہ یوں تباہ ہوئی اور خدا کی طرف سے آواز آتی ہے **یٰحَسۡرَةً عَلَی الۡعِبَادِ** (36:30) او میرے بندو! تم نے کیا کیا اپنے ساتھ!! عزیزانِ من! خدا کی طرف سے یہ آواز آتی ہے۔ وہ رسول تھا کہ جس کے متعلق کہا تھا کہ **علیھم حسرٰت** تیری کیفیت یہ ہے کہ تُو ان کی بربادی پر کیوں خون کے آنسو رو رہا ہے (35:8) خود خدا کہتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے، قوم کی یہ صورت ہوئی انہوں نے خود تباہی مول لی ہے۔

---

❶ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ مر مرا جاتا ہے۔

❷ اب پتہ چلا غلط روش کے انجام کا، تمہارا ستیاناس، اور سرکشی کرو اور تمرد سے ابھر کر آگے آؤ (پھر دیکھو تمہارا بھرکس کس طرح نکلتا ہے)۔

خدا بھی انسان سے اس کی انسانیت الگ نہیں کرتا

یہاں (36:30) میں پھر عبادِ کہا ہے۔ کتنا پیارا لفظ ہے! یہاں مجرمین نہیں کہا' ظالمین نہیں کہا' اس لیے کہ مجرم بھی ہو' اور ظالم بھی ہو' کچھ بھی ہو' خدا کہتا ہے کہ انسان سے اس کی انسانیت الگ نہیں ہوتی۔ یہاں ''عبادِ'' کہا ہے: اومیرے بندو! تسی کی کِتا اپنے تے [1]! جیسے ماں اپنے بچے کے سہارے پہ کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اومیرے پترا! توں کی کرلیا اپنے آپ نوں' اوتوں کیوں پانی اچ گیا ہیگا سی؟ توں کیوں اگ وچ ہتھ پالیا سی؟ اے توں کی کرلیا۔ وین پوندی اے جس طرح ماں [2]۔ عزیزانِ من! یہ چیز ہے۔ **هُمْ خَامِدُوْنَ** (36:29) راکھ کا ڈھیر ہوگئے۔ اس پر کہا کہ **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ** (36:30) اومیرے بندو! تم نے کیا کیا اپنے ساتھ۔ یہ ہے' عزیزانِ من! انسان کا خدا' اور وہ ہے قرآن کا پیش کردہ پیغمبر۔ یہ بندے تباہ ہوتے ہیں تو وہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ ادھر بھی یہ کیفیت ہے' اسمیں بھی کسی قسم کی لچک اور لوچ نہیں ہے' کوئی استثنا نہیں ہے۔ کاروبارِ حیات چل ہی اس طرح سے سکتا ہے کہ قانون جہاں آئے اور انصاف کے ساتھ وہ قانون لاگو ہونا ہو' تو وہاں پھر کسی قسم کی لوچ و لچک نہیں لیکن اس کے باوجود اگر کوئی نفرت آپ کہہ سکتے ہیں' تو وہ اس جرم یا اس کے اس غلط عمل کے خلاف ہوتی ہے تو بھی وہ انسان انسان ہی رہتا ہے' وہ عبد عبد ہی رہتا ہے۔ اگر محاورے کے طور پہ کہا جائے تو اس کی تباہی کے اوپر خدا بھی خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔

وفورِ جذبات اور تقاضائے عدل کے وقت عظمتِ رسول ﷺ

میں وہ واقعہ پھر دہرا دوں جو میرا خیال ہے کہ پہلے بھی درس میں آچکا ہے اور بار بار آتا ہے کہ عدل اور جذبہ انسان' ان دونوں میں فرق کتنا ہوتا ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے کہ یہودی اپنے مقدمات نبی اکرم ﷺ کے پاس لایا کرتے تھے۔ یہ بات ہوئی عادل اور امین ہونے کی۔ مخالفت تو اتنی تھی کہ ان یہودیوں کو باہر نکالنا پڑا تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی لیکن امانت اور عدل کا اعتماد اتنا تھا کہ یہودی اپنے مقدمات اپنے حجر کے مقابلے میں نبی اکرم ﷺ کے پاس لاتے تھے جبکہ انہیں اپنے مقدمات اپنے مطابق طے کرنے کی اور فیصلے کرنے کی اجازت تھی۔ مدینے کی مملکت میں یہ چیز تھی کہ اگر تمہارے ہاں کا کوئی مستغیث' کوئی

---

1. اے میرے بندو! تم نے کیا ظلم ڈھایا اپنے آپ پر!
2. اے میرے لختِ جگر! تُو نے اپنے آپ کو کیا کرلیا! تم کیوں پانی میں گئے تھے؟ تم نے کیوں اپنا ہاتھ آگ میں ڈالا تھا؟ یہ تو نے کیا غضب ڈھایا! یہ وہی ہے جیسے ماں نوحہ کناں ہوتی ہے۔

مجرم' چاہے تو وہ اس عدالت میں بھی آ سکتا ہے' جسے اسلامی عدالت کہتے ہیں۔ وہاں کے وہ مجرم' وہاں کے وہ مظلوم یہ درخواست دے کر حضور ﷺ کی عدالت میں آتے تھے کہ ہم اپنے ججوں سے فیصلہ نہیں کرانا چاہتے' رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں۔ کیا بات ہے مخالفت تو ایسی مخالفت' عدل اور دیانت پہ اعتماد' تو ایسا اعتماد کہ اپنے ججوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے اور آپ ﷺ وہ فیصلے ان کی تورات کے قانون کے مطابق کیا کرتے تھے کہ نہ بھئی' تم ہمارے قوانین کو تو نہیں مانتے' اس لیے میں تمہارے قانون کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ قاتل مجرم آیا۔ ان کے قانون کے مطابق اس کی سزا موت تھی' قتل تھی۔ قتل کے لیے اس زمانے میں' وہیں وہ سر قلم کیا کرتے تھے۔ سامنے کھڑے ہوگئے' جھمگٹا بھی تھا' جلاد بھی سامنے کھڑا تھا۔ اس یہودی مجرم کی ایک بچی چیختی چلاتی ہوئی' بھاگی بھاگی' دوڑی دوڑی' آئی اور حضور ﷺ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور اس درد سے چیخی کہ

کام آخر جذبہ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

اس طرح سے وہ آ کر چلائی اور تڑپی کہ آپ ﷺ نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس نے یہ کہا کہ مجھے یتیم ہونے سے بچا لیجیے۔ بڑی دردانگیز حالت تھی۔ صحابہؓ نے اور یہودیوں نے بھی یہ کہا کہ جب آپ کی یہ کیفیت ہوگئی ہے تو اب آپ ﷺ اس کو کہہ دیں گے کہ معاف کر دیا جائے۔ یہودی شریعت کے اندر معافی نہیں تھی اور عدل میں معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' انہوں نے سمجھا کہ جب آپ ﷺ کی یہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے تو آپؐ پھر اس کو کہہ دیں گے کہ چھوڑ دو۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ ﷺ نے جلاد کو حکم دیا کہ سر قلم کرو۔ اُس نے سر قلم کر دیا۔ بات گئی۔ صحابہؓ نے بعد میں آپ ﷺ سے یہ پوچھا کہ حضور ﷺ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور اس کے باوجود آپ ﷺ نے جلاد کو قتل کرنے کا حکم دیا' یہ کیا بات تھی؟ یہ دو جذبے تو متضاد تھے' ہمیں سمجھ میں بات نہیں آئی۔ سنیئے' عزیزانِ من! اور پھر صحیح حدیث کی یہ پہچان ہوتی ہے کہ یہ چمکتے ہوئے گوہر کی طرح' پتھروں میں پڑی ہوئی بھی بتا دیتی ہے کہ یہ حضور ﷺ کی حدیث ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک سمجھا ہے لیکن تم یہ بات نہیں سمجھے کہ اس وقت محمد ابنِ عبداللہ کی آنکھیں رو رہی تھیں' محمد رسول اللہ ﷺ کی انگلی قتل کا اشارہ کر رہی تھی۔ عزیزانِ من! جذبات کے سیلاب کے اندر یہ فرق کرنا کہ محمد ابنِ عبداللہ تو ایک انسان ہے' اس کا جذبہ ہے' لیکن جج بیٹھا ہوا ہے کرسیٔ عدالت کے اوپر' وہاں وہ جج ہے صرف' اگر وہاں بھی اس کے جذبات کام کرنے لگ جائیں تو عدل نہیں ہوسکتا اور اگر اس کے سینے کے اندر دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا رکھ دیں تو یہ انسان نہیں رہتا پھر' انسان بھی رہے اور جج

بھی رہے۔

ذاتِ رسول اس قسم کی صفات سے کیوں مزین تھی؟

ایک سیرت کے اندر اس قسم کی متضاد صفات کا جمع ہونا' یہ ہے جو قرآن پیدا کرتا ہے مثلاً وہ خدا رحیم بھی ہو اور قہار بھی ہو' وہ رسول **اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ** بھی اور **رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ** بھی ہو۔ اسے کہتے ہیں' Balanced Personality (متوازن شخصیت) تو یہ رسول ﷺ کیوں ایسا تھا؟ اس لیے کہ رسول تو خدا کی صفات اپنے اندر منعکس کرتا تھا۔ خدا کی صفت آپ دیکھتے ہیں کہ خود خدا کہہ رہا ہے کہ ہمارے ہی قانون کے مطابق یہ کچھ ہوا' ہم نے آسمان سے کوئی فوجیں نہیں اتاری تھیں۔ قانون کے مطابق کیفیت یہ ہوئی کہ وہ قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ ایسی تباہ ہوئی کہ زندگی کا کوئی نام ونشان تک باقی نہیں ہے۔ اس راکھ کے ڈھیر کے' جیسے سرہانے کھڑا ہو کر' خدا کہتا ہے: **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ** (36:30)۔ او میرے بندے! تو نے اپنے ساتھ کیا کیا۔ عزیزانِ من! یہ کیفیت ہوتی ہے ایک ناصح مشفق کی' ایک راہنما کی' ایک مصلح کی' جو واقعی اصلاح چاہتا ہے۔ یہاں اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے غم میں تو تو اپنی جان کو گھلا لے گا۔

اب آگے ایک بات آتی ہے' بڑی اہم ہے۔ اصل میں یہاں بات سمجھائی گئی ہے۔ ان آیات سے نظر آتا ہے کہ حضور ﷺ نے خود یہ سمجھ لیا تھا کہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان کو تباہیوں سے بچا دوں یعنی یہ نہیں کہ میں ان کو بتا دوں کہ یہ تباہی کا راستہ ہے اور یہ زندگی کا راستہ ہے' یہ موت کا راستہ ہے' یہ سنکھیا ہے' یہ مصری ہے۔ ایک مشفق ناصح کی طرح ذہن میں یہ تھا کہ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں ان کو تباہی سے بچا دوں' ان کو صحیح راستے کے اوپر چلا دوں۔ اب جب یہ فریضہ اپنے اوپر عائد کر لیا جائے اور وہ صحیح راستے کے اوپر نہ آئیں تو اس سے یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ آدمی جھنجلا اٹھتا ہے۔

نبوت کا فریضہ صرف آگاہ کرنا ہے' صحیح راستے کے لیے زبردستی چلانا نہیں ہے

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر یہ کہا ہے کہ اے رسول! **لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ** (2:272) تیرا فریضہ اتنا ہی ہے کہ تو بتا دے کہ یہ سڑک سیدھی اس گاؤں کی طرف جاتی ہے جدھر تم نے جانا ہے اور یہ اس سے الٹ دوسری منزل کی طرف جاتی ہے' تیرا کام دوراہے پہ کھڑے ہو کر ان کو یہ بتانا ہے' تیرا کام اس کے بعد یہ نہیں ہے کہ پکڑ کے کسی مسافر کو اس راستے کے اوپر یوں دھکیل دے کہ ادھر چل۔ یہ تیرا کام نہیں ہے اس لیے کہ اس سے ان کا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا ہے اور ہم انسان کا اختیار اور ارادہ سلب نہیں کرنا چاہتے۔ بتانا تو اسے یہ چاہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے اور غلط یہ ہے کیونکہ صحیح اور غلط کی پہچان انسان کے اندر نہیں۔ کہا کہ تو

صرف ان کو بتا سکتا ہے کہ غلط یہ ہے اور صحیح یہ ہے: **لَیۡسَ عَلَیۡکَ ھُدٰھُمۡ** (2:272)۔ **ھُدٰھُمۡ** کے معنی ہیں: صحیح راستے پر چلانا۔ کہا کہ اے رسول! یہ تیرا فریضہ نہیں ہے کہ تو انہیں صحیح راستے پر چلائے۔

عزیزانِ من! اب آگے ایسے الفاظ آ گئے ہیں جنہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ الفاظ ہیں کہ **وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ** (2:272)۔ اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ہدایت تو خدا جسے چاہتا ہے خود دیتا ہے۔ یعنی پنجابی اچ اے کہیدا کہ اے تے ساڈا کم ہیگا اے ❶ یہ تو ہماری Jurisdiction (عملداری) ہے' تیری تے نہیں ہیگی۔ اسے اسی کراں گے ❷۔ پھر بات ہوئی کہ جی چلو رسول نہیں' خدا ہی سہی' اگر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جسے ہم چاہیں گے ہدایت دیں گے تو یہ جو غلط راستے پہ چلنے والا ہے' پھر اس بیچارے کا کیا جرم ہے۔ اسے کہہ رہا ہے کہ تم اس کو صحیح راستے پہ نہیں چلا سکتے اور ہمارے ترجمے کی رو سے یہ ہے کہ صحیح راستے پہ ہم چلائیں گے جسے چاہیں گے۔ یہاں **مَنۡ یَّشَآءُ** آیا ہے یعنی جسے ہم چاہیں گے صحیح راستے پہ چلے جائیں گے تو نہیں چلا سکتا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کے ان ترجموں سے نہ صرف یہ کہ قرآن سمجھ میں نہیں آتا' بلکہ بڑے ہی غلط راستے پر آدمی جا پڑتا ہے۔ سوچیے کہ اس ترجمے سے کہاں بات جا پہنچی کہ جسے ہم چاہیں گے ہدایت دیں گے۔

عربی زبان کے قاعدے اور قرآنِ کریم کے مفہوم کے اعتبار سے ان لفظوں کے معنی یہ ہیں: **وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ** (2:272) ہدایت اسے ملتی ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہے' صحیح راستے پہ وہ چلتا ہے جو صحیح پہ چلنا چاہتا ہے۔ **مَنۡ یَّشَآءُ** یعنی جو چاہتا ہے کہ میں صحیح راستے پہ چلوں' یہ اس کو ملتی ہے' نہ تیرے دینے سے' نہ ہماری مجبوری سے' ہم تو مجبور کرتے ہی نہیں ہیں' تیرے بس میں نہیں ہے' تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس کی ذمہ داری ہے؟ **مَنۡ یَّشَآءُ** یعنی تیرا کام صرف یہ بتا دینا ہے' اس کا عبد جو زندہ رہنا چاہتا ہے وہ زندہ رہے' جو خودکشی کرنا چاہتا ہے' خودکشی کرے۔ یہ ہے **مَنۡ یَّشَآءُ**۔ ابھی ابھی بات آتی ہے مجبور ہی کرنا ہوتا تو ہم یہ کیوں نہ کرتے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ **لَیۡسَ عَلَیۡکَ ھُدٰھُمۡ** (2:272)۔ راستہ دکھانا تیرا فریضہ ہے' راستہ پر چلانا تیرا فریضہ نہیں ہے۔ ہم بھی زبردستی صحیح راستے کے اوپر نہیں چلاتے۔ یہ **مَنۡ یَّشَآءُ** ہے یعنی جو صحیح راستے کے اوپر چلنا چاہتا ہے اس کو ہی ہم راستہ دکھایا کرتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تیرے ذمے یہ نہیں ہے کہ تو انہیں صحیح راستے پہ ضرور چلائے۔

حضور ﷺ کے قرابت داروں کے لیے بھی حصولِ ہدایت کا اصول

دوسرے مقام پہ یہی اصول اور بھی واضح کیا ہے۔ کہا ہے کہ عام لوگ تو ایک طرف رہے' ان میں سے وہ بھی تو ہیں جن کو تو بہت

---

❶ پنجابی میں یہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارا کام ہے۔

❷ تیری نہیں ہے۔ یہ ہم کریں گے۔

عزیز رکھتا ہے' جن سے تو محبت کرتا ہے' وہ بہت قریبی ہیں' ان کے لیے تو خاص طور پہ چاہتا ہے کہ وہ تباہ نہ ہو جائیں۔ کہا کہ **اِنَّکَ لَا تَھۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ** (28:56) جن کو تو بہت ہی عزیز رکھتا ہے' جن کے ساتھ تیری بڑی محبت ہے' تو ان کو بھی زبردستی صحیح راستے پر نہیں چلا سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ رسول اللہ ﷺ کتنا جی سے چاہتے ہوں گے کہ یہ تو بچ جائیں' صحیح راستے پہ چلیں' ان سے کہا کہ زبردستی کی بات ہی نہیں ہے۔ تیرا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور حقیقی بیٹا ہی کیوں نہ ہو' اور یہ جتنے بھی قریش کے مخالفین تھے' سب سے عزیز ترین رشتہ دار تو حضور ﷺ کے یہ لوگ تھے' حقیقی چچا ان کے اندر موجود تھے' اپنے داماد موجود تھے' چچا زاد بھائی وغیرہ وہاں موجود تھے' وہ چچا ابوطالب موجود تھے یعنی اپنے یہ سارے عزیز موجود تھے' بہرحال ان کے متعلق تو کم از کم یہ چاہتے ہوں گے کہ یہ تو بچ جائیں' تو کہا کہ سوال تیرا چاہنا نہیں ہے بلکہ جن کو تو اتنا عزیز بھی رکھے' ان کو بھی تو زبردستی نہیں چلا سکتا۔ پھر وہاں لفظ آیا ہے کہ **وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ**(28:56)۔ وہی الفاظ ہیں' جن کا وہی غلط ترجمہ ہوا کہ تو نہیں چلا سکتا ہم جسے چاہیں چلائیں' ہم جسے چاہیں نہیں چلائیں۔ اس کا صحیح ترجمہ و مفہوم یہ ہے کہ ''جو چاہے گا صحیح راستے پہ چلنا' وہی صحیح راستے پر چلے گا''۔ یہاں **مَن احببت** بھی کہا ہے کہ رسول کے ذمہ کیا ہے؟ یہ مختلف مقامات میں ہے۔ یہاں ایک ریفرنس (حوالہ) ہی کافی ہوگا۔ کہا کہ تمہارا کام یہ بتانا ہے کہ **اِنۡ تُطِیۡعُوۡہُ تَھۡتَدُوۡا** (24:54) اے لوگو! اگر تم اس کی اطاعت کرتے جاؤ گے' تو صحیح راستے پہ پہنچ جاؤ گے۔ **وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ** (24:54) رسول کے ذمے تو صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح بات پہنچا دے۔ پہلے تو رسول کہا۔ یہ ان کے اپنے ذہن کی بات نہیں کہ یہ فیصلہ خود کر لیں' راستوں کے اوپر خود سائن پوسٹ لگا دیں۔ یہ تو خدا کی طرف سے ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ راستہ اس طرف جاتا ہے۔ یہ صرف دوسروں تک یہ بات پہنچاتے ہیں' رسول کی ذمہ داری صرف اس بات کو پہنچا دینا ہے' اس کی وضاحت کر دینی ہے' راستوں پہ سائن پوسٹ لگا دینے ہیں کہ یہ راستہ اِدھر جاتا ہے' یہ اُدھر جاتا ہے' بس یہ ہے فریضہ' یہ ہے ذمہ داری' رسول کی اس سے زیادہ ذمہ داری نہیں ہے۔ مار مار کر مسلمان بنانے کی بات نہیں ہے' زبردستی کسی کو صحیح راستے پہ چلانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو خود نہیں زندہ رہنا چاہتا کب تک آپ اس کو زبردستی زندہ رکھیں گے۔ اس لیے یہ تمہارا فریضہ ہی نہیں ہے۔

میری عمر بھر کی تمناؤں کا مرکزی نکتہ اور کوشش: قلب و دماغ کی تبدیلی

ہمارے لیے اس میں ایک بہت بڑا سبق ہے اور مجھے اس کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔ بہرحال ساری عمر میری یہی صورت رہی کہ قرآنِ کریم نے جو غلط اور صحیح راستوں میں تمیز بتائی' یہ عام کرتا چلا گیا۔ اس خطۂ ارض کے اندر بڑی تمنائیں اور آرزوئیں لے کر ہم

آئے کہ یہاں قرآن کا نظام کسی طرح متشکل ہوجائے۔ میں نے یہ ایک آواز اٹھائی' تحریک کی سی شکل اختیار کی' بہت سے رفقا اس میں ہم نوا ہوئے' وہ آ گئے' کم از کم بھی اگر میں لے لوں' اس وقت تو مجھے یہ کچھ کرتے ہوئے کم از کم چالیس سال ہوگئے۔ حالات زیادہ بگڑتے جارہے ہیں' قرآن سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔

میرے ہم نواؤں کے اندر گرمجوش نوجوان بھی ہیں۔ وہ ٹھیک ہے' میں جانتا ہوں ان کے ہاں جذبات کی شدت ہوتی ہے۔ بڑی دیانتداری سے وہ آ کر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اس طرح سے اتنا عرصہ آپ کو بھی ہوگیا' اس طرح سے کچھ نہیں بن سکتا' کیا ہوگا' کس طرح سے وہ نظام متشکل ہوجائے گا؟ انہیں میں سمجھاتا ہوں کہ بھئی! قرآن نے تو یہی طریقہ بتایا ہے کہ جب تک قلب اور دماغ میں صحیح تبدیلی نہیں ہوگی' انقلاب نہیں آئے گا تو میں نے تو قرآن کا یہ راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ کچھ سننے کے بعد جب پھر وہ دیکھتے ہیں کہ حالات ناموافق ہیں' قرآنی نظام کی تشکیل کا سفر زیادہ دور ہوتا ہے تو وہ مایوس ہوجاتے ہیں۔ یہ جو مقامات آتے ہیں کہ نہیں صاحب' یہ بات ہی غلط ہے' وہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے مایوسی ہوتی ہے۔

مایوس ہوجانے کا اصل سبب

یہ مایوسی کیوں ہوتی ہے؟ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہاں قرآنی نظام کا متشکل کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ اسے متشکل کر دینا' قائم کر دینا' یہ ہے ہمارا فریضہ اور جب وہ قائم نہیں ہوتا تو پھر ہم مایوس ہوجاتے ہیں۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ جو ہمارا فریضہ نہیں تھا ہم نے خود اس کو اپنا فریضہ قرار دے لیا' اپنے اوپر یہ Responsibility (ذمہ داری) عائد کرلی کہ ہمارا کام یہاں اس مملکت کو' یہاں کے باشندوں کو' تباہی سے' بربادی سے' بچالینا ہے' قرآنی نظام قائم کر دینا ہے۔ یہ ہم نے اپنے اوپر عائد کیا اور جب یہ دیکھا کہ یہ ہو نہیں رہا تو اس کے بعد پہلے تو یہ ہوا کہ شاید ہمارا طریقہ ہی غلط ہو' لیکن جب سمجھایا گیا کہ طریقہ تو یہی صحیح ہے تو اس کے بعد پھر اس نتیجے پہ پہنچے کہ نہیں صاحب' یہ ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے بعد جو کچھ کرتے تھے' اس کو بھی چھوڑ کر الگ ہوگئے یا دوسرے طریقے اختیار کر لیے۔ یہ دونوں چیزیں غلط ہیں۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم نے اپنے ذمے ایک ایسی چیز لے لی جو ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ خدا اپنے رسول سے کہہ رہا ہے' رسول ہے' اسے کہہ رہا ہے کہ تیرا ذمہ یہ نہیں ہے کہ تو ضرور یہ نظام قائم کر کے رہے' ان لوگوں کو صحیح راستے پہ چلا کر رہے' تیرا کام تو اس بات کو عام کیے چلے جانا ہے۔ جو بطیبِ خاطر تیرے ساتھ آئیں گے ان رفقا کو لے کر پھر کوئی عملی چیز تم کر سکتے ہو' تمہاری ذمہ داری یہ ہے نہیں کہ ان سب کو تم صحیح راستے کے اوپر چلاؤ۔

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کی آخری خواہش پر خدا تعالیٰ کا جواب

یہ وجہ تھی کہ رسول ﷺ آخری وقت تک مایوس نہیں ہوئے اور رسول ﷺ کے ساتھی بھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر نہیں لے لی تھیں جو ان کی ذمہ داریاں نہیں تھیں۔ اس کا غم تھا' اس کا افسوس تھا' اس کا درد تھا' کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا' وہ انسانیت کی تباہی کے اوپر غم اور درد تھا' یہ نہیں تھا کہ ہم ایسا کیوں نہیں کر پاتے۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو یاد ہے کہ نہ کر پانے کی بات' قرآن نے خود دی ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ ایک معصوم سی آرزو دل میں پیدا ہوئی کہ یا اللہ! میری ساری عمر اس طرح سے' ان مشکلات اور دشواریوں میں' تکلیفوں میں' صعوبات برداشت کرتے ہی' گزر جائے گی؟ یا وہ نظام جس کی خاطر میں یہ کچھ کر رہا ہوں' میں وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ بھی لونگا کہ وہ قائم ہوا ہے' کیا ایسا ہوگا؟ بڑی معصوم آرزو ہے' بڑی مقدس ہے' اور ہر دیانتدار قلب میں ایسی آرزو ابھرتی ہے۔ یقین مانیے' جب میں نے یہ دیکھا' سورۃ الرعد کی یہ 40ویں آیت ہے' تو میرے بھی ذہن میں یہ بات آئی کہ اللہ کو یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ اچھا بھئی! اگر یہی صورت ہے تو یہ ہم تمہیں دکھا دیں گے' یہ ہو جائے گا' تمہاری زندگی میں ہی ہو جائے گا۔ بہرحال قرآن میں یہ ہے کہ تیرے دل میں یہ آرزو ابھرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ تیری زندگی میں ہی برپا ہو جائے' ہوگا تو یہ ضرور' ہمارا وعدہ ہے کیونکہ تو صحیح راستے پہ جا رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تیری زندگی میں ہو جائے اور تُو اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لے' تیرا کام یہ نہیں ہے کہ تو یہ دیکھے کہ تیری آنکھوں کے سامنے برپا ہو جاتا ہے فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) تیرے ذمے تو اس کو عام کیے چلے جانا ہے' یہ ہم دیکھیں گے کہ ہمارے قانون کی رو سے وہ کب برپا ہوتا ہے۔ اس کا قانون یہاں تک ہے بڑا ڈاہڈا اے وہ' ذرا جنی جی رعایت وی اور رسول دے جذبات دی نئیں کردا[1]۔

قانون قانون ہوتا ہے' اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا

قانون میں جذبات کی رعایت نہیں ہوسکتی۔ وہ اگر اس طرح پسیج جائے تو ہر روز رات کو دعائیں کرنے والا رو رو کر گڑگڑانے والا "روز اوناں نوں پسیجیا کرے' کدی ایہدے وَل کرے' کدی اوہدے وَل ہویا کرے' او بہتا رویا اے تھوڑا رویا[2]۔" قانون میں جذبات کا کوئی کام نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے' جہاں میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ایمان کی ہی بات ہے' ورنہ میرا جی بھی یہی چاہتا

---

[1] وہ بڑا ہی زبردست ہے۔ وہ تو ذرا سی بھی رعایت رسول کے جذبات کی نہیں کرتا۔

[2] روزانہ ان کے دل میں رحم پیدا کر دے اور وہ رحم کبھی اس کی طرف ہو اور کبھی اس کی طرف کیونکہ وہ زیادہ رویا اور یہ کم۔

تھا کہ اللہ کہہ ہی دے کہ اچھا بھئی! کوئی بات نہیں، تم نے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں، بڑی تکلیفیں برداشت کی ہیں، اتنا تو کم از کم اس کا صلہ ہو کہ مرنے سے پہلے تم اس کی ایک جھلک دیکھ لو لیکن کڑا کورا جواب ملیا اے [1] کہ یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے کہ تمہاری زندگی میں وہ ہو جائے گا یا تمہارے بعد ہو جائے گا، تمہارا کام اس کو پہنچائے جانا ہے: **فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ** [2] (13:40) دوٹوک جواب کہ تیرا کام اسے پہنچائے چلے جانا ہے، یہ ہمارا کام ہے کہ ہم دیکھیں کہ قانون کی رو سے پھل پکتا کب ہے، تیرے بچے کتنے ہی بھوکے کیوں نہ مریں، ان کی بھوک کی خاطر ہم گیہوں کی فصل کو ایک مہینہ پہلے نہیں پکائیں گے، وہ تو اپنے وقت پہ ہی پکے گی۔ یہ ہے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اب ساری بات یہاں یہ کہی گئی ہے، انسان کے اختیار و ارادے کو سلب نہیں کیا، نہ ہم سلب کریں گے۔ یہاں ہے: **مَنْ يَّشَآءُ** (28:56) یعنی جو بچنا چاہیں گے اس کے بچنے کا طریقہ ہم بتا دیں گے۔ اے رسول! نہ تم اس کو زبرستی کر سکتے ہو، تمہارا کام بھی بتانا ہی ہے۔ اگر زبردستی کرنی ہوتی تو کہا کہ ہمارے پاس وہ بھی بڑے علاج تھے: **اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ** (26:4) مشکل کیا تھی ایسا معجزہ دکھا دیتے کہ ان سب کی گردنیں اس کے سامنے جھک جاتیں، گردنیں جھکانے کا ایک طریقہ ہمارے پاس ہے، وہ ہو سکتا تھا، ایسا معجزہ دکھا دیتے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔

معجزوں کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تعلیم

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں یہ اعتقادات ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی طرف سینکڑوں معجزے منسوب کرتے ہیں۔ آپ کسی واعظ سے، کسی مُلّا سے یہ سنیے، اس پر اتنی اتنی ضخیم کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں تمام سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کو گن کر ایک طرف رکھا گیا اور حضور ﷺ کے ان سے غالباً دس گنا زیادہ معجزات اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی فضیلت تو اسی طرح ثابت ہوگی: یہاں سے وہاں تک معجزات ہی معجزات۔ قرآن اس مقام پہ نہیں متعدد مقامات پہ یہ کہتا ہے۔ یہاں (26:3) میں تو اتنی اہم چیز کہی ہے کہ رسول غم سے گھلا جا رہا ہے، وہ تباہ بھی ہو رہے ہیں، یہ سارا کچھ ہے۔ کہا کہ تو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح سے یہ صحیح راستے پہ آ جائیں، کہنے لگا کہ اس کے لیے ایک طریقہ یہ تھا کہ ہم تمہیں ایسا معجزہ دکھا دیتے کہ یہ سب اس

---

[1] کیسا دوٹوک جواب ملا ہے۔

[2] تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 563)۔

کے سامنے جھک جاتے لیکن وہ تو پھر زبردستی مسلمان بنانے والی بات ہوجاتی اور یہاں زبردستی کا تو کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ایک زبردستی تلوار کی بھی تھی۔ اس کو قرآن نے یوں ختم کیا **لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ** (2:256)۔ ایک زبردستی یہ تھی کہ دوسرے کی عقل وفکر کو ماؤف کر دیا جائے اور وہ سر جھکا دیں۔ کہا کہ اگر یوں کرنا ہوتا تو ہم یہ کر سکتے تھے' ہمارے لیے مشکل کیا ہے' یہ ساری کائنات اتنا عظیم معجزہ ہے کہ بڑے بڑے سائنٹسٹ اس کے سامنے سرنگوں ہیں' یہ کون سے باغ کی مولی ہیں' ایک آسمان سے معجزہ دکھا دیتے' ایسی صورت پیدا ہوجاتی کہ سارے کے سارے جھک جاتے لیکن عقل اور فکر کو ماؤف کر کے جو کوئی بات منوانا ہے وہ دین اور اسلام نہیں کہلا سکتا۔ انسان کے ارادے کو اور عقل وفکر کو ماؤف کرا کر کوئی بات منوانا' خواہ وہ تلوار کے زور سے آپ اس کو ماؤف کریں' یا معجزے دکھا کر ماؤف کریں بات تو ایک ہی ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ بات بھی ہم نہیں کریں گے۔ معجزات کے متعلق تو آپ کے ہاں پتہ نہیں کتنی شدت سے یہ عقیدہ ہے۔ پہلا کفر کا فتویٰ لگتا ہی اس سے ہے کہ صاحب! یہ معجزات کا منکر ہے۔

معجزوں کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد

میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن میں ایک مقام پہ نہیں ہے بلکہ بیسیوں مقامات پہ یہ ہے کہ یہ تم سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں' ان سے کہہ دو کہ بابا! میں معجزے دکھا کر تمہیں مسلمان بنانے کے لیے نہیں آیا' میں تو تمہاری عقل وفکر کو اپیل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ **هَاتُوۡا بُرۡهَانَـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ** (2:111) تم اپنے ہاں سے کوئی دلیل لاؤ' دلائل کی رو سے میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں **اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ** (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں' علی وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں اور آگے ہے کہ **اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىۡ** (12:108) میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میری سنت پہ چلے گا' وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔

اب ہمارے ہاں وہ معجزات چلے آئے صاحب! تو میں نے کہا ہے کہ یہ عقیدہ اتنا شدید ہے کہ جس کے متعلق کہا جائے کہ یہ تو معجزات کا منکر ہے یعنی اس کے کافر ہونے میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ ہی نہیں رہتا۔ سرسید (احمد خان: 1898-1817ء) پہ سب سے پہلے یہ کفر کا فتویٰ لگا تھا۔ چونکہ وہ بہت بڑا شخص تھا اس لیے یہ اس کے کفر کا فتویٰ مکے مدینے سے لے آئے تھے۔ جس طرح اوتھے دیاں کھجوراں اوندیاں ہوندیاں' اوفتویٰ لیاندا سی اوتھوں اونا نیں' بہت پکا ❶۔ پرویز (1985-1903ء) کے خلاف بھی یہی چیز ہے۔ ایک دوست کل ❷ ہی یہ بات کہہ رہے تھے کہ صاحب! وہ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب کی ہر بات ہم ماننے کے لیے

---

❶ جس طرح وہاں سے کھجوریں آتی ہیں' اسی طرح انہوں نے وہ کفر کا بہت بڑا فتویٰ وہاں سے لیا تھا۔

❷ یاد رہے یہ بات اپریل 1978ء کی 7 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

تیار ہیں' بڑا صحیح ہے لیکن اتنی سی بات ان سے کہیے کہ یہ جو معجزات سے انکار کرتے ہیں' یہ نہ کریں۔ میں نے بھی کہا کہ ان سے کہیے کہ ٹھیک ہے' جی مان لیتا ہوں' حضرتِ موسٰی علیہ السلام کو یہ معجزے ملے' حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کو یہ معجزے ملے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معجزے ملے' وہ تو ان کو مل گئے' وہ بھی تشریف لے گئے' دنیا سے چلے گئے' وہ معجزات بھی ان کے ساتھ ہی تھے' انہوں نے دکھائے اُن لوگوں نے دیکھے' میرے اور آپ پہ اس کا کیا اثر ہوا جی؟ میں نے کہا کہ انہوں نے معجزے نہیں دکھائے تھے تو پھر یہ کونسا کفر ہو گیا۔ کسی نے کہہ دیا کہ انہوں نے دکھائے تھے تو آج اس کا اثر ہم پہ کیا ہے؟ وہ تو قصہ ماضی ہو گیا' وہ History (تاریخ) کے کچھ Events (واقعات) ہو گئے جسے آپ کہیں گے' تاریخ میں کچھ واقعات ایسے ہوئے' چلو یوں ہوئے' آپ صحیح کہتے ہیں' وہ زمانہ ماضی کی تاریخ ہو گئی' آج تو اس کا کوئی اثر نہیں ہے' وہ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

صداقتیں جذباتی تسکین کی خاطر نہیں آیا کرتیں

حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے دو ہزار سال پہلے کے معجزات کہ وہ مُردوں کو بھی زندہ کیا کرتے تھے' وہ جذام والوں کو بھی اچھا کر دیتے تھے' اندھوں کو اچھا کر دیتے تھے' میرے کسی کام تو نہیں آ سکتے۔ میرے تو کام آج کا کوئی معجزہ آئے گا۔ میں نے کہا کہ ان سے کہیے گا کہ یہ مان لینے سے تم میں اور مجھ میں کیا فرق پڑا۔ یہ تو تمہارے ایک جذبے کی تسکین ہو گئی اور صداقتیں جذبات کی تسکین کے لیے تو نہیں آیا کرتیں۔

یہ سب کچھ کرامتوں کو منوانے کے بہانے ہیں

اصل میں بات کچھ اور ہے۔ یہ احباب نہیں سمجھتے۔ وہ تو میں سمجھتا ہوں کیونکہ میں تو ان وادیوں سے گزرا ہوں۔ یہ اس لیے نہیں ان سے معجزے منواتے کہ حضور کے یہ معجزے تھے۔ وہ کہتے ہیں معجزے کا جو امکان ہے پہلے اس کو منوا لیں کہ یہ ہو سکتا ہے' فطرت کے قاعدے قانون کے خلاف واقعات ہو سکتے ہیں' یہ اصولاً مان لیا جائے تو پھر کیا بات؟ تو پھر ہمارے حضرت جی کے ساتھ جو کرامات منسوب ہیں یہ مانی پڑیں گی۔ اوسائیں بدھو شاہ دی کرامتاں منان واسطے' پرویز صاحب کولوں اے عقیدہ منواندا پیا ہیگا[1]۔ یہ وہی بات ہے جو اس شعر میں کہی گئی ہے کہ

---

[1] وہ پیر و مرشد حضرت بدھو شاہ کی کرامات منوانے کے لیے پرویز صاحب سے یہ عقیدۂ معجزات منواتا ہے۔

حکایت قدِ آں یارِ دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اس دوست کے لمبے قد کی جو میں باتیں کرتا ہوں تو یہ اس کے قد کی باتیں نہیں ہیں' اس بہانے سے میں اپنی عمر کو لمبا کرتا ہوں۔ وہ ان معجزات کے امکان کا اس لیے اقرار چاہتے ہیں کہ یہ جتنے پھر سارے اولیائے کرام' صوفیائے عظام تھے' اوسائیں بوہڑ شاہ تے' گھوڑے شاہ تے' بدھو شاہ' اے جنے بھنگڑ' تے ملنگ' تے اے سارے بیٹھے ❶' ان کے متعلق آپ دیکھیں گے کہ کوئی ان کی تعلیم پیش نہیں کرے گا' ان کی کرامات ہی پیش کریں گے اور جتنے وہ کریں گے تو ان کا رتبہ اتنا ہی بلند ہوگا۔ وہ اس کو یہاں لانے کے لیے منواتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جب آپ نے اس کا امکان مان لیا تو ایک ہزار سال کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں پھر یہ حضرات پیدا ہوئے' ان کی اتنی کرامات پیدا ہوئیں اور اسی نسبت سے اس قوم کے سمجھنے سوچنے کی قوتیں بھی تو ماؤف ہوئیں۔

تقلید پرستی کے تحت قوم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کرنے کی چال کہ کیا یہ پہلے بھی کسی نے کہا؟

یہ قوم جو آج کسی چیز کے اوپر سوچتی نہیں ہے' اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اگلی وجہ تو قرآن خود بتاتا ہے۔ دو باتیں قرآن نے' عزیزانِ من! بتائی ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن کی ساری لم سمجھنے کے لیے یہ دو آیات کافی ہوجاتی ہیں کہ مخالفت کس طرح سے ہوگی۔ پہلی چیز تو اس نے کہا کہ عقل وفکر کو ماؤف کرنے والی یہ چیزیں' جب آئیں گی تو پھر وہ ہر گوشے میں ماؤف ہوجاتی ہے۔ قوم کو اس چیز کے اوپر لگا دیا جاتا ہے کہ یہ Events (واقعات) اس طرح سے ہوتے ہیں' ان کا Cause & Effect (علت و معلول) سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' نہ تم سمجھ سکتے ہو کہ کیسے ہوسکتے ہیں' نہ وہ سمجھا سکتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتے ہیں۔ پہلی چیز تو قوم کی یہ ہوگی اور اب اگلی بات سنو۔ وہ اگلی بات اہلِ شریعت کی آ گئی کہ **وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ** (26:5)۔ پرویز صاحب کے ساتھ تو ساری عمر یہ ہوتی رہی ہے' آپ بھی قدم قدم کے اوپر یہ بات سنتے ہیں کہ جی' پرویز صاحب دی تسی کی گل کر دے ہیگے ہو؟ ❷ ان کی بات آپ کر رہے ہیں وہ تو کچھ انوکھی سی بات کہتے ہیں کہ جی' انہوں نے یہ جو کہا ہے کیا پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہے؟ اتنے اتنے بڑے مفسر' اتنے اتنے محدث' آئمہ کرام' صوفیائے عظام' یہ سارے

---

❶ سائیں بوہڑ شاہ' سائیں گھوڑے شاہ' بدھو شاہ کے یہ جتنے بھنگڑ اور ملنگ تھے یہ سب

❷ آپ پرویز صاحب کی کیا بات کرتے ہیں؟

گزرے' یہ جو اس کا یہ مفہوم دے رہے ہیں' یہ جو یہ بات کہہ رہے ہیں' کیا کسی نے پہلے بھی کہی ہے؟ تو گویا ان کے نزدیک کسی چیز کے سچے ہونے کی سند اور دلیل یہ ہے کہ وہ پہلے بھی کسی نے کہی ہو' اگر کسی نے بھی پہلے کہدی تو سند ہوگئی' اگر یہ چیز نہیں ملتی تو کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو' نہیں مانیں گے۔

مذہب کا سارا دارومدار ہر بات آنکھ بند کر کے ماننے پر ہوتا ہے

سارا مذہب اس پہ چلتا ہے کہ پہلے کسی نے کچھ کہا ہو۔ جو پہلے کسی نے کہا پھر اس کے بعد اسے کسی نے پرکھا نہیں۔ مذہب کے اندر سب سے بڑی سند تواتر ہوتی ہے کہ ایک بات متواتر سے' اسی طرح سے' لوگ مانتے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے کسی نے کہا۔ بعد میں آنے والے نے کہا کہ تمہارے پاس اس کی سند کیا ہے۔ کہنے لگے کہ حضرت صاحب نے کہا تھا۔ جی' فلاں محدث کی کتاب میں' فلاں مفسر کی تفسیر میں یہ آیا ہے' انہوں نے یہ فرمایا تھا۔ یعنی ذمہ داری اپنی نہیں ہے۔ ''انہوں نے یہ کہا تھا'' جب کہد یا جائے اور لکھا ہوا دکھا دیا جائے تو سند ہوگئی پھر کوئی بحث نہیں' کوئی مناظرہ نہیں' کچھ نہیں۔ مناظروں کے اندر' میری ایک عمر اسی دشت کی پیمائی میں گزری ہے' ہم قادیان کے پاس بٹالے [1] کے رہنے والے تھے' اوتھوں دے منڈے جماندرو مناظر ہوندے نیں [2]۔ کیا کیا کرتے تھے؟ مثلاً اہلِ حدیث کے ساتھ' اہل فقہ کا مناظرہ ہو رہا ہے تو کوشش کرتے تھے کہ ہم جو اپنی بات کہہ رہے ہیں' اسے فقہ کی' اہلِ حدیث کے کسی بڑے پہلے مفسر کی کتاب سے دکھا دیں کہ صاحب! دیکھیے' آپ کے ہاں کے بزرگ نے بھی یہ کہا ہے۔ تے اوہدے بعد اوناں دا گھوڑا ای مک جاندا سی اگوں [3]۔ بس مار دیا۔ لاکھ دلائل ایک طرف اور یہ ایک سند ایک طرف کہ پہلے نے بھی یہ کہا ہے' خاموش ہوگئے اور اپنے ہاں تو پوچھو ہی نہیں' کوئی بات ان کے ہاں جا کر کہیے' کوئی فتویٰ ان سے مانگیے' اس فتوے میں لکھا ہوا یہ ہوتا ہے کہ فلاں کتاب میں آیا ہے۔ ہدایہ میں یہ لکھا ہے' علامہ رازی نے یہ کہا ہے' جلالین والے نے یہ لکھا ہے اور اس فقیر کی بھی یہی رائے ہے اور اس نے اپنا انگوٹھا لگایا اور نیچے الجواب صحیح بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک۔ او بھئی ٹھیک کیسے؟ کہ جی اس نے تو اتنی سندیں Quote کر دی ہیں' اتنے حوالے دے دیئے ہیں۔ جب دین میں یہ بات سند قرار پا جائے تو عقل وفکر تو یہاں بھی ختم ہوگئی۔ نہ ان فتویٰ دینے والوں نے کوئی معقول دلیل دی **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** (2:111)۔ رسول کہہ رہا ہے دلیل لاؤ۔ نہ انہوں نے کوئی دلیل

---

[1] آج انڈیا کے ایک ضلع کا نام ہے۔

[2] وہاں کے نوجوان پیدائشی مناظر ہوتے ہیں۔

[3] بس اس کے بعد ان کا گھوڑا ہی ختم ہو جاتا تھا۔

پیش کی' نہ جنہوں نے پہلے لکھا ہے' انہوں نے کوئی دلیل پیش کی' اور جس سے یہ منوا رہے ہیں نہ ہی وہ دلیل مانگ رہا ہے' ورنہ کوئی پوچھے کہ تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟ ارے امام بخاریؒ نے یہ کہدیا' لیکن صاحب! قرآنِ کریم میں تو یہ چیز ہے۔ تو گویا قرآنِ کریم آپ ہی سمجھنے والے پہلے آ گئے' وہ قرآن سمجھتے ہی نہیں تھے۔ اب کون یہ کہنے کی جرأت کرے کہ جی' نہیں' واقعی وہ قرآن انہوں نے نہیں سمجھا تھا تو سند ختم ہوگئی۔ آپ نے دیکھا کہ عقل وفکر' دلیل و برہان Reason اور Logic یہاں سب ختم ہوگئے۔

آپ ان دو آیات کو دیکھیے جو میں نے کہا تھا کہ بڑی اہم ہیں۔ کرامت دکھا دیجیے' تو دلیل اور برہان ختم ہوگئی۔ اسی لیے یہ تصوف والے جو صوفی ہیں وہ علم کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں:

علموں بس کریں او یار
اکو الف تینوں درکار

علم تو دلیل چاہتا ہے۔ کرو کیا کرنا ہے!!

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

وہ کہتا ہے کہ اپنا یہ جو سجادہ تمہارے ہاں ہے یہ جو مصلیٰ ہے' اسے شراب کے مٹکے میں ڈال دے:

کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

جو ان راستوں سے پہلے گزرا ہوا ہے' اسے پتہ ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے' تینوں کی پتہ ہیگا؟[1] عقل وفکر کرامات میں منسوخ ہیں' شریعت کی طرف آئے' عقل وفکر حوالوں (References) سے منسوخ ہوئے اور اگر پہلی دفعہ یہ چیز آئی آپ یہ نہ بتا سکیں کہ یہ پہلے کس نے کہا ہے یعنی ان کے سامنے پہلی دفعہ یہ بات آئے تو اس کے لیے کسی غور وفکر کا تقاضا ہی نہیں' سوچا ہی نہیں جائے گا' یہ بات درخورِ اعتنا ہی نہیں ہوگی' اگر کھڑے ہو کر سوچ بھی لیا جائے تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا کسی اور نے بھی یہ کہا ہے۔

عزیزانِ من! سنو کیا بات ہے؟ کہا کہ **وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ** (26:5) خدا کی طرف سے کوئی بات بھی ان کے سامنے پیش کی جائے' اگر وہ ایسی ہے جو ان کے ہاں پہلے سے نہیں آ رہی' تو بغیر سوچے سمجھے اس سے انکار کر دیں گے' پوچھیں گے کہ کیا پہلے بھی یہ کسی نے کہا ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ یہ بات آج ہی نہیں کہی جا رہی' ان کے ہاں مذہب اور طریقت کی شروع سے یہ روش چلی آ رہی ہے' اس زمانے میں بھی' قرآن شاہد ہے' آج بھی وہی چلی آ رہی ہے' ہزار برس سے یہی چلی آ رہی ہے۔ طریقت میں جایئے تو معجزہ و کرامت ہے' شریعت میں جایئے تو سند یہ کہ

---

[1] تجھے کیا معلوم؟

کیا وہاں پہلے بھی کسی نے یہ کہا ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو وہ چیز نہیں ہے۔ جو نئی چیز ہے اس کو بدعت کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ: ''**کل بدعة ضلالة**'' ہر جمعہ کے خطبے میں آپ کو یہ الفاظ سننے میں آئیں گے: ہر نئی بات ضلالت وگمراہی ہے اور **کل ضلالة فی النار** اور ہر گمراہی جہنم میں۔ بدعت یہ نہیں کہ کوئی اپنی طرف سے یہ کہتا ہے' قرآن کی طرف سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔

دنیا بھر کے مذاہب کی سوچ ہمیشہ یہی رہی ہے

یہاں لاہور میں 1958ء [1] میں ایک بہت بڑا سیمینار ہوا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے اس کا اہتمام ہوا تھا۔ مشرق اور مغرب کے بڑے بڑے اسکالر اور علما اس میں اکٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کس غلط فہمی کے ماتحت ہمیں بھی اس میں دعوت نامہ آ گیا تھا۔ اس دعوت نامے کے اندر کچھ مختصر مقالے تھے جو پیش کرنے تھے۔ میں نے بھی اس میں ایک مقالہ پیش کیا۔ اس سیمینار میں' ازہر یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے علامہ تھے' ان کے ساتھ وہیں کے اور علمائے کرام بیٹھے ہوئے تھے' مستشرق بیٹھے ہوئے تھے' سکّی [1] بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان تک میری بات پہنچی ہوئی تھی' وہ مجھے کھینچ کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا کرتے تھے۔ میرے اس مقالے کے جواب میں انھوں نے یہ بات کہی کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' اس سے پہلے کسی اور نے نہیں کہا۔ میں نے بے ساختہ کہا: Not my fault [2]۔ ان میں سے اگر کسی نے نہیں کہا تو کیا وہ میری غلطی ہے؟ اس پر سارے ہال میں قہقہہ بلند ہوا۔ ادھر وہ مستشرق سکّی بیٹھے ہوئے تھے' اس نے تو اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا: جواب دینا تمھیں ہی آتا ہے۔ میں نے کہا: مینوں تے ایہو جئے ٹکرے ہوئے نیں' میں کی کراں' تسی خوش ہو مغرب اچ ہیگے او [3]۔ وہاں مغرب میں یہ بات کوئی نہیں کہے گا کہ کیا پہلے بھی یہ کچھ کسی نے کہا ہے؟

سنیے' عزیزانِ من! ان سائنسدانوں (Scientists) نے کہا کہ ہم چاند پہ جائیں گے تو مغرب والوں میں سے کسی نے نہیں کہا کہ کیا کبھی پہلے بھی کوئی گیا ہے؟ چاند پر جانے کی مخالفت کی یہ آواز مشرق سے ہی اٹھی۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ کیسے اٹھی تھی۔ پہلی دفعہ جب یہ بات ہوئی کہ روس والے چاند پر جا رہے ہیں تو اس پر بڑی مخالفت ہوئی تھی۔ یہاں باغبان پورے میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ اس میں بہت بڑے واعظ تھے۔ وہ وہاں وعظ کہہ رہے تھے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ''وہ وعظ پنجابی اچ ہے۔ پنجابی واعظ ہووئے پنجابی اچ کہن والا ہووئے' پنجابی سنن والے ہون' تے فیر اوہدوں زیادہ سواد تے اوندا نئیں۔ تے پنجابی دی گل فیر اوتی جاسکدی اے۔ اوناں کیا پئی اے! اونئی گل سنی جے کوئی؟ کہندے نیں چندا تے جانا ہیگا۔ ٹھیک ہے ہن تے چند پورا ہے۔ ہوسکدا

---

1. اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ غلام احمد: مذاکرہ عالم اسلامی' طلوعِ اسلام' 2:11' فروری 1958ء' ص ص 3 تا 32
2. اس میں' میں قصوروار نہیں ہوں۔
3. میرا سامنا تو انہی جیسوں سے ہے' میں کیا کروں؟ آپ خوش نصیب ہیں جو مغرب میں رہائش پذیر ہیں۔

اے پئی' اوہدے تے چلے جان۔ تے فیر اگے ہولی ہولی اوگھٹنا شروع ہویا' تے اے وی ہولی ہولی ایدھر ہونے شروع ہوجان گے۔ٹھیک ہے ہوجان گے۔ تے جدوں انتیاں دا آیا تے بچو کتھے جاؤ گے؟[1]

تقلید پرستی کا نتیجہ حقیقت کے استہزا کی شکل میں نکلتا ہے

اب' عزیزانِ من! قرآن میں اللہ کہتا ہے کہ چونکہ ہم انسان کے اختیار وارادے کو سلب نہیں کرتے' اس لیے ان کی حالت یہ ہے کہ **وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ** [2](26:5)۔ دلائل کی رو سے ان سے کوئی بات کہیے' وہ بات کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو' پوچھتے یہ ہیں کہ کیا پہلے بھی کسی نے یہ کہا ہے اور جب یہ بات نہ ہو' تو اسے معرضین کہتے ہیں کہ نہیں نہیں' یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے اعراض برتتے چلے گئے۔ کوئی معجزہ مانگتا ہے' کوئی سند مانگتا ہے' جب یہ نہیں ملتی تو **فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ** (26:6) اسی بنا پر یہ تمہارے پیغام کی تکذیب کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک بالکل نئی چیز ہے۔ ان کے ہاں کے جو مطالبے ہیں' اس معاملے میں یہ بھی Serious (سنجیدہ) نہیں ہیں۔ استہزا کرتے ہیں' مذاق کرتے ہیں اور مذاق میں یہ باتیں کرتے ہیں۔ یہاں اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جن باتوں کی یہ لوگ ہنسی اڑاتے ہیں وہ ان کے سامنے آکر رہیں گی۔ اس لیے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ایسا ہو نہیں سکتا کہ کسی کا کوئی عمل بلانتیجہ رہ جائے۔ **یستھزؤن** دیکھیے کہ کیسا لفظ قرآن لایا ہے کہ تکذیب کرتے ہیں: عقل وفکر کی بنا پہ نہیں' دلیل و برہان کی رو سے نہیں' بلکہ مذاق اڑاتے ہیں' استہزا کرتے ہیں۔ صداقت کو اگر استہزا سے اڑا دیجیے' دلائل سے اڑا دیجیے' اگر اس سے انکار کر دیجیے' اگر اس کی تکذیب کر دیجیے' وہ اپنے نتائج برآمد کرنے سے تو نہیں باز رہتی۔ تم ایک' تمہاری پوری پارلیمنٹ کے اکاون نہیں' سو کے سو' ساری دنیا کے پارلیمنٹرین اکٹھا ہو کے' متفق علیہ Resolution (قرارداد) پاس کر دیں کہ کل سے سنکھیا مہلک نہیں ہوگا ہم نے فیصلہ کر دیا' لیکن سنکھیا مہلک کا مہلک رہے گا۔ قانون اس سے نہیں بدل سکتا۔ کہا کہ انہوں نے ان طریقوں کے اوپر تکذیب کی۔

---

1. وہ وعظ پنجابی زبان میں ہے۔ پنجابی واعظ ہو' پنجابی زبان میں کہنے والا ہو' پنجابی ہی سننے والے ہوں تو اس سے زیادہ لطف تو کہیں اور نہیں آتا۔ پھر ہی تو پنجابی میں بات کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کیا آپ نے کوئی نئی بات سنی ہے؟ کہتے ہیں کہ چاند پہ جانا ہے۔ ٹھیک ہے اب تو پورا چاند ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس پر چلے جائیں۔ پھر جب یہ آہستہ آہستہ گھٹنا شروع ہوگا تو یہ بھی دھیرے دھیرے ادھر ہٹنا شروع ہوجائیں گے۔ ٹھیک ہے ہوجائیں گے۔ پھر جب 29 ویں کا چاند ہوگا تو پھر کہاں جاؤ گے؟
2. جب بھی خدائے رحمٰن کی طرف سے ان کے پاس کوئی ایسا حکم آتا ہے جو ان کے مسلک میں پہلے سے موجود نہ ہو' تو یہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں (21:2)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔824)۔

تکذیب کرنے کے بعد نتیجہ کیا نکلا؟ یہ جو آج کہا جا رہا ہے کہ اس کا نتیجہ مہلک ہے' ہلاکت ہے۔ وہ ہلاکت' وہ نتیجہ آ کر رہے گا۔ ایک لفظ میں' میں کہدوں کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ** [1] (6:67)۔اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو کہتے ہیں کہ پھر یہ ہلاکت ابھی کیوں نہیں ہوجاتی' وہ کہتا ہے کہ تپ دق کا یا سرطان کا مریض پہلے دن نہیں مرجایا کرتا' ہر بات کا نتیجہ Snowball کی طرح Roll کرتا ہے' آتا جاتا ہے۔اوکہیں تو روکو اس کو۔ پھر اس کا ایک مستقر ہوتا ہے' جہاں آ کر وہ ٹھہر جاتا ہے' وہ مقام ہوتا ہے جب اس کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے' بس اس نتیجہ کے آنے تک کی اتنی سی دیر ہے۔ ان سے کہو کہ اس دوران مذاق اڑاؤ' جو جی میں آئے کرو لیکن اس کا نتیجہ محسوس شکل میں آنا ہے اور آ کر رہے گا۔ وہی اس کا مستقر ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الشعرآء کی آیت 6 تک ہم آ گئے' 7ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] خدا کا قانون یہ ہے کہ ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ بات آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا تا آنکہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے اور اس کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے (7:182-183)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔302)۔

دوسرا باب: **سورة الشعرآء** (آیات 7 تا 31 اور[1] 34 تا 35)

بسم الله الرحمن الرحيم

عزیزانِ من ! آج اپریل 1978ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 7 سے ہو رہا ہے:(26:7)۔

سابقہ آیت میں کہا یہ گیا تھا کہ یہ مخالفین تمہاری ان باتوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ جھوٹی ہیں' تم جھوٹ بولتے ہو' ایسا ہو نہیں سکتا اور پھر اتنا ہی نہیں' اس کے بعد یہ تمہارے ان دعاوی کا مذاق اڑاتے ہیں' تمسخر کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا دعاوی تھے جن کی وہ تکذیب کرتے تھے کہ جھوٹ بولتے ہو' ایسا نہیں ہوسکتا اور پھر وہ لوگ ان کا استہزا کرتے تھے' مذاق اڑاتے تھے؟ دعویٰ تو یہ تھا کہ تم جس نہج پر زندگی گزار رہے ہو' تمہارا نظامِ تمدن' تمہارا نہجِ حیات' تمہاری یہ روش' تمہیں تباہیوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ تم برباد ہو جاؤ ہو گے' تباہ ہو جاؤ گے۔ پہلی چیز تو یہ تھی جسے وہ باور ہی نہیں کرتے تھے۔

---

❶ آیات (26:32-33) کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا پانچواں باب

ظہورِ اسلام کے وقت قریش کی معاشرتی زندگی اور کعبہ کی تولیت کا نشہ

آپ ذرا اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ کون لوگ تھے جو سب سے پہلے مخاطب تھے؟ یہ قریش تھے اور ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہاں حکومت کسی کی نہیں تھی' گویا وہ کسی کے بھی محکوم نہیں تھے اور ان کا مقام ایسا تھا کہ یہ خود ہی ایک حاکمیت کی حیثیت لیے ہوئے تھے۔ کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے یہی نہیں کہ جسے آپ مذہبی پیشوائیت کہتے ہیں' وہی ان کے ہاتھ میں تھی' اس زمانے میں کسی عام عبادت گاہ' پرستش گاہ' یا مندر کے پجاری ہونا' ہی کچھ کم نہ تھا لیکن اس خطۂ ارض کے اندر مکے جیسے مرکزی مقام کا متولی ہونا' بہت بڑی چیز تھی۔ وہ کبھی انڈیا میں ہر دور کے جو مہاجن ہوتے تھے' ان کی بات ذہن میں آتی تھی لیکن وہاں اس سے بھی زیادہ بڑی چیز یہ تھی کہ وہاں کوئی منظّم حکومت بھی نہیں تھی' حاکمیت کی حیثیت ان کے پاس تھی۔ وہ کعبے کے متولی تھے اور اس جہت سے ان کو بڑا معزز مقام حاصل تھا۔ قرآن بتا رہا ہے کہ وہاں صحراؤں کی زندگی میں' ویرانے میں' بیابان میں' لوگوں کے قافلے جاتے تھے' دن دیہاڑے لوٹ مچتی تھی' مگر ان کے قافلوں کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ یہ محض اس لیے تھا کہ یہ قریش کا قافلہ ہے' کعبے کے متولیوں کا قافلہ ہے۔ یہ قافلہ اتنا متبرک سمجھا جاتا تھا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا تو گویا تجارت میں یہ اتنے محفوظ قافلوں کے مالک تھے۔ سردی گرمی' بارہ مہینے' ان کے قافلے رواں دواں رہتے تھے۔

آپ سوچیے کہ مذہب کی دنیا میں' حکومت میں' تجارت میں اور معیشت میں انہیں ایسا مقام حاصل تھا' اور پھر ان کا جتھہ بھی اتنا زیادہ مضبوط تھا' ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم تباہ و برباد ہو رہو گے' اس میں تمہارا کچھ نہیں رہے گا۔ واقعی یہ نشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ویسے تو ہر نشہ یہ کچھ کرتا ہے' یہ چھوٹے سے چھوٹا شراب کا جو نشہ ہے' وہ وقت کی بات ہوتی ہے' وہ شرابی کو دیکھیے' وہ ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہوتا ہے۔ وہ جو مشہور ہے کہ رنجیت سنگھ (1780-1839) ہاتھی پہ جا رہا تھا ''کوئی جٹ سی اگوں اونوں ٹکریا۔ پیتا ہویا سی۔ نشے اچ کیفیت اے ہوندی ہیگی اے کہ اونے کیا: اوکانے آ! ایس کٹے دا کی لینا ای؟ کہتا ٹھیک ہے۔ اونے اشارہ کِتا پئی اینوں ذرا ڈک لو اندر۔ دوئے دن سویرنوں اونوں بلایا۔ کہن لگا: ہاں بھئی چوہدری! کل تے ویلا نئیں سی ہیگا' سانوں کچھ کم سی' سودا تیرے نال ہو نہ سکیا' دس فیر اوس کٹے دا کی دینا ایں۔ کہن لگا: مہاراج! او کل والے جیہڑے سوداگر سن' اولد گئے''[1]۔

---

[1] اسے سامنے سے کوئی جاٹ تھا' جو ملا' وہ نشے میں تھا۔ نشے میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس نے (رنجیت سنگھ) سے کہا: اوکانے! اس بھینسے کا کیا لوگے؟ وہ اسے ''اوکانے!'' ٹھیک ہی تو کہتا تھا' اس (رنجیت سنگھ) نے اشارہ کیا کہ اسے اپنی قید میں لے لو۔ دوسرے دن صبح کے وقت اسے بلایا۔ اس سے کہا: ہاں بھئی چوہدری صاحب! کل تو ہمیں فرصت نہیں تھی' ہمیں کچھ کام تھا' تمہارے ساتھ سودا نہ ہو سکا' اب پھر بتاؤ کہ اس بھینسے کا کیا دو گے؟ وہ کہنے لگا: مہاراج! جو کل والے سوداگر تھے وہ تو لد گئے۔

یہ نشہ جس کی اتنی سی کیفیت ہوتی ہے' اس میں بھی یہ حالت ہے کہ ''کانے نوں کٹے دا بھا پوچھدا اے آدمی'' [1] لیکن یہ حکومت کا نشہ' دولت کا نشہ' اور سب سے بڑا روحانیت کا نشہ ہوتا ہے' اس میں یہ گالیاں دیتے ہیں وہ پاؤں پکڑتے ہیں' تھرتھراتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں' روتے ہیں کہ نہیں حضرت سائیں! تباہ ہو جاؤں گا۔ پوچھو نہیں یہ قوت کتنی بڑی ہوتی ہے' اس کا نشہ کتنا بڑا ہوتا ہے! یہ سب چیزیں قریش کے ہاں ایک جگہ مرکوز تھیں۔ ان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائدار ہوگا [2]

کہنے لگے کہ تمہاری مت ماری ہوئی ہے۔ اور ان کے مقابلے میں دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ تم دیکھو گے کہ یہ جو جماعت ہے' یہ غالب آئے گی' اعلون ہوگی' دنیا میں کوئی ان سے زیادہ اوپر نہیں ہوگا:

مومنے بالائے ہر بالا ترے

کفار کے مقابلے میں آپ ﷺ کی مکّی اور مدنی زندگی

یہ دونوں چیزیں ایسی متضاد تھیں کہ ان کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ ہمارے متعلق کہہ رہا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اور ذرا یہ دیکھیے' معاف رکھیے' آج کے محاورے میں ''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا' مکّے میں اگر یہ کہا جا رہا تھا تو مکّے کی زندگی میں تو پوچھو نہیں ان بیچاروں پہ کیا گزر رہی تھی اور اگر یہ مدنی زندگی بھی آئی ہے تو مدنی زندگی میں تمام افراد گن گنا کے کوئی تین سو کے قریب ہیں' نہ گھر' نہ بار' پناہ گزینوں کی سی حالت' نہ پیسہ پاس' نہ کوئی جائیداد' نہ کوئی فوج' نہ کوئی اسلحہ' نہ کوئی مملکت' وہ کعبے کی تولیت بھی نہیں ہے۔ یہاں یہ تھی ان کی کیفیت اور اُن سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! یہ سارا ساز وسامان دھرا رہ جائے گا اور تم دیکھو گے کہ یہی جو جماعت ہے' یہ تمام کے اوپر کس طرح غالب آ جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ نے قیصر وکسریٰ تک کی سلطنتوں کو بھی پیغام بھجوا دیا تھا کہ جو مظالم تم اپنے ہاں کے کاشتکاروں اور مزدوروں پہ توڑ رہے ہو' اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ اندازہ لگایئے' یہ اِدھر کا دعویٰ! اب یہ دونوں دعاوی دیکھیے' قریش کی سمجھ میں بات ہی نہیں آ سکتی تھی کہ ہم تباہ ہو جائیں گے اور یہ جو کہتے ہیں ہم سب پہ غالب آ جائیں گے' ہے واقعی بات تعجب کی! اقبالؒ (1877-1938ء) نے یہی کہا ہے کہ

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے

ہمارا غبار اٹھ رہا ہے کہ ہم ایک نیا آسمان بنا دیں۔

---

[1] یہ آدمی کانے سے بھینسے کا بھاؤ پوچھتا ہے۔

[2] تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائدار ہوگا (اقبالؒ: بانگِ درا)

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

یہ بات سمجھ میں کس طرح آ سکتی تھی! عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا ایسا محسوس انداز ہے کہ تشبیہ سے بات سمجھا تا ہے کہ اس زمانے کے اس بدو اور قریش کی سمجھ میں بھی بات آ جائے اور آج کے فلاسفر کی سمجھ میں بھی بات آ جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے ان کی نگاہ اسی کسان کے اوپر ہے۔ بیچارہ لنگوٹی پہنے ہوئے' درانتی ہاتھ میں لیے ہوئے' صبح سے شام تک محنت کر کے خالی ہاتھ لوٹ آ تا ہے۔ یہ خشخاش کے دانے کے برابر کچھ بیج ہیں' ان کو جا کر یہ مٹی میں ملا آ تا ہے۔ اگر کسی نے اس سے پیشتر زراعت کا یہ پروگرام نہ دیکھا ہوتو واقعی ہر شخص یہ بات کہے گا کہ اس کی مت ماری گئی ہے۔ یہ کرتا کیا ہے؟ صبح کو چلا جاتا ہے اور اسی دن شام کو لوٹ آ تا ہے' سارا دن لہو پانی ایک کرتا ہے' نہ کھانے کو وہاں سے روٹی ملتی ہے' نہ کوئی پھل ہے' کچھ بھی نہیں ہے اور اگر ادھر سے آ کر وہ یہ کہے کہ صاحب! تم دیکھ لیجیے گا کس طرح سے کوٹھیاں دانوں سے بھرتی ہیں! یعنی جس نے اس سے پہلے اس زراعت کے پروگرام کو نہ دیکھا ہو' وہ جو کہتے تھے حضور ﷺ کو (معاذ اللہ) کہ یہ پاگل ہے' مجنون ہے' کاہن ہے' شاعر ہے' یونہی باتیں بناتا ہے' اس جماعت کے متعلق جو یہ کہتے تھے کہ یہ دیکھو تو سہی' اس جماعت کو! دیکھیے ان کے دعاوی کو' دیکھیے وہ ایسے ہی جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ کسی نے اگر اس سے پہلے نہ دیکھا ہو کہ کھیتی کیسے اگتی ہے اور ایک ایک دانہ جو ہے' وہ کس طرح سات سات سو دانے لاتا ہے' وہ کسان کے اس کاروبار کے اوپر خندہ زن ہو جائے گا۔ بات تو اس نے [1] عشق کی کہی ہے مگر ہے سچ:

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق' خلل ہے دماغ کا

وہ جو کہتے تھے کہ یہ پاگل ہے۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ عشق کا جو خلل ہوتا ہے وہ کچھ اور شے ہے۔ یہ جو دہقان یا کاشتکار ہے' وہ اسے جانتا ہے' اسے اب اس پہ یقینِ کامل ہے' یہ اصل راز ہے۔ وہ جو مہینوں بھر چلچلاتی دھوپ میں' کپکپاتی راتوں میں' جاڑے میں' اس طرح مسلسل محنت کیے چلا جا رہا ہو' کونسی چیز ہے جس کی بنا پہ وہ تھکتا نہیں اور روز یہ کچھ کرتا ہے؟ ایک یقین ہے کہ یہ جو میں نے دانے مٹی میں ملائے ہیں' یہ ایک دن اس طرح برومند ہونگے کہ ساری دنیا اس کو دیکھے گی اور کوٹھیاں دانوں سے بھر جائیں گی۔ یہ یقین ہے جس کی بنا پہ وہ یہ سب کچھ کرتا ہے اور جیسا میں نے عرض کیا ہے اگر پہلے کسی نے نہیں دیکھا تو سنو! یہ ان کا استہزا' ان کا تمسخر' ان کا مذاق اڑائیں گے۔ یہ کچھ بھی وہ برداشت کرتا ہے' کسی کی سنتا نہیں ہے' کان دبائے چلا جاتا ہے اور لگا رہتا ہے۔ یہ تھی

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869ء)

کیفیت اس جماعت کی، اس ننھی سی جماعت کی، جو یہ کچھ کر رہی تھی اور اس جماعت کے افراد یہ کچھ برداشت کر رہے تھے۔

قرآن کے نزدیک کھیتی کی مثال انسانی غور وفکر کو جلا بخشنے کے لیے ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا انداز دیکھیے۔ کہا یہ ہے کہ یہ لوگ تمہارے دعاوی کی تکذیب کرتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، استہزا کرتے ہیں۔ **اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ** (26:7)۔انہیں اور کیسے سمجھایا جائے۔ ایسے سمجھایا جائے کہ ذرا دیکھو تو سہی، وہ دانے، وہ بیج ننھے سے، ان کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ کسان کے پاس ہوتا کیا ہے؟ لیکن اس کے بعد تم نے دیکھا کہ پھر جو اس پہ وہ اس پروگرام کے مطابق محنت کرتا ہے، تو اس میں سے پھر خرمن کے خرمن اس طرح سے لگے ہوئے۔ ان کی نگاہوں میں وہ بات نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا قرآن سمجھا کیسے رہا ہے۔ یعنی وہ چیز ہے کہ جس کی تکذیب نہ وہ اس زمانے میں کر سکتے تھے، نہ آج ہم کر سکتے ہیں۔ کھیتی آج بھی اسی طرح ہوتی ہے اور اسی طرح انسان کے لیے **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً** (26:8) ہے۔ یہ ہے اصل چیز کہ بات تو پیش پا افتادہ سی ہے لیکن غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں حقیقت تک پہنچنے کی بڑی عمدہ نشانیاں ہیں۔ اگر بیج صالح ہے، زمین میں زرخیزی کی صلاحیت ہے، کسان جیسا یقین ہے، محنت کرنے والے کے دل میں استقلال اور استقامت ہے، اور وہ مسلسل محنت کیے چلا جا رہا ہے، اگر یہ ساری چیزیں جمع ہیں تو صرف کھیتی پہ ہی نہیں، دنیا کے ہر پروگرام میں اگر یہ چیزیں ساتھ آ جاتی ہیں تو ان کا نتیجہ محسوس شکل میں یقینی طور پہ سامنے آ کر رہے گا۔ **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً** (26:8) کہ ہم نے یہ بات صرف کھیتی کی نہیں کی، اس میں تو حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ **وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ** (26:8) مشکل یہ ہے کہ یہ اس پہ یقین نہیں کرتے، یقین اگر پیدا ہو جائے، اس بات کے اوپر جو ہم نے کہی ہے، پھر سارے مرحلے آسان ہو جاتے ہیں اور پھر یقینی نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ اصل میں یقین ہی ایک چیز ہے۔ عزیزانِ من! ہم تو صرف باتیں ہی کرنے والے ہیں، ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یقین کہتے کسے ہیں، ایمان ہوتا کیا ہے، اور اسکے اندر کتنی قوت پنہاں ہوتی ہے۔ اس [1] نے بھی کہا، ہم نے بھی شاعر ہی سمجھ لیا کہ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

---

[1] یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یہ یقین کی تو قوت ہی بہت بڑی ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ❶

لیکن ہم کیا جانیں!!

فکرِ قرآن تک رسائی کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ میرے ایک عظیم محسن تھے

'عزیزان من ! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ساری چیزیں 'ہمارے نزدیک 'اب شاعری ہی بن کر رہ گئیں۔ اس کے متعلق کچھ تفصیلی گفتگو آئندہ جمعہ کے درسِ خصوصی میں ہوگی۔ اتفاق سے 21 اپریل کو وہ ہمارا جمعہ ہے' درس کا دن پڑتا ہے' 21 اپریل یومِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہے' حضرتِ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا دن ہے۔ اس ملت پر حضرتِ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت احسانات ہیں' قرآن اور قرآن کے نظام سے انہوں نے ہمیں شناسا کرایا' انہوں نے ہمارے لیۓ جب میں ہمارے لیے کہتا ہوں تو دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے' ساڈے چبلاں واسطے ❷ 'اس قدر عظیم مملکت کا تصور دیدیا ہے۔ اور میں اپنے طور پہ تو کہونگا کہ میرے تو وہ ذاتی محسن ہیں' قرآن سمجھنا میں نے ان سے سیکھا ہے' اس لیے وہ دن سال بھر میں' جنہیں میں اپنے خلوص اور محبت اور عقیدت سے منایا کرتا ہوں' ان میں یہ یومِ اقبالؒ بھی ہے۔ تو یہ 21 اپریل کا جو دن ہے' وہ اس دفعہ خصوصی درس کے لیے میں نے مختص کیا ہے۔ ہر سال ایک خصوصی درس ہوتا ہے تو وہ اکیس اپریل کا جو یہیں اسی جگہ نو بجے دن کے جو درس ہوگا' وہ خصوصی اقبالؒ کے لیے ہوگا' یومِ اقبالؒ کا ہوگا۔ اقبالؒ کا ایک مصرع ہے' اس کی تشریح قرآن کی آیات کی روشنی میں کی جائے گی۔ انہوں نے اس قوم سے کہا تھا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری! ❸

اور میں نے اس دفعہ اپنے خطاب کا موضوع یہی مصرع رکھا ہے۔

---

❶ اقبالؒ: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص۔ 283۔

❷ ہم جیسے بے وقوفوں کے لیے

❸ اقبالؒ: ارمغانِ حجاز (اردو)' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 47 (آوازِ غیب)

علامہ اقبالؒ کے اعتراض کے باوجود قوم نے انہیں شاعر ہی تصور کیا

میں یہ بات کر رہا تھا کہ وہ عمر بھر کہتا رہا کہ او مجھے شاعر نہ کہو‘ او مجھے شاعر نہ سمجھو‘ میں شاعر نہیں ہوں۔ اوناں کیا: تینوں کی پتہ اے توں شاعر نہیں‘ توں ہیگا ایں شاعر ❶۔ یہ جو چیز ہوتی ہے کہ تینوں کی پتہ‘ اس کے لیے آپ کو معلوم ہے کہ دو پیر تھے‘ ان کے دو مرید تھے‘ ان کا آپس میں جھگڑا ہونے لگ گیا۔ ایک نے کہا کہ پیر من قطب است۔ دوسرے نے کہا: پیر من ابدال است۔ اس نے کہا: پیر من غوث است۔ اس نے کہا: پیر من نبی است۔ اس نے کہا: پیر من خدا است۔ تے گل مک گئی‘ اسے شکست ہوگئی‘ تڑپا کہ اب میں آگے کیا کہوں‘ بھاگا بھاگا اس کے پیر کے پاس گیا۔ اس کو جا کر کہنے لگا کہ کچھ پتہ ہے تمہارا مرید کیا کہتا ہے۔ کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا پیر خدا ہے۔ کہنے لگا: نہیں بابا! بالکل غلط ہے۔ میں خدا نہیں ہوں۔ اس نے آ کر اسے کہا کہ تم نے کہا ہے کہ میرا پیر خدا ہے۔ کہنے لگا: ہاں‘ میں کہتا ہوں۔ کہنے لگا: وہ تو کہتا ہے کہ میں نہیں ہوں۔ کہنے لگا: اونوں جانور دے پترنوں کی پتہ ہیگا اے ❷۔

برادرانِ عزیز! وہ ❸ ساری عمر کہتا رہا کہ او بابا! میں شاعر نہیں: اوکیندے ❹ ہیگے تو ہے شاعر‘ شاعر ہی نہیں بلکہ تو شاعر کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ڈھولک اور اس کے یہ شعر‘ یہ رہ گیا اقبالؒ۔ بہرحال میں یہ کہہ رہا تھا کہ **وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (26:8)۔ یہ ساری بات یہ ہے کہ ان کے اندر یقین کی قوت نہیں رہی‘ ورنہ اگر اتنی سی مثال بھی ان کے سامنے ہوتی‘ اگر کاشتکار جیسا بھی یقین ان کے دل میں پیدا ہو جاتا‘ تو بات کہیں سے کہیں پہنچ سکتی تھی۔ کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یقین کی قوت کیا کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم بیج کی مثال کے بعد انسانی توجہ تاریخی شہادت کی طرف مبذول کراتا ہے

قرآن آیا تو اس نے اپنے انداز کے مطابق‘ عزیزانِ من! قریش کی مخالفت کے ردِعمل کو ایک محسوس مثال‘ ایک تشبیہ کے ذریعے سے‘ بات سمجھائی ہے کہ اگر تخمِ صالح ہو‘ بیج صحیح ہو‘ زمین صحیح ہو‘ کاشتکار جیسا یقین ہو تو پھر ایک ایک دانے سے کتنے کتنے دانے پیدا ہوتے ہیں۔ کہا کہ **اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ** (26:9)۔ اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ہے العزیز

---

❶ انہوں نے کہا کہ تجھے کیا معلوم کہ تو شاعر نہیں۔ تو ہے ہی شاعر

❷ اس جانور کے بچے کو کیا معلوم!

❸ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) کی طرف ہے۔

❹ وہ کہتے ہیں کہ تُو شاعر ہے۔

اور دوسرا ہے الرحیم۔ العزیز میں یہ ہے کہ قانون کے اندر اتنی قوت ہو کہ وہ سورج کی حرارت' چلنے والی ہوا' پانی' مٹی اور بیج ان تمام کے اندر امتزاج پیدا کر کے' قانون کی قوت سے اس ایک دانے سے سو سو دانہ اُگ آئے اور الرحیم میں یہ ہے کہ پھر اس میں قوت استبداد ہی کی نہیں ہے' وہ تو اس لیے ہے کہ دانہ اُگ آئے اور انسانیت کی نشوونما ہوجائے۔ کہا کہ محسوس مثال کے بعد تاریخی شہادات کی طرف آ جاؤ۔ یہ قرآن کا انداز ہے کہ وہ اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت مثالوں سے دیتا ہے' تشبیہات سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے' اور تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ تاریخی شواہد میں وہ داستانِ بنی اسرائیل یا کشمکش صاحب ضربِ کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون بار بار لاتا ہے کہ وہ ایک ہی داستان کے اندر بڑی جامعیت ہے۔ یہ جو یوم اقبالؒ کے درس خصوصی کے لیے میں نے تین چیزیں کہا ہے: سلطانی و ملائی و پیری' یہ دنیائے انسانیت میں تین ہی لعنتیں ہیں۔ یہ حقیقت میں ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' اور سرمایہ داری ہیں۔ فرعون کی داستان کو' بنی اسرائیل کی داستان کو' قرآنِ کریم اس تکرار اور اصرار سے اس لیے پیش کرتا ہے کہ یہ تینوں لعنتیں بیک وقت ایک جگہ جمع ہوگئی ہوئی تھیں۔ یہ کابوس کی طرح بنی اسرائیل کے سینے پہ سوار تھیں اور ان کے فولادی پنجے کے نیچے یہ بنی اسرائیل تڑپتی پھڑکتی ہوئی ایک قوم تھی۔ اس کے لیے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا کہ جاؤ' یہ تھی وہ انقلابی جنگ جس کو لڑنے کے لیے یہ آئے تھے۔ اسی لیے قرآن جب بھی اس قریش اور نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی کشمکش کو پیش کرتا ہے تو ہمیشہ بنی اسرائیل کی داستان کو سب سے پہلے سامنے لاتا ہے۔ اس میں ان کی بہت سی تفاصیل میں مماثلت ہے۔ اس لیے وہ اسے سامنے لاتا ہے اور یہاں پہ جب مثال کے طور پہ یہ کہا کہ ان کو وہ کسان کی بات سمجھاؤ اور شہادت میں بنی اسرائیل کی داستان پیش کرو کیونکہ اس حقیقت کی شاہد داستانِ بنی اسرائیل ہے جسے اس جگہ مختصراً دہرایا جاتا ہے۔

اس داستانِ بنی اسرائیل کی ابتدا اس مقام سے کی جاتی ہے جب **وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ** (26:10) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی اور اس سے کہا کہ تم اس قوم (فرعون) کی طرف جاؤ جس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ قرآن حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی داستان [1] کو کبھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے' کبھی مدین کی زندگی سے' کبھی جو شبانی تھی اس سے' کبھی سینا کی چوٹیوں کے اوپر جو اس سے ہم کلامی ہوئی تھی' کبھی فرعون کی طرف جب آئے ہیں' وہاں سے شروع کر دیتا ہے تو یہ اس داستان کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ جہاں وہ موقعہ ومحل کے لحاظ سے مناسب سمجھتا ہے' وہیں سے بات شروع کرتا ہے۔ کہا کہ جب تیرے رب نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ جاؤ' ظالم قوم ہے۔ جب وہ ظلم کا ایک جرم گنا دیتا ہے تو ہاتھی کے پاؤں تلے سب کے

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مکمل داستان کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹر' لاہور' 2005ء

پاؤں، سارے ملی جرائم، جتنے بھی ہیں، وہ سب اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے، قرآن کے استعمال کے اعتبار سے، ظلم کے معنی ہوتے ہیں ''جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو''۔ یہ بڑی جامع چیز ہے صاحب! انسان کو انسانیت کا مقام حاصل نہ ہو، اور وہ جو بندے ہیں ان کو خدائی مقام دیدیا جائے۔ یہ دونوں ہی چیزیں ہیں، ان کو نیچے کی طرف لایا جائے انسانیت کے شرف سے گرا کے، جب بھی اپنے مقام پہ نہ رہے اور انسان کو خدا بنا دیا جائے وہ بھی اپنے مقام پہ نہ رہا۔ یہ دونوں ظلم ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ قوم ظالمین ہے۔ **قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ** (26:11)۔ ان سے جا کے اتنی بات کہو کہ جس راستے پہ جا رہے ہو، اس میں آگے جا کر بڑی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں، بتاؤ ان سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟ کیا بات ہے صاحب! اپنے لیے نہیں کچھ مانگتے آ رہے، اپنی قوم کے لیے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لیے نہیں آ رہے، ان سے کہا جا رہا ہے کہ جس راستے پہ چل رہے ہو، اس راستے میں بڑی خطرناک گھاٹیاں ہیں۔ بتاؤ بچنا چاہتے ہو؟ ایک جگہ ذرا اور بھی تاکید کی ہے۔

داستانِ موسیٰ علیہ السلام میں جلال کے ساتھ جمال کی اہمیت

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی جو ایک عام ہیئت سامنے آتی ہے، اس میں وہ بڑے جلالی قسم کے انسان نظر آتے ہیں، جبھی اس نے صاحب ضربِ کلیم کہا ہے کہ ان کے اندر وہ جلال ہے تو اس جلال کے پیشِ نظر میں نے عرض کیا ہے اور میں اس سے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس جلال کی بھی بڑی ضرورت ہے لیکن سارے جلال ہی کی ضرورت نہیں ہے، ساتھ جمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ موٹر خالی پٹرول سے ہی نہیں چلتی، اس میں موبل آئل بھی چاہیے لیکن یہاں تو ہوتا یہ ہے یا خالی پٹرول ہی ہوتا ہے، انجن جل جاتا ہے یا وہ پٹرول کی ٹینکی میں موبل آئل ڈال کر ہمارے ہاں تصوف آ جاتا ہے۔ بیڑہ ای غرق کر دینے نیں ساری موٹر دا ای[1]۔ تو انہیں کچھ تاکید کرنا پڑتی تھی۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، قرآن جس انداز سے ہے وہ تو ہمارے لیے ہے، ٹھیک ہے موسیٰ علیہ السلام جیسا صاحبِ جلال بھی ہونا چاہیے لیکن جاتے جاتے یہ کہا ہے کہ **اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:43) یہ ادھر سے اتنا صاحب جلال، وہ اُدھر سے اتنا بڑا سرکش، نظر آتا تھا کہ جب دونوں آپس میں ٹکرائیں، پتہ نہیں وہاں کیا چیز ہو گی، کس قسم کے شعلے نکلیں گے، اس لیے کہا کہ **فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا** (20:44)۔ دیکھنا! جاتے ہی، جاتے ہی، چھوٹتے ہی، بات اتنی سختی سے نہ کرنا، ذرا نرمی سے بات کرنا۔ پہلی بات یہ کہ نرمی سے بات کرنا۔ اور کیا کہا ہے؟ یہ کہ **لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى** (20:44) نرمی سے بات کرنا شاید وہ سمجھنے کے اوپر آ جائے اور اگر بات سمجھنے سے بن جائے تو پھر آگے ضربِ کلیمی کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔ قرآنِ کریم

---

[1] ساری موٹر (Car) کا ہی بیڑہ غرق کر دیتے ہیں۔

نے اپنا انداز ہی یہ رکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا' یہ بڑی اہم چیز ہے۔ سورۃ حدید میں آپ دیکھیے کہ اس پروگرام کی یہ دلیل کیا ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ (57:25) پہلی چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام کو دلائل و براہین دے کر بھیجا۔ کہا کہ دلیل کی رو سے بات کرو' ان کو سمجھاؤ' یعنی افہام و تفہیم ان کی پہلی منزل ہے۔ تمام رسولوں کے متعلق یہ کہا کہ جب کسی سے بات کرو تو یونہی لٹھ لے کر نہ پڑ جاؤ' پہلے دلیل اور برہان کی رو سے سمجھاؤ وَمَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ (57:25) اور پھر اگلی چیز یہ کہ جب دلیل و برہان کی رو سے ایک نظام قائم کرنا ہو' تو پھر ضابطہ قوانین اس کے بعد آتا ہے' یہ جو Reason اور Logic اور برہان اور دلیل ہے یہ پہلی منزل ہے۔ اگر یہ جو قوت بے رائے ہے جسے وہ کہتا ہے جہل است وجنوں کہ اگر عقل اور فکر کی رو سے تم بات نہ شروع کرو' اور لٹھ ہی لے کر آجاؤ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پاگل پن ہے۔ اصلاح کے لیے بڑی ضروری چیز ہے کہ پہلے سمجھانے کا مرحلہ آئے' یہ دلیل و برہان کا مرحلہ ہے' پھر بعد میں مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (57:25) ہے۔ اس ضابطہ قوانین کے ذریعے سے اس نظام کو قائم کرو۔

شمشیرِ خارہ شگاف کا مقام دلائل و براہین کے بعد آتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اس مقصد کے لیے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کی طرف اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ہر رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لایا اور اس نے کہا کہ اس ضابطہ قوانین کی رو سے لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (57:25) لوگوں کو اپنے اپنے صحیح صحیح مقام کے اوپر رکھو' ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں ہر شخص کا عمل' ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یہ لوگ عدل و انصاف قائم کریں۔ اب دوسرا یہ ہے کہ قانون آگیا' یہ دوسرے درجے کے اوپر ہے اور اگر ان میں پھر اس قسم کے لوگ ہوں کہ اس کے باوجود وہ قانون شکنی پہ اترا آئے ہوں اور کوئی اور طریقہ باقی نہ رہے تو وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (57:25) پھر ہم نے تیسری چیز دی ہے یعنی شمشیرِ خارہ شگاف بھی انبیاء کے ساتھ بھیجی ہے۔ یہ جو قوت ہے' جسے شمشیر کہا ہے' حدید کہا ہے' فولاد کہا جاتا ہے' آخری درجے کی چیز ہے۔ جب ان دلائل و قوانین سے کام نہ چلے' آخری مرحلہ آجائے تو وہاں قوت آتی ہے۔ اگر اس پروگرام کو الٹ دیا جائے تو پھر جہل است وجنوں ہے' پاگل پن ہے۔ پاگل میں کیا ہوتا ہے؟ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی' اس کے پاس کوئی قانون نہیں ہوتا' اس کے پاس قوت ہی قوت ہوتی ہے۔ ہوند ہوندی اے۔ ہر گل اچ یا او گالیاں دین لگ پیندا اے یا اومک مارن لگ پیندا ہیگا اے [1]۔ یہ پاگل پن ہوتا ہے تو اس لیے یہ کہا کہ جانا۔ اس سے جا کر پہلے نرمی سے بات کرنا [2]' ہوسکتا ہے اتنے سے ہی بات اس کی سمجھ میں آجائے اور اَلَا يَتَّقُوْنَ (26:11)

---

[1] تمردانہ انداز ہوتا ہے۔ ہر بات پہ یا تو وہ گالیاں بکنے لگتا ہے یا ٹھونسے بازی پہ آجاتا ہے۔

[2] یہ اشارہ حضرت موسیٰؑ کی طرف ہے کہ فرعون کے پاس جانا' پہلے نرمی سے بات کرنا (20:44)

اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے وہ خائف ہو جائے۔ یہ نہ ہو تو پھر آگے چلو۔ اب اندازہ لگائیے کہا کہ اس کی طرف جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا وہ اپنی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے بچنا چاہتا ہے یا نہیں؟

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پہلی زندگی کا دور

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی پہلی زندگی میں چند الفاظ میں عرض کردوں' بنی اسرائیل کی قوم میں پیدا ہوئے' فرعون کی محکوم قوم تھی یعنی فرعون کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ مصر کے اس زمانے کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا' یہ محکوم قوم تھی۔ اس زمانے کی محکوم قوم کا تو پوچھو نہیں' کیا ہوتی ہے! اس گھرانے میں پیدا ہوئے' فطرت کا ایک پروگرام تھا جس کی رو سے فرعون کے گھر کے اندر ان کی پرورش ہوئی' وہیں بڑھے پھولے' وہاں یہ ایک دن' وہی جوان کا جلال تھا' اس کی رو سے وہ جو حاکم قوم تھی' اس کے کسی فرد کو کہ وہ یونہی کسی سے زیادتی کر رہا تھا' ہٹانے لگے' مکا لگ گیا' وہ کہیں یہاں (نازک جگہ پر) لگ گیا ہوگا' وہ گر کر مر گیا۔ اس قوم کو پہلے ہی شبہ تھا کہ بنی اسرائیل کی قوم کا یہ بچہ ہے اور یہ محلات میں پل رہا ہے' یہ معلوم نہیں کیا کرے گا۔ انہوں نے پہلے سازش کر رکھی تھی۔ انہیں معلوم ہوا کہ سازش کر رکھی ہے تو یہ وہاں سے بھاگ گئے بارہ سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک وہ اس علاقہ میں جو مدین کا' فلسطین وغیرہ کا تھا' یہ اس علاقے میں رہے تو وہاں یہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر آئے۔ اس زمانے کی جو گلہ بانی معیشت تھی یعنی بھیڑیں چرانا' مویشی پالنا' چراہ گاہوں میں جانا' یہاں پانی گھاس ہے' یہاں چار دن کے لیے رہے۔ ہر صبح سفر' ہر شام سفر اور پھر یہاں سے یہ ختم ہوا' آگے نکل گئے' شبانی تھی۔ یہ اس میں ہی آئے ہوئے تھے [1] کہ جو ایک رات کو' جب قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ان تمام کٹھالیوں میں سے موسیٰ علیہ السلام تمہیں نکالا اور جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے معیار پہ تم پورے اتر آئے ہو' تو پھر ہم نے تمہیں آواز دی اور کہا کہ لو جاؤ اور یہ پروگرام تمہارے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ تو وہاں یہ بات ہوئی کہ جاؤ فرعون کی طرف **قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ** (26:12) موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ تو میری تکذیب کریں گے' مجھے جھٹلائیں گے۔ کس بات سے؟ یہ وہی بات ہے جو پہلے یہاں آ چکی ہے۔ قومِ محکوم کا ایک بھاگا ہوا فرد ہے اور آگے وہ کہتے ہیں کہ میرے ذمے تو انہوں نے قتل کی تہمت بھی لگا رکھی ہے۔ بہرحال حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے جا کر یہ کہتے ہیں کہ تیرا لاؤ لشکر' یہ تیری ساری قوم' یہ محلات' یہ نہریں' یہ باغات' تباہ ہو جائیں گے' برباد ہو جائیں گے' ظلم کی روش کو چھوڑ دو اور یہ جو قوم تمہارے پاس

---

[1] اس کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء۔

ہے' جن کو تم نے اپنے استبداد کے شکنجے میں کس رکھا ہے' ان کو چھوڑ دو۔ تکذیب یہ تھی کہ او! کیا کہتے ہو کہ ہم تباہ ہو جائیں گے اور یہ قوم سلطنت کرے گی!!

فرعون کے ساتھ بغرضِ مذاکرات ایک اور ساتھی کے لیے درخواست

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی مخالفت اس قدر شدت اختیار کر جائے کہ اس کا مقابلہ کرنا تنہا میرے بس کی بات نہ ہو مجھے کوئی بڑی جھنجھلاہٹ سی محسوس ہو رہی ہے' کچھ گھبراہٹ سی ہے کہ میں وہاں کا بھاگا ہوا ہوں۔ یہ کیفیت ہے کہ محکوم کا ایک فرد ہوں تو وہاں جاؤں اور ان سے جا کر یہ کہوں کہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ' پھر کہا کہ **وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ** (26:13) میرا دم گھٹنے لگ جائے اور میں اس سے کھل کر بات بھی نہ کر سکوں اس لیے تو ایسا کر کہ ہارون علیہ السلام کی طرف بھی پیغام بھیج دے۔ اب یہ ٹھیک ہے' میں وہاں اتنا عرصہ رہا ہوں' دس بارہ سال ہو گئے' وہاں سے نکل کر آئے ہوئے' جنگلوں میں بیابانوں میں مویشی چراتے' گڈریئے کی زندگی تاتا تاتا کرتا رہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ وہاں ہوسکتا ہے کہ وہ جو بات کرنے کے لیے لسانی ضرورت ہوتی ہے شاید وہ بھی مجھے میسر نہ ہو' تو اچھا یہ ہے کہ میرے ساتھ میرے بھائی ہارون کو بھیج دے' وہ وہیں رہتا ہے۔ دوسری جگہ آیا ہے **هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي** (28:34) وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے' اس لیے اسے بھی میرے ساتھ کر دے۔

اب یہ دیکھیے کہ یہ چیزیں عام نظر آئیں کہ خدا کا ایک رسول ﷺ ہے' خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں' تم غالب آ جاؤ گے' فتح پاؤ گے اور وہ اپنے ساتھ یہ مدد مانگ رہا ہے' خدا یہ نہیں کہتا کہ جاؤ جاؤ' ہم نے جو کہا ہے ہم تمہارے ساتھ ہیں' کیا ضرورت ہے ہارون علیہ السلام کی' اور ان کی' یہ سب کچھ کی' تم جاؤ' اکیلے جاؤ' تم جا کر کھڑے ہو جاؤ' بس فتح پا جاؤ گے' بلکہ وہ کہتا ہے کہ تم واقعی ٹھیک کہتے ہو' ضرورت ہے' اس کی طرف بھی ہم پیغام بھیج دیتے ہیں' وہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا' پھر کہا اگلی بات یہ ہے کہ **وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ** (26:14)۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہ دو باتیں ہیں' پہلی تو جو کہا ہے کہ وہاں شاید میں اچھی طرح بات نہ کر سکوں' تو ہمارے ہاں تو پھر جب تک زیبِ داستاں کے لیے' ساتھ افسانہ نہ ملایا جائے تو اس میں تو کوئی لطف ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''لطف'' یاد آ گیا' جامعہ ملیہ میں مولانا اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ (1955-1879ء) ہوتے تھے۔ یہاں پنجاب کے دو اچھے بڑے مناظر تھے' ایک مولانا صاحب تھے' وہ اپنی وعظ میں اکثر شعر پڑھا کرتے تھے تو وہ شعر پڑھا: ''یہ تھا سَبق پہلا کتابِ خدا[1] کا''۔

---

[1] یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا   کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا   (الطاف حسین حالی: مسدس حالی' تاج کمپنی لمیٹڈ' لاہور' ص۔ 52)

تو وہ واپس آ رہے تھے، ہم بھی ساتھ تھے۔ مولانا جیراجپوریؒ نے خاموشی میں ان سے کہا کہ مولانا! آپ شعر نہ پڑھا کریں تو اچھا ہے۔ دوسرے مولانا ان کے برابر میں تھے، کہنے لگے: جی نہیں، شعر پڑھنے سے لطف بڑھ جاتا ہے، تو مولانا جیراجپوریؒ کہنے لگے: جی، دویں اکٹھے پڑھیا کرو فیر تسی ❶۔ مولانا جیراجپوریؒ کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ ایک سبق کو سبق کہتا تھا دوسرا لطف کو لطف کہتا تھا تو ہمارے ہاں تو یہ زیبِ داستاں ❷ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ پھر زیب داستاں کے لیے قصہ گھڑا کہ صاحب! حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ شاید میں بات نہ کہہ سکوں۔

فرعون کی داڑھی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں: زیبِ داستان کا ایک قصہ

زیبِ داستاں کا قصہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام بچپن میں وہاں فرعون کی گود میں کھیل رہے تھے تو انہوں نے کھیلتے کھیلتے اس کی داڑھی کو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ فرعون کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا کہ ہاں، یہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے، تے فرعون دی داڑھی نوں ہتھ پوندا پیا ہیگا، تے کر دو قتل ❸۔ وہیں اندر لوگ بھی کچھ ایسے تھے جو ان کے ساتھ تھے، مخلص تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، سرکار! بچہ ہے۔ اس کو اس چیز کی کیا تمیز ہے۔ کہنے لگے: نہیں، اس کو تمیز ہے۔ کہنے لگے: ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ انہوں نے کچھ تھوڑے سے دہکتے ہوئے انگارے، کوئلے لا کر سامنے رکھ دیئے اور انہوں نے ایک کوئلہ لیا اور منہ میں ڈال لیا صاحب! تو اس سے ان کی زبان جل گئی۔ انہوں نے کہا کہ دیکھا جی! بچہ ہے، نہیں سمجھتا ہے۔ تب اس نے کہا ہے: اچھا! جانے دو تو زبان جل گئی۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ زبان جو جلی ہوئی تھی تو یہ ان کی زبان میں لکنت تھی، اچھی طرح بول نہیں سکتے تھے، اس واسطے انہوں نے کہا تھا کہ دوسرا آدمی میرے ساتھ دید یجیے اس لیے میرا بھائی میرے ساتھ جائے۔ اگلی چیز ہمارے ہاں پھر یہ ہے کہ انہوں نے اس قبطی ❹ کا قتل کیا تھا، پھر بھاگے تھے۔

یہاں قرآن دو لفظوں میں بات کہہ جاتا ہے کہ **وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ** (26:14)۔ **ذَنْبٌ** کہتے ہیں ''کسی کے خلاف جو تہمت لگا دی جائے''۔ یہاں کہا کہ انہوں نے میرے خلاف ایک تہمت لگا رکھی ہے، میرے سر پہ الزام دھرا ہے۔ وہ اقرار نہیں کرتے کہ میں نے اس کو قتل کیا ہے، کہتے ہیں کہ میرے سر پہ ایک الزام دھرا ہوا ہے اور چونکہ وہ حاکم قوم کا فرد تھا جو مر گیا تھا، میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے لیکن انہوں نے جو تھانے میں ایف آئی آر ❺ لکھوائی ہے وہ یہی چیز ہے کہ اس نے اس کو قتل کیا ہے، محض اس لیے کہ وہ

---

❶ جی، پھر آپ دونوں، اکٹھے ہی پڑھا کریں۔

❷ ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے (اقبالؒ: بالِ جبریل)

❸ فرعون کی داڑھی پکڑ رہا ہے، اسے قتل کر دو۔

❹ قبطی: قدیم مصری قوم، فرعون کے ساتھی۔ مصر کا قدیم نام ''قبط'' تھا۔

❺ ایف آئی آر First Information Report

شخص ان کی قوم کا فرد تھا' میں قوم محکوم کا فرد تھا۔ اس لیے **وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ** (26:14) میرے ذمے انہوں نے ایک الزام دھرا ہوا ہے' اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہاں عدل اور انصاف کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ میں گیا اور انہوں نے دھر لیا: **فَأَخَافُ أَنْ يَّقْتُلُوْنِ** (26:14) ڈرتا ہوں کہ وہ پھر مجھے پھانسی نہ دیدیں۔ جواب تھا: **قَالَ كَلَّا** (26:15) خدا نے کہا: نہیں' گھبراؤ نہیں' ان کی مجال نہیں کہ وہ ایسا کریں لیکن یہ ٹھیک ہے کہ مہم کی سختی کے پیشِ نظر ہارون علیہ السلام کو بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیے۔ اس لیے کہا **فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ** (26:15) تم دونوں جاؤ۔ یہ ہمارے قوانین' ہمارے دلائل' جتنے بھی ہیں' یہ بڑے محکم ہیں۔ تم ان کو لے کر آگے جاؤ تو سہی۔ یہ نہیں کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' تم کچھ بھی نہ کرو گے' تو بیٹھے بٹھائے ہم تمہیں کامیابی دیدیں گے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ہم تمہارے Behalf (کی طرف سے) وہاں بحث شروع کر دیں گے۔ کہا کہ **اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ** (26:15) تم جا کر وہاں سب کچھ کرو' ہم سنیں گے کہ تم کیا کہتے ہو۔ کیا بات ہے! احتیاط کے لیے یہی بڑی چیز ہوتی ہے کہ کسی بچے کو بھی یہ معلوم ہو کہ جو میں کر رہا ہوں' وہ باتیں ابا جی سن رہے ہیں تو وہ بات کرنے میں بڑا محتاط ہو جاتا ہے' ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ یہ کہہ کر ایک بڑی ذمہ داری اس کے اوپر عائد کر دی کہ وہاں یہ نہ کرنا کہ جو جی میں آئے' میں وہاں جا کر کرتا رہوں اور کہتا رہوں اور کوئی مجھے سننے والا ہی نہیں ہے۔ نہیں' جو کچھ تم وہاں کہو گے ہم اسے سنیں گے (20:46) اس لیے کوئی بات نہیں ہے۔

قاصد کی حیثیت سے فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ

عزیزانِ من! **فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (26:16) فرعون کے پاس گئے' بات صرف یہ کہی کہ میں خود کوئی مدعی بن کر نہیں آ رہا' میں پیغامبر ہوں' قاصد ہوں' سفیر ہوں۔ یہ چیز آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانے کے بھی خواہ وہ بادشاہ تھے' ان کے ہاں بھی یہ Etiquette (مسلمہ ضابطہ آداب ورسوم) تھا کہ یہ جو دوسری سلطنتوں کے سفیر یا قاصد یا پیغامبر آتے تھے' ان کے خلاف کچھ نہیں کیا جاتا تھا۔ اب یہ کسی سلطنت کے یا مملکت کے تو سفیر یا قاصد بن کر یا Ambassador (سفیر) بن کر نہیں گئے تھے۔ کیا کہتے کہ کس کی حکومت کی طرف سے میں آیا ہوں؟ کہا کہ **اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (26:16) پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارے ہاں خود یہ چیز موجود ہے کہ جو سفرا ہوتے ہیں' قاصد ہوتے ہیں' ان کو ہاتھ نہیں ڈالا کرتے۔ میں قاصد ہوں۔ اب یہ بات کہ کونسی حکومت کی طرف سے قاصد آیا ہوں' تو سنو! میں تو رب العلمین کی طرف سے' جو تمام کائنات کا رب ہے' اس کا قاصد ہوں' ذرا مہربانی کر کے "ہتھ سوچ کے پاؤنا"[1]۔ کیا بات ہے' اس مقام پہ رسول کہنا' خود جو مملکت کے آداب ہیں اس کی رو سے بھی

---

[1] ہاتھ سوچ سمجھ کر ڈالنا۔

یہ کتنی بڑی بات ہے اور کتنی بڑی حکومت کا میں سفیر بن کر آیا ہوں۔

حاکم کی حاکمیت محکوم قوم سے ہی وابستہ ہوتی ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تم سے کچھ تمہاری سلطنت نہیں چھین رہا' حکومت نہیں چھیننا چاہتا' تمہیں تمہارا تاج و تخت مبارک' میں تو صرف یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ تم نے بنی اسرائیل کی قوم کو وہاں اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے' بڑی مظلوم قوم تھی' میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کو یہاں تمہارے حوالے کر دوں لہٰذا تم الگ ہو جاؤ۔ اتنی سی بات ہے کہ اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ (26:17) بنی اسرائیل کو اجازت دیدے کہ میں ان کو اپنے ساتھ تمہاری مملکت کی حدود سے کہیں باہر لے جاؤں' تو ظاہر ہے کہ یہ کونسی ایسی چیز تھی جو اس سے نہ کی جاتی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں مانگ رہے تھے' اس کا بگڑتا کیا ہے' لیکن سب سے بڑی چیز تو تھی جو یہ مانگ لی۔ حاکم کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اس کے پاس محکوم رہے۔ اب اگر کوئی محکوم ہی نہ رہے تو وہ حاکم کس طرح سے ہوگا' وہ حکومت کس پہ کرے گا' اپنی قوم پہ تو حکومت کی نہیں جا سکتی' جو قوم محکوم ہے وہ ہونی چاہیے' اگر محکوم قوم کو وہاں سے نکال لیا جائے تو اس کے بعد حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

انسانی سوچ کی زبوں حالی: ملوکیت کی بجائے جمہوریت

بات میں سے بات نکل آئی۔ یہ اس دور کی ملوکیت تھی جسے ہم دورِ استبداد' دورِ جہالت' دورِ وحشت کہتے ہیں۔ تہذیب نے ابھی اپنے قدم نہیں جمائے اس لیے وہاں اپنی قوم حاکم ہوتی تھی' دوسری قوم محکوم ہوتی تھی' اس پہ حکومت کی جاتی تھی۔ دورِ تہذیب نے کہا کہ یہ تو بڑی وحشت ہے کہ دوسری قوم ہے' اس کے اوپر حکومت کی جائے' اپنی قوم کو حاکم سمجھا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ملوکیت بڑی درندگی ہے' جمہوریت ہونی چاہیے۔ اچھا جی! اس میں کیا ہوتا ہے؟ اپنی قوم کے اکیاون' انچاس کے اوپر حکومت کرتے ہیں[1]۔ یہ وہ خدشہ تھا کہ جو محکوم قوم ہے وہ پوری کی پوری نکل کر کہیں چلی نہ جائے تو اس کے بعد حکومت ہی ختم ہو جائے' نہ رہے بانس' نہ بجے بانسری' اس لیے ملوکیت کے بجائے جمہوریت لائے۔

---

[1] جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے' تولا نہیں کرتے
اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش — ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

اپنی ہی قوم اپنے ہی ہاتھوں محکوم

عزیزانِ من! انہوں نے کہا کہ نہیں' ایسا انتظام کرو کہ ''کتھے جان جوگے وی نہ ہون اے' تے رہن وی ایتھے ای''❶ **وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ** (2:167) جہنم سے کوئی نکل کر باہر نہیں جا سکے گا۔ ان کو یہیں رکھو۔ عزیزانِ من! اس زمانے میں یہ جو محکوم قوم الگ ہوتی تھی' اس کے دل میں ہر وقت یہ آگ بھڑکتی رہتی تھی: یہ حاکم قوم ہے' یہ ظلم کرتی ہے' ہم محکوم ہیں' ہم کمزور ہیں' ہم ناتواں ہیں' اس لیے ہم پہ ظلم ہوتا ہے تو گویا ہر وقت یہ ذہن میں ہوتا تھا کہ کسی طرح اس غلام کے جوئے سے ہم چھوٹ جائیں' کسی طرح ان کے دستِ تظلم سے نجات حاصل کر لیں' دل میں یہ تھا' جیسے اس دور کے غلام (Slave) کے ذہن میں ہر وقت یہ ہوتا تھا کہ میں کسی طرح سے بھاگ جاؤں' غلامی کی زنجیروں کو توڑ دوں۔ غلامی کے خلاف دل میں جذبات' اتنے نفرت کے ہی نہیں' سرکشی کے ابھرتے تھے' اسی طرح سے اس زمانے میں جب کوئی قوم محکوم ہوتی تھی اس کے دل میں بھی آزادی کے لیے بڑی تڑپ ہوتی تھی' وہ بڑی کوشش کرتے تھے اس دور کے بعد جب ہمارے ہاں کا یہ مہذب دور آیا جسے آپ مغربی جمہوریت کہتے ہیں تو اپنی ہی قوم کے اندر ایک حصہ محکوم ہوتا ہے' ایک حصہ حاکم ہوتا ہے' نتیجہ یہ کہ وہاں تو یہ تھا کہ ہم اس ملک کو چھوڑ جائیں۔ محکوم یہ چاہتا تھا کہ ہم اس ملک کو چھوڑ جائیں' کہیں اور چلے جائیں۔ اب اگر ان کو اس ملک کے اندر سے چلے جانے کی اجازت دیدی جائے تو پھر وہاں کوئی زیادہ محکوم نہیں رہتا تھا۔

مغربی جمہوریت کے سدا زہریلے اثرات

عزیزانِ من! مغرب کے جمہوری نظام کے اندر یہ کہیں جا بھی نہیں سکتے۔ ان کا تو ملک ہی یہی ہے۔ جانا کہاں ہے؟ تو پھر ہوتا کیا ہے؟ سارا وقت ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو حاکم قوم یا صاحب اقتدار گروہ ہے یا جماعت ہے' اس کی ٹانگ کھینچی جائے' ملک میں فساد برپا کیا جائے' یہ نیچے آ جائے ہم اوپر چلے جائیں: اتر کانٹو! میں چڑھاں' اج دے بچیاں نوں کچھ وی نئیں پتہ ہیگا۔ کی کرے❷! ہر وقت مسلسل فساد کی یہ کشمکش رہتی ہے: ''اتر کانٹو!'' میں چڑھاں کی انہوں نے ایسی طرح ڈالی ہے کہ ساری دنیا اسے سینے سے لگائے پھر رہی ہے: خدا کی رحمت ہے صاحب!! بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ **اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ** (26:17) اجازت دے کہ میں بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ دیکھا' بڑی معصوم سی ایک درخواست ہے کہ ان کو

---

❶ کہیں اور جانے کے لائق بھی نہ رہیں' رہیں بھی یہیں۔

❷ اے جسدِ قوم کے کانٹو! مسندِ اقتدار سے ہٹو' میں برسرِ اقتدار آؤں۔ آج کے بچوں کو تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ کیا کریں وہ بیچارے!

چھوڑ دے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسے مقام پہ ملوکیت کرتی کیا ہے؟ وہ دیکھتی ہے کہ اس نے فتنہ برپا کرنا ہے۔ اتنی صدیوں سے یہ محکوم قوم تھی، کبھی ان کے دل میں یہ خیال تک بھی نہیں پیدا ہوا تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں، کسی اور جگہ جا کر اپنی آزادی حاصل کریں۔ یہ آیا، یہ فتنہ! کیا کیا جائے؟ یہ ان کے لیے بڑا ہی اہم سوال تھا۔

اپنی حاکمیت کو قائم رکھنے کے لیے ملوکیت کے خطرناک حربے

ان کا پہلا حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو Win Over کیا جائے یعنی اس کو کچھ مراعات دیجائیں، احسانات کیے جائیں، اپنا مقرب بنا لیا جائے، اس کو ساتھ ملا لیا جائے۔ اس طرح سے اسی قوم کا یہ فرد ہے جس کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی ہے۔ اب دیکھیے کہ وہ بات انہوں نے کہی ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دیں، اس کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگے: موسیٰ علیہ السلام! ارے، ایسا طوطا چشم، ایسا احسان فراموش، موسیٰ! تم اتنی جلدی بھول گئے۔ تمہارے ساتھ جو ہمارے تعلقات تھے، جو ہماری نوازش ہائے پیہم تھیں۔ بنی اسرائیل کی قوم سے تمہیں لیا اور محلات کے اندر تمہیں یہ زندگی بسر کرائی، اتنی نوازشیں تمہارے ساتھ ہیں۔ کہا کہ تو سامنے کھڑا مجھ سے یہ باتیں کر رہا ہے! **قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّکَ فِیۡنَا وَلِیۡدًا وَّ لَبِثۡتَ فِیۡنَا مِنۡ عُمُرِکَ سِنِیۡنَ** (26:18) فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! کیا یہ نہیں ہے کہ تمہاری پرورش ان محلات میں ہوئی ہے، ہماری گود میں ہوئی ہے، یہاں بڑھ پھول کر بڑے ہوئے، عمر کا ایک حصہ یہاں گزرا، شہزادوں کی طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ پھر ہم نے تمہیں نہیں نکالا۔ **وَ فَعَلۡتَ فَعۡلَتَکَ الَّتِیۡ فَعَلۡتَ وَ اَنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ** (26:19) خود تم نے ان احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ خود ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا۔ یہ کچھ کیا اور اس کے بعد خود ہی اس سے ڈر کر تم یہاں سے بھاگ گئے، ہم نے تو تمہیں نکالا بھی نہیں ہے۔ اتنے احسانات ہیں! تم کیسے ناشکر گزار آدمی ہو؟ **وَ اَنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ** (26:19) اس قدر احسان فراموش، اس قدر ناشکر گزار! دیکھا آپ نے ملوکیت کی آنکھوں میں وہ جادو ہے۔ یہ ہے وہ چیز، یہ ہے وہ سحر۔

پہلی چیز یہ آ رہی ہے کہ ادھر سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اتنے صاحب جلال تھے، تو ادھر فرعون کی فرعونیت بھی تو ضرب المثل ہے۔ محکوم قوم کا ایک فرد سامنے سے آ کر یہ باتیں کر رہا ہے۔ اس پر ہاتھ ڈال لینا مشکل کیا ہوگا! میں آگے چل کر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ قومیں بھی سیاست میں بہت دور اندیش ہوتی تھیں، بہت دور تک ان کی نگاہ جاتی تھی، وہ ہلڑ نہیں مچاتے تھے۔ بہر حال فرعون اس بات کی طرف آیا ہی نہیں ہے کہ تم نے بنی اسرائیل کے متعلق وہ کیا کہا۔ کسی کے متعلق کچھ پرانے احسانات کی یاد دلاؤ اور آگے پھر بات چلے گی۔ اسی طرح سے برخوردار! پھر آگے بات بتاؤ، بات کیا ہوئی۔ یہ جو بات ہے کہ تم نے کچھ کیا اور خود ہی بھاگ گئے۔ اس سے

بھی آپ دیکھیے کہ اس کو Protection (حفاظت) دیدی کہ ہم نے تمہارے خلاف کچھ نہیں کیا تھا' تم خود ہی بھاگ گئے تھے' کوئی بات نہیں آؤ بیٹھو: جا اومنڈیا! پانی لے آ حقہ لے آ' ایہدے واسطے روٹی دا انتظام کروا اندر' کہہ دے بی بی نوں کہ روٹی کھان گے ❶۔ کیا انداز ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے کیے گئے احسانات کا جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کہی ہے' اس جرم کی طرف تم نے توجہ دلائی ہے' میں یہ سمجھ گیا ہوں' نوازشات بھی تم نے گنا دی ہیں اور یہ بھی تم نے کہہ دیا ہے کہ تم کچھ کر کے یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اگرچہ تم نے اس وقت ہاتھ نہیں ڈالا تھا لیکن **قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ** ❷ (26:20)۔ یہ آئی وہ بات۔ کہا کہ یہ ٹھیک بات ہے جو تم کہتے ہو کہ قتل کیا تھا' وہ دانستہ قتل نہیں تھا۔ اب **اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ** (26:20) کا ہمارے ہاں تو ترجمہ یہ کر دیا جاتا ہے کہ ''میں اس زمانے میں گمراہ تھا''۔ تو گمراہ بھی اگر قتل کرتا ہے تو قتل تو ہوتا ہی ہے۔ **ضآلین** کے معنی گمراہ ہی نہیں ہوتا' ناواقف ہوتا ہے' بے خبر ہوتا ہے' Confused ہوتا ہے' سہواً کام کرنے والا ہوتا ہے۔ تو کہا کہ بات یہ تھی کہ وہ دانستہ قتل نہیں ہے۔ فوراً جو اپنی Defence (دفاع) تھی' اسی وقت پیش کر دی کہ اس وقت کا میرا مکالمہ ہی' کل کو یہ عدالت میں پیش نہ کر دے کہ تم نے خود اقرار کیا تھا۔ میں نے جب کہا بھی تھا کہ تم نے ایسا کیا' تو چلو' تم خاموش رہے تھے' تو اس کے معنی ہیں کہ اعتراف کر لیا تھا۔ جناب فوراً بات ہو رہی ہے' یہ سفیر بھی کسی چھوٹی مملکت کا سفیر نہیں ہے' رب العالمین کا ایک سفیر آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ تم نے یہ بات جتائی ہے' میں سمجھ گیا ہوں لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دانستہ قتل نہیں تھا' سہواً ایک بات مجھ سے ہوئی ہے۔ میں اس لیے یہاں سے چلا گیا تھا کہ مجھے پتہ تھا کہ تم اتنی سی بات کو میرے سر پہ رکھ کر میرے خلاف قتل کا جرم عائد کر دو گے کیونکہ تمہاری قوم کا وہ فرد تھا اور میں جانتا تھا کہ یہاں کیا ہوا کرتا ہے' میں محلات کی سازشوں سے خوب واقف تھا' اس لیے میں یہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ میں نے واقعی قتل کیا ہے اور اس جرم کی پاداش سے بچنے کے لیے یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ ایک لفظ کے اندر ساری Defence (دفاع) پیش کر گئے۔ کہتا یہ ہے کہ **فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ** (26:21) میں اس لیے بھاگا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ یہاں دھاندلی ہوتی ہے۔ عدل کی بنا پہ جو سزا ملتی ہو' اس کا خوف نہیں ہوتا۔ خوف اس سزا کا ہوتا ہے جو دھاندلی کی وجہ سے ملتی ہے' اس لیے چلا گیا۔

---

❶ ارے بچے! ذرا جاؤ' ان کی ضیافت کا سامان لے آؤ۔ روٹی کا انتظام کرو' بی بی کو کہہ دو کہ مہمان کھانا کھائیں گے۔

❷ موسیٰ ؑ نے کہا کہ میں نے دانستہ اسے قتل نہیں کیا تھا۔ میں نے تو اسے محض ایک مکا مارا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ مکے سے ہی مر جائے گا (28:25)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔836)۔

وہاں گیا ہوں، یہ ایک لمبی بات ہے **فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ** (26:21) خدا نے میرے ذمے یہ پروگرام عائد کیا ہے، اس لیے میں اس کے پیغامبر کی حیثیت سے تمہاری طرف آ گیا ہوں۔ یہ ہے ساری بات۔ اب یہ بات کہ جو الزام تم نے میرے ذمے لگایا تھا تو میں نے بات کر دی، اب تم وہ جتنی باتیں کر رہے ہو کہ مجھ پہ یہ احسان کیا، مجھ پہ یہ نوازش کی، مجھ پہ یہ کرم کیا، اور پھر مجھے احسان فراموش کہا، سنیے، عزیزانِ من! خدا کا ایک پیغامبر بھیڑیں چراتا ہی کیوں نہ آیا ہو، قدرت نے، داعیہ فطرت نے، اس کی تربیت کی ہوئی ہوتی ہے، جواب سنیے!

کیا ان احسانات کے بدلے، میں اپنی پوری قوم کو تمہاری غلامی میں رہنے دوں؟

اب رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم نے بچپن میں میری پرورش کی اور محلات میں ناز و نعمت سے پالا تو سنو! **وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ** (26:22) میری ذات پہ جو تم نے کچھ احسانات کیے، اس کی قیمت یہ مانگتے ہو کہ میں اپنی پوری قوم بنی اسرائیل کو تمہاری غلامی کے حلقے میں رہنے دوں۔ یہاں **تَمُنُّهَا عَلَيَّ** آیا ہے۔ ٹھیک ہے مجھ پہ، میری ذات پہ، ہی کچھ کیا ہے، مجھ سے اس کا بدلہ مانگو، جو کچھ لینا ہے۔ مجھ پہ، ایک فرد پہ، وہ احسان! اور اس کی قیمت یہ مانگتے ہو کہ میں پوری قوم کو تمہاری غلامی کے جوئے کے اندر رہنے دوں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں تمہارا مرہونِ کرم ہوں۔

عزیزانِ من! غور فرمائیے، قوموں کے اندر جتنے غدار پیدا ہوتے ہیں ان کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ اوپر والے اس ایک فرد کے اوپر احسان کرتے ہیں اور اس کی قیمت یہ لیتے ہیں کہ وہ پوری کی پوری قوم سے، پورے کے پورے ملک سے، غداری کرتا ہے۔ یہاں اپنی ذات پہ جو احسان ہے، اس سے انکار نہیں کیا۔ کہا یہ ہے کہ اس کی قیمت جو تم مانگتے ہو، ذرا سوچو تو سہی۔ کیا کردار پیش کیا جاتا ہے ان انبیائے کرام کا!

یہ داستانیں نوعِ انسانی کے لیے قیامت تک سبق آموز حقائق ہیں

آپ دیکھتے ہیں کہ یوں یہ داستان [1] امیر حمزہ کی نہیں ہے، الف لیلیٰ [1] کی نہیں ہے۔ یہ داستانیں جو قرآنِ کریم پیش کر رہا ہے، قیامت تک کے لیے صداقتیں ہیں، ہمارے لیے ہدایت ہے، راہنمائی ہے، زندگی کے اصول ہیں کہ تم پہ اگر کسی فرد کا احسان بھی ہو،

---

[1] داستان قدیم دور کی صنف ہے۔ اردو داستان پہلے دکن میں شروع ہوئی پھر شمالی ہند میں 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد بہت سی داستانیں لکھی گئیں لیکن اس سے پہلے میر عطا حسین کی ''نوطرز مرصع'' موجود تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گل کرائسٹ نے تدریسی غرض کے لیے دعوت دی تو میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار اور گنج بخش''، حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل اور طوطا کہانی''، خلیل علی خاں اشک کی ''داستان امیر حمزہ'' جیسی داستانیں وجود میں آئیں۔ جو داستانیں نگاروں نے اپنے طور پہ لکھیں ان میں رجب علی سرور کی داستان ''فسانۂ عجائب''، مرزا حیرت کی ''الف لیلیٰ'' کے علاوہ ''طلسم ہوش ربا'' قابلِ ذکر ہیں (سید شمس الحق بخاری: تعارف زبان و تدریس اردو، رحمانیہ مرکز، حیدر آباد، 2000، ص۔ 183)۔

احسان کا بدلہ یہ نہیں ہے کہ تم اس کے ہاں قوم بیچ دو۔ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ (26:22) سے ضمناً بات آ گئی۔ وہ لفظی بھی ہے اور لغات کی بھی ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ عربی زبان کے اعتبار سے عبادت کے معنی محکومیت اور اطاعت کے ہیں۔ یہ لفظ وہیں ہے: اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ (26:22) بنی اسرائیل کو تم غلام بنائے رکھو' یہ نہیں ہے کہ وہ ان سے اپنی پوجا پرستش کراتا تھا' بلکہ یہ معنی ہوتے ہیں کہ ان کو غلام بنائے رکھا۔ لہٰذا ادھر تو آیا ہی نہیں ہے اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ایسا جواب دیا ہے کہ جسے منہ توڑ کہتے ہیں' اب اس کو کچھ سوجھی نہیں۔ کہا یہ تھا کہ میں رب العالمین کی طرف سے سفیر بن کر آیا ہوں تو فرعون نے کہا کہ اچھا' تم نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ میں رب العالمین کی طرف سے آیا ہوں۔

فرعون کا کہنا تھا کہ رزق کے یہ سارے سرچشمے میرے ہیں

اس پر فرعون نے ایک چبھتا ہوا سوال داغ دیا قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (26:23)۔ فرعون نے کہا کہ وہ کونسی مملکت ہے' کونسی حکومت ہے' جس کا تم نے نام لیا ہے' جس کی طرف سے تم آئے ہو' یہ رب العالمین' تمام اقوامِ عالم کا نشو ونما دینے والا کون ہے؟ اور اپنے اہلِ دربار سے کہا کہ تمہیں تو پتہ ہے کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (79:24) تمہارا رب تو میں ہوں۔ اب اس سے میں پوچھتا ہوں کہ اس کا اور بنی اسرائیل کا رب اگر میں نہیں ہوں تو وہ رب العالمین کون ہے' جس کی طرف سے یہ آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ رب العالمین پوچھتے ہو' تشریح چاہتے ہو' سنو: قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا (26:24) موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ رب پوری کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کا رب ہے' جو ان کے مابین ہے' اس کا رب ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس کے اندر اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (79:24) تم بھی آ جاتے ہو' تمہارا یہ ملک مصر بھی آ جاتا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ اس نے لوگوں میں پروپیگنڈے کے لیے یہ ڈھنڈورا پٹوایا تھا کہ اس کی باتوں میں نہ آنا' مصر کی یہ ساری زمین میری ملکیت ہے۔ اس کی نہریں' اس کے دریا' سارے کے سارے میری ملکیت ہیں' اس بنا پہ میں تمہارا ان داتا ہوں۔ رب کے معنی ان داتا ہوتے ہیں' میں پرورش کرنے والا ہوں' کہیں اس کی باتوں میں نہ آ جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا (26:24) یہ مصر' اس کی سرزمین' اس کی نہریں' اس کے دریا' یہ تو کچھ شے ہی نہیں ہیں۔ ساری کائنات' اس کی پستیاں بلندیاں' اس کے مابین جو کچھ ہے' رب العالمین ان سب کا رب ہے۔ کہا کہ اس کی جو یہ ربوبیت اور حاکمیت ہے اس کو تسلیم کون کرے گا؟ اس کے لیے کہا کہ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ (26:24) اگر تم اس بات پہ یقین رکھتے ہو تو پھر یہ بات ہے اور اگر تمہارا یقین نہیں ہے تو پھر ٹھیک ہے' میں کسی حکومت کا نمائندہ نہیں ہوں تو یہ ہے حقیقت۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَہٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (26:25)۔ اس پر فرعون نے اپنے درباریوں پر ایک نظر ڈالی اور ان سے کہا کہ تم سنتے ہو کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے' اس کی

باتیں گہری توجہ کی محتاج ہیں۔ انہیں دل کے کانوں سے سنو!

فرعون تو خود بھی ایک دیوتا کی پرستش کرتا تھا

یاد رکھیے! یہ فراعنہ جو اپنے آپ کو خدا کہتے ہیں' یہ نہیں ہے کہ ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ خدا نہیں بنتے تھے۔ یہ تو خود آمن رع کی پرستش کرتے تھے۔ خود یہ فراعنہ جو بادشاہ تھے' یہ بھی اس آمن رع کی پرستش کرتے تھے [1]۔ تو پرستش والا خدا ان کے ہاں بھی الگ تھا۔ یہ اپنی پرستش نہیں کراتے تھے۔ ان کے ہاں کی حکومت اپنی تھی۔ جو گردو پیش تھے ان سے یہ پوچھا کہ سنتے ہو کیا کہہ رہا ہے؟ کہ یہ نہ ملک مصر میرا ہے' نہ اس کی زمین میری ہے' نہ اس کی نہریں میری ہیں' نہ میں تمہارا پروردگار ہوں' نہ میں ان داتا ہوں۔ یہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔ سنو کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے کہ اس کا مالک کوئی اور ہی ہے اور وہ ایسا ہے کہ یہ تمہارا سارا ملک' تمہاری نہریں' زمینیں سب کا وہ رب ہے' تے اسی کچھ وی نئیں وچ [2]۔ کہتا ہے کہ **اَلَا تَسۡتَمِعُوۡنَ** (26:25) او سنتے ہو کیا کہہ رہا ہے؟ اگر اس کی مان لیں گے تو میں تو گیا ہی گیا' او! تم بھی کچھ نہیں رہو گے۔ یہ کہتا ہے تمہارا کچھ ہے ہی نہیں۔ بھڑکایا ان کو۔ یہی کچھ کرتے ہیں کہ سنتے ہو' یہ کیا کہہ رہا ہے؟

---

[1] فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ یہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فارا ع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ آمن رع دیوتا کے سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ وہ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی تھا۔ مندر کی عالیشان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور مغربی مصر کے تمام منادر کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا۔ اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے آمن کے مندر میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم سویں حصہ آبادی پر اس کی حکومت تھی۔ یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاہن (Head Priest) کی وجاحت و ثروت۔ یہی آمن قرآن کریم کا ہامان ہے اور شاہانِ مصر یعنی فراعنہ مصر انہی دیوتاؤں کے اوتار مانے جاتے تھے۔ حوالہ ڈاکٹر سٹنڈروف کی کتاب "قدیم مصریوں کا مذہب" نیز ڈاکٹر Breasted کی کتاب A History of Egypt (تاریخ مصر) قدیم مصر کی تاریخ پر مشہور تصنیف ہے۔ دیکھیے اس کا 1954 کا ایڈیشن نیز دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن' جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص ص 1568-1571۔

[2] ہماری تو اس میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔

وحی ہمیشہ انسان کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھتی ہے

اب اگر کوئی مولوی صاحب مناظر ہوتا تو وہ فرعون کی اس بات پہ آ جاتا اور کہتا کہ کیا کہتے ہو تم ان لوگوں سے؟ کیا کہتا ہے یہ تم سے؟ میں پہلے تم سے نمٹ لوں' پھر اس کی بات سنوں گا۔ جی نہیں' صاحب! اس کا تو انداز ہی اور ہوتا ہے۔ وہ اس میں نہیں الجھتا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی بات کو ان سنی کر کے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا کہ قَالَ رَبُّكُمْ (26:26) حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی جو Argument (دلیل) کی لائن تھی وہ اسی پہ آگے بڑھ رہے ہیں' اس کی ان سنی کر رہے ہیں' کہتے ہیں کہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ❶ (26:26)۔ اس کا یہی صحیح طریقہ ہوتا ہے' ورنہ اگر اس سائیڈ لائن میں الجھ جائے تو اصل مقصد نظر انداز ہو کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مناظرے کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ اس کو دوسری پٹڑی پہ ڈال دو۔ یہ لوگ تو مناظر نہیں تھے۔ انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی کہ تم نے یہ کیا کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (26:24) وہ ارض وسما کا رب ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ آیا ہوگا کہ خیر' باہر کی کائنات ہے' اس کا رب ہوا کرے' یہ کوئی بات نہیں' یہاں کہا کہ وہ رَبُّكُمْ (26:26) ہے۔ فرعون اکیلا نہیں بلکہ تم جتنے ہو' جن کی طرف اس نے تمہیں کہا ہے وہ تم سب کا رب ہے۔ تمہارا ہی نہیں بلکہ وَرَبُّ اٰبَآءِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ❷ (26:26) تمہارے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے۔ تم اپنی سلطنت و مملکت کے لیے دلیل یہ لا رہے ہو کہ سات پشتوں ❸ سے یہ حکومت تمہارے خاندان میں چلی آ رہی ہے مگر یاد

---

❶ وہ خدا صرف خارجی کائنات ہی کا رب نہیں' وہ خود تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباؤ اجداد (سابقہ فراعنہ مصر) کا رب بھی وہی تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 837)۔

❷ کہا کہ وہ خدا صرف خارجی کائنات ہی کا رب نہیں' وہ خود تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباؤ اجداد (سابقہ فراعنہ مصر) کا رب بھی وہی تھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 837)۔

❸ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ قریب (1700/1600 ق م) قیاس کرنا چاہیے۔ قریب تین ہزار سال (ق م) سے لے کر اسکندر کے زمانہ تک' فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ فراعنہ کا سب سے آخری خاندان اہل فارس کا تھا' جسے اسکندر نے (332 ق م) میں شکست دی تھی۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ (2100 ق م) میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسرِ حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی یہی خاندان مصر پر حکمران تھا لیکن بعض علمائے اثریات و مکتشفین مصریات کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی زمانے کے فرعون کا نام ریمیس ثانی (Rameses II) تھا' ڈاکٹر برسٹڈ (Breasted) کی کتاب A History of Egypt کے 1954ء ایڈیشن کے مطابق ہیکسوس (Hyksos) کا زمانہ 1788 تا 1580 ق م تک کا تھا اور ریمیس ثانی کا عہد 1392 لغایت 1325 ق م' منفتاح (Merneptah) نے 1325 سے 1315 ق م تک حکومت کی تھی۔ یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآنِ کریم بحث نہیں کرتا' اس لیے کہ اس کا کام ان حقائق کو پیش کرنا ہے جو واقعات میں مضمر ہیں' نہ کہ وقائع نگاری۔ (ماخوذ از پرویزؒ: برقِ طور' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1993' نیز پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961ء ص ص 71-1568)۔

رکھو وہ تمہارا ہی رب نہیں، تمہارے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے۔

حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق فرعون کی بدکلامی اور آپؑ کی بلند نگہی

فرعون نے پھر اہلِ دربار کی طرف دیکھا: قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (26:27) کہا کہ وہ جس نے اسے بھیجا ہے اس کا تو ہمیں پتہ نہیں ہے لیکن وہ جسے اس نے ہماری طرف یہ قاصد اور رسول بنا کر بھیجا ہے اس کے متعلق تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بالکل پاگل ہے۔ لو! کہتا ہے کہ یہ زمینیں ہماری ہیں ہی نہیں، یہ نہریں ہماری ہیں ہی نہیں، ہم رب ہی نہیں ہیں بلکہ رب کوئی اور ہے، ہمارا بھی ہمارے آباؤ اجداد کا بھی رب کوئی اور ہے۔ او پاگل! کیا انداز ہے صاحب! اب وہ یہاں تک اتر آیا کہ پاگل کہہ رہا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کوئی اور دوسرا ہوتا تو پھر اگر چپت نہیں لگا سکتا تھا، تو گلے تو اس کے پڑتا کہ ذرا تہذیب سے تو بات کرو، کیا کہہ رہے ہو تم۔ لیکن وہ اپنی اسی لائن میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ہفوات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (26:28)۔ مشارق کا رب، مغارب کا رب، اس کرۂ ارض کا رب، East (مشرق) کا رب، West (مغرب) کا رب، کائنات کا رب، تمہارا رب، تمہارے آباؤ اجداد کا رب، وہی ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (26:28)۔ حکومت کے نشے سے باہر آؤ اور عقل وفکر سے بات کرو کہ یہ زمین تمہاری پیدا کردہ ہے یا تمہارے آباؤ اجداد نے بنائی تھی یا کہیں سے تم نے خریدی تھی، تم اس کی ملکیت کیسے کہہ رہے ہو؟ یہ دریائے نیل اور یہ اس کی نہریں ہیں ذرا دیکھو تو سہی، اس کا جو سرچشمہ ہے، جو منبع ہے، وہ پانی کس کا پیدا کردہ ہے؟ تمہارا ہے یا وہاں بیٹھے ہوئے تمہارے باپ دادا کا؟ کیا واٹر ورکس انہوں نے لگا رکھا ہے؟ کون ہے رب ان تمام چیزوں کا؟ تَعْقِلُوْنَ عقل سے بات کرو۔ اپیل عقل وفکر سے کی جارہی ہے۔ وہ دھاندلی کی بات کر رہا ہے، یہ عقل کی بات کر رہے ہیں۔ کیوں عقل کہا؟ کیونکہ اس نے مجنون کہا تھا کہ یہ پاگل ہے۔ کہا: کیا اس قسم کی باتیں پاگل کیا کرتے ہیں؟ میں عقل کو اپیل کرتا ہوں، ذرا عقل سے فیصلہ کرو۔ کوئی شخص بھی زمین کے اوپر ذاتی ملکیت عقل کی رو سے ثابت ہی نہیں کر سکتا۔

کائنات کا ایک ایک ذرہ صرف خدا تعالیٰ ہی کا تخلیق کردہ ہے

عزیزانِ من! جتنی چیزیں خدا نے انسانوں کی پرورش کے لیے دی ہیں، ان پہ ذاتی ملکیت کسی شخص کی عقل کی رو سے ثابت ہی نہیں ہوسکتی۔ کہتے ہیں کہ میں نے باپ سے یہ وراثت میں لی، یہ ٹھیک ہے لیکن باپ نے کہاں سے لی؟ اگر وہ ڈاکا ڈال کر کچھ مال لے گیا اور مر کر تمہیں دے گیا تو کیا وہ مال جائز ہوگیا، وہ حلال ہوگیا؟ اس نے زمین کیسے لی تھی؟ یونہی پیچھے چلتے جاؤ، اس نے

اپنے باپ سے لی' چلتے جاؤ' بابا آدم تک پہنچو گے' اس نے کہاں سے لی تھی؟ تو قصہ ختم ہوگیا۔ میں نے فلاں سے خریدی۔ چوری کا مال جو خریدنا ہے' وہ بھی جرم ہے۔ وہ اس کے اوپر اپنی ملکیت ثابت کرے تب تو یہ خرید و فروخت جائز ہوگی' یہ خرید و فروخت جائز کیسے ہوئی؟ لے دے کر بات یہاں آجائے گی کہ صاحب! وہ قانون ہے جس کی رو سے ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ قانون تم نے تمہارے جیسے جوڈاکو ہیں' انہوں نے بنالیا۔ **تعقلون** : میں بات عقل سے تم سے پوچھتا ہوں' بتاؤ عقل کی رو سے' جواب کیا ہے؟ اب فرعون سے نہ رہا گیا۔ اس نے طیش میں آ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنی زبان بند کرو اور کان کھول کر سن لو کہ **قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِىْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ** (26:29) اگر تم نے میری مملکت میں رہتے ہوئے میرے سوا کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کر لیا' خواہ وہ تمہارا خدا ہی کیوں نہ ہو تو یہ کھلی ہوئی بغاوت ہوگی' جس کی پاداش میں تمہیں جیل خانے بھجوا دوں گا۔ لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ اپنے آپ کو حاکم منوانے کا تھا

اب فرعون دیکھ رہا تھا کہ وہ خود Cabinet (کابینہ) کے منسٹر' امراء' وزراء' اہلِ دربار کے سامنے پھیکا پڑ رہا تھا' مبہوت ہو رہا تھا' سوجھتی نہیں تھی' دلیل نہیں دے سکتا تھا' تو اس نے سوچا کہ اگر یہ سلسلہ اس طرح سے جاری رہا تو وہ تو یہیں مارا جائے گا! طیش میں آ کر کہا کہ موسیٰ علیہ السلام! لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں دیکھیے یہ ''الٰہا'' (26:29) کا لفظ آیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو معبود نہیں منوا رہا تھا یعنی یہ کہ اگر میری پرستش نہیں کرو گے تو میں یہ کرونگا' اس کا تو یہ دعویٰ ہی نہیں تھا' وہ اپنی پرستش ہی نہیں کراتا تھا۔ یہ الٰہ کیا ہے؟ یہ حاکم ہے' صاحبِ اقتدار ہے۔ کہا کہ اگر تم مجھے نہیں' کسی اور کو صاحبِ اقتدار مانو گے تو **لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ** (26:29) تو میں کیا کرونگا؟ وہی جو مستبد کیا کرتا ہے یعنی جیل خانے بھیج دوں گا۔ کیا دلیل ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو **اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** (26:28) کہہ رہے ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ جیل خانے بھیج دوں گا۔ **قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَىْءٍ مُّبِيْنٍ** (26:30) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں پاگل ہوں تو بتاؤ اس قسم کی باتیں پاگل کیا کرتے ہیں؟ میں عقل کو اپیل کرتا ہوں' ذرا عقل سے فیصلہ کرو۔ کوئی شخص بھی زمین کے اوپر ذاتی ملکیت عقل کی رو سے ثابت ہی نہیں کر سکتا۔ کہا کہ اگر میں اپنے دعوے کی تائید میں کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤں تو کیا تم پھر بھی مجھے قید کر دو گے؟ کیا تم معاملہ کو دلائل و براہین کی رو سے طے کرنے کے بجائے' دھاندلی سے کام لینا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاں استبدادِ فرعون کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں ہے؟ دلائل اور براہین کی رو سے میری باتیں ہیں جو میں تمہارے سامنے کہہ رہا ہوں' اگر میں وہ چیزیں پیش کروں' جو بڑی واضح ہوں تو پھر بھی یہی

ہوگا کہ تم مجھے جیل بھیج دو گے' بات نہیں کچھ کرو گے' کوئی دلیل نہیں دو گے' جیل خانے بھیج دو گے؟

اب یہ کہا تھا کہ اگر میں ایسی بات کہوں جو بالکل ہی واضح ہو' تو اس جواب سے فرعون کچھ جھینپا۔ اس نے کہا کہ ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے **قَالَ فَأْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ** ❶ (26:31)۔ آگے دو آیات ہیں' عزیزانِ من! جن میں وہ دو چیزیں آتی ہیں جو عام طور پہ ذہنی الجھاؤ کا باعث بنتی ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہیں معجزات کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ چاند کی طرح چمک رہا تھا (26:33) اور اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن گیا (26:32)۔ یہ ہے اگلی آیات کا عام ترجمہ' جو کیا جاتا ہے۔ اس (26:31) کے بعد ہی وہ دو آیات آ رہی ہیں اور تفصیل کے ساتھ ہیں۔ میں ان دونوں آیات کو درمیان میں چھوڑتا ہوں کیونکہ ذرا آگے چل کر ان کی تفصیل آ رہی ہے ❷۔ جب وہ آئے گی تو اس وقت یہ زیادہ اچھی طرح سے سمجھ میں آ سکیں گی کہ یہ بات کیا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ ہر رسول' جس مقام پر' اس کے پاس کوئی دلیل نہیں رہتی' تو وہ وہاں معجزہ دکھا دیتا ہے۔ معجزہ کے معنی ہیں: جس سے عقل عاجز آ جائے' بات سمجھ میں نہ آئے کہ کیسے ہو گیا۔

ہمارے ہاں کے تراجم کا معیار اور عقل کے برعکس معجزوں کا تصور

میں یہاں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں' عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں جو بات کہتا ہوں وہ تمہیں اس وقت سمجھ میں آئے گی جب تم **اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** (26:28) عقل وفکر سے کام لو۔ میں نے جو دلیل دی ہے' وہ ابھی تمہاری عقل میں نہیں آئی۔ میں مبین یعنی اس سے بھی واضح تر کوئی اور بات تمہیں کہوں گا۔ اب اگر اس کے معنی معجزے کے لیے جائیں کہ جس میں عقل ماؤف ہو جاتی ہے تو یہاں انہوں نے کہا کہ تم عقل سے کام لو تو تم بات سمجھ جاؤ گے۔ معجزے میں عقل وفکر سب ختم ہو جاتے ہیں' اس طرح ان معانی میں تضاد آ جاتا ہے۔ قرآن ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا کا رسول وہاں بیٹھا ہوا' مناظرہ ہو رہا ہو اور مولوی صاحب نے مناظر کی طرح جو جی میں آیا کہہ دیا۔ ان کے ہاں تو ہمالیہ پہاڑ کی طرح ایک ایک لفظ ہوتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ **اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** (26:28)۔ جو بات اب آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ کریں گے وہ عقل کو اپیل کرنے والی ہوگی۔ دعویٰ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اسے سمجھنے کے لیے ذرا عقل سے' فکر سے' کام لو۔ یہ جو میں نے کہا ہے' یہ

---

❶ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو لاؤ' میں بھی دیکھوں' وہ کونسی نئی بات ہے جسے تم پیش کرنا چاہتے ہو؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 837)۔

❷ آیات (26:32-33) کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا پانچواں باب' مئی 1978ء کی 19 تاریخ کا درس' ص ص۔ 113 تا 138۔

بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب اگر میں اپنے دعوے کی تائید میں کوئی کھلی ہوئی یعنی مبین دلیل لے آؤں' اس سے واضح تر بات اور دلیل لے آؤں تو کیا تم پھر بھی مجھے قید کر دو گے؟ کیا تم معاملہ کو دلائل و براہین کی رو سے طے کرنے کے بجائے دھاندلی سے کام لینا چاہتے ہو؟ کیا تمہارے ہاں استبدادِ فرعونی کے علاوہ اور کوئی قانون نہیں (26:30)؟ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (26:28) اگر تم ذرا بھی عقل وفکر سے کام لو تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اگر اس کے بعد وہ یہ کچھ کہے کہ اچھا اگر یہ بات ہے تو لو وہ میں نے اپنی لٹھ پھینکی اور وہ سانپ بن گیا تو عزیزانِ من! بتاؤ یہ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (26:28) بات تو ختم ہوگئی۔ بات یہ نہیں ہے۔ یہ آگے جو باتیں آئیں گی' وہ عقل کی اس سطح سے بھی اونچی سطح کی جو عقل ہے' وہ اس کو اپیل کرنے والی باتیں آئیں گی' عقل کو ماؤف کرنے والی باتیں نہیں آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جن معنوں میں ہمارے ہاں یہ کچھ مانا جاتا ہے کہ انبیائے کرام ایسے مقام پہ معجزہ دکھا دیتے تھے' وہ صحیح نہیں ہے۔

عقل وفکر کو بالاتر رکھ کر کسی بات کو منوانا وحی کی شان کے شایان ہی نہیں

معاف رکھیے' عزیزانِ من! ہر رسول عقل کو اپیل کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ کیا جب وہ اس مقام پہ آ جاتا تھا تو وہاں پھر ایسی بات کرتا تھا کہ جس سے عقل وفکر ہی ماؤف ہو جائے؟ خدا کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے ہر رسول سے ایسے مقام پر ایسی بات کہلوائے جو عقل وفکر کو ماؤف کر دے۔ یہ یاد رہے کہ ہم اس سے انکار نہیں کر رہے ہیں کہ خدا یہ نہیں کر سکتا۔ وہ خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے تو یہ کونسا مشکل ہے کہ وہ ایک عصا کو سانپ بنا دے لیکن جن کے ہاتھوں سے تم یہ کچھ ہو جانا کہتے ہو' ان کی دعوت تو عقل وفکر کی طرف ہے۔ وہ یہاں کہہ رہا ہے کہ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (26:28) اگر تم ذرا بھی عقل وفکر سے کام لو تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس سے اگلی ہی آیت کے اندر تو ایسی بات نہیں آئے گی کہ ان کی عقل وفکر ہی ماؤف ہو جائے۔ آج جن کے سامنے یہ آیات آتی ہیں' تو ان معجزے والوں سے کہیے کہ صاحب! یہ کیسے ہو گیا تھا؟ کہنے لگے کہ جی معجزے سے ہو گیا تھا' یہ عقل وفکر میں آنے کی بات تھوڑی ہے' معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جسے سمجھنے سے عقل عاجز آ جائے یعنی آج دو چار ہزار سال کے بعد بھی' جو علم اور عقل اتنی آگے بڑھ گئی ہے' ہم بھی یہی جواب دیتے ہیں کہ یہ بات عقل میں آنے والی نہیں ہے' تو وہ فرعون کیا کہتا ہوگا کہ تم نے تو مجھے ابھی کہا تھا کہ میں عقل کی رو سے بات کروں گا' اور یہ جو کر رہے ہو تو اس میں عقل آتی کہاں ہے!!

پرویزؒ کی عمر کا آدھا حصہ کیسے گزرا؟

عزیزانِ من! سب سے بڑی چیز یہ مقام ہے جس پہ میں ایک مدت تک رکا رہا۔ عمر کا پہلا آدھا حصہ تو میں بھی یہ سب کچھ مانتا

تھا۔ ہمارے ہاں جس طرح سے یہ باتیں چلی آ رہی تھیں وہی دلیلیں ہم دیتے چلے جا رہے تھے۔ جس مقام پہ رکا' وہ یہ تھا کہ یہ ایک رسول کی طرف سے' آخری چیز ہے' ان کے بقول معجزہ دکھا دینا ہے۔ مناظرہ ہوتا ہے' مباحثہ ہوتا ہے' دلائل آتے ہیں' ٹکراؤ ہوتا ہے' جنگیں بھی ہوتی ہیں۔ اور یہاں بقول ان کے اس کے بعد رسول اپنے دعوے کی صداقت کے ثبوت میں ایک معجزہ دکھاتا ہے تو گویا خدا کی طرف سے یہ آخری چیز ہے جو اس نے کہی ہے اور سارے قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ کوئی قوم بھی معجزہ دیکھ کر ایمان لے آئی ہو۔ آخری تدبیر خدا کی' وہ بھی اس نے کر دیکھی۔ کاہے کے لیے معجزہ دکھایا تھا؟ کہ یہ لوگ نبوت کے دعوے کو تسلیم کر لیں اور اس پہ بھی انہوں نے تسلیم نہیں کیا (معاذ اللہ معاذ للہ)۔ عزیزانِ من! یہ تھا وہ مقام جہاں میں کانپ اٹھا کہ کیا کہوں اس چیز کو! میں نہیں کہتا (معاذ اللہ)' یہ الفاظ کہنا میری جرأت نہیں ہے لیکن جو کوئی منہ پھٹ ہے' اس نے تو جوش میں کہہ دیا ہے کہ ''خدا کی ضربِ آخر بھی الٹ کر رہ گئی''۔ بہرحال میں دوش نہیں دیتا جو اس کو اس معنی میں نہیں لے گا وہ اسی نتیجے پہ پہنچے گا کہ معجزے نے بھی کیا کر دیا۔

اس غیر قرآنی تصور کا نتیجہ

انہوں نے جب یہ کہا کہ بدر کے میدان [1] میں جب رسول اللہ ﷺ کی فوج کو شکست ہونے لگی تو آپ ﷺ نے مٹھی بھر کنکر اٹھائی اور یوں مارا اور سارے قریش اندھے ہو گئے۔ ارے' قریش کو تو اسی وقت ایمان لے آنا چاہیے تھا' مگر وہ نہیں لائے۔ اس زمانے کی توہم پرست قومیں تھیں ان کی تو معجزے کی کیفیت یہ تھی کہ خود ہمارے ہاں کی یہ کتبِ احادیث بتاتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کا ایک صاحبزادہ ابراہیم [2]' چھوٹی عمر میں انتقال کر گیا' تو سورج کو گہن لگ گیا' یہ سارے قریش بھاگے بھاگے حضور ﷺ کے پاس آ گئے کہ ہم ایمان لاتے ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو' آپ ﷺ نے کہا کہ میرے لیے اس سے زیادہ اور بڑی خوشی کی خبر کیا ہو گی کہ تم خدا کی صداقتوں کو تسلیم کر لو لیکن بات میں صرف اتنی سی پوچھنا چاہتا ہوں کہ کل رات تک تو تم صرف یہی نہیں کہ انکار کرتے تھے' تم نے مخالفتوں میں انتہا کر دی تھی' یہ شاباش کیا تبدیلی آئی جو تم سب کے سب آ گئے ہو۔ انہوں نے کہا: جی' آپ ﷺ کی صداقت کا اس سے زیادہ بیّن ثبوت کیا ہو گا کہ آپ ﷺ کے بیٹے کی وفات ہوئی ہے تو آسمان کے کرّوں نے اس کے ماتم میں سیاہ لباس پہن لیا ہے۔ اس لیے ہم تو آ گئے ہیں کہ صاحب! واقعی آپ خدا کے رسول ہیں۔ معجزے سے منوانے والی بات جو تھی' اس سے بڑی اور کیا ہو سکتی تھی۔ نہ بھی تھا (معاذ اللہ) تو بھی یونہی آدمی Exploit (استحصال) کر لیتا ہے کہ ٹھیک ہے' خود آئے ہیں' میں کیوں نہ کروں' مگر انہوں نے یہ نہیں کیا۔

---

[1] یہ اشارہ جنگِ بدر (سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء) کی طرف ہے۔

[2] تاریخ بتاتی ہے کہ آپؐ کے تین بیٹے' حضرت قاسمؓ' حضرت ابراہیم اور حضرت طاہر تھے جن کا انتقال اوائلِ عمر میں ہی ہو گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کے بیٹے کی وفات کا سورج کے گرہن سے کوئی تعلق نہیں ہے

آپ ﷺ تو خدا کے رسول تھے وہ تو غلط Impression (تاثر) دے کر بھی اپنی بات نہیں منوانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھیے صاحب! چاند اور سورج کو گرہن خدا کے طبیعاتی قوانین کے تابع لگتا ہے' اس کا ثابت ہونا کسی انسان کی موت اور حیات سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے میرے بیٹے کی موت اور سورج کے گرہن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر تم اس بنا پر ایمان لائے ہو تو اس ایمان سے تمہارا کفر اچھا ہے کہ یہ تو کل ہی ٹوٹ جائے گا۔ ایمان یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ عقل وفکر کی بنا پہ جو میں کہتا ہوں تم اس کو صحیح سمجھتے ہو کہ نہیں؟ میں اس طرح سے تمہارا ایمان قبول نہیں کرتا۔ وہ تو یہ لوگ تھے۔ ایک طرف یہ بھی محراب ومنبر میں ہمارے سامنے فخر سے بیان کیا جاتا ہے' اسی سانس میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب! بدر کے میدان میں آپؐ نے وہ کنکریاں ماریں' وہ سارے اندھے ہوگئے' خود تو ان کی یہ کیفیت ہے کہ ایمان کے لیے آئے اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا' معجزہ دیکھ لیا کہ سارے اندھے ہوگئے اور ایک بھی ان میں سے ایمان نہ لایا' مخالفت میں چلے گئے' دوسرے سال❶ پھر لشکر لے کر آ گئے تو یہ آخری تدبیر بقول ان کے کارگر تو نہیں ہوئی' کاہے کے لیے دکھایا یہ معجزہ؟

وحی عقلِ انسانی کو جلا بخشتی ہے' اُسے پامال نہیں کرتی

عزیزانِ من! یہ دین عقل کو جلا دینے کے لیے انسانی فکر کو بلند کرنے کے لیے' اپنے دعوے کی صداقتوں کو دلائل و براہین کی بنا پہ منوانے کے لیے آیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابھی کچھ ہی دروس پہلے سورۃ الفرقان❷ کی آخری آیات میں مومن کی Definition (تعریف) آپ نے دیکھی تھی کہ **وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا** (25:73) مومن تو وہ ہیں کہ اور تو اور اگر خدا کی آیات بھی ان کے سامنے پیش کی جائیں تو انہیں بھی وہ اندھا اور بہرا بن کر قبول نہیں کرتے۔ اگر آپ معجزہ دکھا کر منواتے ہیں وہ تو آپ نے خود اندھا بہرا تو بنا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ مومن ہی نہیں ہیں جو اس طرح سے اندھا بہرا بن کر ایمان لائیں۔ میں نے یہ اس لیے عرض کیا تھا کہ یہ جو دو آیات درمیان میں آئی ہیں' آگے چل کر تفصیل آئے گی' تو میں اس وقت یہ عرض کروں گا کہ یہ جو ہمارے ہاں اس قدر مسلسل' متواتر' متفق علیہ چلا آ رہا ہے یہ سارا کچھ اس کے لیے آ جاتا ہے تو یہ پھر بات کیا تھی؟ یہ ید بیضا کیا تھا؟ یہ عصائے موسوی کیا تھا؟ آج میں نے کہا ہے' چونکہ

---

❶ یعنی 14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625 کو ہونے والی جنگِ احد میں

❷ اس کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ الفرقان' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007ء ص ص۔ 365 تا 379۔

بات یہ ہے' ذہن میں رکھیے کہ یہ بات وہی ہوگی جو عقل وفکر کو اپیل کرے گی۔ دو آیات درمیان میں چھوڑ کر 34ویں آیت لے رہا ہوں۔ وہ آیت ''سحر'' کے متعلق ہے۔

لفظ سحر کا قرآنی مفہوم جادو نہیں

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗ (26:34) اس کے بعد پھر فرعون نے اپنے ہاں اہلِ دربار سے کہا کہ **اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ** (26:34)۔ بس یہاں لفظ ساحر آیا اور انہوں نے کہا کہ یہ دیکھیے' انہوں نے کہا تھا کہ جادوگر ہے۔ اک نوری جادو ہوندا اے' اک کالا ہوندا اے۔ کیندے نین: ساحر علیم کیا اے نا۔ اے نوری جادو اے[1]۔ ساحر کا لفظ آ گیا اور انہوں نے کہہ دیا: جادو۔ نہ کوئی عربی محاورے سے پوچھتا ہے' نہ قرآن سے پوچھتا ہے کہ وہ یہ بات کس کو کہتے تھے۔ سحر کا ترجمہ جادو کیا' اس کے بعد ساحر کے معنی جادوگر کر دیا۔ اب انہوں نے کہا کہ اس قسم کی چیزیں دکھائی ہوں گی جو انہوں نے کہا ہے کہ جادوگر ہے۔ ان کی زبان میں' عبرانی کے اندر' ان کے ماحول میں' اس دور کے اندر' یہ جتنے بڑے بڑے پروہت ہوتے تھے' یہ جتنے بڑے بڑے مذہب کے پیشوا ہوتے تھے' وہ جو کچھ لوگوں کے ساتھ کرتے تھے' جو ان کی وہ فریب کارانہ حرکتیں تھیں' یہ ان کو ساحر کہتے تھے۔ یہ Magi تو ابھی تک ایران کے اندر ہیں۔ یہ مجوس ہیں' یہ وہی لفظ ہے' جہاں سے Magic آیا ہے۔ یہ ایران کے اندر زرتشت کے ہاں' یہ بڑی چیز تھی' اسی لیے وہ مجوس کو Magi کہتے ہیں۔ Magi سے Magic ہے جس کا ترجمہ جادو کیا ہوا ہے۔ وہ آگے بات آئے گی تو میں سحر کے متعلق بتاؤں گا کہ قرآن نے اسے کیسے استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے پروہت ہیں' ان کے ہاں کے یہ مذہبی پیشوائیت کے بلند مقام کے اوپر جو لوگ ہیں' یہ جو پنڈت ہیں' ان کے ہاں کے کلیسا کے یہ پادری ہیں' آپ کے ہاں یہ متولی ہیں' یہ تمام کے تمام وہ ہیں جنہیں پیری وملائی وسلطانی' کہتا ہے۔ یہ سارے کے سارے وہ ہیں' جو اس قسم کی شعبدہ بازی کی کچھ چیزیں لوگوں کو دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ سارا فریب تھا۔ سحر کے معنی ''فریب'' ہیں' یہ فریب کار کے معنوں میں آتا ہے' فریب کار ہے۔ یہاں فرعون نے اپنے اہل دربار' سرداران قوم سے کہا کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص (حضرت موسیٰ علیہ السلام) علیم ہے ان چیزوں کو خوب جانتا ہے۔ یہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں سے خوب واقف ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ چاہتا کیا ہے؟

دراصل فرعون کو اپنی شخصی حکومت کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا

کہا کہ **يُرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ** (26:35)۔ چاہتا یہ ہے کہ اپنی چال بازیوں سے تمہیں اس

---

[1] ایک نوری جادو ہوتا ہے اور ایک کالا جادو۔ کہتے ہیں کہ یہاں ساحر علیم کہا ہے۔ یہ نوری جادو ہے۔

ملک سے نکال دے اور خود حاکم بن بیٹھے۔ بات تو یہ تھی' معجزے کی بات نہیں تھی' نہ وہاں وہ اس قسم کی کوئی گفتگو تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ شخص کہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ ان سے پوچھ رہا ہے کہ **فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ** (26:35)۔ سو بتاؤ تمہارا اس بات میں کیا مشورہ ہے؟ اب یہاں سے یہ نظر آیا کہ اگرچہ وہاں بھی ملوکیت تھی' ایک شخصی حکومت ہوتی تھی' لیکن وہ بھی مشورے سے کچھ کیا کرتا تھا کہ مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔ بات بڑی خطرناک نظر آتی ہے۔ اس کے دلائل کا جواب میرے پاس کوئی نہیں ہے اور جو اس کے قرائن ہیں' اس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ بہت دور تک پہنچا ہوا ہے' علیم ہے' بڑا فریب کار ہے لیکن اس شخص کی بڑی نگاہ ہے' دور تک گئی ہوئی ہے' مجھے نظر آتا ہے کہ یہ تمہیں نکال پھینکے گا اور یہ مملکت اور حکومت کے اوپر قبضہ کرے گا' بتایئے' مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں؟ اور پھر ان کا مشورہ اور اس کے بعد اس کا جو فیصلہ ہے' اسے ہم آئندہ لیں گے۔

درمیان کی دو آیات 32 اور 33 چھوڑ کر ہم سورۃ الشعراء کی آیت 35 تک آ گئے۔ اگلے جمعہ کو جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یوم اقبالؒ کے سلسلہ میں درسِ خصوصی ہے۔ اب اگلا درسِ قرآن مئی 1978ء کی 5 تاریخ کو ہوگا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

تیسرا باب: **سورة الشعرآء** (آیات 36 تا 43 اور[1] 46 تا 49)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1978ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 36 سے ہو رہا ہے: (26:36)۔

---

[1] آیات (26:32-33) اور (26:44-45) کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا پانچواں باب، ص ص۔ 113 تا 138۔

داستانِ بنی اسرائیل فرعون' ہامان اور قارون کی چابک دستیوں ہی کی ترجمان ہے

سابقہ جمعہ کو درس کا ناغہ رہا اور اس گزشتہ سے پیوستہ یومِ اقبالؒ کے سلسلہ میں جمعہ کو خصوصی درس[1] تھا' موضوع بھی خصوصی تھا۔ جو آج مسلسل درس ہے وہ دو نشستوں کے بعد شروع ہو رہا ہے۔ اس لیے تجدید یادداشت کے لیے یہ عرض کر دوں کہ سلسلۂ کلام صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی آویزش سے متعلق تھا۔ صرف فرعون ہی نہیں' قرآن نے خود بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون' ہامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا تو جیسا کہ اب آپ کو یاد ہوگا' میں ہمیشہ یہ کہا کرتا ہوں کہ انسانیت کو کچلنے کے لیے تین ہی شکنجے ہیں' تین ہی لعنتیں ہیں: ملوکیت یعنی انسانوں کی انسانوں پر حکومت' برہمنیت جسے مذہبی پیشوائیت کہتے ہیں یعنی انسانوں کی حکومت کو خدائی اختیارات کا حامل قرار دے کر اس بادشاہ کو خدا کا سایہ یا اس کا نائب بنا دینا گویا فرعون اور ہامان دونوں کا یہ گٹھ جوڑ ہوتا ہے اس لیے دونوں کو قرآن نے ساتھ کے ساتھ بیان کیا' تیسرا قارون ہے' جو نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ ہے۔ ان سب کا' اس پورے نظام کا' مقصد یہ ہوتا ہے کہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے' انسانوں کو بھوکا مارا جائے' ان کی بھوک کو Exploit (استحصال) کیا جائے اور اس سے اس نظام کو قائم رکھا جائے۔ قرآنِ کریم نے مختلف حضراتِ انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ میں ان تین محاذوں میں سے کہیں ان میں سے کسی ایک کا ذکر کیا ہے' کہیں دو کا کیا ہے۔ یہ جو فرعون اور صاحبِ ضربِ کلیم کی کشمکش ہے اس میں اس نے ان تینوں کو یکجا کیا ہے۔ اس نسبت سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کشمکش اور یہ محاذ آرائی کتنی زیادہ سنگین' کتنی زیادہ اہم ہوگی اور یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اس قدر تفصیل سے اس داستان کو بیان کیا گیا ہے کہ کسی اور نبی کی داستان یا محاذ آرائی کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ اُس دور کی ہی بات نہیں ہے' جب تک نوعِ انسانی زندہ ہے' یہ کشمکش اس کے ساتھ جاری رہے گی۔ ابلیس نے قیامت تک کے لیے مہلت مانگ رکھی ہے اور یہ ابلیس ہی کے مختلف پیکر ہیں' جو رنگ بدل کر آتے رہتے ہیں۔ اس لیے قرآن نے اتنی تفصیل سے یہ بات کی ہے۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا کہ جاؤ' یہ نظامِ فرعونی' برہمنیت اور قارونیت حدود فراموش ہو رہا ہے' جاؤ اور اس کو روکو۔ قومِ بنی اسرائیل فرعون کی مملکت میں ایک محکوم قوم کی حیثیت سے رہتی تھی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نسلی اعتبار سے اسی قوم سے متعلق تھے۔ یہ وہاں گئے' فرعون سے جا کر کہا کہ یا تو اس نظام کو بدلو اور اگر یہ نہیں ہے تو کم از کم یہ محکوم قوم جس کے سینے پہ تم کابوس بن کر سوار ہو' میرے ساتھ جانے کی اجازت دیدو' میں اسے لے جاؤں اور خدا کی آزاد فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دوں' سینا

---

[1] اس درسِ خصوصی کا نام تھا: اسے کشتۂ سلطانی و ملاّئی و پیری! یہ بصورت پمفلٹ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' سے دستیاب ہے۔

کی وادیوں میں، میں اسے لے جاتا ہوں، تمہارا کچھ نہیں بگڑتا لیکن سوچیے تو سہی کہ حاکم قوم سے اگر محکوم قوم کو الگ کر دیا جائے تو اس کا باقی رہتا کیا ہے، وہ حکومت کس پر کرے گا۔ وہ تو ملوکیت کا دور تھا۔ اس زمانے میں ملوکیت کا وہ نیا پردہ، جسے آپ مغرب کا نظام جمہوریت کہتے ہیں، اس میں سے اگر 49 ووٹس والی جو Minority (اقلیت) ہوتی ہے، اسے الگ کر لیا جائے، تو پھر 51 والی اکثریت (Majority) کس پہ حکومت کر سکتی ہے۔ وہ تو لذت ہی اس میں ہوتی ہے کہ یہ اقلیت ایک بات کہے، وہ اکثریت اس کی مخالفت کرے۔ اس میں Expression (اظہار) کی آزادی ہے جتنا جی چاہے وہ اقلیت تقریریں کرے اور اس تقریریں کرنے پر مواخذہ بھی کوئی نہیں ہوتا، یہ سب کچھ کرے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہ خندہ زیر لب ان کو سنتے رہتے ہیں، مسکراتے رہتے ہیں اور اس کے بعد جب کہتے ہیں کہ ہاں جی! ہاتھ کھڑے کیجیے، ہمیں پتہ ہے کہ 51 تو ادھر آنے ہیں تو اس اقلیت کا آزادیٔ اظہارِ بیان نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ یہ جو آخری شکست دینے کی لذت ہے، یہ ہے ملوکیت۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ وہ کس طرح آمادہ ہو جاتا کہ اسے جانے دیتا!

پروہتوں کی فریب کاری کا دوسرا نام سحر ہے

قرآن بتاتا ہے کہ **قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ** (26:34) فرعون نے اپنی کابینہ کے منسٹروں سے، درباریوں سے جو گرد و پیش بھی بیٹھے ہیں، کہا۔ قرآن نے ''حَوْلَهٗ'' کہا ہے۔ اس نے ان سے کہا کہ اسے یہ کچھ یونہی، کوئی بھولا سا مذہبی سا انسان، ہی نہ سمجھ لیجیے، یہ شخص (حضرت موسیٰ علیہ السلام) بہت بڑا فریب کار ہے، علیم ہے اور اس کے ساتھ بڑی معلومات رکھتا ہے، اس کا بہت گہرا علم بھی ہے اور فریب کار بھی ہے، انسانیت کے نام پہ، خدا کے نام پہ آ کر باتیں کر رہا ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہے کہ **يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ** [1] (26:35)۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ''سحر'' کا لفظ ہمارے ہاں عام طور پر جادو کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور آپ جتنے بھی تراجمِ قرآن کریم دیکھیں گے ان میں اس کا ترجمہ بھی جادو ہی لکھا ہوتا ہے اور ساحر جادوگر ہوتا ہے۔ اس آیت یعنی (26:35) میں کہا کہ یہ جادوگر آ گیا ہے، اپنے جادو کے زور سے یہ کچھ کر دے گا یعنی اپنی حکومت قائم کرے گا اور تمہیں اپنے ملک سے نکال باہر کرے گا۔ اسے یاد رکھیے کہ یہ نہ جادوگری ہے، نہ جادو کا زور ہے۔ عرب سحر کا لفظ ان فریب کاریوں کے لیے استعمال کرتے تھے جو مندروں کے پروہت کیا کرتے تھے۔ چونکہ وہ فریب کاریاں اتنے لطیف پردوں میں ہوتی تھیں کہ محسوس طور پر، مرئی طور پر، نظر نہیں آتی تھیں، اس لیے وہ اس کو سحر کہہ کر پکارتے تھے۔ اس انداز کی فریب کاری جو Detect (شناخت) نہ کی جا سکے، سحر کہلاتی تھی۔ جادو بھی وہ ہوتا ہے جس کا اثر تو

---

[1] اس کا ارادہ یہ نظر آتا ہے کہ یہ اپنی فریب کاریوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر، یہاں اپنی حکومت قائم کرے اور تمہیں اس ملک سے نکال باہر کرے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 838)۔

بتاتے ہیں کہ ہوگیا لیکن یہ کیسے ہوگیا' یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بہت بعد کی چیز ہے۔ عربی زبان میں بنیادی طور پر سحر کے معنی اس قسم کی فریب کاری ہے جو جلدی سے Detect (شناخت) نہ کی جا سکے[1]' اور یہ لفظ مندر کے جو پجاری تھے' جسے آپ مذہبی پیشوا کہتے ہیں' ان کے لیے بولا جاتا تھا۔ یہ جو Magi ہیں' جو ایران والے مجوسی ہیں' وہیں سے تو یہ Magic کا لفظ آیا ہے یعنی یہ بنیاد ہی Magi سے ہے۔

فرعون نے کہا کہ یہ بھی بات تو مذہب کے ریفرنس (حوالے) سے کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے بھی کسی مندر کا پجاری کہا جائے تو ٹھیک ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ساحر ہے لیکن بڑا علیم ہے' معلومات بڑی گہری ہیں' علم بھی رکھتا ہے اور پھر یہ پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ چاہتا کیا ہے؟ کہا کہ **یُرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِہٖ** (26:35) چاہتا یہ ہے کہ اس قسم کی فریب کاریوں سے' لفظی طور پہ تو یہ کہیں گے' تمہیں تمہاری مملکت سے نکال باہر کرے۔ یہ صرف مملکت سے ہی نکال باہر کرنے والی بات نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اقتدار تمہارے ہاتھ سے چھین لے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ پوری قوم کی قوم کو اس مملکت سے نکال کر کہیں سمندر میں پھینک دے اور خود وہاں زمین پہ مسلط ہوجائے۔ یہ تختہ الٹ دینا' سلطنت چھین لینا ہے۔ اس میں وہ قوم تو وہیں رہتی ہے' اس قوم کا اقتدار چھین لیا جاتا ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر فرعون کی زبان میں اور الفاظ میں بیان کیا ہے اور وہ بڑے اہم الفاظ ہیں۔ یاد رکھیے **یُّخْرِجَکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ** (26:35) کی تشریح ہو رہی ہے۔ اقتدار چھین لے گا تم سے' مملکت چھین لے گا تم سے' یہ تمہیں نکال باہر کرے گا۔ مسندِ اقتدار سے تم لوگوں کو الگ کر دے گا' اگر ترجمہ ہی کرنا ہے تو یہ یوں کیجیے۔

نظامِ زندگی کے لیے اقدارِ خداوندی کو عملی طور پر نافذ کرنے کا نام دین ہے

قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کہا ہے اور وہاں ایک بڑی اہم بات سامنے آتی ہے' عزیزانِ من! اور وہ ہے کہ دین کسے کہتے ہیں۔ اب تو ہمارے ہاں جیسا آپ کو پتہ ہے' دین کا ترجمہ ہی مذہب ہوتا ہے' حالانکہ یہ دو بالکل ایک دوسرے کے متضاد و متخاصم اصطلاحات ہیں' مترادف نہیں' ایک کا مفہوم دوسرا نہیں ادا کرتا' دین اور مذہب بالکل ایک دوسرے کی ضد[2] ہیں۔ **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ o اِلٰی فِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ وَقَارُوْنَ** (40:23-24)۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ قرآن نے وہ

---

[1] صاحبِ تاج العروس نے لکھا ہے کہ ''سحر'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو یعنی ایسا دھوکا جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکا کس طرح دیا گیا ہے۔ پھر بقول ابن قتیبہ (القرطین جلد اول' ص 257)' یہ لفظ عام دھوکے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

[2] مذہب اور دین کے ان نکات کی مزید وضاحت اور فرق کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1996)۔ بہارِ نو' لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ص ص۔ 222-218)۔

تینوں گنائے ہوئے ہیں تو یہ تین افراد نہیں ہیں جن کی طرف حضرت موسیٰؑ کو بھیجا ہے بلکہ وہ تین مختلف نظام ہیں: نظامِ سیاست‘ مذہبیت کا نظام اور نظامِ معیشت۔ فرعون کہتا کیا ہے؟ یہاں (26:35) میں تو یہ تھا کہ یہ تمہیں تمہارے اقتدار سے نکال باہر کرے گا‘ سورہ المؤمن (40) کی 26ویں آیت میں الفاظ دیکھیے گا اگر ریفرنس آپ کے سامنے ہے۔ یہ کہا ہے کہ **اِنِّیٓ اَخَافُ** (40:26) مجھے ڈر یہ ہے۔ سنیے! کیا ڈر ہے؟ اور وہ جو (26:35) میں ہے کہ یہ تمہیں اس ارض سے‘ اس مملکت سے‘ اس اقتدار سے‘ الگ کر دے گا تو یہاں قرآن اس کی تشریح وتفسیر کر رہا ہے کہ **اِنِّیٓ اَخَافُ** (40:26) میں ڈرتا ہوں کہ **اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ** (40:26) یہ تمہارا نظام بدل دے گا۔ دین کے معنی ہی نظام کے ہیں‘ نظامِ مملکت کے معنی ہیں۔ اپنی آزاد مملکت نہ ہو تو دین ہوتا ہی نہیں ہے۔ اسے یاد رکھیے جب اپنی آزاد مملکت نہ ہو‘ دین نہیں ہوتا تو پھر یہ ساحر آتے ہیں‘ یہ مذہب کو پیش کرتے ہیں اور اس کا نام دین رکھ دیتے ہیں۔ یہ ہے سحر۔ اس لیے ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)

یہ ہیں ساحر اور یہ ہے سحر۔ اب دیکھیے وہ کس طرح سے بات کو واضح کرتا ہے۔ قرآن نے کن الفاظ میں اس کی بات کو پیش کیا ہے۔ پوچھا ہے کہ یہ کرے گا کیا؟ کہا کہ **اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ** (40:26) اگر یہ کامیاب ہو گیا تو یہ تمہارے نظام کی جگہ یہاں اپنا ایک نظام قائم کرے گا اور اگر کامیاب نہ ہوا تو کم از کم **اَنۡ یُّظۡهِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ** (40:26) یہاں Anarchy (تشت وانتشار) Create (پیدا) کر دے گا۔ فساد ہی فساد برپا ہوگا‘ کوئی نظام ہی باقی نہ رہے گا۔ یہ جو کیفیت ہے قرآن دو لفظوں میں یہ دونوں چیزیں کہہ گیا ہے۔ وہی جو ایک Judgement (فیصلہ) تھی کہ اگر Resolution (قرارداد) کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ Legitimate (قانون کے مطابق) ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ناکام ہوتی ہے تو بھی وہ یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ یہ فساد ہی فساد برپا کر دے گا۔ کس انداز میں قرآن یہ کہہ گیا ہے‘ اس کی زبان سے آپ دیکھیے۔ یہ لوگ بھی سیاست کے کھلاڑی تو تھے‘ اگرچہ یہ چار ہزار سال پہلے کی بات ہے لیکن بہرحال سیاست تو سیاست تھی‘ یہ لوگ یونہی بدھو نہیں تھے۔ حکمرانی آسان بات نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو گیا تو یہ نظام بدل کر اپنا نظام مسلط کر دے گا اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا تو بہرحال الٹ پلٹ ضرور کر دے گا۔ فساد کے معنی ہوتے ہیں: الٹ پلٹ کر دینا۔ کہا کہ یہ تہس نہس کر کے رکھ دے گا‘ کوئی نظام بھی باقی نہیں رہنے دے گا۔

آپ انسانیت کی سیاسی تاریخ پہ غور کیجیے۔ نظام بدلنے والے‘ یعنی دوسرے نظام کی جگہ اپنا نظام قائم کرنے والے آتے ہیں‘

کامیاب ہوتے ہیں تو وہ واقعی اپنا نظام قائم کرتے ہیں یعنی اپنی حکومت قائم کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کم از کم وہاں تہس نہس تو ضرور کر دیتے ہیں۔ Chaos (انتشار) Create (پیدا) کر دیتے ہیں' انارکی Create (پیدا) کر دیتے ہیں۔ وہ دونوں چیزیں اس نے کہی ہیں کہ یہ ہے جو کچھ اس کا عندیہ مجھے نظر آتا ہے۔ اب یہاں سے آپ نے یہ دیکھا کہ اس نے کہا ہے کہ ان **یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ** (40:26) تمہارا دین بدل دے گا' دوسرا نظام لے آئے گا۔

کافر گری کی بنا پر قتل کا فتویٰ

جب مذہب آیا ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں ایک لفظ مرتد ہے۔ مرتد کی سزا قتل ہے۔ مرتد وہ ہوتا ہے جس کے متعلق یہ حضرات' جو اس کے اجارہ دار ہیں' یہ فتویٰ دیدیں کہ اس کے عقائد اسلام جیسے نہیں رہے۔ اسلام جیسے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جیسے ان کے عقائد ہیں' ویسے نہیں رہے۔ اسی لیے ہر فرقے والا دوسرے فرقے کو کافر قرار دیتا ہے کہ اس دوسرے فرقے میں وہ مدعی ہوتے ہیں کہ ہمارے سارے عقائد اسلام کے مطابق ہیں کیونکہ اس فرقے کے عقائد کے مطابق نہیں ہوتے اس لیے وہ انہیں مرتد قرار دے کر کافر قرار دیتا ہے تو مرتد کے معنی ہوئے وہ شخص جس کے عقائد ان کے عقائد سے ہم آہنگ نہ رہیں۔ ساری بات عقائد کی ہوگئی۔ اب اس میں مرتد کی سزا قتل کے معنی ان کے ہاں یہ ہیں کہ ایک غیر مسلم' ایک ہندو' جب جی چاہے مسلمان ہوجائے' اگرچہ اس بیچارے کی مصیبت بڑی ہوتی ہے' اگر اتفاق سے جہاں وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے' وہاں کی مسجد کے مولوی صاحب اہل حدیث ہیں' اور وہ مسلمان بھی ہوگیا اور دوسرے جمعہ میں اس نے جا کر حنفیوں کی مسجد کے اندر نماز پڑھنا چاہی' تو وہ کہیں گے کہ پہلے مسلمان تو ہو۔ ارے صاحب! میں تو اسلام لایا ہوں۔ کہتے ہیں کہ نہیں' تم اسلام نہیں لائے تم اہلِ حدیث ہوئے ہو۔

مذہب کی دنیا میں جان کا خطرہ

آپ کو معلوم ہے کہ پٹھانوں کے علاقے کی وہ بات مشہور ہوگئی ہوئی ہے۔ ان کے گاؤں میں ہمیشہ ایک ہندو ضرور رکھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں کا کاروبار ہی سارا اس کے سر پہ چلتا ہے۔ تو بنیے کی کسی معاملے میں مولوی صاحب سے کھٹ پٹ ہوگئی۔ مولوی اس وقت تو خاموش رہا لیکن جمعہ کے خطبے میں اس نے کہا کہ مسلمانو! تمہیں پتہ ہے تمہارے گاؤں میں قیامت برپا ہوگئی' تمہارے ہاں کا بنیا وہابی ہوگیا۔ بس پھر کیا تھا: وہابی مرتد ہوجاتا ہے' مرتد کا قتل ضرور ہوتا ہے۔ بس وہ نماز کے بعد فارغ ہوئے اور اس جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے کہیں یہ سن لیا کہ یہ کیا قیامت آ گئی' اس نے اپنے کسی اور سے ساز باز کی۔ اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بالکل نہیں' ان سے کہا کہ وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہے کہ یہ بالکل غلط کہتے ہیں' میں حنفی کا حنفی ہوں تو ٹھیک

ہے یعنی وہ رہے ہندو کا ہندو' اس سے غرض نہیں ہے۔ جب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو اس کو تو اسلام میں لے آتے ہیں' بفرضِ محال کسی وقت اس اسلام پہ اس کا دل نہیں ٹکتا' وہ اسے چھوڑنا چاہتا ہے' باہر جانا چاہتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں' تم نکل نہیں سکتے۔ یہاں One way Traffic (یک طرفہ ٹریفک) ہے: آ تو سکتے ہو' واپس نہیں جاسکتے۔ پھر جو واپس جانا ہوتا ہے' یہ اس کو ارتداد کہتے ہیں۔ جو مرتد ہونا ہے اس کی سزا قتل ہے۔ مذہب کی آزادی کے آپ دیکھتے ہیں' یہ محراب و منبر سے کتنے بڑے اعلان کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے مذہب کی آزادی دی ہے جو دنیا میں کسی اور کو نہیں دی۔ وہ آزادی کیا ہوتی ہے؟ One way Traffic (یک طرفہ ٹریفک) والی بات ہوتی ہے کہ آنے کی آزادی ہے' جس کا جی چاہے آتا جائے' جب وہ آ گیا تو دروازہ بند ہوگیا' House Full ہوا اور اس کے بعد اگر وہ نکلنا چاہے تو کوئی دروازہ نہیں کہ کسی طرح سے کسی ادھر ادھر کا دروازہ پھاند کے نکلے تو وہاں وہ باہر کھڑا ہوتا ہے' اس کی سزا قتل ہوتی ہے اور جس کا جی چاہے اس کو قتل کر دے۔ اس کا نام ہے ارتداد۔

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے ارتداد کیا معنی رکھتا ہے۔ ارتداد کا معنی ہوتا ہے ''ایک چیز چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی دوسری چیز لے آنا''۔ قرآنِ کریم دین کا ارتداد کہتا ہے۔ یہ سورۃ مائدہ 5 کی آیت 54 میں ہے۔ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت اور ایک ہی لفظ سے کیا کیا معنی کیا کیا حقائق نکلتے چلے آتے ہیں۔ یہ ہے تصریفِ آیات۔ ایک آیت لیجیے اور دیکھیے کہ قرآن اس کی تشریح اور تفسیر مختلف مقامات پہ کس طرح کرتا چلا جاتا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ تم سے اقتدار چھین لے گا' اس کو اس نے ان الفاظ میں Express (بیان) کیا کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا' یعنی یہ جو موجودہ نہج ہے' مملکت کا نظام ہے' یہ اس کی جگہ یہاں اپنا نظام مسلط کر دے گا۔

قرآنِ حکیم نے دینِ اسلام کو قرآنی نظام کے الفاظ میں متعین کیا ہے

قرآن کہتا ہے کہ **يَـٰٓأَيُّهَا الَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ**[1] (5:54)۔ یہ جو مملکت کا نظام ہے' اسے قرآن نے متعین کیا اور تم لوگوں نے متشکل کیا ہے۔ اب ارتداد یہ ہوگا کہ **مِـنْـكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ** (5:54)۔ جو اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرے گا یا جو بدل دے گا' اس اسلامی نظام کی جگہ اسلامی نہیں بلکہ میں تو ہمیشہ قرآنی کہا کرتا ہوں تا کہ متعین ہو جائے۔ آپ اسلامی کہیے تو وہ ہر شخص جس چیز کا نام اسلامی رکھ لے' لیکن جب آپ متعین طور پہ قرآنی کہیں گے تو اس طرح آپ نے متعین کر

---

[1] اے ایمان والو! جو تم میں' نظامِ خداوندی سے پھر جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 259)۔

دیا کہ اس نظام کی سند یہ ہے۔ میں اس لیے زبان سے کہہ رہا ہوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو بھی خدا کی نازل کردہ کتاب قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتا' انہی کو کافر کہا جاتا ہے تو وہ میں نے اسی لیے کہا ہے کہ وہ قرآنی نظام یہی ہے جو قرآن نے خود کہا ہے۔ کہا کہ جو اس نظام کو' دین کو' تبدیل کرے گا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ غور فرمائیے کیا نتیجہ ہے؟ یہ کہ **فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ** (5:54) اس قوم کی جگہ ایک دوسری قوم آجاتی ہے۔ پہلے **یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (5:54) کہا ہوا ہے' تمہارا نام تو مسلمان رہ گیا' مسلمان اگر نظامِ قرآنی کو بدل کر کوئی دوسرا نظام اپنے ہاں رائج کر لے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یہ نہیں ہے کہ یہ مرتد کا فتویٰ دیا اور ایک فرد کو قتل کر دیا۔ وہ یہ ہے کہ اس قوم کی جگہ ایک دوسری قوم آجائے گی۔ اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ **یُّحِبُّھُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ** (5:54) وہ خدا کے نظام کو محبوب رکھے گی اور ان کے اس نہج کی وجہ سے خدا ان کو محبوب رکھے گا۔ **اَذِلَّۃٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ** (5:54) مومنین کے سامنے وہ محبت اور پیار کے جذبات سے جھکے ہوئے ہوں گے' مخالفین کے سامنے وہ سنگِ گراں بن کر' تیغِ فغاں بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور **یُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (5:54) مفادِ انسانیت کے کاموں کے لیے ہر وقت مصروفِ عمل رہیں گے۔

فی سبیل اللہ کی اصطلاح نوعِ انسانی کے مفاد میں کیے جانے والے عمل کے ساتھ مشروط ہے

یاد رکھیے' جہاں قرآن نے فی سبیل اللہ کہا ہے اس کے معنی ہیں: انسانیت کے مفاد کے لیے کوئی کام کرنا۔ فرد اپنے لیے کام کرتا ہے' اپنے گھر بار کے لیے کام کرتا ہے' خاندان کے لیے' برادری کے لیے' قوم کے لیے' اپنی مملکت کے لیے' کام کرتا ہے لیکن قرآن جس کو صحیح عملِ صالح کہتا ہے وہ یہ ہے کہ **اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ** (13:17) جو کام انسانیت کی منفعت کے لیے کیا جائے گا' بقا اس کو ہوگی اس کے لیے قرآن کی اصطلاح فی سبیل اللہ ہے۔ یہ کسی اور کی منفعت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ہے جس کے لیے خدا نے کہا ہے' جس کی منفعت کے لیے کام کرنا خدا نے کہا ہے یعنی **یَنۡفَعُ النَّاسَ** ہو' وہ انسانیت کی منفعت کے کاموں کے لیے' ہر وقت مصروفِ عمل رہیں گے۔ جہاد کے معنی یہ ہوں گے۔ **وَ لَا یَخَافُوۡنَ لَوۡمَۃَ لَآئِمٍ** (5:54) اور اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ان کو قطعاً کوئی خوف اور بحث نہیں ہوگی کہ یہ کیا کہیں گے اور وہ کیا کہیں گے۔

حقیقت کا یہ عالم ہے کہ پرویزؒ صاحب کی کوئی کتاب یا رسالہ اب تک بین نہیں ہوئی مگر اس کے باوجود مخالفت کیوں؟

یہ بڑی چیز ہے کہ یہ کیا کہیں گے اور وہ کیا کہیں گے۔ چھوٹے سے پیمانے کے اوپر تو مجھے روز اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ میرے گھر کے کمرے کے اندر آ کر بڑے بڑے ذمہ دار حضرات کہتے ہیں کہ پرویز صاحب! یہ بالکل ٹھیک ہے ہم تو بیس سال سے متفق ہیں جو کچھ آپ کہتے ہیں' ہے ہی یہی صحیح نظام' اور یہاں سے اٹھتے ہوئے طلوعِ اسلام کی کاپی بھی وہ لے لیتے ہیں' مگر باہر اسٹال پہ چھوڑ

جاتے ہیں کہ کہیں باہر سڑک پہ کوئی دیکھ نہ لے کہ طلوعِ اسلام کی کاپی اس کے ہاتھ میں ہے اور وہاں جا کر کہیں اعتراف نہ کرنا پڑے۔ اعتراف تو ایک طرف رہا' کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں لے گا کیونکہ یہ قانوناً جرم نہیں ہے۔ یہ پرچہ (مجلّہ طلوعِ اسلام) آج تک بین (Ban) ہی نہیں ہوا۔ اللہ کا احسان ہے کہ پرویز صاحبؒ کی کوئی کتاب' کوئی پمفلٹ' آج تک قانون کی زد میں نہیں آیا' تو قانوناً اس میں کچھ ڈر کی بات نہیں ہے۔ یہ کس چیز سے ڈرتے ہیں؟ اس سے کہ لَوْمَةَ لَآئِمٍ [1] (5:54)۔ اچھا تو بھی پرویزی ہوگیا اے کے؟ اونئیں یار' خدا دا نام من' میں کس طرح پرویزی ہوگیا توبہ توبہ؟ تے سنیاں اے تو پرویز صاحب کول جا کے کیناوی ایں کہ میں تے ویہاں وراں توں تہاڈے نال آں [2]۔ اس سے سمجھ میں بات آتی ہے کہ قرآن نے اس قوم کی جو خصوصیات بتائی ہیں' ان میں اس خصوصیت کی بنیاد کیا ہے۔

کسی بات کو بغیر سوچے اپنائے چلے جانا جہالت کا عمل ہے

عزیزانِ من! ہوسکتا ہے کہ آپ بڑے بڑے مخالفتوں کو' تزاحم کو بھی برداشت کریں مگر یہ لَوْمَةَ لَآئِمٍ [1] (5:54) جسے آج کی اصطلاح میں Public Opinion (عوامی رائے) کہا جائے گا' یہ ایک ایسی ابلیسی اصطلاح ہے جس میں آپ متعین ہی نہیں کر سکتے کہ کس کی Opinion (رائے) ہے' کون کہنے والا ہے۔ وہ جو ہمارے گھروں کے اندر کی زندگی میں ہوتا ہے' یہ آپ ان سے پوچھیے' خاص طور پہ جب یہ رسومات ہوتی ہیں۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ کیوں ایسا ہے' کہیں گے کہ ایس طرح ہوندا ہی آیا ہیگا اے [3]۔ اگر نہیں کروگے' تے لوکی کی کین گے؟ [4] وہاں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ ان کی جہالت ہے جو کہتے ہیں کہ ہوندا ای آیا اے [5]۔ مذہب کی زبان میں کہیں گے کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے' یہ تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ یہ وہی ہے جو پنجابی کے لفظ ہیں کہ اونوں ذرا حلق چوں کڈ دیؤ تے شریعت ہوجاندی اے۔ یعنی اے سٹیج پہ سے آ کر کہن دی گل آ [6] ان سے پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ Public Opinion (عوامی رائے) ہے۔ یہ سارا خوف لَوْمَةَ لَآئِمٍ ہے۔

---

1. کسی کے طعن و تشنیع سے
2. اچھا تو کیا تو بھی پرویزی ہوگیا ہے؟ ارے نہیں بھئی! خدا کا نام مانو توبہ توبہ میں کس طرح پرویزی ہوگیا!! سنا ہے کہ تم پرویز صاحب کے پاس جا کر کہتے ہو کہ میں تو بیس سال سے آپ کے ساتھ ہوں۔
3. اسی طرح ہی ہوتا آیا ہے۔
4. تو لوگ کیا کہیں گے؟
5. یہ ہوتا ہی آیا ہے۔
6. اسے ذرا حلق سے ادا کر دو تو یہ شریعت بن جاتی ہے۔ یعنی اسے اسٹیج پہ آ کر کہنے کی بات ہے۔

عزیزانِ من! آپ کبھی تن تنہا بیٹھ کر غور کیجیے گا کہ ہمارے کتنے ہی ایسے کام ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں کہ واقعی یہ صحیح ہونے چاہییں اور محض اس لیے اعلانیہ ان کو نہیں کرتے کہ ہم **لَوۡمَةَ لَآئِمٍ** سے ڈرتے ہیں' Public Opinion (عوامی رائے) سے ڈرتے ہیں' رسوم کے توڑنے سے ڈرتے ہیں' برادری دے میہنیاں توں ڈرنے آں' جیہڑا ہوندا آیا اے ہیگا اونوں نہ کیتا جائے گا تے لوکی کی کہین گے' اوہدے تو ڈرنے آں ❶۔ اور بڑی بات یہ کہتے ہیں کہ یہ نہ کرنے سے ناک کٹ جاتی ہے' کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ کسی کی ناک کٹی ہوئی ہے' کمبخت روز کٹتی ہے اور پھر اتنی کی اتنی رہ جاتی ہے۔ میں نے **لَوۡمَةَ لَآئِمٍ** پر اس لیے زور دیا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ جو غلط معاشرہ ہے وہ **لَوۡمَةَ لَآئِمٍ** کے اندر ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے! **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (5:54) اے مسلمانوں! **مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰهُ بِقَوۡمٍ** (5:54) اگر تم میں سے کوئی اس نظامِ قرآنی کو چھوڑ دے گا' بدل دے گا' دوسرا نظام اختیار کر لے گا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ پورا دوسرا نظام لانا ہے تو پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا۔ وہ ایک دوسری قوم لائے گا' دوسری قوم آئے گی جو پھر اس نظام کو قائم کرے گی' دین کو قائم کرے گی۔

قرآنِ حکیم کا نظامِ حیات کسی صورت میں بھی پیوندکاری قبول نہیں کرتا

اب ہمارے سامنے یہ بات آ گئی کہ جسے ارتداد کہا جاتا ہے' وہ کیا ہے؟ ارتداد کے معنی ہی اس ذاتی نجی عقائد کی ایسی تبدیلی نہیں ہے کہ وہ مولوی صاحب کے عقیدے کے برابر نہ ہو' بلکہ ارتداد کے معنی ہیں' ''ایک چیز چھوڑ کر اس کی جگہ کوئی دوسری چیز لے آنا۔'' ایک نظام' دین کے معنی نظام کے ہیں' جو کہ ایک نظامِ قرآنی ہے' اس لیے یہ کہہ کر خطاب ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (5:54) اے مسلمانوں سا نام رکھانے والو! **مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ** (5:54) تم نے اس نظام کو بدل دیا تو یہ ہے دین سے' قرآن سے ارتداد' قرآن کریم **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** (5:54) کہتا ہے' ایمان والے کہہ کر پکارتا ہے۔ یہاں ایمان والے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو نہیں ہیں۔ قرآن کی وہ اصطلاح ہے جو اپنے آپ کو بہرحال مسلمان کہتے ہیں۔ اب آگے ان دو لفظوں میں تفریق آ گئی: ایک تو ہو گئے جنہیں قرآن مومن کہتا ہے اور ایک جن کو ہم مسلمان کہتے ہیں تو جہاں **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا** اس Context (متن) میں آئے گا کہ جو تم میں سے یہ دین بدل دے گا تو بدلنے والے تو پھر جماعتِ مومنین نہیں رہ سکتے' مسلمان اس کا ترجمہ ہو جائے گا: اے مسلمانو! اگر تم نے اس دین کو' اس نظامِ مملکت کو' بدل دیا جو قرآن نے متعین کیا ہے تو پھر اس کا نتیجہ پیوندکاری نہیں ہوگی' پھر تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی۔ وہ نظام جو قرآن میں خدا نے متعین کیا ہے وہ اس نظام کو متعین کرے

---

❶ برادری کے طعن و تشنیع سے لرزاں و ترساں ہیں۔ جو ہوتا آیا ہے اسے نہ کیا جائے تو لوگ کیا کہیں گے' سے خائف ہیں۔

گی' یہ ہے قوم جو آ کر دین کو متعین کرے گی۔ یہ ہے دین۔ آپ کو پتہ ہے یا نہیں' پنجاب کے گاؤں میں آپ گئے یا نہیں' وہاں دین کسے کہا گیا ہے۔ گاؤں کے جو عام مسلمان ہوتے ہیں' وہ تو مسلمان کہلاتے ہیں۔ ادھر اگر چوہڑا مسلمان ہو جائے' تے اونوں دیندار کیندے ہیگے نیں' نماز پڑھدا اے تے اونوں مصلی کیندے نیں۔ تے مصلی' تے دیندار الگ فرقے بن گئے' گروہ بن گئے' برادریاں بن گئیں' مسلماناں دے وچ اوناں نوں شمار ای نئیں کیتا جاندا❶۔

یاد رکھیے! دین نظامِ مملکت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ**❷ (5:54)۔ یہ Public Opinion (عوامی رائے) یہ چیز ہے کہ ہوندا ای اوندا اے' ایس طرح ای ہوندا اے' نک وڈیا جاندا اے❸۔ یہ اسلاف کا مسلک ہے' تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ وہ اس سے خوف نہیں کریں گے۔ جن چیزوں سے سمجھتے ہیں کہ ملامت ہوتی ہے اس سے نہیں ڈریں گے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ ملامت سے نہ ڈرنا' Public Opinion سے نہ خائف ہونا اتنی بڑی چیز ہے کہ یہ قرآن نے اس قوم کی خصوصیت بتائی ہے اور یہ اسی لیے ہے کہ قوموں کے اندر ایسے افراد تو پائے جاتے ہیں جو ان حقیقتوں کو' ان صداقتوں کو مانتے ہیں' تسلیم کرتے ہیں' لیکن کمرے کے اندر تسلیم کرتے ہیں' باہر زبان پہ لانے کی جراٴت نہیں کرتے' یہ **لَوْمَةَ لَآئِمٍ** کی وجہ سے ہے' اور میں کہتا ہوں کہ قوم کے اندر یہ جو حلقہ ہے' جو کہتا ہے کہ ہم حقیقت میں اسے Believe کرتے ہیں کہ یہی صحیح بات ہے اگر وہ **لَوْمَةَ لَآئِمٍ** سے اٹھ کھڑے ہوں تو آپ دیکھیں کہ دین کتنی جلدی متمکن ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا نہ کرنا منافقت ہے۔

---

❶ اسے ''دیندار'' کہتے ہیں۔ نماز پڑھتا ہے تو اسے ''مصلی'' کہتے ہیں۔ اس طرح ''مصلی'' اور ''دیندار'' الگ الگ فرقے بن گئے' گروہ بن گئے' برادریاں بن گئیں۔ انہیں مسلمانوں کے زمرے میں شامل ہی نہیں کیا جاتا۔

❷ اے ایمان والو! جو تم میں سے نظامِ خداوندی سے پھر جائے (تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا' اللہ کا کیا بگاڑے گا) اللہ ان کی جگہ ایسی قوم لے آئے گا جس کے افراد دنیا کی ہر شے کے مقابلہ میں' نظامِ خداوندی کو زیادہ عزیز رکھیں گے اور ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا بھی انہیں عزیز رکھے گا۔ ان کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وہ اس نظام کے ماننے والوں کے سامنے' ریشم کی طرح نرم اور شاخِ ثمردار کی طرح خمیدہ ہوں گے' لیکن اس نظام کے مخالفین کے مقابلہ میں فولاد کی طرح سخت (48:29). وہ اس نظام کے قیام اور استحکام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے اور کسی کی طعن و تشنیع سے نہیں ڈریں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 259)۔

❸ یہ ہوتا ہی آیا ہے' اسی طرح ہوتا ہے' ناک کٹ جاتی ہے۔

قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا جہنم یہ ہے کہ قوم تو ہو لیکن وہ نظام سے محروم ہو

میں نے عرض کیا تھا کہ فرعون نے کیا کہا ہے؟ کہا یہ ہے کہ **يُرِيدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ** (26:35) یاد رکھو! اس کے عزائم مجھے یہ نظر آتے ہیں کہ یہ تمہیں اقتدار سے الگ کر رہا ہے' اور اس کے لیے' دوسری جگہ لفظ استعمال کیا ہے کہ تمہارا دین بدل کر یہ دوسرا دین لے آئے گا' اس نظام کی جگہ دوسرا نظام لائے گا۔ اور میں پھر دہرا دوں جو اس نے کہا تھا کہ اگر تو یہ اس میں کامیاب ہوگیا تو یہ دوسرا نظام مسلط کر دے گا اور اگر یہ اس انقلاب میں کامیاب نہ ہوا تو فساد تو ہوگا' کم از کم یہاں Chaos (انتشار) تو Create (پیدا) کر دے گا' انارکی (خلفشار) پیدا کر دے گا کہ کوئی نظام ہی نہ رہے۔ چار ہزار سال پہلے کی سیاست اور آج کی سیاست' آپ دیکھ رہے ہیں کہ الفاظ وہی ہیں۔ فرعون نے کہا کہ یہ کچھ کر دے گا۔ **فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ** (26:35) سو بتاؤ کہ تمہارا اس باب میں کیا مشورہ ہے (7:110)؟

امیر المومنین کا فریضۂ حیات لائن آف ایکشن کا ہے

یہاں پھر ایک اور لفظ آ گیا ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو لفظ امر ہے' امیر المومنین یہیں سے ہے۔ آج کل ڈکٹیٹر کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کم از کم امیر المومنین تو ہمارے ہاں خلافت کا لفظ ہے۔ وہ جو صحیح خلفائے راشدینؓ تھے' امیر المومنین کہلاتے تھے' امیر بہت بڑی چیز ہے لیکن جب اس کے معنی بدلے ہیں تو اس کے تو معنی ہی آج ڈکٹیٹر کے ہوگئے۔ یہ امارت یا امیر' قرآن کی رو سے' صحیح اسلامی نظام کے اندر' حکم دینے والا نہیں ہوتا' امر کے معنی حکم ہوتے ہی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں Direction (سمت) متعین کرنا۔ عربوں کے ہاں صحرا میں سڑکیں تو ہوتی نہیں تھیں' Sign Posts (نشاناتِ راہ) بھی نہیں لگ سکتے تھے تو وہ جانے والے جیسے یہ اسکاؤٹس کرتے ہیں' کسی قسم کے چھوٹے چھوٹے پتھر لیتے تھے' تھوڑا اس کو رنگتے تھے' یا سفیدی لگاتے تھے اور ان کو جگہ جگہ صحیح لائن پہ آگے آگے لگاتے جاتے تھے۔ یہ جو ڈائریکشن متعین کرنے یا ڈائریکشن دینے کے لیے اس قسم کی نشانیاں راستے پہ لگائی جاتی تھیں ان کو امارات کہتے تھے اور یہ جو نشانیاں لگانے والا تھا' یہ امیر ہوتا تھا۔ یہ جو قوم کو صحیح راستے پر چلنے کی نشانیاں لگانے والا تھا' یہ امیر المومنین تھا۔ یہ کوئی ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ اس کے معنی حکم نہیں ہے۔ اب وہاں بھی آپ دیکھیے کہ فرعون تو شخصی حکومت کا پیکر تھا۔ اس کو کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ اپنے منسٹروں کو' درباریوں کو کہتا ہے کہ **فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ** (26:35)۔ اب اگر آپ اس کے معنی حکم لیتے ہو تو آپ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ انہوں نے کہا کہ بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو' یعنی فرعون جیسا وہ بادشاہ اور اپنے اہلِ دربار سے یہ پوچھے کہ کہو تم کیا حکم دیتے ہو۔ دیکھا کس طرح سے خود جس جگہ یہ لفظ آیا ہے' وہاں

اس ترجمے کی غلطی کس طرح نمایاں طور پہ سامنے آ گئی۔ کیا فرعون ان سے کہے گا کہ تم کیا حکم دیتے ہو؟ یہ اس سے پوچھتا ہے' جسے ہم مشورۃً کہتے ہیں کہ بتاؤ تمہارے نزدیک لائن آف ایکشن کون سی صحیح ہے' لائن آف ایکشن امر کا صحیح ترجمہ ہے' وہ لائن لگاتے تھے صحیح راستے کی۔ اب یہاں ایک اور سیاست آتی ہے۔

مذہبی دنیا میں دین کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے

عزیزانِ من! یہ پرانے قصے نہیں ہیں' یہ اساطیر الاولین نہیں ہیں۔ وہ قومِ قریش جن کے سامنے قرآن پیش کیا تھا' وہ یہ کہہ کر استہزاً مڑ جاتے تھے کہ کیا یہ اساطیر الاولین' پہلے کی قوموں کی کہانیاں' بیان کرتا ہے؟ ہم بھی ان واقعات کو بیان کرتے ہیں تو پہلی قوموں کی کہانیاں سمجھ کر ہی بیان کر دیتے ہیں۔ قرآن داستان [1] گوئی کرنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ تو داستان گو کو سامری کہتا ہے' بہکانے والا کہتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ سارا جتنا دین تھا' مذہب میں آیا اور داستان گوئی میں بدل گیا' آپ جتنی بحثیں' جتنے منبروں سے کرتے ہیں' وہ ساری داستان گوئی ہوتی ہے۔ وہ داستانیں پھر یہیں تک نہیں رہتیں' وہ تو پھر شاعری میں آتی ہیں۔ اس میں تو بس مولا دے' بندہ لے۔ اب مثنوی [2] ان کے ہاتھ میں آ گئی ہوئی ہے۔ اس میں چلتے ہیں صاحب' ذرا سا گلا ٹھیک ہو اور سینے میں زور ہو۔ وہ تو ہوتا ہے کہ اتنا پلاؤ کھایا ہے۔ پھر زور کیوں نہیں ہوگا!! پھر یہ کان پہ ہاتھ رکھ کر جب وہ مثنوی کا شعر پڑھ دیتے ہیں تو اس کے لیے نہ قرآن کی آیات کی ضرورت ہے' نہ کسی حدیث کی ضرورت ہے' کچھ نہیں۔ اس کی وجۂ جواز صرف یہ ہے' کہ مولانا روم فرما گئے۔ یہ ساری داستان گوئی ہے' اس کے اندر کوئی سند نہیں ہے۔ قرآن میں یہ داستانیں نہیں ہیں' یہ سامریت نہیں ہے۔ وہ مذہبی خطیبوں کی جو داستانیں سنا سنا کر سلاتے ہیں' قرآن کہتا ہے کہ یہ اساطیر الاوّلین نہیں ہیں۔ اب تو ہمارے بچے جو تین تین چار چار سال کے ہیں وہ دادی اماں کیا' اپنی اماں سے بھی کتنا آگے ہوتے ہیں۔ ہمارا بھی یہی حال تھا کہ رات کو نیند نہیں آتی تھی تو جو نانی اماں یا دادی اماں تھیں' وہ کہانی سناتی تھی۔ بات کہتے تھے پنجاب میں کہ وہ ایک سبز پری ہوتی تھی اور کالا دیو ہوتا تھا' بس یہی ہوتی تھی۔ وہ کاہے کے لیے سناتی تھی؟ تاکہ بچہ سو جائے۔ کہانی سنائی اس لیے جاتی ہے کہ قوم سو جائے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ

---

[1] داستان قدیم دور کی صنف ہے۔ تحریری داستانوں سے پہلے داستان کو زبانی سنایا کرتے تھے۔ داستانوں کی خصوصیات یہ ہیں: داستان طویل ہوتی ہے' قصہ در قصہ ہوتی ہے' مافوق الفطرت عناصر داستان کا اہم عنصر ہوتے ہیں' رومانوی ہوتی ہے' کردار فرضی ہوتے ہیں' داستان کی معاشرت مانوس ہوتی ہے' عبارت مقفی و رنگین ہوتی ہے' متضاد اوصاف کا تصادم دکھایا جاتا ہے۔ ان اوصاف کو اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان ان سے بہک جاتا ہے۔

[2] اصطلاح شاعری میں مثنوی ایک صنفِ نظم کا نام ہے جس میں دو دو مصرعوں کے اشعار ہوتے ہیں' اور کوئی مسلسل بات بیان کی جاتی ہے۔ شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے ردیف کا التزام اور تسلسلِ مضمون خاص طور پر اہم ہیں۔

اساطیر الاولین ہیں جب کہ قرآن کہتا تھا یہ اساطیر الاولین نہیں ہیں' یہ واقعات جو ہم بیان کر رہے ہیں قیامت تک کے لیے تمہیں ڈائریکشن متعین کریں گے۔ سنیے! اس نے اپنے درباریوں سے کیا کہا ہے؟ اب اس میں نظر آتا ہے کہ آمر یعنی ڈکٹیٹر کے ذہن میں' نخوت' تکبر' انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے' ایک فرد کے اختیارات اتنے لامتناہی ہوتے ہیں۔

دورِ ملوکیت میں' سب سے پہلے' انسان' جاں بخشی کا طلب گار ہوتا ہے

سنیے! پھر یہ دو سیاستیں ہمارے سامنے آتی ہیں: **وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْ** (40:26) بحث و تمحیص کے بعد اس نے اہل دربار سے یہ کہا کہ چھوڑو مجھے۔ نظر آتا ہے کہ وہ اسے کچھ آئین و قوانین یا کچھ تدبیروں کی پابندیوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ ''ذرونی'' کا لفظ کیا عجیب قرآن نے کہا ہے! او بھئی! چھوڑو مجھے ان پابندیوں سے **اَقْتُلُ مُوْسٰی** (40:26) میں اسے قتل کرتا ہوں۔ **وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ** (40:26) اور اسے کہتا ہوں کہ بلاؤ اپنے رب کو کہ تم کو بچالے۔ نظر آیا کہ جو ایک مطلق العنان' صاحبِ اقتدار ہے اس کے ذہن میں تدبیر ہی ایک آتی ہے: کھینچ دو دار کے اوپر' لٹکا دو ان کو وہاں' قتل کر دو اس کو۔ یہ چیز ہے جو وہ کہتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ فرعون جیسے آمرِ مطلق کے بھی اہل کچھ ایسے تھے کہ انہیں بات کرنے کی جرأت تھی۔ اس نے کم از کم یہ جرأت دلا رکھی تھی' ورنہ وہ تو ہر بات میں کہتے تھے کہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ پہلے جان کی امان مانگتے تھے پھر زبان پہ ایک لفظ لاتے تھے۔ بہر حال انہیں اجازت تھی۔ انہوں نے کہا کہ نہ' یہ نہ کرنا۔ نظر آتا ہے کہ ان کی نگاہ زیادہ گہری تھی: **قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۝ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ** (26:36-37)۔ ان کو ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایئے' ایک گیسٹ ہاؤس میں ان کو ٹھہرایئے اور اس اثنا میں مذاکرات کا انتظام کیجیے' جس لائن کا یہ شخص ہے یہ بھی بار بار خدا کا نام لیتا ہے' مذہب کا نام لیتا ہے تو یہ یہاں خالص سیاست پہ گفتگو ہو رہی ہے' اس سے کام نہیں چلے گا اور تم ہو بات بات پہ غصے میں آ جاتے ہو اور تمہیں معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا' قوم محکوم ہی سہی اس کا خون گرم ہو چکا ہوا ہے' اس پہ ہاتھ نہ ڈالنا اور یہ عجیب چیز ہمیں نظر آتی ہے کہ یہ وہاں بیٹھے ہوئے یہ سب کچھ کرتے بھی رہے اور قوم کو لے کر نکل گئے۔ اتنی جرأت اس میں نہیں ہوئی کہ ان کے اوپر ہاتھ ڈال دیتا' ورنہ وہاں مشکل کیا تھی۔ انہوں نے کہا کہ نہ **اَرْجِهْ** (26:36) ان کو مہلت دو' خاطر تواضع کرو اور اسی لائن کے لوگوں کو بلاؤ۔ اب اس کو مذہبی مناظرہ کہہ لیجیے یا مذاکرات کہہ لیجیے' وہ ان سے آ کر باتیں کریں' یہ ساحرِ علیم ہے' اپنے بھی جو **بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ**[1] ہیں' قرآن نے اسے ساحر کہا ہے۔ تم سحار بلاؤ' اس سے بھی زیادہ فریب کار بلاؤ' وہ بھی علیم ہے' یہ بھی علیم ہوں' معلومات ہوں اور نہلے پہ دہلا بٹھاؤ۔

---

[1] مختلف معبدوں سے ماہرین سحر کار پروہت بلا لائیں۔

فرعون کی چابک دستی کی سیاست

عربی زبان جاننے والے ان دو الفاظ کے جو ''ابواب'' ہوتے ہیں' ان کو جانتے ہیں کہ کس طرح ان میں مفہوم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ سحار Comparative Degree (تفصیل بعض) ہے یعنی یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ جو ساحر ہوں انہیں بلاؤ' وہ باتیں کریں۔ کہا کہ پھر یہ بات کمرے کے اندر کرنے کی نہیں ہے' عام مجمع میں' پبلک کے اندر یہ چیز کرو' وہاں یہ شکست کھائے اور وہاں ہمارے ساحر غالب آئیں تو Public Opinion (رائے عامہ) خود بخود اس کے خلاف ہو جائے گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ فرعونی سیاست کیا کیا طریقے تجویز کر رہی ہے۔ **فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ o وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُم مُّجْتَمِعُوْنَ** (26:38-39)۔ ٹھیک ہے انہوں نے اپنے پروہت' مذہبی پیشواؤں کو بلا لیا' بڑے بڑے ان کے ہاں کے جو پروہت تھے' علما تھے' جنہیں قرآن احبار کہتا ہے' انہیں بلا لیا' عام لوگوں کو' پبلک کو بھی' اکٹھا کیا کہ تم بھی جمع ہو جاؤ۔ انہیں کاہے کے لیے اکٹھا کیا؟ عزیزانِ من! دو ہزار سال تو قریباً حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو اور کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال ان سے پہلے کا تاریخی طور پر یہ واقعہ سمجھ لیجیے کہ ساڑھے تین ہزار سال آج سے پہلے کی باتیں ہیں۔ سیاست دیکھیے' وہاں بھی کیا کام کر رہی ہے۔ لوگوں کے اس مجمع کو کاہے کے لیے بلا لیا؟ **لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ** (26:40) اگر یہ غالب آئیں تو ان کا اتنا شاندار جلوس نکالا جائے' اٹھارہ میل لمبا جلوس نکالو یعنی پروپیگنڈے کا فن آپ دیکھتے ہیں' پبلک میں یہ کچھ کرو اور جب یہ غالب آئیں تو پھر ان کا اتنا بڑا جلوس نکلے کہ ساری مملکت میں یہ معلوم ہو جائے کہ جھوٹا تھا وہ جس کو شکست دی' سچے یہی ہیں۔

شکم پروری کے پیشِ نظر فرعون کی مذہبی پیشوائیت کا پہلا مطالبہ

عزیزانِ من! یہ داستان نانی اماں کی کہانی نہیں' بلکہ اس کا ایک ایک ٹکڑا آپ دیکھیے حقائق کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ آگے چلیے' کہا کہ **فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ** (26:41)۔ یہ دین کے محافظ آ رہے ہیں۔ ساری زندگیاں مذہب کے لیے انہوں نے وقف کی ہوئی ہیں' مجاہدین فی سبیل اللہ کہلاتے ہیں۔ آتے ہی کیا شرط پیش کرتے ہیں؟ آ رہے ہیں اپنے مذہب کو باطل کے اوپر غالب کرنے کے لیے (بقول ان کے عقیدے کے) اور آتے ہی کہتے ہیں کہ سرکار! پہلے یہ فرمائیے کہ ہمارا معاوضہ کیا ہوگا؟ تین' ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی بات میں نے کی ہے۔ اگر میں یہ نہ بتاؤں کہ یہ کہاں کی کہانی ہو رہی ہے تو آپ کے ذہن میں آ جائے گا کہ اے مسیت دی گل ہوندی پئی اے [1]۔

---

[1] یہ مسجد کی بات ہو رہی ہے۔

جادو کے سلسلہ میں ہماری کتب احادیث و تفاسیر کے بیانات

قرآن، سحر کو، جادو کو، باطل کہتا ہے، جھوٹ کہتا ہے، فریب کہتا ہے۔ رسول اللہؐ کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ ان کم بختوں کو دیکھیے کہ یہ تمہیں جادوگر کہتے ہیں۔ قرآن نبی کے لیے زور دیتا ہے کہ وہ ساحر ہو ہی نہیں سکتا' اور ہمارے ہاں فخر سے ہزار برس سے تمام احادیث کی کتابیں، تفاسیر کی کتابیں، متفقہ طور پر اس معاملے پر یہ کہتی ہیں کہ یہ جادو کا مناظرہ تھا' یہ جادوگری کا مقابلہ تھا اور وہ جادوگر تھے، یہ بڑے جادوگر تھے، انہوں نے چھوٹا چھوٹا جادو کر کے کھیل دکھایا، انہوں نے بڑا کھیل دکھایا، یہ غالب آ گئے: جادو میں غالب آ گیا نبی خدا کا!!

سحر کے بنیادی معنی فریب کاری ہے اور قیامت بالائے قیامت یہ ہے کہ خدا خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہتا ہے کہ یہ کمبخت تمہیں ساحر کہہ رہے ہیں، کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں حدیثوں کی طرف آ جائیے کہ نبی ساحر ہوتا ہے' یہ بخاری مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے۔ ان کے ہاں یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے اوپر ایک یہودی عورت نے جادو کر دیا تھا' کتنے عرصے تک آپ اس جادو کے اندر مبتلا رہے تھے' اور آپ کی کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ ایک کام جو نہیں کیا ہوا ہوتا تھا' سمجھ لیتے تھے کہ میں نے کر لیا ہے' کیے ہوئے کے متعلق بھول جاتے تھے کہ کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق' میں کیا عرض کروں، میرا تو جگر پھٹ جاتا ہے!

ان کے ہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درباریوں کا، ان ساحروں کا' معاملہ تو متفق علیہ چلا آ رہا ہے' کہیں بھی اس کے متعلق کسی نے کوئی تردید نہیں کی کہ یہ سارا کھیل جادو کا نہیں تھا۔ وہ دو آیات وہاں (26:32-33) میں آئی تھیں اور دو یہاں (26:44-45) آئی ہیں۔ اگرچہ پہلے بھی یہ سورۃ الاعراف (7) میں آ چکی ہیں لیکن چونکہ اب دوبارہ آئی ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ میں ان آیات کے متعلق یہ عرض کروں کہ ان کا مطلب کیا ہے، ان کا مفہوم کیا ہے؟ میں نے وہاں وہ دو آیات (26:32-33) پچھلے درس ❶ میں چھوڑ دی تھیں، یہ دو آیات اس کے ساتھ بھی ملتی ہیں، ان کو بھی چھوڑتا ہوں ❷، اس لیے کہ یہ جو قرآنِ کریم واقعہ بیان کر رہا ہے، اس کا تسلسل بڑا ضروری ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کتنے اہم حقائق بیان کر رہا ہے، ہمارے لیے قرآن اس واقعہ کے اندر، سیاست کی، مذہبی پیشوائیت کی، فریب کاریوں کی، کتنی بڑی گائیڈ لائن دے رہا ہے۔ میں نے اس لیے اس تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے درمیان سے ان آیات

---

❶ دوسرا باب: سورۃ الشعراء، آیات 32 اور 33۔

❷ آیات (26:32-33) اور (26:44-45) کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا پانچواں باب، ص ص۔ 113 تا 138

کا مفہوم' وہاں سے بھی موقوف کر دیا تھا' ملتوی کر دیا تھا۔ یہ دو آیات پھر اسی تسلسل میں ہیں' اس وقت انہیں بھی میں چھوڑتا ہوں۔ یہ پورا واقعہ جو اس آویزش اور کشمکش کا ہے' چند آیات کے بعد یہ ختم ہو جائے گا تو اس کے بعد میں پھر ایک یا دو درس انہی کے لیے مختص کر دوں گا کہ میں بتاؤں کہ یہ بات کیا ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ یہ جادوگروں کی وہ رسیاں نہیں ہیں' جو سپولیاں بن کر چل رہی ہیں اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو یہ اژدھا بن گیا اور اس نے سپولیوں کو نگل لیا تھا۔ اگر فرعون نے یہ سب کچھ سامنے ہوتے دیکھا تو پھر ایمان کیوں نہ لایا؟

عزیزانِ من! اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ یہ جادو کی بات نہیں تھی' یہ ان کا اس مذہب کی بنیاد کے اوپر' جس کے نمائندے یہ لوگ آئے تھے' یہ دو نظام تھے جن کا تصادم تھا۔ دو نظام تھے جس میں ایک طرف سیاسی امارت' مذہبی پیشوائیت' نظامِ سرمایہ داری تھا۔ دوسری طرف ایک نظام تھا جس میں کوئی انسان کسی انسان کا نہ حاکم بن سکتا ہے' نہ محکوم بن سکتا ہے' کوئی انسان دوسرے انسان کا روٹی کا محتاج نہیں ہوسکتا' خدا اور بندے کے درمیان کوئی انسان کھڑا نہیں ہوسکتا' اس لیے مذہبی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس نظام کے علمبردار حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تھے اور اس نظام کے علمبردار فرعون کے جتنے علما اور مشائخ اکٹھے ہوئے تھے' وہ تھے۔ جب مقابلہ شروع ہوا تو **قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ** (26:43) موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ لاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے' اسے پیش کرو۔ دراصل یہ ان دو نظاموں کے درمیان' دونوں طرف سے آپس میں' تصادم تھا' مباحثہ تھا' مناظرہ تھا' دلائل تھے' براہین تھے اور قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ان کی ہر دلیل کے اوپر جو اس کی طرف سے دلیل پڑتی تھی' چکنا چور کر کے ان کی دلیلوں کو رکھ دیتی تھی اور یہ دلائل و براہین تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان کے علما نے یہ براہین دیکھے تو وہ بہرحال علیم تھے' عالم تھے' بات تو اتنی ہی تھی کہ انہوں نے اپنا پیشہ مذہبی پیشوائیت کا اختیار کر رکھا تھا: فریب کاری اس کا تقاضا تھا' عوام کو بھی فریب میں رکھا جائے دوسروں کو بھی فریب میں رکھا جائے۔ انہوں نے جب اپنے سامنے بالکل کھلے واضح براہین دیکھیں' بے نقاب دلائل دیکھے' تو ان کے سامنے صداقتیں بے نقاب آ گئیں۔

مذہبی پیشوائیت کا وقار اور اُس کی اہمیت

عزیزانِ من! آپ کے سامنے یہاں ایک بڑی اہم اور عظیم حقیقت آتی ہے۔ دیکھیے ان کا مقام یہ ہے۔ آج یہ ان بیچارے مولوی علما وغیرہ کا تو مقام کچھ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو یونہی بڑا بنا رکھا ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں تو سلطنت کسی حاکم کی چل نہیں سکتی تھی جب تک اس کو مذہبی پیشوائیت کی تائید حاصل نہ ہو جائے۔ اب تو عیسائیت کے اندر بھی پوپ الگ

ہو گیا ہے۔ جس زمانے میں مملکت کے اندر یہ پوپ ہوتا تھا' پادری ہوتا تھا' مملکت کی پوری کی پوری جو لگام تھی وہ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ہندوستان میں برہمن کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ آپ کے ہزار سال کے اندر جو آپ کی ملوکیت کا دور ہے یہی علما تھے' جو انہیں **ظل اللّٰہ علی الارض** بناتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے' عباسیوں ❶ کے آخری دور کے اندر اور اس کے تباہی کے بعد بھی یہ جو خلیفہ تھا اسے خلیفۃ المسلمین بنا رکھا ہوتا تھا اور طوطے کی طرح پنجرے میں ڈال کے' فتوے کے احکام کے اوپر بحیثیت صدر کے دستخط اس سے کرایا کرتے تھے' اور حکومت سارے یہ کرتے تھے۔ یہ تھا ان کا مقام۔ یہ جو آئے تھے یہ اس مقام کے حامل تھے اور پھر یہ شرط بھی ساتھ تھی کہ اور زیادہ مقرب بننے والی بات کیا ہوگی۔

اب یہاں آ کر ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ صداقت کو جب سامنے بے نقاب دیکھ لیا' سنیئے' عزیزانِ من! بڑا اہم مقام آ رہا ہے' قرآن کہتا ہے کہ **فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ** (26:46) موسیٰ علیہ السلام نے نظامِ خداوندی کی تائید میں محکم دلائل پیش کیے جو پروہتوں کی فریب پر مبنی دلیلوں کو ایک ایک کر کے نگل گئے۔ وہ دلائل اس قدر واضح' بیّن اور محکم تھے کہ ان کی روشنی میں پروہتوں پر موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی صداقت بے نقاب ہوگئی اور **قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ رَبِّ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ** (26:47-48) انہوں نے کہا کہ ہم نے صداقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا ہے' ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں' اس صداقت کے سامنے جھکتے ہیں' فرعون کے دربار میں مجمع کے سامنے ہم ایمان لاتے ہیں۔ ربِ موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کے اوپر ہم ایمان لائے۔ یہاں سجدین کا لفظ دیکھیے قرآن کہاں لایا ہے اور یہاں پتہ چلتا ہے کہ سجدہ کس کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ انہوں نے ماتھا زمین پہ رکھ دیا ہوگا' رکھا بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔ اس کے معنی ہیں سرِ تسلیم خم کر دینا' صداقتوں کے سامنے جھک جانا' اس اعلان کے ساتھ جب کہ فرعون سامنے بیٹھا ہے اور اس کے لیے بھی یہ بڑا Psychological Moment (نفسیاتی لمحہ) ہے' اپنے ان ساحرین کا شکست کھانا' شکست کھانے کے بعد اس کی موجودگی میں مجمع کے سامنے یہ اعلان کر دینا' یہ وہی ہے او جیہڑا کیندے نیں فرعون دے پلے تے لکھ نئیں رہیا اوس ویلے ❷۔ کیا کیفیت ہوئی ہوگی اس کی! قرآن میں آتا ہے کہ اس کی کیفیت کیا ہوئی ہے۔ میں فرعون کی کیفیت بعد میں سامنے لاؤں گا' پہلے ان ساحرین دربارِ فرعون کا مقام سامنے لاتا ہوں۔

عزیزانِ من! اس وقت تقابل ہے' بنی اسرائیل کی قوم سینکڑوں سال تک محکوم رہی' اس محکومیت کی لعنت سے بچانے کے لیے دو پیغمبر آئے' وہ ان کو اس محکومیت کی لعنت سے نکال کر آزادی کی فضاؤں میں لے گئے' بڑی چیز ہے۔ تاریخ کا بیان تو یہ ہے کہ وہاں

---

❶ یاد رہے' عباسیوں کا دَور 750 تا 1258ء پر محیط ہے۔

❷ جو کہتے ہیں کہ اس وقت فرعون کی عزت و عظمت خاک میں مل گئی۔

حضرتِ شعیبؑ بھی ان کے ساتھ آ ملے۔ اب یہ تین پیغمبر ہیں اور بنی اسرائیل کی کیفیت یہ ہے۔ ساری تورات کو آپ دیکھیے، خود قرآن میں یہ سب کچھ ہے۔ چلے جا رہے ہیں۔ ایک گاؤں میں دیکھا کہ وہاں صاحب! گاؤں کے باہر ایک بت رکھا ہوا ہے، جس کو وہ پوج رہے ہیں۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا پلہ پکڑ کے بیٹھ گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہمیں بھی اس قسم کا ایک خدا بنا دو، ہم بھی اس کو پوجیں۔ او تمہارا ستیاناس، ان بتوں کی پرستش سے چھڑا کر تو تمہیں میں یہاں لایا ہوں اور یہاں تمہاری کیفیت یہ ہے کہ مجھ سے ہی کہہ رہے ہو کہ اس قسم کا ایک مجسمہ بنا دو، ہم اس کی پرستش کریں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر آگے لے کر چلے گئے۔ کچھ دنوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اس Camp (پڑاؤ) سے کسی کام کے لیے الگ ہوئے، ادھر گئے تو قرآن کہتا ہے کہ یہاں ایک مولوی صاحب نے یا سامری نے انہی سے کہا کہ لاؤ، یہ زیور جو تم پہنے پھرتی ہو، وہ تمہارے لیے وبالِ جان ہوگا۔ بھٹ پیا او سونا جیہڑا کناں نو کھاوے۔ اے سونا تہاڈے کناں نوں کھاندا پیا اے [1]۔ انہی سے وہ لیا اور ایک بچھڑا بنا دیا۔ بتایا یہ کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں، یہ مذہبی پیشوا اپنے پلے سے ایک پیسہ نہیں خرچ کرتے، سب جاہلاں کول لیندے نیں [2]۔ وہی جو تم سے لیتے ہیں انہی کو تمہارا خدا بنا دیتے ہیں۔ بچھڑا بنا دیا اور یہ سارے اس کی پوجا کرنے لگے یعنی یہ قوم جو پیغمبروں کی نام لیوا قوم تھی، انہوں نے فرعون والا مذہب ویسے نہیں اختیار کیا تھا، یہ اپنے انبیاء کے مذہب کے اوپر بظاہر چلے آتے تھے، ساڈے ورگے مسلمان سن او سارے [3] پھر دو تین پیغمبران کے اندر موجود ہیں، اور قدم قدم کے اوپر ان کی یہ حالت ہے۔

دورِ ملوکیت میں قوموں کی تعلیم و تربیت کرنا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے

اب سوال یہ ہے کہ ان کی یہ حالت کیوں تھی؟ عزیزانِ من! محکومیت سے انسان کے اندر کی جرأتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ محکوم قوم انسانیت کی سطح سے نیچے چلی جاتی ہے۔ ان کی تربیت، ان کی تعلیم، ان کے جواہر اور خودی کو بیدار کرنا، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، بڑا کٹھن کام ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو آزاد قوم میں غیرت و مردانگی کا عنصر پھر بھی باقی رہتا ہے

اس کے برعکس جو آزاد قوم ہے، یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال تو غلط طریقوں پہ کرتی ہے، لیکن ان کے اندر جوہرِ مردانگی ہوتا ہے، غیرت ہوتی ہے، حمیت ہوتی ہے، صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ آزاد قوم کے اندر یہ تمام چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ آزاد قوم

---

1. بھٹ پڑا وہ سونا (Gold) جو کانوں کو کھا جائے۔ (کہا کہ) سونا تو تمہارے کانوں کو نقصان دیئے جا رہا ہے۔ ''بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹے کان''، یہ مثل ہے یعنی وہ چیز یا دولت کس کام کی جس سے تکلیف پہنچے۔
2. یہ سب کچھ جاہلوں سے لیتے ہیں۔
3. وہ تمام ہمارے ہی جیسے مسلمان تھے۔

کے نمائندے تھے۔ یہ بڑی چیز تھی۔ آپ اس مقام پہ اپنے آپ کو رکھ کے سوچیے' دیکھیے' جہاں ساحرین کے یہ بڑے کھڑے تھے' ایک طرف اتنی کششیں' جاذبیتیں' مفاد تھے' وہ تمام کے تمام سارے چھن رہے ہیں' یہی نہیں کہ چھن رہے ہیں' دوسری طرف ان کو پتہ ہے کہ فرعون جس کی حکومت میں ہیں' اس کے بعد اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔ اور وہ کیا کچھ نہیں کرے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا لیکن جب صداقت سامنے آئی ہے' محکوم قوم تو آزاد ہونے کے بعد بھی پلہ پکڑ کر بیٹھتی تھی کہ ہمیں بت بنا دیجیے' آزاد قوم کے یہ فرد ہیں کہ جب صداقت سامنے آئی ہے تو جتنے بھی مفادات ہیں' نہ صرف ان کے چھننے کی پرواہ نہیں ہے' جتنے بھی عقوبات اس کے ضمن میں آنے ہیں' ان سے بھی کوئی خوف نہیں۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:47) انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ چیز ایک آزاد قوم کا فرد ہی کرسکتا ہے۔ آزاد قوم کا فرد! جی! چاہتا ہے اگر وقت ہوتا تو میں آپ کے سامنے اقبالؒ (1877-1938ء) کو لاتا۔ آزاد اور محکوم کا اس نے بہت تقابل کیا ہے۔ زیادہ نہیں تو چند ہی اشعار لیتا ہوں:

دین و دانش را متاع ارزاں دہد

انسان کی دین اور دانش اور متاع اس دنیا میں کیا ہوتی ہے؟ دین و دانش' را متاع ارزاں دہد

تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

انسان بدن کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان تک بیچ دیتا ہے' دین اور دانش بیچ دیتا ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' میں اردو کی ایک نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پُر سوز و طرب ناک

عزیزانِ من! یہاں محکوم اور آزاد میں مذہب کی یہ بات ابھی نہیں آئی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ محکوم اور آزاد ہونے کی بات ہے' ابھی صرف اس کے اندر ان دو چیزوں کا ذکر ہے' دین سے جو فرق پڑتا ہے وہ ابھی نہیں آیا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے' آزاد کا دل زندہ و پرسوز وطرب ناک' ہونا بڑی چیز ہے۔

آزاد کی دولت دلِ روشن' نفسِ گرم

میں کیا ان کی تشریح کروں! میں نے کہا تھا کہ یہ نصاب (Curriculum) پڑھانے کی چیزیں تھیں' عزیزانِ من! اقبالؒ (1877-1938ء) بتاتا ہے کہ آزاد کی دولت دلِ روشن' نفسِ گرم ہے۔ اس نے دو کیا باتیں کہی ہیں! اس میں یہ شخص نفسیاتی Psychological اور دماغی (Intellectual) امراض' دونوں لے آیا ہے۔

آزاد کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نم ناک

بیٹھے تھے تے رو لیے تھوڑا جیا❶۔

محکوم، آزاد اور بندہ مومن کا ایک تقابلی جائزہ

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک

وہ بندہ افلاک ہے۔

ہفت آسماں بہ گردش و ما درمیانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

سات آسمان گردش میں ہیں، ہم ان کے نیچے پس رہے ہیں۔اے غالب! اس حال میں اب ہم سے مت پوچھ کہ ہم پہ کیا گزر رہی ہے۔ یہ بندۂ افلاک وہ خواجۂ افلاک۔ یہ ہے محکوم اور آزاد کا فرق۔

تزکیہ نفس کا مقصد خودی کی نشو ونما کرنا ہے

جب پھر یہ آزاد اپنی ان صلاحیتوں کو لیے ہوئے مردِ مومن ہو جائے تو وہ اپنی ان تمام صلاحیتوں کو خدا کی متعین کردہ اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے۔بس یہ فرق ہوتا ہے۔ وہ مردِ مومن ان اقدار کے مطابق انہیں صرف کرتا ہے اور وہ محکوم ہے کہ جس کے پاس یہ متاع ہی نہیں ہے یعنی وہ ایمان لے آئے تو کیا، کافر رہے تو کیا! یعنی اس کے پاس دھیلا بھی نہیں دین واسطے تے اونے خرچ کی کرنا❷۔اس کے پاس متاع ہی نہیں ہے۔محکوم کی بڑی تربیت کرنا پڑتی ہے۔

---

❶ تو تھوڑا سا رو لیں۔

❷ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے دھیلا بھی نہیں ہے۔ وہ خرچ کیا کرے گا!

تزکیہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کی خودی کی پرورش کرنا پڑتی ہے' نشوونما کرنا پڑتی ہے' اسے پہلے ابھار کر عام آزاد کی سطح پہ لانا پڑتا ہے اور جب یہ تربیت کی جاتی ہے تو وہ محکوم ہی نہیں بلکہ محکوم میں بھی جنہیں ہم کم تر درجے کا غلام اور لونڈیاں تک کہتے ہیں ان کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی بریرہ سے یہ کہتے ہیں کہ اب یہ بیوی بن کر وہاں جائے گی' لونڈی بن کر نہیں۔ بات یہ تھی کہ قرآن کے قانون کی رو سے وہ اب آزاد ہوگئی تھی' اس کے مالک نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ اسے کہا جائے کہ وہ واپس آجائے' اس کی جدائی میں میرا دن بڑا مشکل سے گزرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی سے مدینہ کی گلی میں یہ بات کہی۔ کون کہنے والا ہے؟ رسول' کہ جس پر ایمان لا کے وہ مومن ہوئی ہے۔ وہ سربراہِ مملکت ہے' مدینے کا بزرگ ہے' اتنا بڑا محسن ہے کہ اس نے آزادی دلائی ہے' غلامی سے چھڑا کے آزاد کرایا ہے' وہ کہہ رہا ہے کہ واپس چلی جاؤ۔ لیکن اب یہ بیوی بن کر وہاں جائے گی' لونڈی بن کر نہیں۔ تربیت دیکھیے کہ اب وہ محکوم نہیں ہے' غلام نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرہ سال رسول اللہ ﷺ نے مکے میں گزارے تھے۔ معاف رکھیے' وہ پلاننگ میں نہیں گزارتے تھے' ان کی تربیت میں گزارے تھے۔ دیکھیے تو یہ تربیت تھی کہ وہ بریرہ یہ بات پوچھتی ہے کہ حضور ﷺ آپ جو مجھے یہ کہہ رہے ہیں' کیا آپ ﷺ کو خدا کا حکم آیا ہے؟ ہمارے ہاں کے مفتی صاحب' مولوی صاحب' کو آپ روز سنتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے' اسلام میں یہ بات نہیں ہے' شریعت کی رو سے یہ ہے' مگر کوئی سند نہیں' کوئی حوالہ نہیں کہ کس نے یہ کہا ہے لیکن وہاں تو آپ جانتے ہیں کہ دیانت تھی۔ بریرہ نے پوچھا: کیا خدا کا حکم آیا ہے؟ کہا: نہیں' بریرہ! یہ میرا مشورہ ہے۔ کہنے لگی: معاف فرمائیے' پھر میاں بیوی کے معاملے' میں آپ سے بہتر سمجھتی ہوں' میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ جیتی رہو بیٹی! سر پہ ہاتھ دیا' ہنستے ہوئے ادھر تشریف لے گئے۔ خوشی ہوئی کہ ان کے اندر یہ کیفیت میری تربیت نے پیدا کر دی ہے۔ یہ ہے وہ فرق جو اس انسان میں پیدا ہوتا ہے جب وہ آزاد ہوجاتا ہے' عزیزانِ من! اور اگر کوئی پہلے ہی سے آزاد قوم Convert (تبدیل) ہو کر آئے تو یہ جو اگلا مرحلہ آتا ہے' یہ بھی بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ ان کی وہ صلاحیتیں جو ساحل ناآشنا ہوتی ہیں' جو سیلاب بنی ہوئی ہوتی ہیں' ان کو ساحلوں کے اندر مقید اور محبوس کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان کہ میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے

ابلیس کوئی پابندی اپنے اوپر عائد نہیں کرنا چاہتا لیکن اس پر پابندی عائد کرنا ہوتا ہے۔ پھر ابلیس کی بات آئی تو میں وہ حدیث دہرادوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر شخص کا ایک ابلیس ہوتا ہے' صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ کیا حضور ﷺ کا کوئی ابلیس ہے؟ کہنے لگے: ہاں' میرا بھی ابلیس ہے۔ پھر کہنے لگے: میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔ بس یہ ہے بات۔ آزاد تو

اپنے اندر بہت بڑے ابلیس لاتا ہے اور ابلیس کا ہونا بڑی چیز ہے بشرطیکہ اسے مسلمان کر لیا جائے۔ یہ وہ ابلیسیت کے اندر کی آزادی اور حریت ہے جس کے لیے اقبالؒ (1877-1938) نے ابلیس و جبریل ❶ کی نظم کہی ہے۔ جبریل ❷ نے ایک دن ابلیس سے کہا کہ ستیاناس! تم تو ڈوبے تھے۔ صنم! ہم کو بھی لے ڈوبے ہو۔

ابلیسیت کو کنٹرول کرنے کا طریق صرف تعلیم و تربیت ہے

وہ مشہور ہے کہ فرشتوں میں معلم الملکوت کا بہت بڑا مقام تھا اور جبریل اس سے کہتا ہے کہ صاحب! ہم تو تیری گستاخی کے باعث شرم کے مارے خدا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تو چلو اب بھی واپس ❸ آ جاؤ' ہم معافی دلا دیتے ہیں۔ کہنے ❹ لگا کہ اے جبریل! تمہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ آزاد ابلیس کا مقام کیا ہوتا ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو' اللہ ھُو' اللہ ھُو!

یاد رکھیے! دو ہی طریقے ہیں: یا تو یہ محکوم قوم جو تمہارے پلے پڑے' اس کی مسلسل و پیہم تعلیم و تربیت کی جائے۔ یہ وہ چیز تھی جس کی تشکیلِ پاکستان کے بعد ضرورت تھی۔ ہم محکوم قوم تھے' صدیوں کے محکوم تھے۔ آزادی کی جرأتیں اور صلاحیتیں ہمارے اندر مفقود نہیں تو کم از کم خوابیدہ تو ہو چکی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ یہاں ''ملی زندگی'' شروع کی جاتی۔ میں نے یہاں آتے ہی ''طلوعِ اسلام'' میں پہلی چیز یہ کہی تھی کہ کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم جس قسم کے لوگ وہاں سے آئے ہیں' ہمارے ذمے تو یہ لگا دو کہ ہم اس مملکت کی سرحدوں کو محفوظ رکھیں' یہ خطہ زمین محفوظ رہے' اس کے لیے ہم کٹ مریں اور آنے والی جو نسل ہے ان کی تعلیم و تربیت کچھ اس طرح سے کرو کہ ان کے اندر جو خوابیدہ صلاحیتیں ہیں' وہ بیدار ہوں اور اقدارِ خداوندی کے مطابق

---

❶ اقبالؒ: بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص ص۔ 159 تا 161۔

❷ جبریل: ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟
ابلیس: سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو
جبریل: کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

❸ جبریل: ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

❹ ابلیس: آہ اے جبریل! تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

استعمال کی جائیں، جب یہ ملک بھی بچے گا، مملکت بھی بچے گی، قوم بھی بچے گی، اور آپ کو صحیح آزادی حاصل ہوگی اور پھر اسلامی بھی بن سکے گی۔ وہ آپ نے نہیں کیا تو اب دونوں ہی چیزیں آپ کے اندر آ گئیں، جو ادھر اللہ ھُو والے ہیں، ان کے اندر تو آزادی کوئی صلاحیت ہی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

اصل کام نوجوان نسل کی صلاحیتوں کے سیلاب کو ساحلوں کے اندر محفوظ کرنے کا تھا

شرم آتی ہے یہ جوان کے مظاہر ہوتے ہیں اور جو نئی نسل اٹھی ہے، وہ بجائے اس کے کہ ایک ندی اور ایک دریا بنتی، ان کا پانی ساحلوں کے اندر رہتا، وہ ساحل توڑ کر سیلاب بن گئے ہوئے ہیں۔ سیلاب کو گالیاں دینے سے کچھ نہیں بنتا۔ سیلاب کا قصور نہیں ہوتا کہ وہ سیلاب بن گیا۔ ہمارا قصور ہے کہ جنہوں نے وہ بند نہیں بنائے، ساحل نہیں بنائے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے جو یہ بات کہی ہے، جو محکوم اور آزاد کا یہ تقابل کیا ہے، یہ ایمان کے بعد کی بات ہے، وہ تو صرف ان صلاحیتوں کو اقتدارِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر رکھنے کا ہے بشرطیکہ وہ صلاحیتیں ہوں۔ سُکّے دریا دا کی ہیگا، اے پاویں بند بنّو، پاویں نہ بنّو [1]۔ اس میں پانی لاؤ اور دونوں طرف ساحل پختہ بناؤ، اور پھر یہ آزاد ہوں۔

محکوم کو ذاتی عقیدہ بدلنے کے لیے بھی فرعون کی اجازت مطلوب ہوتی ہے

اب قرآن کہتا ہے کہ **فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ** [2] (26:46)۔ یہ جو سجدہ ہے اس کا اقبالؒ (1877-1938ء) کے ہاں سے پوچھو کہ یہ کیا ہے۔ سجدے کے متعلق دو ایک چیزیں ہیں: فرعون کی فرعونیت اور اس کا غضب۔ پہلے میں وہ لے ہی آؤں تو پھر تقابل میں ذرا بات سمجھ میں آئے گی۔ فرعون اپنے پروہتوں کی شکست پر پہلے ہی غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ اب جو اس نے دیکھا کہ وہ برملا، موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں، تو وہ ان پر برس پڑا اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں، گرج کر، بولا کہ ہیں! **قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ** (26:49)۔ یہ مذہب کا معاملہ ہے۔ کہتا ہے کہ ''ہماری اجازت سے پہلے ہی تم نے موسیٰؑ کے مذہب کا اعلان کر دیا، اس کے لیے ہماری اجازت کی ضرورت ہے''۔ دیکھتے ہیں کہ یہ ملوکیت کہاں تک اپنے اقتدار کی وسعتیں پھیلا رہی ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر تم ذاتی عقیدہ بھی نہیں بدل سکتے۔ ہماری اجازت کے بغیر ہی تم نے یہ کیا!! اصل یہ نظر آتا ہے کہ

---

[1] خشک دریا کا کیا ہے! خواہ بند لگاؤ یا نہ لگاؤ۔

[2] وہ دلائل اس قدر واضح، بیّن اور محکم تھے کہ ان کی روشنی میں، پروہتوں پر موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت بے نقاب ہوگئی اور انہوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 859)۔

وہ آئی سیاست ابلیسی یا فرعونی۔ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (26:49)۔ یہ تمہارا کام نظر نہیں آتا' یہ بہت بڑا ساحر ہے' یہ اندر اندر سازش کرتا رہا ہے۔ تم اور یہ دونوں ملے ہوئے ہو' اور تم لوگوں نے یہ ڈھونگ رچایا ہے کہ ایسا ایسا سب کچھ کیا جائے اور ایسے مقام کے اوپر تم اس چیز کا اعلان کرو۔ سب سازش ہے' تمہاری اندر ہی اندر۔ اس کا ذہن اُدھر جاتا ہی نہیں ہے کہ واقعی یہ صداقت سے ایسا کر رہے ہیں' ذہن جاتا اس طرف ہے کہ اس کے اندر کوئی سازش ہے۔ جبھی تو وہ صحیح راستے کی طرف نہیں آتا۔ اپنی غلطیوں کی طرف' اپنی کمزوریوں کی طرف' توجہ نہیں جاتی' جاتی اس طرف ہے کہ کوئی سازش کر رہا ہے۔ یہ سازش ہے اور یہ تمہارا بڑا گرو گھنٹال ہے' جس کے ساتھ تم مل گئے ہو فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (26:49) تمہیں ابھی پتہ چل جاتا ہے کہ میں کیا ہوں اور تم نے یہ کیا ہے؟ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (26:49) دیکھو میں کیا کرتا ہوں' ٹنگواتا ہوں' تمہیں صلیب پہ' کاٹتا ہوں تمہارے ہاتھ اور پاؤں' ایک ایک عضو الگ الگ کرتا ہوں' تڑپا تڑپا کے تمہیں مارتا ہوں' تمہیں پتہ نہیں کہ سامنے کون ہے اور کس سے واسطہ پڑا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس قدر گرجتے ہوئے یہ بات کہی جا رہی ہے۔

عزیزانِ من! درس کا وقت ختم ہو گیا ہے اور مقام بڑا اہم ہے۔ اگر انہوں ❶ نے تھوڑا سا وقت مجھے دے بھی دیا تو اس میں بات نہیں نپٹے گی۔ میں سمجھتا ہوں اس کو ہم آگے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہ جو فرعون کی گرج ہے' وہ ہمارے سامنے آئی۔ بندہ آزاد کا جو Reaction (ردِعمل) ہے' اس کے بعد وہ ہے دیکھنے کے قابل کہ وہ اس کا جواب کیا دیتا ہے اور پھر یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ یہ ساری چیزیں ان کے سامنے تھیں کہ جو ہم کر رہے ہیں' اس کا انجام یہ ہوگا اور اس کے بعد جو ان کا سجدہ ہے' اس سجدے کی قیمت کتنی ہے۔ وہ قیمت اقبالؒ (1938-1877ء) بتاتا ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے کیونکہ اب وقت ختم ہو گیا۔

ہم سورۃ الشعرآء کی آیت 49 تک آ گئے ہیں۔ آگے ہم اسی تسلسل میں' انہی مضامین میں لیں گے اور اسی میں ممکن ہے' وقت آ جائے کہ وہ جو میں نے معجزات اور سحر کہا ہے ان کے لیے بھی کوئی تفصیل ❷ سامنے آ جائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

❀......❀......❀

---

❶ یہ اشارہ درس ٹیپ کرنے والے اصحاب کی طرف ہے۔

❷ یہ تفصیل اسی کتاب کے پانچویں باب میں آئی ہے' جہاں آیات 32 تا 33 اور 44 تا 45 زیرِ درس آئی ہیں۔

چوتھا باب: سورة الشعرآء (آیات 46❶ تا49اور50 تا51)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1978ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعراء کی آیت 46 ❶ سے ہو رہا ہے حالانکہ یہ آیات (26:46-49) پچھلے درس میں بھی سامنے آ چکی تھیں۔

قرآنِ حکیم میں امم سابقہ کے بیان کردہ واقعات' کہانیاں نہیں ہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ ہم آگے چلے گئے تھے لیکن مجھے آج پھر پیچھے سے سرشتہ کلام کو شروع کرنا پڑتا ہے تا کہ ربطِ مضمون اسی طرح سے جاری رہے اس لیے میں نے آیت 46 کہا ہے۔ ویسے ہم پچھلی دفعہ آیت 49 تک آ گئے تھے جسے آج مجھے دہرانا پڑے گا۔

---

❶ پچھلے باب میں آیات (26:46-49) آ چکی ہیں۔ یہاں ربطِ مضمون کے لیے انہیں دہرایا گیا ہے۔

آپ کو یاد ہے کہ میں بار بار اس حقیقت کو سامنے لاتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے یہ جتنے واقعات ہیں' اممِ سابقہ کی یہ جتنی سرگزشتیں ہیں' انبیائے گزشتہ کے یہ جتنے کوائف ہیں' یہ کہانیاں نہیں ہیں' یہ محض تاریخ نہیں ہے بلکہ ان کے اندر انسانیت کی ہدایت کے لیے ابدی حقائق ہیں اور انہیں تاریخی شہادتوں کی سند کی تائید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان سب میں یہ جو آویزشِ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ہے' اس کو اس اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ یہ ایک بڑا جامع طور پر انقلابی مرحلہ ہے۔ انسانیت کو ذبح کرنے والی تین ہی چھریاں دنیا میں ہیں۔ ایک انسانوں کی انسانوں پر حکومت' اسے آپ سیاست کہہ لیجیے' ملوکیت کہہ لیجیے۔ دوسری چیز نظامِ سرمایہ داری ہے' وہ بھی درحقیقت انسانوں کا انسانوں پہ غلبہ ہوتا ہے' پہلے میں سیاست کے زور پہ ہوتا ہے' فوج کے زور پہ ہوتا ہے' اس دوسرے میں معاشی محتاجی پیدا کر کے' دوسرے کی روٹی چھین کر پھر اس سے ہر کام کرایا جاتا ہے اور یہ جو درمیان میں کرانے والے ہیں' یہ مذہبی پیشوائیت ہوتی ہے اور یہ ان تمام چیزوں میں ایک فریب دے کر کام کراتی ہے۔ یہ وہ ہے جسے قرآن نے سحر کہا ہے۔ اب آپ کو بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ جنہیں دربارِ فرعون کے ساحرین کہا جاتا ہے ان کے بارے میں ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے کہ وہ جادوگر تھے' وہ آئے' انہوں نے کوئی جادو کی رسیاں پھینکیں' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر تھے (معاذ اللہ معاذ اللہ) انہوں نے ان کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا۔

مذہبی پیشوائیت کی تھپکیوں کا نتیجہ

یہ مذہبی پیشوائیت کی سحرکاریاں ہیں۔ یہ کالا جادو اور نورانی جادو اور ٹونے اور ٹوٹکے نہیں ہیں۔ مذہبی پیشوائیت ان محکوم ومحتاج قوموں کو سلائے رکھتی ہے کہ یہ حکمران تو "ظِل اللہ علی الارض" ہیں یعنی خدا کا زمین کے اوپر سایہ ہیں۔ یہ خود حکومت نہیں کرتے ہیں یہ تو ان کی شکلوں کے اندر خدا کی حکومت ہے۔ ان کے خلاف' ان کے کسی حکم کی نافرمانبرداری' خدا کی نافرمانبرداری ہے۔ وہ بار بار یہ تھپکیاں دیتے رہتے ہیں۔ سرمایہ داری کا نظام آتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ میاں! رزق تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے' جسے چاہے امیر بنا دے' جسے چاہے غریب بنا دے' جسے چاہے لکھ بنا دے جسے چاہے لکھ بنا دے' غریب کا اپنی غریبی کے اوپر شکایت کرنا' امیر کی امارت کے متعلق ذرا سا دل میں خیال لانا کہ صاحب! یہ سب کچھ لے گئے یہ تو خدا کی تقسیم کے خلاف اعتراض ہے' توبہ کرو بابا! کیا کر رہے ہو' قیامت بھی تو آنی ہے۔ یہ سلائے رکھتے ہیں۔ ان کا Function (فعل) یہ ہوتا ہے۔

داستانِ بنی اسرائیل کا مرکزی نکتہ فرعون' ہامان اور قارون کے کردار کی وضاحت پر مبنی ہے

ساری انسانیت کی تاریخ کے اندر آپ دیکھیں گے کہ انسان کے ہاتھوں انسان کا گلا گھونٹنے کی یہ تین ہی لعنتیں ہیں۔ داستانِ

حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ تینوں کی تینوں لعنتیں یکجا اکٹھی ہوگئی تھیں: فرعون کی فرعونیت' انسان کی استبداد کی حکومت' قارون کی سرمایہ داری' ہامان کی مذہبی پیشوائیت۔ یہ جو آتا ہے کہ جب فرعون دلائل سے قاصر آ گیا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' ان کو تھوڑے وقت کے لیے مہلت دیجیے اور اس نے ان کو بلایا جنہیں ساحرین کہا جاتا ہے۔ یہ جادوگر نہیں تھے۔ یہ مذہبی پیشوائیت تھی۔ کہا کہ آؤ' اپنی سحرکاری سے اس کو ذرامات کر کے دکھاؤ۔ وہ یہ Function (کام) تھا جس کو ادا کرنے کے لیے وہ آئے تھے۔ اس لیے قرآنِ کریم میں جس تفصیل کے ساتھ' شدومد کے ساتھ' اقرار وتکرار کے ساتھ' یہ داستان بیان ہوتی ہے' کوئی اور داستان ایسے بیان نہیں ہوئی اور اس میں بھی جو مختلف ٹکڑے آئیں گے وہ انہی تینوں کے متعلق آئیں گے۔ اس لیے اسے محض ایک کہانی سمجھ کر آگے نہیں گزر جانا چاہیے اور یہ وجہ ہے کہ جہاں بھی ان کا تذکرہ آتا ہے آپ دیکھیں گے میں دو دو تین تین چار چار دروس ان کے لیے مختص کر دیتا ہوں۔ یہ بڑی بنیادی حقیقتیں ہیں۔

ہمارے ہاں قرآن کو سمجھنے کا انداز

اب ہمارے ہاں قرآن سمجھنے کا جو انداز ہے' وہ یہی ہے کہ قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ وہ جو مذہبی پیشوائیت والے ان کے سامنے تھے جب حقیقت بے نقاب ہو کر آ گئی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ یہ شخص پیش کر رہا ہے' وہ صداقت ہے' وہ حق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ [1] (26:46)۔ اب آپ قرآن کے ترجمے دیکھ لیجیے۔ لکھا ہے کہ وہ سجدے میں گر گئے۔ ''وہ سجدے میں گر گئے'' کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ سجدہ کیا یعنی ماتھا زمین پہ رکھ دیا۔ قرآنِ کریم کے تراجم میں' تفاسیر میں' جہاں بھی آپ دیکھیں گے یہی لکھا ہے کہ انہوں نے صاحب! سجدہ کر دیا' سر زمین کے اوپر رکھ دیا۔

ساحرین کا سجدہ میں گر جانے کا مفہوم اور فرعون کا کردار

ارے بھئی! سجدہ کر دیا! وہ کونسی ایسی قیامت آ گئی جس کے اوپر اس نے اتنی بڑی گرج کے ساتھ' کڑکتے ہوئے' غضب کے عالم میں' بپھرے ہوئے شیر کی طرح کہا کہ اوہو! یہ بات ہے جو تم نے کی فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (26:49) میں تمہیں ابھی اس کا مزا چکھاتا ہوں۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (26:49) میں ابھی تمہاری مشکیں کسواتا ہوں' تمہیں الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈلواتا ہوں۔ صلیب پہ چڑھاتا ہوں' سولی پہ چڑھاتا ہوں' تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹتا

---

[1] وہ دلائل اس قدر واضح' بیّن اور محکم تھے کہ ان کی روشنی میں' پروہتوں پر موسیٰ ؑ کی دعوت کی صداقت بے نقاب ہوگئی اور انہوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔839)۔

ہوں۔اگر یہ سجدہ تھا تو اس سجدہ کرنے سے اس کا کیا بگڑا تھا؟

ہمارے ہاں انگریزوں کی حکومت کا پہلا اعلان

آپ کو معلوم ہے کہ جب یہاں انگریزوں کی حکومت [1] آئی ہے اور انہوں نے یہاں پوری طرح سے اپنے پاؤں جمائے ہیں' تو اس وقت اس مسلم قوم کو Queen Victoria (ملکہ وکٹوریہ 1819-1901ء) کی طرف سے جو پہلا منشور' جاری ہوا تھا' اس کی پہلی شق یہ تھی کہ اس ملک کی تمام آبادی' ہندو مسلمان عیسائی سکھ کوئی بھی ہوں' ان سب کو سجدوں کی اجازت ہوگی' ان سب کو عبادت کی اجازت ہوگی' ان سب کو پرستش کی اجازت ہوگی' ہم ان میں کوئی دخل نہیں دیں گے۔ایک حاکم قوم جب اپنی حکومت کو مستحکم کرتی ہے تو وہ پہلا اعلان یہ کرتی ہے کہ انہیں سجدوں کی اجازت ہوگی' عبادت کی اجازت ہوگی' پرستش کی اجازت ہوگی۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے مترجمین اور مفسرین کی جانب سے کہا یہ گیا ہے کہ فرعون کے ان مذہبی پیشواؤں نے سجدہ کر دیا۔ یہ کہہ کر وہ تمام آگے بڑھ جاتے ہیں۔آگے یہ ہے کہ یہ دیکھ کر فرعون نے یہ کہا کہ یہ کیا قیامت ہے۔ابھی دیکھو میں تمہیں اس کا مزہ چکھاتا ہوں۔مزہ چکھانے کا اس نے اعلان کیا کہ صلیب پہ چڑھا دوں گا' سولی پہ چڑھا دوں گا' ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا' کھال کھنچوا دوں گا' الٹا لٹکا دوں گا' یہ سب چیزیں اس نے ایک ہی سانس میں گرجتے برستے ہوئے کہدیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی پیشانی کو زمین پہ ٹکا دیا تھا تو یہ کونسی ایسی چیز تھی جس پہ اس طرح اس کا خون کھول گیا اور وہ آخری انتہائی سزا' جو کسی کو دی جاسکتی ہے' اس پہ آ گیا' یعنی وہ انہیں بغاوت کی سزا دے رہا ہے تو یہ جسے قرآن نے سجدہ کہا ہے' عزیزانِ من! بہت بڑی بغاوت کی نشانی ہے۔ یہ زمین پہ پیشانی ٹکا دینا نہیں ہے۔

سنیے! ان مذہبی پیشواؤں نے خود یہ کہدیا۔ سنیۓ قرآن کس طرح خود Explain (وضاحت) کر دیتا ہے کہ یہ بات کیا تھی جس کی وجہ سے یہ کچھ ہوا۔فرعون نے گرجتے برستے یہ کہا اور ان مذہبی پیشواؤں نے ایک تبسمِ جاں فروز کے ساتھ کہدیا کہ کیا کہہ رہے ہو! یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اتنے سے ہی کہ جب انہوں نے ہنس کر یہ کہدیا ہوگا تو پوچھو نہیں اس کی کیفیت کیا ہوئی ہوگی اور آگے ہے وہ بات کہ یہ ہوا کیا ہے' یہ ہوئی کیا تبدیلی ہے؟ انہوں نے اس کڑک اور گرج کو دل کے پورے سکون کے ساتھ سنا اور نہایت اطمینان سے **قَالُوْا لَا ضَیْرَ** (26:50) کہا کہ تم جو جی میں آئے کرو' اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔اب ہماری نگاہوں کا زاویہ بدل چکا ہے کیونکہ انہوں نے **قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ** (26:47-48)

---

[1] یعنی غیر منقسم انڈو پاک میں 1857ء

اعلان کر دیا کہ ہم خدائے رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں یعنی اس خدا پر جس کی طرف موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دعوت دیتے ہیں اور کہا کہ اِنَّـــآ اِلٰـــی رَبِّـنَـــا مُـنۡـقَـلِـبُـوۡنَ (26:50)۔منقلبون کا یہ لفظ انقلاب سے ہے۔کہا کہ ہم میں ایک انقلاب آ گیا ہے۔بھئی! اس انقلاب نے کیا کیا ہے؟ کہا کہ اس نے ہماری نگاہوں کا رخ بدل دیا ہے۔ یہ رخ کس سمت کو ہوگیا ہے؟ کہا کہ ''اِلٰی رَبِّنَا ''۔ پہلے جونصب العینِ حیات تھا' اب وہ بدل گیا ہے۔اب نگاہوں کا زاویہ بدلا ہے' منزلِ مقصود بدلی ہے' نصب العینِ حیات بدل گیا ہے۔ تیری جگہ خدا ہمارے سامنے آ گیا۔ یہ لفظ منقلبون ہے۔اسے انقلاب کہتے ہیں' عزیزانِ من! اب سمجھ میں بات آئی کہ یہ سجدہ کیا تھا؟ وہ کیوں گرجا تھا؟ کیوں برسا تھا؟ میں کہہ رہا ہوں کہ سجدے کا جو مفہوم ہمارے ہاں لیا جاتا ہے قرآن اس کی تائید نہیں کرتا مگر انہوں نے قرآن کے ترجمے میں بھی سجدے کا یہی مفہوم کر دیا ہے اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔

محسوسات کی خوگر قوم کی نفسیاتی کیفیات

میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو سجدہ ہے' جب انگریزوں نے یہاں اپنی مملکت مستحکم کی ہے' تو پہلا اعلان ملکہ وکٹوریا (1819-1901ء) کی طرف سے یہی ہوا تھا کہ مسلمانوں کو بھی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی' پرستش کی' سجدوں کی' اجازت ہے' انہوں نے سب سے پہلے اعلان کے اندر گارنٹی دی ہے اور ادھر یہ فرعون ہے جو اس سجدے کے اوپر یہ کہہ رہا ہے۔سجدے اور سجدے میں فرق ہے۔ یہ سجدہ صرف ماتھے کو زمین پہ ٹکانے کا نام ہے' حاکم قوم جانتی ہے کہ اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔اتنا ہی نہیں کہ کچھ نہیں بگڑتا' کبھی فرصت ہوئی تو میں بتاؤں گا۔ میں نے تو پچیس سال اس انگریز کی حکومت میں ان کے ساتھ گزارے ہوئے ہیں' میں آپ کو بتاؤں گا کہ ان کی نفسیات کیا ہوتی ہے اور کس طرح سے وہ ہماری رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں۔انہیں یہ معلوم تھا کہ اگر یہ زمین کے اوپر سجدہ کرنے والی جو بات ہے اس سے ان کو روکا تو یہ محسوسات کی خوگر قوم اسے برداشت نہیں کرے گی اور اگر اس کی اجازت دیدی تو ہمیشہ کے لیے مرہونِ کرم رہے گی:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

اور پھر وہ کہ

بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹہ
سنکھوں کی صدا گونجتی ہے روز برابر

ایک سجدہ قابلِ تحسین اور لائقِ سزائے موت

عزیزانِ من! یہ قصیدے ہیں جو ہم سے پڑھوائے جاتے تھے' ہم نے اپنے بچپن میں پڑھے ہیں۔ اسی سجدے پہ ایک وہ سجدہ ہے جس پہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تم دیکھو تو سہی میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔ ایک وہ سجدہ ہے جس کی وہ خود اجازت دیتے ہیں' اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں' مساجد بنوا کر دیتے ہیں' ان کے اندر قالین بچھوا کر دیتے ہیں کہ سجدے کرو' ایک سجدہ یہ ہے۔ اس کا ترجمہ سجدہ کر کے آپ آگے بڑھ جایئے تو بات بالکل سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اس کو ہوا کیا تھا؟ ہوا یہ تھا کہ اِنَّـآ اِلٰـی رَبِّـنَـا مُـنْـقَـلِبُوْنَ (26:50)۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہاں کیا ہوگیا ہے۔ یہ زمین پہ سر رکھ دینے والی بات نہیں ہے۔ یہ منقلبون ہے' یہ ہمارے اندر انقلاب آ گیا ہے اور انقلاب اور انقلاب میں بھی تو فرق ہے۔ ایک انقلاب تو وہ فساد ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ انقلاب تو قلب سے ہے۔ یہ تو دلی تبدیلی کا نام ہے۔ یہاں ہمارے اندر ایک تبدیلی واقع ہوگئی' اور وہ یہ ہے کہ پہلے نصب العین حیات تم تھے اور اب خدا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے آتے ہی کہا تھا کہ اگر ہم اس پہ غالب آ گئے' اگر ہم اس مناظرے کے اندر کامیاب ہوگئے تو بتایئے' ہمیں کیا انعام ملے گا اور اس نے یہ کہا تھا کہ انعام بھی تمہیں ملے گا اور سب سے بڑی چیز یہ ہوگی کہ اِذًا لَّـمِـنَ الْـمُـقَرَّبِیْنَ (26:42) تم ہمارے مقرب بن جاؤ گے تو اس سے زیادہ ایک محکوم کے لیے اور کیا بات ہے کہ وہ شاہ کا مقرب بن جائے۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب' پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

شاہ کا مقرب بن جانا یا مصاحب بن جانا' وہاں ایک ہی لفظ ہے۔ اس نے شاہ کا مقرب یا مصاحب ہو جانا کہا تھا' جسے وہ عزت دیدے پھر اس کا ٹھکانہ کیا ہے! ایک یہ کیفیت تھی۔ پہلی اور دوسری کیفیت انہوں نے بیان کی کہ صاحب! اب یہ خیال دل سے نکال دیجیے: اِنَّـآ اِلٰـی رَبِّـنَـا مُـنْقَلِبُوْنَ [1] (26:50)۔ یہ ایک انقلاب آیا ہے' تیری بجائے اب ہمارا نصب العین حیات خدا ہو گیا۔

مردِ مومن دنیا میں فرعونیت کا سب سے بڑا باغی ہوتا ہے

اور یہ ہے سب سے بڑا انقلاب جو اس سجدے کی شکل میں آیا ہے۔ یہ سجدہ کیا ہے؟ یہ کہ اب یہ سر تمہارے سامنے نہیں جھکے گا۔ اس

---

[1] ہماری تمام توجہات' اپنے نشوونما دینے والے کی طرف مرکوز ہیں' صحیح منزل آشکارا ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے (تم ہمیں بیگناہ قرار دے دو یا مجرم۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا' ہماری آرزو یہ ہے کہ جب ہم اپنے خدا کے حضور جائیں تو اس کے سامنے مجرم نہ قرار پائیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 840)۔

سے بڑی بغاوت اور کیا ہوسکتی ہے! ایک سانس میں وہ کہہ رہے تھے کہ تمہارا مقرب بننا ہمارے لیے وجہِ افتخار ہے اور دوسرے وقت وہ کہہ رہے ہیں کہ اب یہ سر تمہارے سامنے نہیں جھکے گا۔ ہمارے اندر انقلاب یہ آ گیا ہے کہ اب یہ کسی اور کے قوانین کے سامنے جھکے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے بغاوت کی سزا کیوں تجویز کی تھی۔ اس سے بڑی بغاوت کیا ہوگی! اس معاملے میں مومن سے بڑا باغی دنیا کے اندر کوئی نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! وہ کہتا ہے: لا الہ کہ تو بھی الہ نہیں' تو بھی الہ نہیں' کسی کے پاس اقتدار نہیں' کسی کے پاس اختیار نہیں تو اس سے بڑی بغاوت دنیا میں کیا ہوسکتی ہے۔ سارے الہ سے بغاوت ہے لیکن انارکی (انتشار) نہیں' کوئی بھی ایسا نہیں جس کے سامنے سر جھکے۔ یہ صرف الا اللہ ہے۔ یہاں آیا ہے: اِنَّـآ اِلٰی رَبِّـنَا مُنْقَلِبُوْنَ (26:50)۔ یہ ہے کہ پہلے الہ تم تھے' اب الہ کوئی اور ہوگیا ہے۔ دیکھا' اس نے اس بات کو' اس سجدے کو کیسے بھانپا!

آزاد قوم کے افراد شاہ کے منظورِ نظر تو ہوسکتے ہیں لیکن غلام قوم کی مانند جوہرِ خودی سے عاری نہیں ہوتے

قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں یہی چیز آئی ہے۔ آیئے میں آپ کو عرض کروں کہ دوسرے مقام پہ کن الفاظ میں انہوں نے یہ بات کہی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! ابھی میں اس کی تفسیر بیان کرونگا۔ قوم آزاد تھی' پہلے نگاہ کی غلطی تھی' فکر کی غلطی تھی' سمجھ کی غلطی تھی' سوچ کی غلطی تھی۔ جب اس میں اصلاح واقع ہوئی' حقیقت سامنے آ گئی' تو وہ جو اندر خودی کے جوہر تھے' وہ موجود تھے' وہ اجاگر ہوگئے۔ غلام کے اندر جوہرِ خودی مفقود ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل میں ذرا آگے چل کر عرض کرونگا۔ اس انقلاب کے بعد آپ دیکھیے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ معاف رکھیے گا آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے' بات سجدے کی آ گئی ہے۔ سنیئے! یہ انقلاب کیا کرتا ہے؟

اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنے کی بجائے سیاستِ فرعونی کی عمل پیرائی

سورۃ طٰہٰ میں اور اس سورۃ الشعراء میں بھی یہ آیا ہے کہ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ [1] (20:71)۔ پہلی چیز یہ ہے کہ جب صاحب کو اقتدار کی کرسی ملتی ہے تو اس کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ مجھ میں کیا نقص ہے' میرے اس نظام میں کیا نقص ہے' بلکہ اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہورہی ہے' اندر سے یہ تو ملے ہوئے تھے۔ دیکھا' کیسے وہ سیاستِ فرعونی سامنے آئی جسے اقبالؒ (1938-1877ء) نے اپنے ہاں کہا ہے۔ اللہ آپ کو توفیق دے تو ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کو کبھی پڑھیے گا' وہ چھوٹی سی مثنوی ہے لیکن اسے پڑھیے گا قرآن کی روشنی

---

[1] تم میری اجازت کے بغیر ہی موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لے آئے ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ (موسیٰؑ) تمہارا پیر و مرشد ہے جس نے تمہیں پروہتی کا علم سکھایا تھا۔ (تم اندر سے' سب ملے ہوئے تھے تاکہ مجھے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلو)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 839)۔

میں۔ پہلا ری ایکشن (ردِّعمل) یہ ہوتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ اپنی طرف دیکھیں کہ کیا نقائص ہیں' کیا کمزوریاں ہیں' کیا چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس قوم کو یہ شکایتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ جو بھی آواز بلند کرے اس کے خلاف پہلا ری ایکشن (ردِّعمل) یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں' یہ سازش ہو رہی ہے۔ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ (26:49) اوہو! پتہ اب چلا تمہارا گروگھنٹال یہ ہے' اندر ہی اندر سب کچھ تم اس سے سیکھے ہو اور یہ بن کے آ گیا ہے' یہ ایک دوسری قوم کا فرد ہے' تم دوسری قوم کے فرد ہو اور یہ جو اندر ہی اندر مناظرے ہو رہے تھے' یہ سارا جتنا کچھ بھی ہو رہا تھا' یہ نوراکشی تھی' تم اندر سے ملے ہوئے تھے۔ دیکھا! ری ایکشن (ردِّعمل) کیا ہوتا ہے؟ ہر مستبد حاکم کا ری ایکشن (ردِّعمل) یہ ہوتا ہے' وہ اپنی طرف نہیں دیکھتا' وہ اپنی کمزوریوں کی طرف نہیں دیکھتا' یہ دیکھ پائے تو یہ کیفیت کیوں پیدا ہو۔ کہتا ہے کہ تم اندر سے ملے ہوئے تھے' سازش ہے' دیکھو! میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں حالانکہ نہ یہ ملے ہوئے تھے' نہ یہ سازش تھی۔ اس نے کہا کہ صلیب پہ لٹکوا دوں گا' اعضا کاٹ دوں گا' موت آئے گی۔

فرعون کے سامنے ایمان کی پختگی کا اظہار

سنیئے عزیزانِ من! کہا کہ سن رکھو! قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا (20:72)۔ کہا بات اصل میں یہ ہے کہ پہلے ہمارے سامنے کوئی دو Possibilities (امکانات) یا دو Alternatives یا دو متبادل چیزیں نہیں تھیں' تم ہی بادشاہ تھے' تم ہی خدا تھے' تم ہی ان داتا تھے' تم اپنے آپ کو انا ربکم الاعلیٰ کہتے تھے' ہم تسلیم کرتے تھے' کوئی دوسرا سامنے تھا ہی نہیں۔ اب ہمارے سامنے ایک اور آ گیا ہے اور وہ ایسا ہے جس پر ہم تمہیں کسی قیمت پر بھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ ایمان اسے کہتے ہیں' عزیزانِ من! باقی رہا یہ کہ تم نے جو ہمیں یہ دھمکی دی ہے' ڈراوا دیا ہے' یہ ڈراوا نہیں ہے' ہم جانتے ہیں کہ تو یہ سب کچھ کر دے گا۔ سنیئے الفاظ عزیزانِ من! فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ (20:72) کوئی رحم کی درخواست نہیں' کوئی اور Explanation (وضاحت) نہیں ہے' کہا کہ جو تیرے جی میں آئے فیصلہ کر لے' جو تیرے جی میں آئے' کر لے۔ آپ سنیئے ایمان لانے والے دلائل و براہین کی رو سے ایمان لائے ہیں' یہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ ''جو تیرے جی میں آئے کر لے'' اگلے الفاظ ہیں' عزیزانِ من! اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (20:72) تیری گرفت یا تیرا ہاتھ زیادہ سے زیادہ ہماری اس دنیا کی زندگی' اس طبعی زندگی' تک پہنچ سکتا ہے اور زندگی تو اس سے آگے جاتی ہے' وہاں تو تیرا باپ بھی نہیں جا سکتا۔

عزیزانِ من! جب زندگی کا یہ تصور ایمان بن جائے کہ زندگی یہی زندگی نہیں ہے لہٰذا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ (20:72) جو تیرے جی میں آئے کر لے' تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ اس کے لیے پھر الفاظ سن لیجیے۔ کہا کہ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (20:72) تیرا اختیار' تیرا اقتدار' تیری مملکت کا دائرہ' صرف اس دنیاوی زندگی تک ہے۔ یہ اس طبعی حیات تک

ہے اور زندگی تو اس سے آگے، بہت آگے، چلتی ہے۔اس زندگی تک تیری دسترس ہی نہیں ہے۔ تیرے جو فیصلے ہیں، وہ اس زندگی تک ہی ہیں۔تو بات کیا ہے! یہ تو اس زندگی تک کے فیصلے تک پہ صاحب بنا پھرتا ہے۔ جو جی میں آئے کر دے ہم تیری گرفت سے بہت آگے ہیں۔ تیری گرفت میں زیادہ سے زیادہ یہ جسم آ سکتا ہے، ہم تیری گرفت میں نہیں آ سکتے، ہم بہت آگے چلے گئے ہیں۔

فرعون اپنے ساحرین پر جرم عائد کرنے کے سلسلہ میں کشادہ ظرف واقع ہوا تھا

ان مذہبی پیشواؤں نے ایک بات اور بھی کہی کہ ہم تیرے شکر گزار بھی ہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ کس بات کے شکر گزار ہیں؟ کہا کہ اس بات کے شکر گزار ہیں کہ تو نے بہر حال کچھ تھوڑا سا کشادگیٔ ظرف کا ثبوت دیا ہے: وَ مَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا (7:126)۔شکر گزاری یہ ہے کہ تو نے یہ نہیں کیا کہ ہمیں گرفتار کرا دیتا۔ بات تو تیرے دل میں یہ تھی کہ ہم بغاوت اختیار کر رہے ہیں اور تو نے یہ کھلے بندوں کہا ہے۔ اگر اس کے بجائے کوئین کی پڑیا ہمارے گھر میں بھیج دیتا اور گرفتار کرا دیتا، کسی چوری کے مقدمے میں محبوس کر کے لے آتا تو وہ بات ہمارے لیے بڑی وجہ ذلت ہوتی۔ ہم تیرے شکر گزار ہیں کہ تو نے صرف یہ جرم ہم پہ عائد کیا ہے کہ تم خدا پر ایمان کیوں لے آئے ہو۔تمہارا شکریہ۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس سے فرعون کی کشادگیٔ ظرف بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ کس معنی میں اعتراف کرتے ہیں کہ شکریہ؟ اس معنی میں کہ تو نے ہمارے خلاف صرف یہی جرم عائد کیا ہے کہ ہم خدا پہ ایمان کیوں لے آئے۔ یہ وہ جرم ہے جس کا ہم فخر سے، مسرت سے، دل و جان سے اعلان کرتے ہیں کہ ہاں ہم نے یہ جرم کیا ہے، ہزار بار کیا ہے:

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
پھر اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

فرعون کی عدالت کے مجرم اور خدا کی عدالت کے مجرم میں فرق

ساحرین دربارِ فرعون نے کہا کہ تو نے وہی فردِ جرم ہم پہ عائد کی ہے، ورنہ ہم جانتے ہیں جو اس دور کی میکاوَلی سیاست، سیاستِ فرعونیہ ہے۔ وہ کبھی صحیح جرم کو سامنے نہیں لاتی۔ وہ ایسے جرائم ان کی طرف منسوب کرتی ہے جس میں تذلیلِ انسانیت ہوتی ہو۔ دیکھتے ہیں کہانی کے اندر، کیا باتیں چلی آ رہی ہیں! شکریہ ادا کیا ہے کہ تم نے یہی جرم عائد کیا، اس کا ہمیں اعتراف ہے۔ باقی رہا مجرم، تو کہا کہ مجرم اور مجرم میں فرق ہے: اِنَّهٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ (20:74)۔تیری عدالت میں اور خدا کی عدالت میں مجرم بن کر آنے میں فرق ہے۔ تیری عدالت میں وہ جرم باعثِ فخر ہے، جبکہ باعثِ ذلتِ انسانیت یہ ہے کہ خدا کی عدالت میں انسان مجرم بن کر جائے۔ اس کا احسان ہے کہ ہم تیری عدالت میں مجرم بن کر آئے ہیں۔ اس کی عدالت میں مجرم بن

کر نہیں جائیں گے۔ تیری عدالت میں جرم کی سزا ملے گی' یہ زندگی ختم کر دو گے' جسمانی زندگی ختم کر دو گے' یہ تم نے ختم کی' سزا ختم ہوگئی' موت کے بعد تو سزا ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی بارگاہ میں اگر کوئی مجرم بن کر جائے گا تو وہاں کی سزا کی کیفیت یہ ہوگی کہ **لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَ لَا یَحۡیٰی** (20:74) وہاں نہ زندگی ہوگی نہ موت ہوگی' انسان نہ زندوں میں شمار ہوگا' نہ مُردوں میں۔ یہ وہ سزا ہے جسے سزا کہتے ہیں' اس کے مقابلے میں یہ کیا سزا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کیسے دلیل پہ دلیل چلی آرہی ہے کہ تیری دسترس تو اسی دنیاوی زندگی تک ہے' اس سے آگے تیرا ہاتھ نہیں جاسکتا اور تیری سزا زیادہ سے زیادہ یہ سانس ہی ہیں' جو لے سکتی ہے' پھانسی کے تختے پہ چڑھا دو گے تو یہ نہیں آئیں گے' اس کے بعد آگے تو کچھ نہیں۔ لیکن اس کی عدالت میں جس مجرم کو سزا ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں نہ یہ زندگی ہوتی ہے' نہ موت آتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس سزا سے بچ گئے۔ تیری سزا کیا ہے جسے تو سزا کہتا ہے؟ یہ کچھ بھی نہیں۔

ساحرین کا یہ سجدہ ان کا ذہنی اور نفسیاتی انقلاب تھا

آپ نے غور فرمایا' عزیزانِ من کہ یہ سجدہ کیا ہے؟ میں نے کہا ہے کہ یہ صرف ماتھے کا زمین پر ٹکا دینا نہیں ہے۔ یہ **مُنۡقَلِبُوۡنَ** ❶ ہے۔ یہ ایک انقلاب تھا۔ جو اندرونی انقلاب ہوتا ہے' اس کی مرئی' محسوس شکل ہوتی ہے' جسے ہم سجدہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے' جیسے ہم جب کسی کو سلام کرتے ہیں تو ماتھے پہ یوں ہاتھ رکھتے ہیں' دوسرا اگر آواز نہ بھی سنے' دیکھ ہی لے تو اس کو معلوم ہے کہ سلام کر رہا ہے۔ یہ انسان کے اندر ایک نفسیاتی کیفیت ہے' جو اس کے دل کے اندر یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے' اس کا محسوس اظہار حرکات و سکنات سے ہوسکتا ہے۔ یہ Parallelism (متوازیت) کہلاتا ہے۔

سجدے کے معنیٰ' اس کا مفہوم' اور اس کا انداز

انسان کے باہر کی حرکتوں سے' دل کے اندر سے چھپے ہوئے جذبات کا اظہار یا نمود ہوتی ہے۔ رکوع میں جائیے تو آدھا جھکاؤ ہوتا ہے' اس سے بھی آپ کی تسکین نہیں ہوتی کہ ''نئیں' جی نئیں بھریا❷'' تو پھر اس کے سامنے زمین پہ سر رکھ دیتے ہو۔ یہ سر رکھنا کوئی بات نہیں۔ یہ **مُنۡقَلِبُوۡنَ** تو وہ ہے' جو اندر ایک انقلاب آیا ہے' یہ اس کی محسوس نشانی ہے جو میں کر رہا ہوں۔ کہا کہ **اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ** ❶ (26:50)۔ سجدے کے معنی ہی قرآنِ کریم کی رو سے یہ ہیں' عزیزانِ من! دو چار آیات پیش کرتا ہوں' ورنہ

---

❶ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ (26:50) ہماری تمام توجہات' اپنے نشوونما دینے والے کی طرف مرکوز ہیں' صحیح منزل آشکارا ہو کر سامنے آچکی ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔840)۔

❷ نہیں جناب! دل نہیں بھرا۔

اس کے لیےتو قرآن میں بہت سی آیات ہیں۔قرآن کا پیغام ہی یہ ہے:اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ (7:206)خدا کے بندوں کی نشانی پوچھتے ہو؟وہ اس کی اطاعت اور محکومیت سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ یہ ان کی علامت بتائی۔ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ (7:206)یعنی وہ صرف اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔تفسیر تو قرآن آپ بتا رہا ہے کہ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ [1] (7:206)۔اب ہمارے ہاں عبادت کا ترجمہ پرستش ہوا کہ اس کی پرستش سے کبھی سرکشی نہیں کرتے اور یَسۡجُدُوۡنَ کے معنی یہ ہوئے کہ سجدہ زمین پہ سر رکھ کر کرتے ہیں۔ایک بار نہیں' جو نمازی ہیں' وہ دن میں کم از کم چوالیس مرتبہ زمین پہ سر رکھتے ہیں۔اس کی کوئی سزا نہیں دیتا' کوئی سولی پہ نہیں لٹکاتا' بلکہ اس کے لیے آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔جو یہ ''سجدہ'' ہے' یہاں تو یہ کہا ہے کہ وہ اس کی محکومیت سے' اس کی اطاعت سے سرکشی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرے مقام پہ دونوں چیزیں آ گئیں: لا الٰہ بھی کہ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے' صرف اس کے احکام کے سامنے جھکتے ہیں۔سورۃ العلق کی آخری آیات ہیں' میں وہ پوری آیات تو نہیں پیش کر سکتا۔ وہاں ایک مخالف کا یا مخالفین کے نمائندے کا ذکر ہے کہ رسول اللہؐ کے سامنے کس انداز سے اس نے مخالفت کی اور کیا کیا اس کے عزائم تھے' کیا کیا ارادے تھے' کس شکل میں سامنے آیا ہے؟ یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ کیا وہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ اسی طرح کرتا چلا جائے گا اور کوئی اسے روکنے والا ہی نہیں ہوگا؟ کَلَّا (96:19)رسول! آگاہ رہو' سن رکھو کہ ہرگز نہیں! لَا تُطِعۡہُ (96:19)اس کی بات نہ مانو' اس کی اطاعت نہ کرنا۔ یہ ہوا لا الٰہ کہ یہ نہ کرنا۔عربی جاننے والے جانتے ہیں یہ کَلَّا کہاں آتا ہے۔اس کے اندر وارننگ دی جاتی ہے: دیکھنا کہیں ایسا نہ کر لینا' دیکھنا کوئی اور الٰہ نہ تجویز کر لینا۔اور کیا کرنا؟ وَاسۡجُدۡ (96:19) خدا کی اطاعت کرنا' اس کے قوانین کی اطاعت کرنا۔اس سے کیا ہوگا؟ کہا کہ وَاقۡتَرِبۡ (96:19) یہ سجدہ کر' اور اس کے قریب ہو جا' ایک سجدہ کر اور اس سے اور قریب ہو جا۔ یہ ہے سجدہ' عزیزانِ من! اس سے اور قریب ہو جا۔

سجدے کے قبول ہونے اور نہ ہونے کا معیار

مجھ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا تھا کہ وہ سجدہ قبول ہوا ہے یا نہیں؟اس کی نشانی کیا ہے؟ میں نے کہا: بھئی! میں تو کیا عرض کروں جس کا قبول ہوا ہو اس سے پوچھو' میں اتنا ہی جانتا ہوں اگر سجدہ کرنے سے پہلے اور سجدہ کرنے کے بعد کی آپ کے اندر کی حالت میں فرق نہیں آیا تو سجدہ قبول نہیں ہوا۔ ایک ایک سجدے سے اندر انقلاب آتا جاتا ہے' عزیزانِ من! حضور نبی اکرم ﷺ

---

[1] وہ اس کی اطاعت میں کبھی سرتابی اختیار نہیں کرتے۔

نے فرمایا تھا کہ صلوٰۃ مومن کی معراج ہے۔معراج کے معنی میں ہم نے یہی دیکھا ہوا ہے کہ یہ وہ ہے جس کو ہم معراج شریف کہتے ہیں' ورنہ وہ تو بڑی اعلیٰ بات کہہ گئے ہیں۔انہوں نے فرمایا کہ جوصلوٰۃ ہے' وہ مومن کے لیے سیڑھی ہے۔معراج تو سیڑھی کو کہتے ہیں' ہر سجدے کے ساتھ ''اک ڈنڈا اُتاں ہوجاندا اے ❶ ''یہاں کہا کہ **وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ** (96:19) ہر ڈنڈا جس پہ آپ اوپر چلتے ہیں' اس سے آپ اپنی منزل کے اور قریب ہوجاتے ہیں' اس کے قریب جو آخر میں سب سے بڑی بلندی کے اوپر ہے' جہاں آپ نے پہنچنا ہوتا ہے۔اس طرح ہر نئے ڈنڈے کے اوپر قدم رکھتے ہیں' تو آپ اپنی منزل کے اور قریب ہوجاتے ہیں۔کس قدر لطیف چیز ہے! یہ ''واسجد'' کا ایک لفظ ہے: ہور اُتاں چلیا جا' ہور جا چلیا ❷ جا ہور ❸ قریب ہوجا' ہور قریب آ جا' آ جا۔کس طرح سے اوپر کشادہ ظرفی سے کھڑا کہہ رہا ہوتا ہے: چلا آ ' میرے بیٹے! چلا آ میرے بچے! چلا آ ۔ مائیں یہ کرتی ہیں' جب وہ بچے کو سیڑھیاں چلاتی ہیں۔خدا کہتا ہے: **وَاسۡجُدۡ** (96:19) بظاہر یہ ہے کہ سجدہ کر' نیچے جھک' واقترب' یہ تو سیڑھی ہے' اوپر چلا آ ' اور تیرے جھکاؤ کے اندر' تیری پیشانی میں' معراج جھلک رہا ہے۔یہ سجدہ! پتہ ہے اس سجدے سے کیا ہوتا ہے؟ آیئے اب بتائیں کہ ساحرین کے اس سجدے سے ہوا کیا؟

مومن کا ایک سجدہ اسے دنیا کی ہر طاغوتی قوت سے آزادی دلانے کا موجب بنتا ہے

سنیئے' اقبالؒ (1938-1877ء) نے جو سمجھا تھا اور پھر اسے سمجھایا کیسے تھا؟ کہا کہ

مسلمانیم و آزاد از مکانیم

مسلم کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ جو آپ کے ہاں کے یہ مکان اور زمان حدود ہیں' وہ ان سے بہت بلند ہوتا ہے۔

بروں از حلقۂ نہ آسمانیم

وہ تو اس کائنات کے حلقے سے بھی آگے ہوتا ہے' مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے۔اور بات آگے کہی کہ:

بما آموختمند آں سجدہ کزوے

ہمیں تو وہ سجدہ سکھایا گیا ہے کہ جس سے

بہائے ہر خداوندے بدانیم

---

❶ ایک قدم اوپر اٹھ جاتا ہے۔

❷ اور اوپر چڑھتے جاؤ' اور اوپر

❸ اور زیادہ

دنیا کے ہر خدا کی قیمت ہم جان گئے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔ہمیں تو وہ سجدہ سکھایا گیا ہے۔کیا بات کہدی! کیا ہے کہ دنیا کے ہر خدا کی قیمت جان گئے ہیں۔ یہ سب خدا بکاؤ مال ہوتے ہیں' مگر ہمیں ان کی قیمت کا پتہ نہیں ہوتا' اورہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بھی بکاؤ مال ہے' یہ بھی جان گئے ہیں حالانکہ ایک ایک کے گلے کے اندر وہ چٹ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ جو دوکانوں پہ آجکل ہوتا ہے جہاں بھاؤ نہیں کرانا پڑتا' ہرایک کے اوپر اس کی قیمت لکھ دیتے ہیں' ہر خدا کی گردن کے اندر وہ چٹ ہوتی ہے۔ہم پھراس کو پڑھ لیتے ہیں کہ اِس کی یہ قیمت ہے' اُس کی وہ قیمت ہے۔ یہ ہے عزیزانِ من' وہ سجدہ!

نخواہم ایں جہان و آں جہاں را

یہ سجدہ بزنس نہیں ہے' تجارت نہیں ہے' سوداگری نہیں ہے کہ سجدہ کرتے ہیں اور خدا سے کہتے ہیں کہ اس کے معاوضے میں جنت دیدے' یہ تو سودے بازی ہوئی۔ کہنے لگے کہ بات یہ نہیں ہے۔ نہ یہ جہان چاہیے' نہ وہ جہان چاہیے:

مرا ایں بس کہ دانم رمزِ جاں را

اتنی بات ہی ہے کہ مجھے خود معلوم ہوجائے کہ جو انسانی زندگی' انسانی جان ہے' اسکا راز کیا ہے' یہ مجھے بتادے اور

سجودے دہ کہ از سوز و سرورش

ایسا سجدہ دے کہ اس کے سوز اور سرور سے

بوجد آرم زمین وآسماں را

کائنات وجد میں آجائے۔ وہ ہے یہ سجدہ۔ یہ ہے وہ ''مُنۡقَلِبُوۡنَ'' (26:50)۔اس میں منزلِ مقصود بدل جاتی ہے' نصب العینِ حیات بدل جاتا ہے۔ یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے' عزیزانِ من! اس سجدے سے وہ جرأت پیدا ہوتی ہے کہ جب ہر خداوند کی قیمت چٹ پہ لکھی ہوئی اس کی گردن میں ہمارے سامنے ہو' پھر خوف کی کوئی بات نہیں رہتی' معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تو خود اس قیمت میں خریدا جاسکتا ہے' اس سے ڈرنے کی کونسی بات ہے۔ وہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ صداقت کی جو بات دل محسوس کرتا ہے' بلا دھڑک 'جرأت کے ساتھ' وہ اسے زبان پہ لے آتا ہے:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

(اقبالؒ: بال جبریل)

قلندروں کا یہ طریق ہوگیا: ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق۔ جب دل نے صداقت کو دیکھ لیا تو زبان پہ وہ چیز کیوں نہ

آئے۔عزیزانِ من! جب دنیا کے ہر خدائی کے مدعی کی قیمت آپ کو معلوم ہو جائے تو یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

کافر اور مومن کے درمیان حدِ فاصل صرف خدا کا قانون ہے

ایک یہ ہے جو ان کا ایمان ہے' ایک وہ ہے جو ہمارا ایمان ہے۔ہمارے ایمان سے پہلے ایک بات اور سن لیجئے' ایک اور آیت یاد آ گئی۔قرآنِ کریم میں بتایا گیا ہے کہ **لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ** (47:19) : کائنات کے اندر کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' کسی کے حکم' کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکنا: الا اللـہ (47:19) بس ایک ہی صاحبِ اقتدار ہے۔ **اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ** (6:57). حقِ حکومت صرف اس کو ہے' صرف اس کے قوانین کے سامنے جھکو۔اس کے قوانین اس کی کتاب کے اندر مندرج اور محفوظ ہیں۔یہی بات تو اس نے کہی کہ **وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44) کافر اور مومن کی تفریق ہی یہ ہے کہ جو بھی خدا کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' انہیں کافر کہا جاتا ہے' تو قرآن کا یہ مقام ہوا۔ سورۃ انشقاق میں ہے کہ **فَمَا لَھُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ** (84:20) حیرت ہے کہ انہیں معلوم نہیں کہ ہم شرفِ انسانیت کی کتنی بڑی بات ان کو بتا رہے ہیں: ''کسی انسان کے سامنے نہیں جھکنا''۔ یہ کتنی بڑی چیز ہے' عزیزانِ من! ہم ان سے یہ کہہ رہے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی' یا ان کا دل نہیں مان رہا' پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے!! یہ تعجب سے کہتا ہے۔کہتا ہے ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَاِذَا قُرِئَ عَلَیۡھِمُ الۡقُرۡاٰنُ لَا یَسۡجُدُوۡنَ** (84:21) اور جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا جاتا ہے تو اس کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔

ہمارے ہاں حاشیہ میں لکھے گئے ''السجدہ'' کی تکمیل کا انداز اور مفہوم

میں اس آیت کا مفہوم بتانے سے پہلے یہ عرض کروں کہ آپ نے قرآنِ کریم کے چھپے ہوئے نسخے دیکھے ہونگے' کہیں کہیں حاشیے پر ''السجدہ'' لکھا ہوا ہوتا ہے' وہاں جب وہ آیتیں آتی ہیں تو وہ جسے قرأت کے آدابِ قرآن کہتے ہیں' اس میں ہوتا یہ ہے کہ وہ پڑھ رہا ہے جب وہاں وہ آیت آئے تو وہ قرآن کو یوں بند کر کے' ٹھپ کر' رکھے اور اس کے بعد ایک سجدہ کرے اور پھر آگے قرآن پڑھے۔اس آیت کو آیتِ سجدہ کہتے ہیں یعنی جب اس آیت پہ پہنچے تو سجدہ کرے اور پھر آگے بڑھے حتیٰ کہ تراویح میں' رمضان میں بھی' وہ حافظ جب پڑھ رہا ہوتا ہے' تو بتاتا ہے کہ اس میں اب آیتِ سجدہ بھی آئے گی کہ جب وہ ہو تو وہ پھر کھڑے کھڑے ہی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ یہ جو سجدہ ہے' اس سجدے کے حکم کی تعمیل اس طرح سے ہوتی ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس وقت جب اس آیت پر پہنچے تو یوں سجدہ کر دیجئے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے خلاف' سجدہ کیا تھا؟ یہ وہ کہہ رہا ہے کہ **فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ** (84:20) یہ کیوں نہیں ان حقائق پہ ایمان لاتے۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ** (84:21) جب قرآن ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو **لَا يَسْجُدُونَ** (84:21). وہ کہہ یہ رہا ہے کہ ان کو کیا ہوگیا ہے' قرآن جیسی چیز جو ساری دنیا کی محکومیت سے ان کو چھڑا کر شرفِ انسانیت کے بلند مقام پہ پہنچانے والی ہے' جب وہ ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو یہ اس کے سامنے نہیں جھکتے' اوروں کے دروازوں کے اوپر جا کر جھکتے ہیں۔ان کو کیا ہوگیا ہے؟ کہ یہ **لَا يَسْجُدُونَ** (84:21) ہیں۔کتنی بڑی چیز تھی جو قرآن نے ان آیات میں کہی ہے' کہ قرآن پیش کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے نہیں جھکتے بلکہ دیگر چیزوں کے سامنے جھکتے ہیں۔ مسلمان نے کتنا آسان بنا دیا کہ جب یہ آیت آپ کے سامنے آئے تو اس آیت کو پڑھ کر' قرآن کو ٹھپ کر دیجئے' ایک سجدہ کیجئے اوراس کے بعد پھر آگے چل پڑیئے۔چلو جی خدا دا آ حکم تے منیا گیا نا[1] ۔اس نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ قرآن پیش کیا جاتا ہے تو اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہم نہیں ہیں' یہ اور ہیں۔ دیکھیے' جب ہمارے سامنے یہ آیت آئی ہے''تے اسی تے جھٹ سجدے اچ گئے آں''[2] ۔منکر کے لفظ سے یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی: اے مُنکر نئیں ہوئے ہوئے قرآن توں [3] ۔کیفیت یہ ہے کہ آیاتِ سجدہ جتنی آتی ہیں تو ان کے اوپر جو حکمِ خداوندی ہے' تو ہم اسی وقت اس کی تعمیل کر دیتے ہیں: قرآن کو الگ رکھ کر سجدہ کر دیتے ہیں۔خدا کے حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔منکر تے نئیں نا ہوئے ہیگے [4] ۔وہ یہ کہہ رہا تھا کہ **لَا يُؤْمِنُونَ** (84:20) یہ ایمان نہیں لاتے' یہ خدا کے قانونِ مکافات کو تسلیم نہیں کرتے۔اس کے آگے یہ بات ہے۔ یہ ہے وہ سجدہ جو یہاں کہا گیا ہے۔ایک ایمان یہ ان ساحرین کا تھا۔

علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات میں اس سجدے کا ذکر

ایک بات یاد آ گئی' شاید میں نے اس کو کہیں نہیں لکھا۔حضرتِ علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) سے جب 1938ء میں میری آخری ملاقات [5] ہوئی ہے تو وہ بہت بیمار تھے۔سید نذیر نیازی (1900-1981AD) نے ''اقبالؒ کے حضور'' کتاب لکھی ہے۔

---

[1] اچھا ہوا کہ خدا کے اس حکم کی تو تعمیل ہوئی۔

[2] ہم تو فی الفور سجدے میں جا گرے۔

[3] یہ قرآن سے منکر نہیں ہوئے ہیں۔

[4] منکر تو نہیں ہوئے ہیں۔

[5] اس کے لیے ملاحظہ کیجیے: پرویزؒ غلام احمد: علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقات' طلوع اسلام' 4:4' اپریل 1951' ص ص۔30 تا35۔

اس میں ہماری اس ملاقات کا تفصیلی ذکر ہے۔اس ملاقات میں یہ بات آئی ہے جب ''جاوید نامہ''[1] کے ایک نامے میں انہوں نے عالمِ بالا میں مختلف ارواح کی شکل کے اندر ان کے کوائف بیان کیے ہیں۔''جاوید نامہ'' بڑی عجیب کتاب ہے۔اس میں بہت سی جو بڑی بڑی بلند ہستیاں مختلف ادوار میں گزری ہیں' جن کا تاریخ میں ذکر آیا ہے' علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے ان کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اس آخری ملاقات میں ان سے یہ عرض کیا تھا کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس میں آپ کو دربارِ فرعون کے جو ساحرین تھے' انہیں بھی ضرور لانا چاہیے تھا' اس لیے کہ آپؒ نے جتنا کچھ سجدے کے متعلق ہمیں بتایا ہے وہ ان کے ایک سجدے میں' ان کی پیشانی میں' جھلک رہا ہے' اسے آنا چاہیے تھا۔انہوںؒ نے کہا کہ تم نے ٹھیک کہا کہ آنا چاہیے تھا' اور بھی کئی مقام ہیں جو آنے چاہئیں تھے' بہرحال اُس وقت نہیں یاد آیا' اگر مجھے مہلت مل گئی' زندگی ملی' تو میں ضرور یہ مقام لاؤں گا' ان کا مجھ پہ حق ہے کہ میں ان کا ذکر ''جاوید نامہ'' میں کروں۔

عزیزانِ من! ایک یہ ساحرین ہیں' اب دربارِ فرعون کا ایک اور مردِ مومن آتا ہے۔وہ بھی جب آگے آئے گا تو میں عرض کروں گا۔ایک ان ساحرینِ دربارِ فرعون کا ایمان ہے۔وہ پہلی بار اس حقیقت کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں۔آپ سوچیے ان کا مقام کتنا بلند ہے! ایک طرف وہ حکومت کرتے تھے' یہ لوگ پروہت تھے' پھر فرعون جیسا مستبد ظالم' بربریت کا مجسمہ ہے' جس کی کیفیت یہ ہے' وہ اسی طرح ان کے سامنے ہے اور ان کا جواب یہ ہے جو میں اوپر بتا چکا ہوں۔

---

[1] علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی اردو' فارسی اور انگریزی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

اردو تصانیف: علم الاقتصاد (نثر) (1903ء) بانگِ درا (1924ء) بالِ جبریل (1935ء)' ضربِ کلیم (1936ء) ارمغانِ حجاز حصہ اردو (1938ء) یہ علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

فارسی تصانیف: اسرارِ خودی (1915ء)' رموزِ بےخودی (1918ء)' پیام مشرق (1923ء)' زبورِ عجم (1927ء) جاوید نامہ (1932ء)' پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (1936ء)' مسافر (1936ء)' ارمغان حجاز حصہ فارسی (1938ء) یہ علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

انگریزی تصانیف: (۱) ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا انگریزی' اردو ترجمہ ''فلسفہ عجم'' شائع کردہ نفیس اکیڈیمی حیدرآباد (دکن) یہ وہ مقالہ ہے جو انہوں نے 1905 تا 1908ء کے قیامِ یورپ کے دوران مکمل کیا۔اس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔(۲) خطبات اقبال: Reconstruction of Religious Thought in Islam یہ لیکچرز 1928ء میں مدراس میں دیئے گئے اور 1930ء میں شائع ہوئے۔پہلے چھ لیکچرز تھے۔بعد میں ایک اور کا اضافہ کیا گیا (پرویزؒ: (1992ء) تصوف کی حقیقت۔لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ص ص۔258 تا 259)

نوٹ: اسی باب میں علامہ اقبالؒ کے مردحر کے عنوان سے دیئے گئے فارسی اشعار کی متعدد فٹ نوٹ میں دی گئی تشریح و توضیح اس کتاب سے ماخوذ ہے: پرویزؒ (1997)۔مجلس اقبال حصہ دوم۔لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)۔ص ص۔83 تا 91۔

نفع ونقصان کے پیشِ نظر ہماری حالتِ زار

انسان کے سامنے جلبِ منفعت اور مضرت دو ہی چیزیں ہوتی ہیں یعنی یا کوئی منفعت حاصل کرنا یا کسی نقصان سے بچنا۔ یہاں دونوں چیزیں تھیں۔ انہوں نے ان دونوں میں سے ایک کی بھی پرواہ نہیں کی' اعلان کر دیا اور دوسری طرف ایک ایمان ہمارا بھی ہے۔ میں ایمان سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' ورنہ میں نہیں سمجھتا۔ اب میں اس کے لیے کیا لفظ استعمال کروں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو قانونِ خداوندی سے روگردانی کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ **وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ** (22:11) وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں لیکن اس طرح گویا وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے انگریزی میں وہ On Defence لفظ ہوتے ہیں کہ نہ اِدھر ہونا' نہ اُدھر' دیوار کے اوپر بیٹھ کے دیکھتے رہنا' اگر اِدھر والوں کا غلبہ ہوا تو چھلانگ لگائی اِدھر' اگر اُدھر والوں کا غلبہ ہوا تو اُدھر۔ کہا کہ دنیا میں ان کو بھی دیکھیے' خدا کی عبودیت اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں مگر وہاں On Defense دیوار پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨاطۡمَاَنَّ بِهٖ** (22:11) اس اطاعت سے اگر فائدے حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں' تو اللہ کا شکر ہے۔ صاحب! اس کے عبادت گزار ہیں' بڑے مطمئن ہوتے ہیں' فائدے حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن **وَ اِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨانۡقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ** (22:11) اور اگر ذرا کہیں نقصان کا احتمال ہو تو جھٹ دوسری طرف چھلانگ مار کر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ **خَسِرَ الدُّنۡيَا وَ الۡاٰخِرَةَ** (22:11) ذلت اور رسوائی' اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' ان کی حال کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی بھی' دنیا میں خسارہ اور آخرت میں بھی۔ **ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ** (22:11) یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے جس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ جس کا دونوں جہانوں میں منہ کالا ہو جائے' تو قرآن کہتا ہے کہ اس سے بڑا نقصان کس کا ہوگا۔ یہ ہے جہاں ہم لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو بالکل چھوڑ کے' تیاگ کے' الگ ہوگئے۔ ملحد بے دین' سچ مچ ہو جاتے ہیں' وہ ان چیزوں کو نہیں مانتے' وہ اس کیفیت میں نہیں ہیں لیکن یہ جو اس چیز کے یعنی خدا کی عبادت کے مدعی ہیں' لیکن کرتے اس طرح سے ہیں کہ اس سے فائدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب تو وہ کچھ قوانین بدل گئے ہیں' یہ وراثت کے قوانین جو پہلے ہوتے تھے' اس میں ہمارے ہاں رواج چلتا تھا' شریعت کی رو سے بھی وراثت چلا کرتی تھی۔ عدالت میں پہنچ کر' عدالت بھی یہ سوال کیا کرتی تھی کہ بھئی! وہ جو وراثت ہوتی تھی کہ عام طور پر لڑکیوں کو حصہ نہیں دیا کرتے تھے' تو وہاں عدالت کی طرف سے یہ سوال ہوا کرتا تھا کہ شریعت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہو یا رواج کے مطابق چاہتے ہو' تو وہ پہلے ہی اپنے وکیل سے پوچھ لیتے تھے کہ کس طرح

فائدہ زیادہ ہوگا۔ وہ انہیں بتا دیتا تھا۔ اگر شریعت سے زیادہ فائدہ ہوا تو کہتے تھے کہ الحمدللہ ہم تو مسلمان ہیں' توبہ توبہ شریعت کے خلاف کسی اور چیز پہ نہیں' اللہ کو جان دینی ہے' کافر ہو کر نہیں مرجانا' اے شریعت دے مطابق ای کرو بھاویں سانوں نقصان ای ہوندا ہووے' او پہلے پتہ کرلیا ہوندا سی ❶۔ ہم نے شریعت کے مطابق فیصلہ کیا ہے' اس چیز کا سوال ہی نہیں ہے کہ ہمیں کیا ملا ہے۔ جے اونے کیا کہ ایہدے وچ نقصان اے ❷' رواج کی جگہ ان کے ہاں فقہ میں ایک لفظ عرف عام آتا ہے کہ جی فیصلہ کس کے مطابق ہے' کہنے لگے: فقہ حنفی میں عرف لکھا ہوا ہے' جی' ہم تو عرف کے مطابق چاہتے ہیں یعنی فیروی او فقہ دے مطابق ای چاہندے نیں ❸۔ وہ فیصلہ رواج کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہوگا وہ جو اصطلاحیں ہوتی تھیں وہ ذرا سا فائدہ اس طرف ہوتا ہے تو وہ رواج کے مطابق عدالت سے فیصلہ لیتے ہیں' ذرا سا ادھر فائدہ ہوتا ہے تو شریعت کے مطابق لیتے ہیں۔ یہ کن کا ایمان ہے؟ یہ غلام کا ایمان ہے' مردِ حر کا ایمان نہیں ہے۔ ساحرین دربارِ فرعون کا ایمان نہیں ہے' یہ ہم جیسے مسلمانوں کا ایمان ہے۔ دونوں کے ایمانوں میں بڑا فرق ہے۔ وہ ایمان اور یہ ایمان سراسر مختلف ہیں۔

اُمتوں کی کبریائی مردِ حر کی پیشانی کی رہینِ منت ہوتی ہے

عزیزانِ من! بات سامنے آئی ہوئی ہے کہ دونوں کے ایمان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک وہ مردِ مومن ہے' ایک ہم مدعیِ ایمان ہیں۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ رزم گاہِ حیات کے اندر نیویں پا کے بیٹھے رہتے ہیں ❹۔

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف ❺

مابہ میداں سربجیب' اُو سربکف ❻

اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس شخص ❼ کو عطا کی تھی۔ مابہ میداں سربجیب' اُوسربکف۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ

---

❶ یہ (فیصلہ) شریعت کے مطابق ہی کرو' بے شک اس سے ہمیں نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ نفع نقصان کا انہوں نے پہلے ہی معلوم کرلیا ہوتا ہے۔

❷ اگر اس نے کہا کہ اس میں نقصان ہے۔

❸ یعنی پھر بھی وہ فقہ کے مطابق ہی فیصلہ چاہتے ہیں۔

❹ شرمسار' گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔

❺ لَاتَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی (20:68) مت خوف کھاؤ۔ تم ان پر غالب آ کر رہو گے۔

❻ مردِ آزاد یعنی بندۂ مومن کا دل خوف وہراس سے خالی ہوتا ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ سربکف دشمن کے مقابلہ کے لیے باہر میدان میں نکل آتا ہے۔ اس کی جرأتیں بے باک اور حوصلے نہایت بلند ہوتے ہیں۔

❼ یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) کی طرف ہے۔

دارد اندر سینہ تکبیرِ امم
در جبینِ اوست تقدیرِ امم

امتوں کی جو کبریائی ہے' جو بلندیاں ہیں' اس کا راز اس کے سینے کے اندر ہوتا ہے اور اس کی پیشانی میں قوموں کی تقدیریں جھلک رہی ہوتی ہیں ۔

عزیزانِ من! مردِ حُر' بندہ آزاد' کا کیا پوچھتے ہو! کیا عرض کروں کہ کیا ہوتا ہے! اس کی تو

قبلہ ما گہ کلیسا' گاہ دَیر
اُو نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر ❶

کبھی یورپ کی طرف نگاہیں ہیں' کبھی امریکہ کی طرف نگاہیں۔ وہ انقلابی بن رہا ہے تو کن کی طرف دیکھ رہا ہے؟ ان کی طرف جن میں اس کی ہمت ہی نہیں' وہ بھارت سے دوستی کی سوچ رہے ہیں ۔

سکراتِ موت کی کیفیت

یہ سارے جو کلیسا اور دیر کی طرف نگاہیں کیے ہیں ' وہ صرف روٹی کے واسطے کیے ہیں۔ عزیزانِ من! ''کھوتے دی سطح تے' گھاہ واسطے۔ سارے قسم دے بھار چک لیندے' پاویں اوروڑی لددوے' تے پاویں روئی لددوے ❷ ۔

صبح و شامِ ما بہ فکر سازو برگ
آخرِ ماچیست ؟ تلخیہائے مرگ ❸

---

❶ ہم محض روٹی کی خاطر' کبھی دنیا کی ایک طاقت کو اپنا قبلہ مقصود قرار دیتے ہیں' کبھی دوسروں کو' کبھی انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں' کبھی ہندو کے' لیکن مردِ حُر ان میں سے کسی کے سامنے بھی جھولی نہیں پھیلاتا۔ وہ اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے اس لیے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ اُو نہ گنجد در جہانِ رنگ و بو

ہم سب انگریز کے غلام ہیں لیکن مردِ حُر صرف ایک اللہ کا غلام ہوتا ہے۔ اس کی قلب کی وسعتوں کے سامنے یہ ساری مادی کائنات ہیچ اور تنگ ہو جاتی ہے۔ وہ پہنائے عالم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے خود اس کے اندر گم نہیں ہوتا۔

❷ وہ گدھے (حیوان) کی سطح زندگی پر محض گھاس کھانے کے لیے ہیں۔ اس واسطے وہ ہر قسم کا وزن اٹھا لیتے ہیں۔ خواہ ان پر روڑی بجری لا دیں اور خواہ روئی (اس سے انہیں سروکار نہیں)

❸ ہماری ساری زندگی محض اپنی طبعی ضروریات کے حصول کی تگ و دو میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مقصود و منتہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب مقصود و منتہی محض طبعی زندگی ہو تو اس کا انجام موت کی تلخی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ ہماری ساری زندگی، یہی دنیا کی چیزیں ہیں، یہی طبعی زندگی کے ساز وسامان سے چلی جاتی ہے۔اور پھر مرتے وقت جسے سکراتِ موت کہتے ہیں، جوان چیزوں کے چھوڑنے پہ تلخی گزرتی ہے، تو اس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ وہ ایسا ہوتا ہے جیسے کانٹے دار جھاڑی کے اوپر چادریں ڈالی ہوئی ہوں اور انہیں کوئی جھٹکا دے کر کھینچے۔ وہ کانٹے، اور چادریں کیا ہوتی ہیں؟ یہ جو اس نے سارا کچھ دنیاوی کمایا ہوا ہوتا ہے، ایک ایک چیز اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے، اور موت اس چادر کی طرح اس کو کھینچ رہی ہوتی ہے، گھسیٹ رئی ہوندی اے جنوں کیندے ہیگے نیں۔ اے ہوندی اے سکراتِ موت ❶۔جبکہ مومن کہتا ہے کہ

در جہانِ بے ثبات او را ثبات
مرگِ اُو را از مقاماتِ حیات ❷

میں پائیدار زندگی، حیاتِ جاویداں کی طرف جا رہا ہوں۔دنیا میں ہر شے میں تغیر ہے مگر وہ ہے کہ جس کو تغیر نہیں ہوتا۔اس کے نزدیک موت موت نہیں ہوتی، زندگی کے مقامات میں سے ایک مقام ہوتا ہے، ایک کمرے میں سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

ما کلیسا دوست! ما مسجد فروش!
او زدستِ مصطفیؐ پیمانہ نوش ❸

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست
فقر اُو از لا الہ تیغ بدست ❹

---

❶ جسے کہتے ہیں کہ اسے گھسیٹ رہی ہوتی ہے۔یہ ہوتی ہے سکراتِ موت

❷ یہ مادی کائنات اور خود انسان کی طبعی زندگی ہر آن بدلتی اور فنا ہوتی رہتی ہے لیکن مردِ آزاد کی ذات، ان تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔وہ حیاتِ جاوید کی حامل بن جاتی ہے، جسے ہم موت کہتے ہیں وہ اس کے لیے زندگی کے مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ ہوتا ہے۔وہ خوب جانتا ہے کہ
موت، اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

❸ ہماری کیفیت یہ ہے کہ حقیر سے مفادِ عاجلہ کے لیے دین فروشی اختیار کر لیتے ہیں۔اس کے لیے کبھی عیسائیوں سے یارانہ گانٹھا جاتا ہے۔کبھی یہودیوں سے پیانِ وفا باندھا جاتا ہے، کبھی کفار کی دہلیزوں پر سر جھکایا جاتا ہے، کبھی مشرکین کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کیا جاتا ہے لیکن مردِ حُر اُس پست سطح پر کبھی نہیں اترتا۔نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتا ہے اور اس کے رنگ میں ایسا رنگا جاتا ہے کہ وہ غیروں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاتا

❹ ہم ساری عمر بھیک منگوں کی طرح ذلیل وخوار رہتے ہیں۔وہ کاسۂ گدائی کی جگہ شمشیر بدست باہر نکلتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔

کوچے کوچے، گلی گلی، ایک ایک ملک، ایک ایک قوم، کے سامنے بھیک کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں۔ مگر مردِ حُر لا الہ تیغے بدست سے، ہر ''الہ'' کے سامنے ''لا'' کہتے ہوئے، صرف خدا کے آگے جھکتے ہیں۔

ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد
ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد ❶

سوکھے ہوئے گھاس کے تنکے، ذرا سی تیز ہوا جدھر کی چلی، اُدھر ہی اڑ کے اس کے ساتھ چلے گئے اور اس کی ضرب، فرہاد کی طرح، چٹانوں میں سے زندگی کی جوئے آب، نکال کر لے آتی ہے اور کہتا ہے کہ

محرمِ اُو شو زمابے گانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو ❷

خدا تمہیں کہیں وہ مردِ مومن، وہ مردِ حر بنا دے، ساڈے جئے نوں چھڈ دے اوہدا پلہ پھڑ لے جے کتھے لبھ جائے تے ❸۔ یہ گھر تباہ کردے، اوہدا دامن تھام لے جے کتھے لبھ جائے تے ❹۔ انہوں (علامہ اقبالؒ) نے اسرار ورموز کے ابتدا میں مولانا روم ❺ کے یہ شعر لکھے ہوئے ہیں:

---

❶ ہماری کیفیت خس و خاشاک کی سی ہے جسے ہوا کا ہر تند و تیز جھونکا جدھر چاہے اُڑائے پھرے اور اس کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ اس کی ایک ضرب پہاڑ سے جوئے شیر نکال کر لے آئے۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر

❷ تو ہمارے پاس بیٹھ کر کیا کرے گا۔ جا کسی ایسے مردِ حُر کی صحبت میں بیٹھ اور اس سے ان حقائق کو سیکھ جس سے زندگی پہاڑ کی طرح محکم ہو جاتی ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کی قربانی دے اور اس کے بعد دیکھ کہ تجھے دنیا میں کیا کچھ نہیں ملتا۔

❸ ہم جیسے کو چھوڑ دے، اس کا پلو پکڑ لے جہاں بھی وہ ملے۔

❹ اگر کہیں تجھے مل جائے تو اس کا دامن تھام لے۔

❺ مولانا جلال الدین رومیؒ 1207ء میں بلخ میں پیدا ہوئے، بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فرید الدین عطارؒ کے زیر تلمذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کیے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیام بر ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے (پرویزؒ (1997ء)۔ مجلس اقبال حصہ دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ۔ ص۔20)۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

میں نے دیکھا کہ کل وہ شیخ دن میں دیا جلائے ہوئے پھر رہا تھا۔ کہا: حضرت کیا کر رہے ہیں آپ؟ کہنے لگے: یہ جو یہاں چوپائے اور وحشی درندے پھر رہے ہیں' ان سے تنگ آ گیا ہوں' کسی انسان کی تلاش کر رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بھی مدت سے تلاش کر رہا ہوں' اب تک نہیں ملا۔ کہنے لگا کہ کوئی بات نہیں' وہ جو نہیں ملتا اسی کی تلاش ہے' مردِ حر کی تلاش ہے۔

خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

عزیزانِ من! بات چل نکلی ہے' میرے سامنے اس سے زیادہ اور بھی آ رہا ہے اور تفسیر کون بیان کرے گا' اور پھر ہماری حالت جو ہے' مثنوی اسرار و رموز کی ہے۔ یہی سجدہ' یہی چراغ وہ کچھ نہیں رہا۔ اب تو

از قیامِ بے حضور من مپرس
از سجودِ بے سرورِ من مپرس ❶

کوئی آتا ہے تو اس کے سامنے ہم تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں' قیامِ بے حدود کھڑے ہیں' سامنے کوئی ہے ہی نہیں اور سجدہ محض رسمی ہے:

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمتِ مردانِ آزاد است و بس ❷

ایک لمحے کے لیے کیوں اس کا جلوہ آئے؟ یہ تو جو مردِ آزاد ہے' وہ اسی کی قسمت میں ہوتا ہے کیونکہ

---

❶ میں خدا کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہوں اور زبان پر "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے الفاظ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اعلان کہ "میں تیرے سوا کسی اور کی محکومی اختیاری نہیں کرتا۔" اور دل کہیں اور ہوتا ہے۔ میرا سر سجدہ میں ہوتا ہے لیکن یہ سجدہ محض رسمی ہوتا ہے۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی جو ایک سچے مومن کے سجدہ میں ہوتی ہے۔

❷ محکوم کا سجدہ محض ایک رسم کی ادائیگی ہوتی ہے' جس سجدہ سے خدا کی صفات انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتی ہیں تو وہ صرف آزاد مردوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔

مَردے آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم رو چرخِ کبود ❶

مردِ آزاد جب سجدے کے اندر جاتا ہے تو آسمان اس مردِ مومن کا طواف کرتا ہے۔عزیزانِ من! انسان کا انسانوں کی غلامی سے نکل کر ایک اللہ کا غلام بن جانا' یہ ہے سجدہ اور وہ سجدہ کیا کم شرف ہے! ساری کائنات اس کے گرد طواف کرتی ہے' اس لیے کہا کہ

از غلامے لذتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآن مجو

غلام ایمان کی لذت سے کیسے آشنا ہوسکتا ہے۔ یہ چیز اس میں تلاش نہ کر۔قرآن کا حافظ ہوجانا اور بات ہے' اس میں ایمان نہ تلاش کر۔

مومن است و پیشۂ او آزری است
دین و عرفانش سراپا کافری است ❷

مومن ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کا پیشہ بت تراشی ہے۔اسی لیے اقبالؒ (1877-1938ء) کہتا ہے کہ

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟ ❸

اگر کوئی قوم انسانوں کے خودساختہ قوانین کا اتباع کرتی ہے تو' خواہ اس کی اپنی ہی حکومت کیوں نہ ہو' وہ محکوم ہے۔یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیشِ نظر حضرت علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ

---

❶ جب کوئی مردِ آزاد سجدہ میں جاتا ہے تو آسمان اس مردِ مومن کا طواف کرنے لگ جاتا ہے۔اس کے برعکس:

ما غلاماں از جلالش بےخبر از جمالِ لازوالش بےخبر

ہم غلام' نہ جلالِ خداوندی سے آگاہ ہوسکتے ہیں' نہ اس کے جمال سے۔

❷ غلام قوم کے افراد' مومن کہلاتے ہیں لیکن بت گری اور بت فروشی ان کا پیشہ ہوتا ہے۔ان کی شریعت اور طریقت دونوں کفر کے مظاہر ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ علامہ اقبالؒ (اور قرآن) کے نزدیک غلام اور آزاد میں یہ فرق نہیں کہ اگر کسی قوم پر کوئی غیر قوم حکومت کرتی ہے تو وہ قوم محکوم ہے اور اگر وہ اپنے ملک پر آپ حکمران ہے تو وہ آزاد ہے۔قرآن کی رُو سے محکوم اور آزاد میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی قوم قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے تو وہ آزاد ہے اور اگر انسانوں کے خودساختہ قوانین کا اتباع کرتی ہے تو محکوم ہے خواہ ان کی حکومت اپنی ہی کیوں نہ ہو۔

❸ اقبالؒ: بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 65

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت ❶

اگر تمہارے جسم میں زندگی کی گرمی موجود ہے تو پھر وہ ہے جو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ صلوٰۃ تو مومن کے لیے معراج ہے، ورنہ اقبالؒ کہتا ہے کہ

در نداری خونِ گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن ❷

اگر دل کے اندر ایمان کا سوز نہیں ہے، سنیے کیا ہے؟ یہ کہ ایک پرانی رسم ہے، چلی آ رہی ہے: چار رکعت نماز فرض، منہ قبلہ شریف، امام دے پچھے، تے اللہ اکبر تو اس صورت میں تیرا یہ سجدہ محض ایک رسم ہے۔ اس لیے اقبالؒ نے کہا کہ:

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں ❸

عزیزانِ من! یہ سجدہ ہے اور تذکرہ ہو رہا تھا، ساحرینِ دربارِ فرعون کا۔ یہ وہ سجدہ ہے جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ **فَاقۡضِ مَآ اَنۡتَ قَاضٍ** (20:72) جو تیرے جی میں آئے فیصلہ کر لے، تو کر ہی کیا سکتا ہے، تیری دسترس، تیری مملکت کی وسعت، تیرے اقتدار و اختیار کی حدود، صرف اس طبعی زندگی تک ہیں۔ تیرے ہاتھوں سے موت نہیں آئی تو مرگ کے ہاتھوں سے موت آ جائے گی۔ زندگی بہت آگے چلی جاتی ہے۔ یہ ہے، عزیزانِ من! ایمان اور یہ ہے انقلاب۔ اگر آپ کے اندر، یہ انقلاب ہے، یہ ایمان ہے کہ زندگی اسی طبعی دنیا کی زندگی نہیں ہے، اس کی متاعِ حیات نہیں ہے بلکہ وہ تو جوئے رواں ہے۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود ❹

---

❶ اگر دل میں ایمان کی حرارت ہے تو یہ حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے کہ صلوٰت مردِ مومن کو اس مقام پر پہنچا سکتی ہے جس تک دوسرے انسانوں کی نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتی۔ صلوٰۃ اس نظام کا نام ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اسی اتباعِ احکامِ قرآنی سے جماعتِ مومنین کو وہ سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہو سکتی ہیں جو اقوامِ عالم میں کسی اور کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔

❷ اگر سینہ حرارتِ ایمان سے خالی ہے تو پھر تیرا سجدہ، ایک رسم کے سوا کچھ نہیں۔

❸ آزاد بندوں کی عید میں ملک اور دین کی شان و شوکت جھلکتی نظر آتی ہے اور محکوموں کی عید، کمزوروں اور ناتوانوں کے ہجوم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

❹ انسانی ذات کے اس دنیاوی زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ یہ ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود — ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

انسانی ذات کی بیداری کا نام خود آگہی یا شعورِ خویش (Self Consciousness) ہے۔ یہی شعورِ خویش، مرنے کے بعد آگے چلتا ہے۔

یہ زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ جب اس زندگی کی کسی قدر میں اور اس زندگی کی کسی متاع میں ٹکراؤ (Tie) پیدا ہو جائے تو پھر یہ چیز ہوتی ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم اس پر تمہیں ترجیح نہیں دے سکتے۔ بس یہ ہے ایمان۔

اُخروی زندگی کی متاعِ حیات

جب ان اقدارِ خداوندی میں اور اس دنیا کی متاع کے اندر ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو اُن اقدار کو ترجیح دینا' اِن کو اس دنیا کی متاع کے اوپر قربان کر دینا' یہ ہے ایمان۔ یہ ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ اے فرعون! تو کر ہی کیا سکتا ہے کیونکہ **اِنَّـآ اِلٰـی رَبِّـنَـا مُنۡقَلِبُوۡنَ** (26:50) ہمارے اندر یہ انقلاب آ گیا ہے' ایمان' عزیزانِ من! اس کو کہتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ پیدائشی ایمان حاصل ہی نہیں ہوتا' جیسے کوئی بچہ پیدائشی ایم اے نہیں ہوتا' خواہ وہ باپ ایم اے چھوڑ کر پی ایچ ڈی بھی کیوں نہ ہو' اسے تو الف ب بھی نہیں آ سکتی' اسے ایم اے ہونا پڑتا ہے۔

کوئی پیدائشی بچہ نہ مسلمان ہوتا ہے نہ کافر

جسے ہم مومن کہتے ہیں' مومن یہ نہیں کہ پیدائشی ایم اے پیدا ہو جاتا ہے' کوئی پیدائشی مسلمان نہیں پیدا ہو جاتا' پیدائشی تو نہ مسلمان ہوتا ہے' نہ کافر ہوتا ہے۔ پیدائشی ایک بچہ ہوتا ہے جیسے حیوان کا بچہ ہوتا ہے' اسی طرح انسان کا بچہ ہوتا ہے' اسے خود کچھ بننا پڑتا ہے۔ یہ جو قرآن نے ایمان کے لیے ہر جگہ Verb ❶ (فعل) کا استعمال کیا ہے کہ ''جو ایمان لاتے ہیں''۔ یہ نہیں ہے کہ ہمیں بیچ میں چھوڑ دیا ہے' وہ تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ** (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو کہتے ہو کہ ہم تو ایمان والے ہیں! ایمان لاؤ۔ وہ کیا ایمان ہے؟ یہاں یہ بتایا ہے کہ وہ یہ ایمان ہے' جو ساحرین دربارِ فرعون کا ایمان ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں یہ کس چیز کا تقابل ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ پروہت کا' اس دور کی پیشوائیت کا' مرتبہ بادشاہ سے بھی اونچا ہوتا تھا۔ ایک طرف اتنا بڑا مرتبہ' دوسری طرف اس فرعون کا استبداد' یہ دونوں چیزیں سامنے ہیں' صداقت سامنے آ گئی۔ اس کے اعتراف کا نام' اس کے اعلان کا نام' ایمان ہے۔ اب اس میں جو یہ دونوں چیزیں ہیں' ان کی کوئی قیمت ان کی نگاہ میں نہیں رہی' قیمت اُس ایمان کی ہو گئی۔ یہ جو چیز ہے کہ صداقت سامنے آئے تو اس کا اعتراف کرنا ہے یہ ایمان ہے' یہ ہیں جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ اس ایمان کے بعد خدا ملتا ہے۔ یہ ہے وہ سجدہ جس کے بعد اس نے کہا ہے کہ **وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ** (96:19)۔ انسان' اس ایمان کے بعد اس سے قریب

---

❶ جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے۔

ہوتا ہے لیکن یہاں تو اب پوچھو ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

اب پھر اپنی بات درمیان میں آ جاتی ہے تو کیا کریں' کہنا ہی پڑتا ہے کہ ہم نے مسلمان ہونا بہت آسان بنا دیا ہے۔ وہ جو اس نے بہشت کے متعلق کہا ہے کہ:

بہشتے بہر پاکانِ حرم ہست
بہشتے بہر ارباب ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے ''فی سبیل اللہ'' ہم ہست

کہتا ہے کہ بہشت تو بڑی جدوجہد کے بعد ملتا ہے' بڑی مشکلات کے بعد ملتا ہے' لیکن یہ جو ہمارے ہاں کے مسلمان ہیں'ان کے ہاں تو

''بہشتے فی سبیل اللہ'' ہم ہست

اللہ واسطے بھی بہشت ملدا ہیگا اے۔ اے زندگی وی اینا ں دی سارے منگدے آں ای گذر جانی' روٹی وی منگ کے کھانی' تے بہشت وی منگ کے ای جانا' اللہ بخش دے' بخشش منگدے پئے نیں۔ سب سے بڑی ہماری دعا' سب سے بڑی ہماری آرزو یہ ہے کہ اللہ بخش دے[1]۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

کبھی سوچا ہے کہ بخش دے کیا ہے؟ بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست۔ مفت ملتا ہے۔ معاف رکھیے گا'' پھر آج میرے سینے میں دردسوا ہوتا ہے'' کہا تھا' اور آخر میں آ کر ایک بات آ گئی' تھوڑا سا تو اس کے اندر لطافت پیدا ہو۔ خدا مفت ملتا ہے۔ یہ بہت دیر کی بات ہے۔ Partition[2] سے بھی پہلے' ہندوستان میں ہندوؤں کی ایک فلم آئی تھی۔ ایک شخص تھا سر سے پاؤں تک چارسوبیس' اس کے گھر میں بیوی بھی نہیں ہے' ایک بہن تھی' ماں باپ بھی نہیں تھے' وہ بھگوان کے بت کی پوجا وجا بہت کرتے تھے۔ مذہبی لوگ تھے۔ بہن نے ایک دن بھائی سے کہا کہ مجھے مندر میں بڑی دور جانا پڑتا ہے تو اشیر جی کی جو مورتی ہے' بھگوان کا جو بت ہے' اس کی پوجا کرنے کے لیے بڑا وقت لگ جاتا ہے۔ اگر تو مجھے کہیں سے بھگوان لا دے تو میں گھر میں ہی اس کی پوجا کر

---

1. اللہ واسطے بھی بہشت ملتا ہے۔ یہ ان کی ساری زندگی بھی مانگتے ہی گزر جانی ہے۔ انہوں نے روٹی بھی مانگ کر کھانی ہے اور بہشت بھی مانگ کر ہی جانا ہے۔ اللہ بخش دے' یہ بخشش مانگتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی دعا' سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ اللہ بخش دے۔
2. تقسیم پاک و ہند

لیا کروں۔اس نے کہا: بہت اچھا ہے' لے آؤنگا۔ وہ کسی مندر میں گیا اور نہایت عمدہ سونے چاندی کی جو بڑی قیمتی مورتی تھی' چرا کے لے آیا' وہ لاکر اس نے رکھ دیا' وہ بہت خوش ہوئی۔اس نے کہا کہ بہت اچھی چیز ہے لیکن یہ تو بڑی قیمتی ہے' یہ کتنے میں آئی ہے؟ کہنے لگا: بھولی کہیں کی! بھگوان کہیں مول بکتے ہیں بازاروں کے اندر؟ کہنے لگی: پھر کیا؟ کہنے لگا: یہ اپنے بھگت سے لایا ہوں۔ یہ ہوتے ہیں تو یونہی ساتھ چلے آتے ہیں۔لیکن جب وہ قیمت مانگتا ہے تو عزیزانِ من! وہ جان سے تو کم پہ سودا ہی نہیں کرتا۔''میں سمجھتا ہوں اے تے بیعانہ ای ہجے ہوندا ہیگا اے' ایسے واسطے موت دے نال مال نئیں ملدا ایس گاہک نوں❶۔'' اے بیعانہ تے سٹ' ہاں چل! ہاں میرے نال❷۔اگلی منزلیں تو آگے جا کر طے کرنا ہوتی ہیں۔یہ قیمت ہوتی ہے اس خدا کی **وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ** (96:19) یہ کر کہ دنیا کے ہر خدا کو خریدتا چلا جا اور پھینکتا چلا جا۔یہ ہے ایمان۔

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی

عزیزانِ من! اب میں ایمان اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ بہرحال کچھ باتیں ہی ہیں جو رہ گئی ہیں۔خود مومن ہونا تو بڑی چیز ہے' اب تو کوئی مومن دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔معاف رکھیے گا' پھر ذاتی سی بات آ گئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ آپ احباب کو معلوم ہے کہ میری تربیت' تعلیم اور پرورش میرے دادا جان❸ کی آغوش میں ہوئی تھی۔اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے' بہت بڑے عالم تھے۔دوسری طرف ایک بہت بڑے صوفی بزرگ بھی تھے' قرآن پڑھا رہے تھے' مومن کے متعلق جہاں قرآنِ کریم میں غالباً سورۃ المؤمنون تھی' جہاں مومن کی صفات آئی ہیں' جہاں مومن کی خصوصیات آئی ہیں' بتا رہے تھے' بڑا عمدہ انداز تھا ان کا۔ کوئی عجیب قسم کا ہیبت ناک سا تصور میرے ذہن میں آیا۔ میں نے کہا: دادا جان! یہ ہوتا ہے مومن!! کہنے لگے: یہ ہوتا ہے مومن! میں نے کہا: جی' مجھے تو آج دنیا میں کہیں ایک بھی مومن نظر نہیں آتا' تو ہم تو گئے۔مومن کی ایک چیز یہ تھی کہ کافر اس کے اوپر کبھی غلبہ حاصل نہیں کر سکے گا' میں نے کہا: جی' یہ تو ایک بھی نظر نہیں آتا' یہ تو ہمیں کھا جائیں گے۔کہنے لگے: بیٹا اطمینان رکھو' اگر تمہیں کوئی مومن نظر نہیں آتا تو آج دنیا کے اندر کافر بھی نہیں۔مصطفیٰ ﷺ نہیں ہے تو آج ابولہب بھی نہیں ہے' بچ جاؤ گے۔لیکن کافر تو اب' عزیزانِ من! اس پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں کفر میں پختہ ہو گئے' جب انہوں نے کہا تھا تو اس وقت کافر ہمارے سامنے

---

❶ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو ابھی بیع نامہ ہی ہوتا ہے۔اسی لیے موت سے اس گاہک کو مال نہیں ملتا۔

❷ یہ پھینکو پیشگی رقم وہاں' اب چلو میرے ساتھ۔

❸ مولوی' چودھری' حکیم' رحیم بخشؒ

ہندو ہی تھا وہاں ۔اب تو کافر نے اورغلبہ حاصل کرلیا ہے کہ دنیا میں ہر مسلمان کی مملکت میں' ہر مسلمان کا دل اس وقت کافر کے غلبے سے دھڑک رہا ہے ۔ایک ملت کی حیثیت سے دنیا میں سب سے زیادہ بڑی آبادی ہے' جغرافیائی پوزیشن یہ ہے کہ یہ کرّہ ارض کا قلب ہے' مراکش سے لے کرانڈونیشیا تک بحرِ ذخار ہے' موجیں مارتا ہوا' دعویٰ ہے ایک کتاب پرایمان کا' ایک خدا پر ایمان کا' اندازہ لگایئے۔اور کیفیت یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی سلطنتیں جن کے پاس عین اس پورے کے پورے بحرِ ذخار کے اندر' جن کو آپ مشرقِ وسطیٰ یعنی مسلمانوں کے ممالک کہتے ہیں' ایک اتنا سا جزیرہ ہے' جس جزیرے کی مٹی بھی' مسلمانوں نے اپنے سر پہ ڈھوڈھو کے بنا کے ان کو دی' اس جزیرے کے اندر چند یہودی آ کے بسے' ان یہودیوں کے مسئلے پہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے دل سینے میں' دھڑک رہے ہیں ۔قرآن نے کہا تھا کہ کفار کا کبھی مومنین پہ غلبہ ہو ہی نہیں سکے گا' باقی ساری دنیا کے کفار تو ایک طرف رہے۔ میں نے کہا ہے کہ ان کے اتنے بحرِ ذخار میں' ایک اتنا سا چھوٹا سا جزیرہ' اس میں اتنی سی آبادی' 27 لاکھ کی آبادی' وہ کہتے ہیں' یہ لاہور کی آبادی ہے' پورے ستر اسی نوے کروڑ مسلمانوں پر غلبہ ہے[1] ۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ مسلمان کرتے کیا ہیں؟ ہر سال دنیا کے یہ تمام مسلمان' دس لاکھ' بارہ لاکھ' چودہ لاکھ' سولہ لاکھ حج میں چلے جاتے ہیں۔ حج کا آخری رکن عرفات کے میدان میں جبلِ رحمت کے اوپر ہوتا ہے' وہاں ان کا امام خطبہ دیتا ہے' اسکے بعد آواز آتی ہے کہ حاجیاں دے حج قبول جنوں کیندے نیں[2]' اس کے بعد ایک دعا ہے جس کے متعلق یہ ہے کہ ایسے وقت میں جو دعا مانگی جائے' وہ خدا قبول کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حاجی جب حج میں جاتا ہے تو جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے ایسے ہوجاتا ہے' سارے گناہوں کی آلائش جتنی بھی ہے' وہ ساری وہاں دھل جاتی ہے ۔تو اس قسم کے دس پندرہ لاکھ جن کا کہا جائے کہ کوئی گناہ کی آلائش نہیں ہے' جبلِ رحمت کے زیرِ سایہ حج قبول ہوجانے کے بعد متفقہ طور پر' گزشتہ تیس سال سے دعا مانگتے ہیں: یا اللہ! ان یہودیوں کا بیڑہ غرق کر' ان کی مملکت کو تباہ کر' تے منہ تے ہتھ رکھ کے فٹے منہ کہہ کے مڑ کے آجاندے نیں جناب[3]! اور وہ یہودیوں کی آبادی وہاں بڑھتی چلی جارہی ہے ۔ان یہودیوں کو بھی دوبارہ وہاں جانے کے بعد' مجھے معاف رکھیے' پھر بھی شرم نہیں آتی' جن گھروں سے فقیرنوں اک واری روٹی نہ ملے' دو واری روٹی نہ ملے' او تیسری واری اوندا ای نئیں او تھے کہ میں کئی

---

1. یاد رہے یہ بات مئی 1978 کی 12 تاریخ کو کہی گئی تھی۔
2. جسے کہتے ہیں کہ حاجیوں کے حج قبول ہوئے۔
3. منہ پہ ہاتھ رکھ کر' تف! لعنت تجھ پر' کہہ کر واپس آجاتے ہیں جناب!

واری ایتھے آچکیا واں' اے روٹی نئیں دیندے ہیگے [1]۔ ان حج کرنے والے مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ اس کے دروازے کے اوپر جو تیس سال ان کو ہو گئے' جاتے ہیں' ساری دنیا کے مسلمان مانگتے ہیں۔ آتے ہیں تو وہ یہودی اور زیادہ بڑھے ہوئے ہوتے ہیں' ان کی آبادی نہیں مٹتی ہے۔ یہ ان کی کیفیت ہے۔ تو یہ جو چیز تھی کہ انہوں [2] نے کہا کہ بیٹا! شکر کرو کہ اگر کوئی مومن دنیا میں تمہیں نظر نہیں آتا تو ابوجہل کے انداز کا کافر بھی کوئی دنیا میں نہیں ہے' اس لیے بچے ہوئے ہو۔ لیکن آج تو میں نے عرض کیا کہ کافر تو اس انداز کے آ گئے مومن ان سے بھی نیچے چلے گئے۔ یہ تھا جو کچھ اقبالؒ (1877-1938ء) نے اس سجدے کے متعلق ہمیں بتایا تھا کہ وہ ہوتا کیا تھا:

بہائے ہر خداوندے بدانیم

اگر یہ سجدہ ہے تو سجدہ خدا کے حضور ہے۔ اگر نہیں ہے تو جیسا اس نے کہا ہے کہ یہ سجدہ رسمِ کہن سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہی تھا وہ نکتہ جو دربارِ فرعون کے ان ساحرین نے سمجھا اور برملا کہا کہ **اِنَّا نَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنۡ کُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (26:51) چونکہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لائے ہیں' اس لیے ہمیں امید کامل ہے کہ ہمارے خدا کا قانون ربوبیت' ہماری سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے ہمیں محفوظ رکھے۔

وقت ہو گیا' عزیزانِ من! انہی آیات میں ہم جا رہے ہیں۔ آئندہ یہ آیت [3] 52 لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

❀......❀......❀

---

1. جن گھروں سے فقیر کو' مانگنے پر' ایک دفعہ روٹی نہ ملے' دو دفعہ روٹی نہ ملے' وہ تیسری بار وہاں آتا ہی نہیں کہ میں کئی دفعہ یہاں آ چکا ہوں' یہ روٹی دیتے ہی نہیں ہیں۔
2. یہ اشارہ پرویزؒ کے دادا' مولوی' چودھری' حکیم رحیم بخشؒ کی طرف ہے۔ وہ حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے۔
3. آیات 52 تا 74 کے لیے دیکھیے: چھٹا باب' مئی 1978ء کی 26 تاریخ کا درس' ص ص۔ 139 تا 165

پانچواں باب: سورۃ الشعرآء (عصا' ید بیضا اور سحر: آیات 32 تا 33 اور 44 تا 45)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1978ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم سابقہ جمعہ کو سورۃ الشعرآء کی آیت [1] 52 تک پہنچا تھا۔

داستانِ موسیٰ علیہ السلام اور دربارِ فرعون میں عصا کی حقیقت اور اس کی اہمیت

تسلسل کی رو سے تو مجھے آگے چلنا چاہیے تھا لیکن آپ کو یاد ہے کہ اس داستان میں یہ جو آویزشِ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ہے' اس میں بار بار' بتکرار و اصرار' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا' ساحرانِ دربارِ فرعون کے سانپ بلکہ سپولیوں کا' ان کے اژدھا کا' اور پھر وہاں اس سارے ''جادو'' کے کھیل کا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یدِ بیضا کا' انہی کے عصا کا کہ جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو وہاں عصا مارا تو سمندر پھٹ گیا' سینا کی وادیوں میں پہنچے پانی نہیں تھا' عصا مارا چشمے پھوٹ پڑے' کا ذکر ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس پوری داستان میں یہ جو عصا ہے' یہ بڑی ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور یہی وہ معجزات ہیں جن کی بنا پہ کہا جاتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بڑے اولوالعزم پیغمبر تھے یعنی اگر اے اوناں کول سوٹا نہ ہوندا' تاں او اولوالعزم نہ ہوندے [2]۔ کوئی تفسیر اٹھا لیجیے' کوئی ترجمہ

---

[1] آیات 52 تا 74 کے لیے دیکھیے اس کتاب کا چھٹا باب' مئی 1978ء کی 26 تاریخ کا درس۔ آج کا یہ درس آیات 32 تا 33 اور 44 تا 45 پر محیط ہے۔

[2] یعنی اگر ان کے پاس یہ لاٹھی نہ ہوتی تو وہ اولوالعزم نہ ہوتے۔

اٹھا لیجئے یہی ملے گا۔ عصا' پنجابی اچ جیہڑا فیر عصا ہو جاندا' اے سوٹا' لاٹھی [1] آ۔ اب ہر جگہ یہی لکھا ہوا ملے گا تو ذہن دوسری طرف جائے گا ہی نہیں: اب یہ لکڑی ہے جو یہ سارا کچھ کرتی نظر آئے گی۔ ترجمے بھی یہ ہوں گے تفسیریں بھی یہ ہوں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اصل میں ہے کیا؟ عصا [2] عربی کا لفظ تھا۔ یہ عاصا یا عصا یا سوٹا' ساڈی زبان دا تھا' اس طرح سمجھ لیا کہ قرآن شریف نازل ای اردو یا پنجابی اچ ہویا اے [3]۔

عربی مبین کی اہمیت

ان مقامات میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جو بار بار کہتا ہے کہ اسے ہم نے لسانِ عربی مبین میں نازل کیا ہے' تو اس کے کیا معنی ہیں ورنہ ایک کتاب جو عربی زبان میں ہے' اس کے اندر بار بار یہ کہنا کہ یہ عربی زبان میں ہے' کوئی معقول بات نہیں ہے۔ کیا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کوئی انگریزی کی کتاب ہو' اس کے درمیان میں یہ لکھا ہوا ہو کہ یہ انگریزی زبان کی کتاب ہے' یہ اردو زبان کی کتاب ہے؟ یہ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیوں Stress (تاکید) کیا گیا ہے؟ عجیب چیز ہے خدائے خبیر و بصیر اور علیم و سمیع کی' اسے تو پتہ ہے کہ کیا کیا کچھ اس کے ساتھ ہوگا۔ اس بنا پر یہ Stresses (تاکیدات) کیے گئے ہیں' Antitheses (دعوائے تضادات) دیئے گئے ہیں' تاکیداً کہا گیا ہے کہ اس کو سمجھنا ہو تو عربی مبین کو سمجھو' پھر قرآن سمجھ میں آئے گا۔ وہ تو پتہ تھا کہ یہ ساری دنیا میں پھیلنا ہے' عجم میں بھی جانا ہے' اردو بولنے والوں میں بھی جانا ہے' فارسی بولنے والوں میں بھی جانا ہے' اس کے ترجمے بھی ہونے ہیں' پہلے تفسیریں بھی ہوتی ہیں۔ تو کہا یہ ہے کہ اسے عربی مبین کی رو سے سمجھو اور عربی مبین کے معنی ہیں کہ محاورہ عربی دیکھو کہ عرب ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرتے تھے' ان الفاظ کے کیا معنی لیتے تھے اور جب ہم عربی زبان دیکھتے ہیں تو وہ تو ایک بحرِ عمیق ہے جو آپ نے سنا ہے کہ

---

1. یہ عصا وہی ہے جو پنجابی زبان میں آ کر لاٹھی کہلاتا ہے۔
2. عصا کا مادہ ''ع ص وٗ'' ہے۔ تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن کے مطابق عصا کے اصلی معنی ''اجتماع اور ائتلاف'' کے ہیں۔ لاٹھی کو اس لیے عصا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے کے لیے انگلیوں کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے۔ محصوتُ القوم کے معنی ہیں ''میں نے قوم کو جمع کر لیا۔'' العصا جماعت کو کہتے ہیں۔ شق العصا۔ جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ القی المسافر عصاہ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ''مسافر نے اپنی لاٹھی ڈال دی۔'' لیکن یہ محاورہ ہے یہ بتانے کے لیے کہ وہ منزل پر پہنچ کر القی پر ٹھہر گیا اور پڑاوَ ڈالا۔ لطائف اللغۃ (یہ احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی دمشقی کی کتاب ہے جس میں الفاظ کی لغوی باریکیوں سے بحث کی گئی ہے) میں ''العصا'' کے معنی ''الوبیل'' (یعنی سخت۔ گراں) لکھے گئے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (1961ء)۔ لغات القرآن (جلد سوم)۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص ص۔ 1169 تا 1170۔
3. یہ عاصا یا عصا یا لاٹھی گویا ہماری ہی زبان کے الفاظ تھے۔ اسی طرح سمجھ لیا کہ قرآن کریم نازل ہی اردو یا پنجابی زبان میں ہوا ہے۔

صاحب! اس میں اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ ہیں' شمشیر کے لیے ایک ہزار الفاظ ہیں [1]۔ یا میرے اللہ! بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر اونٹ کا پور پور بھی اکٹھا کیا جائے تو ہزار نہیں بنتا' پانچ ہزار سات سو چوالیس الفاظ اس کے لیے کیا ہیں۔ ان کی زبان یہ تھی کہ ایک تو مادے کے اندر ایک بنیادی تصور دیا جاتا تھا اور پھر باقی الفاظ جسے آپ مجازی کہتے ہیں' وہ Literal Meaning (لغوی معنی) نہیں ہوتے' مجازی ہوتے تھے کہ ان کو کن کن معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہے عربی زبان کی وہ خصوصیت جس سے یہ لسانِ مبین بنتی ہے تو قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے جو مفردات ہیں یعنی جنہیں الفاظ کہا جاتا ہے' انہیں دیکھا جائے کہ اس کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مادے سے خواہ ہزار الفاظ بھی بنیں' ان الفاظ میں یہ بنیادی تصور تو ہر جگہ موجود ہوگا اور آگے اس کے استعمال کی مختلف شکلیں ہونگی۔ یہ استعمال کی شکلیں جب آپ کے سامنے آئیں گی اور پھر عربی ادب میں آپ دیکھیں گے کہ وہ ان الفاظ کو کس کس مفہوم میں اپنے ہاں استعمال کرتے تھے تو پھر وہ مفاہیم سامنے رکھ کر قرآن کی طرف آیئے تو وہاں یہ بات نکھر جاتی ہے کہ یہ عرب ان الفاظ کو ان معنی میں استعمال کیا کرتے تھے۔

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کے سمجھنے کی ایک بنیادی چیز۔ اب اس سے انحراف (Deviation) کیسے ہوا؟ اس سے جو بات آگے چلے گی پھر ہر دفعہ مجھے وہ لمبی داستان دہرانا پڑے گی۔ ہوا یہ کہ اس امت کے ذہن کو قرآن کے مفہوم سے الگ کرنے کے لیۓ قرآن کی آیات کے معانی' ان روایات کی رو سے متعین کر دیئے گئے' جن میں سے بیشتر وضعی ہیں' جعلی ہیں' بنائی ہوئی ہیں۔ میں نے جو کہا ہے غالباً اس کی اہمیت آپ کے سامنے نہیں آئی۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کے ان الفاظ کے معانی ایک ہی دفعہ متعین کر دیئے یعنی وہاں روایت میں یہ چیز لکھ دی کہ اس کے یہ معانی ہیں' مثلاً وہ 5744 معانی ایک لفظ اونٹ کے ہیں' تو ان میں سے کوئی ایک معنی لیا اور کہہ دیا کہ اس کے معنی قرآن کی اس آیت میں یہ ہیں۔ اب آپ اس معنی سے الگ ہٹ نہیں سکتے۔ یہ ہوئے روایات کی رو سے قرآن کے ان الفاظ کے معانی۔ آگے یہی بات' تفاسیر میں آئی' کیونکہ جب یہ کہا جائے کہ

---

[1] عربوں کے ہاں شہد کے لیے اسی (80) الفاظ' سانپ کے لیے دوسو (200)' شیر کے لیے پانچ سو (500)' تلوار کے لیے ایک ہزار (1000) اور اونٹ کے لیے پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے (حوالہ رچرڈ مارس بک (Richard Maurice Bucke) کی کتاب ''آفاقی شعور'' (Cosmic Consciousness)۔ ص۔ 30 تا 31۔ نیز پرویزؒ (1960ء)۔ لغات القرآن (جلد دوم)۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام۔ ص۔ 5

نبی اکرم ﷺ نے یہ معانی بتائے ہیں' یہ معانی متعین کیے ہیں تو اس کے بعد کس کی جرأت ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ میں اسے نہیں مانتا یا میں اس سے الگ کوئی معانی لیتا ہوں۔کوئی یہ کہہ ہی نہیں سکتا۔ وہ لکھے گا کہ حضورؐ نے یہ فرمایا ہے اور وہ معانی متعین ہو گئے۔وہ معنی تفسیر میں متعین ہوئے' ہمارے ہاں ترجمے والوں نے یہ تفاسیر دیکھیں اور ان میں جو متعین معنی تھا' اس کو اپنے ہاں ترجمہ لے لیا۔اب وہ ایک متعین معنی ہے' سارے قرآن میں اسی کی رو سے' آپ نے ہر جگہ آیات کے معانی اور مفاہیم کو متعین کرنا ہے' ان الفاظ کے ان متعین معانی کی رو سے جو اس طرح سے آپ کے سامنے آئے ہیں' اب محاورہ عرب اور لسانِ عربی مبین تو گئی۔کہنے کے لیے تو یہ ٹھیک ہے کہ اگر یہ معانی نبی اکرم ﷺ کے ہیں تو حضور ﷺ سے زیادہ عربی مبین کو جاننے والا کون تھا۔اگر صرف عرب کی حیثیت سے بھی آپ لیں اور پھر حضور ﷺ کی بصیرت ہے' اتنے الفاظ میں سے آپ ﷺ نے یہ معنی متعین کر دیئے' تو تراجم و تفاسیر کا معاملہ ٹھیک ہو جاتا۔لیکن اصل شے پھر وہیں آجاتی ہے کہ یہ جسے آپ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ معانی متعین کیئے' تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے متعین کیے۔یہ تو کوئی اڑھائی سو سال بعد یہ روایات اکٹھی کی گئیں۔

نزول قرآن کے وقت کی زبان پر عجمی عربی کے اثرات

عباسیہ دور (750-1258AD) میں جو عربی تھی اسے آپ زبان کے اعتبار سے بھی دیکھیے تو وہ عربی وہ نہیں رہی تھی جو عربوں کے ہاں نزولِ قرآن کے زمانے میں تھی' یہ تو ساری عجمی عربی ہو گئی ہوئی تھی۔فارس کے فتح ہونے کے بعد عباسیوں کے زمانے میں' یہ سارے آپ کے ہر شعبہ زندگی کے اوپر چھائے ہوئے تھے' ادب اور ثقافت میں بھی یہی چھائے ہوئے تھے۔تو جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اس کے مفاہیم کے لیے اس نے یہ وسائل دینے تھے۔وہ جو زمانہ نزولِ قرآن کی مبین عربی ہے' وہ اس عربِ جاہلیت کی شاعری کے اندر محفوظ چلی آتی ہے۔یعنی باقی چیزوں کے اندر تو تحریف ہو جاتی ہے' انحراف ہو جاتا ہے' بہت چیزوں کی آمیزش بھی ہوتی ہیں' لیکن شعر کے اندر یہ چیز مشکل ہوتی ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے بعض اشعار وضع بھی کیے لیکن جو جاہلیت عرب کے اشعار آ رہے تھے ان میں ان کی زبان کا سارا سرمایہ اشعار کی صورت میں موجود تھا۔

قرآنِ حکیم کو نثر کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے

آپ کو شاید علم نہ ہو' عربی زبان اتنی صدیوں سے چلی آ رہی تھی' اتنی وسیع' پھیلی ہوئی تھی' نثر میں ان کی پہلی کتاب قرآنِ کریم ہے' عربی زبان میں نثر کی اس سے پہلے کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔وہ نثر کی طرف آتے ہی نہیں تھے' شاعری ان کے لیے وجہ

امتیاز تھی اور شاعری ہی ان کا ادب تھا۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے لیے آیہ رحمت بن گئی۔ نثر کی کتابوں کے اندر احراف وتحریف ہوسکتی تھی' شاعری میں بہت کم ہوتی ہے' اور وہ شاعری بڑی وسیع ہے۔ اس کے اندر یہ جو الفاظ ہیں' ان کے جو مجازی معنی ہیں' وہ استعمال ہوئے تھے۔

عصا کے بنیادی معنی اجتماعیت اور جامعیت کے علاوہ گرفت میں لینے کے بھی ہیں

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی آیات کے معانی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ محاورہ عرب آپ کے سامنے ہو اور پھر تصریفِ آیات یعنی قرآنِ کریم نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں کن کن معانی میں استعمال کیا ہے' اور یہ دو چیزیں ہیں' جن سے قرآن سمجھ میں آجاتا ہے۔ عصا[1] کے معنی سوٹا' لاٹھی' پنجابی میں عاصا۔ ویسے تو عصا یہاں بھی محفوظ ہے' ہمارے ہاں عصائے پیری ہے۔ یہ اس کے بنیادی معنی نہیں ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ہیں ''اجتماعیت' جامعیت' اکٹھا ہونا' گرفت میں لینا' کسی چیز کو اکٹھا کر کے گرفت میں لینا' کیونکہ انگلیوں کو اکٹھا کر کے یوں سوٹے کو پکڑا جاتا تھا اس اعتبار سے اس سوٹے کو عصا کہنے لگ گئے' بنیادی طور پر سوٹے کو عصا نہیں کہا جاتا۔ اس کی بنیاد اجتماعیت' گرفت اور قوت ہے۔ تینوں چیزیں آجاتی ہیں۔ آپ دیکھیے لاٹھی کو پکڑنے کے لیے یہ تینوں چیزیں اکٹھی آتی ہیں۔ عجیب بلا تھی یہ قوم۔ تو جس چیز کو اس اعتبار سے انہوں نے پکڑا کہ منتشر انگلیوں کو اکٹھا کیا' اب عصا کے بنیادی معنی اجتماعیت آگئے۔ گرفت میں لیا تو اس کے مجازی معنی دوسرے آگئے کہ کسی شے کو اجتماعیت کے بعد گرفت میں لینا۔ اور قوت سے پکڑا جاتا ہے اس لیے وہ تیسرے معنی اس کے آگئے کہ اس کے اندر قوت کا ہونا ضروری ہے۔ تین چیزیں آگئیں اور اس کے اگلے معنی ہوتے تھے کہ وہ چیز جس پر زندگی میں سہارا کیا جائے' جو زندگی میں سہارے کا موجب بنے' وہ چونکہ سہارے کا موجب لاٹھی اور لکڑی بنتی تھی' اس لیے اس کو انہوں نے عصا کہنا شروع کیا۔ تو عصا کے بنیادی عربی مبین کے اندر جو معنی ہیں' وہ سوٹا ہی نہیں ہیں' یہ بعد میں اس کے جو استعمال کی شکلیں ہیں ان میں ایک استعمال یہ بھی تھا کہ وہ اس سوٹے کو عصا کہتے تھے جبکہ اس کے بنیادی معنی یہ نہیں تھے۔ یہ عربی مبین میں اس لفظ اور اس کے جو مشتقات ہیں' جو اس سے یہ الفاظ بنے ہیں' اتنی تعداد میں ہیں' جن کے معنی اجتماعیت ہیں: جماعت' نظام' قوت' گرفت' سہارا' ضابطہ اور ضبط تو نکلا ہی اسی سے ہے۔ ان تمام معانی میں وہ یہ چیز استعمال کرتے تھے۔ حیرت تو مجھے اس سے بھی یہ ہوتی ہے کہ خود ہمارے ہاں ادب میں ہی نہیں احادیث میں بھی ایسی موجود ہیں جس میں یہ لفظ ان معنی میں استعمال ہوا ہے۔

---

[1] عصا اور ید بیضا کی مزید تشریح وتفہیم کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۂ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء ص ص۔ 65 تا 67۔

عصائے موسیٰ کا یہ سارا ذکر تورات کا بیان کردہ ہے

احادیث کی طرف آنے سے پیشتر میں یہ عرض کروں کہ یہ جو عصائے موسوی کی ساری کہانیاں ہمارے ہاں مشہور ہیں وہ خود تورات میں موجود ہیں۔ اے سوٹے دیاں جھیڑیاں داستاناں ❶ نیں' یہ ساری تو رات کے اندر ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ساری چیزیں وہیں سے آئی ہیں لیکن حیرت ہے کہ خود تورات میں اس کے متعلق ایسے مقامات موجود ہیں' جہاں کسی حد تک یہ حقیقت منعکس ہوتی ہے اگر چہ وہ کتابِ محرف ہے۔ یاد رکھیے اوریجنل (اصل) تورات عبرانی زبان میں تھی۔ عبرانی زبان بھی اسی عربی مبین سے ہے۔ یہ عربوں کی ثانی زبان تھی' اسی سے ہی وہ زبان بنی ہوئی تھی۔

حدیث کے علاوہ خود تورات میں عصا کے معنی ''قوت اور حکومت'' کے دیئے گئے ہیں

ان کے ہاں عبرانی زبان کے اندر یا تورات میں جو بھی موجودہ ترجمہ ہوا ہے' عجیب اتفاق ہے کہ اس میں بھی یہ لفظ عصا موجود ہے اور یہ سوٹے کے معنی میں نہیں ہے' مثلاً اس میں ایک کتاب پیدائش ہے جو تورات کی سب سے پہلی کتاب ہے' اس کتابِ پیدائش کے 49ویں باب کی دسویں آیت میں لکھا ہے کہ ''یہودہ سے ریاست کا عصا کبھی جدا نہیں ہوگا''۔ آپ دیکھتے ہیں یہ ''ریاست کا عصا'' کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہ قوت کے معنی میں' خود مملکت کے معنی میں' ریاست کے معنی میں' نظامِ ریاست کے معنی میں' ضابطۂ ریاست کے معنی میں' کئی ایک مقامات پر تورات میں استعمال ہوا ہے اور ہمارے ہاں جیسا میں نے عرض کیا ہے' احادیث میں یہ چیز آئی ہے۔ مسلم کی ایک بڑی اہم حدیث ہے۔ اگر صرف حدیث کی تشریح پہ جاؤں تو عجیب چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ وہ بڑی اہم چیز ہے: **مَنْ اَتاکم و امرکم جمیع علی رجل واحد.** اگر کوئی شخص تمہارے پاس آئے' دراں حالانکہ تمہارا نظامِ مملکت کسی ایک فردِ واحد کے اوپر مجتمع ہو گیا ہو' امت نے ایک فرد کو مرکز مان لیا ہو' امت اس کے اوپر متحد ہو گئی ہو' اور اس کے بعد اگر کوئی شخص آئے۔ **یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فقتلوہ.** وہ آئے اور تمہارے عصا میں شگاف ڈالے' پھوٹ ڈالے' تمہارے عصا کو Disintegrate کرنا چاہے یا تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا چاہے حالانکہ تم ایک فرد کے اوپر مجتمع ہو چکے ہوئے ہو' اگر کوئی شخص اس غرض کے لیے آتا ہے' تو **فقتلوہ.** اس کو قتل کر دو۔ دوسری روایت میں ہے من کان کسے باشد' کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ پوچھیے کہ یہ ہمارے ہاں یشق عصاکم موجود ہے' ایک جگہ نہیں

---

❶ یہ جو لاٹھی کی داستانیں ہیں۔

ہے' متعدد مقامات میں عصا کا یہ لفظ ہمارے ہاں روایات میں آیا ہوا ہے' جس کے معنی ہی نظامِ مملکت کے ہیں' سلطنت کے ہیں' ضابطہ کے ہیں' قوت کے ہیں' گرفت کے ہیں' سہارے کے ہیں اور یہاں تو آپ کے سامنے ہے: یشق عصاکم یعنی تمہارے نظامِ مملکت کو Disintegrate (منتشر) کرنا چاہے۔ یہی اس کا صحیح ترجمہ ہے: اگر وہ اس کو ٹکڑے کر دینا چاہے۔ اب آپ دیکھیے اور ان معنی کو سامنے رکھیے اور پھر چلیے قرآن کے مقامات میں۔ دوسری چیز عربی مبین کی ہے اور عربوں کی زبان کی ہے کہ وہ تشبیہات' استعارات اور امثالات کے اندر گفتگو کیا کرتے تھے۔ قدم قدم کے اوپر مثال تھی' بات بات میں تشبیہ تھی اور استعارے تھے۔ قرآن نے وہی اسلوب اپنے ہاں اختیار رکھا ہے۔ مجازی معنی عام طور پہ ہوتے ہی تشبیہات اور استعارات میں ہیں' ان کو مجازی کہا ہی اس لیے جاتا ہے۔

تشبیہات اور استعارات میں مجازی معنی کا استعمال

خود آپ کے ہاں بھی ہے مثلاً اگر اس لفظ ڈنڈا کو لے لیں تو آپ دیکھیے اس کا جو استعمال ہے' وہ جو اتنی سی لکڑی ہوتی ہے صرف اسی کو ہی ڈنڈا نہیں کہتے' اس کے مجازی معنی تو دیکھیے: چار کتاباں عرشوں آیاں' تے پنجواں آیا ڈنڈا[1]۔ اب اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ یہ کتابیں ایسے آئیں تو اللہ میاں نے اتنا بڑا بانس کا ٹکڑا بھی اوپر سے پھینک دیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ عصا' جسے آپ اپنی زبان میں سوٹا کہتے ہیں' دیکھیے کہ کس کس معنی میں یہ استعمال کرتے ہیں مثلاً ''جس کی لاٹھی' اس کی بھینس'' یہاں نہ بھینس سے مراد وہ مویشی ہے جس کو ہم بھینس یا Buffalo کہتے ہیں' نہ لاٹھی سے مراد یہ سوٹا ہے۔ جس کی لاٹھی' اس کی بھینس' اب اگر وہ کہے کہ صاحب مقدمے کا فیصلہ اس طرح سے ہوگا کہ جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے' بھینس اس کو دی دی جائے گی کہ یہ تمہاری ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

یدِ بیضا کا حقیقی مفہوم

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کا یہ جو بنیادی طور پہ قرآن کا اسلوب ہے' اس کو ذہن میں رکھیے اور ہر کتاب میں یہ بات ہے۔ اب یدِ بیضا کو دیکھیے۔ ید کے معنی ہوئے ہاتھ۔ پوچھیے عربوں سے کہ ان کے ہاں یہ ید کا لفظ متعدد مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں بھی ہاتھ' دست دیکھیے تو سہی کہ آپ اسے کن کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں: ''کوئی ہاتھ

---

[1] چار آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور پانچواں ڈنڈا نازل ہوا۔ عام طور پر یہ چار کتابیں یہ کہی جاتی ہیں: تورات' زبور' انجیل اور قرآنِ پاک۔

آ جائے''۔اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یوں پکڑ لیا جائے۔''دیکھے غیروں کے ہاتھ'' یعنی ان الفاظ کو استعمال کرتے چلے جایئے' اب ہر مقام کے اوپر اس کا ایک معنی یا مفہوم جو آپ نے متعین کیا ہے' وہی استعمال نہیں ہوگا۔آپ دیکھتے ہیں کس طرح معنی بدلتے جاتے ہیں۔قرآن سمجھتے ہوئے اسے ہمیشہ زیرِ نظر رکھیے کہ کن کن مفاہیم میں وہ ان الفاظ کو استعمال کرتے تھے: قوت' دلیل' طاقت' گرفت اور پھر بیضا' اس کے معنی تو روشن کے ہیں' جب آپ روشن دلیلیں کہیں گے تو بات اتنی صاف ہوجاتی ہے۔آپ اپنے ہاں ''ملتِ بیضا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ بیضا کا لفظ بھی ہمارا نہیں' ایک حدیث میں آیا ہوا ہے' یہ ملت کے معنی کے اندر استعمال ہوا ہے: لقد ترکتم علی مثل البیضا۔ حدیث جو صحیح نظر آتی ہے' چمک جاتی ہے۔میں تم میں ایک ملت' (مثل کے معنی ملت کے ہوتے ہیں) ملتِ بیضا چھوڑ کے چلا ہوں' ایک مثل' ایک ملت چھوڑ کے چلا ہوں: روشن۔کیسی روشن؟ عجیب روشن ہے: بیضا' لیلھا و نھارھا سوآء۔ جس میں رات اور دن ایک جیسا روشن رہے گا' تاریکی نہیں آئے گی۔اب دیکھتے ہیں کہ یہ بیضا کا لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوا' ورنہ بیضہ تو انڈے کو کہتے ہیں۔اس تمہید سے مقصد یہ تھا کہ قرآنِ کریم کے معانی کو اس طرح سے لیجیے' قرآنِ کریم کے مفردات کے جو معانی ہیں' ان کو اس طرح سے سمجھیے' پھر بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

فرعون کے دربار میں فریقین کے درمیان کوئی جادوگری کا تماشہ نہ تھا

اب یہ جو عصا کی اور یدِ بیضا کی کہانی ہے' اس کی اہمیت تو ہمارے سامنے آتی ہے' جب معرکہ فرعون کے دربار میں برپا ہوتا ہے' وہ ساحرین آتے ہیں اور یہی چیز ہے' جو ساحرین کے اس لفظ نے ہمارے ہاں الجھن پیدا کردی ہے۔سحر کے معنی جادو' ساحر کے معنی جادوگر' ساحرینِ دربارِ فرعون کے معنی' دربارِ فرعون کے جادوگر۔اب جو وہاں جادوگر آئے تو اِدھر سے انہوں نے بھی کہا کہ یہ سب سے بڑا جادوگر ہے' اس کا ترجمہ ہم نے کیا جادوگر' تو اب وہ جادوگر' ان کا ترجمہ ہوا' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سب سے بڑے جادوگر' اب جو وہاں تماشہ ہو رہا ہے وہ جادو کا تماشہ ہے۔انہوں نے بھی اپنی رسیاں پھینکیں' سپولیے بن گئے' انہوں نے عصا پھینکا اژدھا بن گیا' یہ سارا جادو ہی تو تھا۔ یہ ہے کہانی جو ہمارے ہاں چلی آرہی ہے حالانکہ فرعون کے دربار میں فریقین کے مابین یہ کوئی جادوگری کا تماشہ نہیں تھا۔

سحر کے معنی جادو نہیں بلکہ فریب کاری کے ہیں

سحر کا جو ایک لفظ ہے' اس کے معنی جادو کیے' ساحر کے معنی انہوں نے جادوگر کیے' ان عربوں سے پوچھا ہی نہیں کہ تم اسے کن معنوں میں استعمال کرتے ہو۔عزیزانِ من! سحر فریب کاری کو کہتے تھے اور ساحر' یہ جو مذہبی فریب کار ہوتے ہیں' ان کو کہتے تھے۔یہ

جو ہمارے ہاں پرانی زبان ہے' خود ایران کی پہلوی زبان' اس کے اندر بھی میں نے کہا تھا کہ Magic کا لفظ تو Magi سے ہے' وہ مجوس ہے تو یہ جتنے بھی مندروں کے اندر' یہ کاہن اور یہ شاعر اور یہ پیشین گوئیاں کرنے والے' ہاتھ دیکھنے والے' ہر قسم کی فریب کاریاں کرنے والے ہیں' وہ کہتے تھے کہ یہ چیز ہم ''سحر'' کی بنا پہ کرتے ہیں۔ ان کو ساحر کہا جاتا تھا' تو یہ جتنے مذہبی پیشوا ہوتے تھے ان کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا تھا اور برے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا' ان کے ہاں جو ان کی عزت تھی اس کے ساتھ ہی استعمال ہوتا تھا۔

فرعون ساحرین کو مناظرے کے لیے بلاتا ہے اور آگے بات ہے کہ مناظرین نے وہاں دیکھا کہ وہ اژدھا بنا ہوا تھا' آپ کیوں نہ اس کا ترجمہ مناظر کریں۔ آپ کے ہاں تو یہ چیز ہے۔ اس سے بات صاف ہوجاتی ہے کہ یہ ایک مناظرہ ہو رہا تھا تو وہاں قرآن کا لفظ موجود ہے' لیکن ہم نے چونکہ وہ جادو یہ سانپ اور وہ سپولیے لگانے تھے' اس واسطے ''مناظرین'' کے معنی بھی ہم نے دیکھنے والا کر لیا۔ قرآن کریم کے اندر ''نظرة'' کا لفظ مناظرے کے لیے آیا ہے' تنقید کے لیے آیا ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر یہ چیز سامنے ہو تو بات واضح ہوجاتی ہے۔

میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں مجازی طور پر تو وہ دربارِ فرعون کا معرکہ آتا ہے کہ وہاں یہ کچھ ہوا۔ یہ بات دربارِ فرعون میں ہی نہیں ہوئی تھی' بات کہیں اور ہوئی تھی اور بات ہوئی تھی طور کی چوٹیوں پر' جب پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں گئے' وہ واقعہ یہ تھا کہ بھیڑیں چراتے چراتے رات ہوگئی' سردی تھی' اندھیرا تھا' ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا' دور سے کہیں آگ کا ایک شعلہ نظر آیا (20:10)۔ انہوں نے کہا کہ آگ ہے۔ خیر وہ بات اور ہے وہ وہاں پہنچے: **فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی** [1] (20:11) تو آواز آئی۔ آواز کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جیسے میں بول رہا ہوں اور آواز آپ تک پہنچ رہی ہے' یہ تو معاملات ہی خدا کے ہیں' خدا کی آواز' خدا کا بولنا' خدا کا سننا' آپ جیسا نہیں ہے۔ بہرحال ''آواز آئی کہ اے موسیٰ! علیہ السلام'' **اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی** (20:12)۔ ہمارے ہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی پاکیزہ وادی ہے' جہاں تم پھر رہے ہو' جوتے اتار کر آؤ۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ پہاڑ' پہاڑ کی چوٹی یا پہاڑیاں' مقدس ہیں' جس طرح مسیتے وڑنا ہوندا اے تے جوتی باہر لاہ کے جانا ہوندا اے [2]۔ جوتا اتار کے جاؤ۔ بہرحال یہ بات تو کچھ اور ہی ہے۔

---

[1] جب موسیٰ آگ کے قریب پہنچا تو ایک آواز آئی کہ' اے موسیٰ! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 704)

[2] جس طرح مسجد میں داخل ہونا ہوتا ہے تو جوتے اتار کر جانا ہوتا ہے۔

یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام تو نے تلاشِ حقیقت میں بہت صحرانوردیاں کیں' اب اس مقام کے اوپر آ گئے ہو جہاں تمہارا یہ سفر اور یہ مسافت ختم ہو جائے گی۔ اب یہاں "جوتا اتار دو" ایک محاورہ ہے۔ یہاں قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں: **بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى** (20:12)۔ طوی اس وادی کا نام تھا۔ عربوں سے پوچھو: طوی کے معنی ہوتا ہے "لپیٹ دینا"۔ یہاں کہا کہ تمہاری راہوں کو' تمہاری مسافت کی ان گردشوں کو' ہم نے اب لپٹا دیا ہے' ختم کر دیا ہے' اب وحی کی طرف آ ؤ' جس میں اس طرح تلاشِ حقیقت میں مارے مارے پھرنا نہیں پڑتا اور پھر کہا کہ **وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ** (20:13) میں نے تمہیں ایک عظیم پروگرام کے لیے چن لیا ہے **فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى** (20:13) اب اس پروگرام کی تعلیم' اس کے احکام' ہدایات' یہ سارے دیئے جا رہے ہیں۔ کہا کہ غور سے سنو کہ یہ کیا ہے: **اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ** ❶ (20:14)۔ پہلی بات یہ ہے جو تم سے کہنی ہے کہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا** (20:14) اس دنیا کے اندر کوئی صاحبِ اقتدار نہیں' صرف ہم صاحبِ اقتدار ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔

دیکھ رہے ہیں پروگرام! اوپر فرعون ہے جو کہتا ہے کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى** ❷ (79:24)۔ یہاں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ پہلی بات یہ یاد رکھو کہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ** (20:14)۔ یہاں ترجمہ یہ کر دیا کہ میری عبادت کیا کرو۔ بھئی! یہ جو اِلٰہ ہے' یہ وہ ایک اِلٰہ نہیں ہے۔ وہ کیا کراتا تھا؟ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرعون سے عبادت کا یہ لفظ کہتے ہیں کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنی غلامی میں' محکومی میں' رکھا ہوا ہے۔ وہاں لفظ عبادت ہے۔ یہاں کہا کہ **فَاعْبُدْنِيْ** (20:14) کسی کی محکومی نہیں کرنی' کسی کی غلامی اختیار نہیں کرنی' کسی کی اطاعت اختیار نہیں کرنی' اس لیے کہ اِلٰہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔ ہم ہی ہیں۔

حضرت موسیٰ کے ذمہ ایک کٹھن منزل کو سر کرنے کا پروگرام ہے

عزیزانِ من! آگے قرآن نے کہا کہ **واقم الصلوٰۃ لذکری** (20:14)۔ پروگرام دیا۔ کہا کہ سن رکھ' موسیٰ علیہ السلام! کون سا یہ نکتہ آگے آیا ہے جس پہ تم ابھی تک کھڑے ہو! اس حقیقت کو یاد رکھ کر کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15) گردشِ دوراں کی پیچیدگیوں میں' ایک انقلاب موج در موج' لپٹے ہوئے چلا آ رہا تھا' ان گردشوں کے اندر وہ چھپا ہوا تھا' محسوس طور پہ سامنے نہیں آیا تھا۔ اب ہماری مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک اندر ہی اندر آ رہا تھا' محسوس طور پر' نمودار ہو کر' سامنے آ جائے۔ یہ ہے وہ پروگرام جس کے لیے ہم نے تمہیں چنا ہے۔ یہ بڑی عظیم چیزیں ہیں۔

---

❶ خدا میں ہی ہوں۔

❷ میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔

انقلاب ایک دن میں نہیں آ جاتا۔ فساد تو ایک دن میں ہو جاتا ہے' ایک ساعت میں ہو جاتا ہے۔ انقلاب بہت لمبی چیز چاہتا ہے' یہ تو قلب کی تبدیلیاں ہیں۔ یہ اندر اندر ہو رہا تھا۔ کیسی عجیب چیز ہے! قرآن کہتا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے اس کے لیے ہم نے تمہیں چنا تھا۔ وہ انقلاب کیا ہے؟ کیا بات ہے! یہ ہے غور سے سننے کی چیز۔

اس قرآنی انقلاب کی اصل منزل' اس کا مدعا اور اس کا ماحصل

عزیزانِ من! پھر آپ کہیں گے کہ بات تو وہاں سے چلی تھی۔ میں اور کیا کہوں جو اس راستے میں یہ چیزیں آ جائیں تو انہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ پروگرام یہ ہے کہ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰی (20:15) انقلاب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی محنت کے پھل کو اس سے کھینچ نہ لے' ہر شخص کو اس کی محنت کا ماحصل خود ملے۔ یہ ہے انقلاب جو ہم نے لانا ہے' یعنی اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اس مقصد کے لیے انقلاب لایا جا رہا ہے کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے اور سلب ونہب کا موجودہ فرعونی' قارونی اور ہامانی معاشرہ جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے' الٹ کر رکھ دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے اس انقلاب کو ثمر بار بنانے کے لیے چند ایک ہدایات

اس انقلاب کے لیے فرمایا کہ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ فَتَرْدٰی (20:16) یاد رکھ! یہ انکار کرنے والے' سرکشیاں کرنے والے' تیرے راستے میں کھڑے ہوں گے۔ ایک تو یہ تیرے راستے میں کھڑے ہوں گے۔ تیرے جذبات بھی بعض اوقات ایسے ہو جائیں گے کہ تیرے راستے میں کھڑے ہو جائیں گے' ان کو راستے میں کھڑے نہ ہونے دینا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَرْدٰی (20:16) تو تباہ ہو جاؤ گے۔ انقلاب کے راستے میں دو چیزیں بتائی ہیں: (۱) انقلاب کے مخالفین اور (۲) خود انسان کے اپنے اندر کے جذبات۔ تھوڑی سی بھی طاقت ہاتھ میں آئی تو وہ یوں گیا۔ اچھا بھلا جو عصا ہے وہ اس کے بعد پھر مبین اژدھا بن جاتا ہے' وہ سارے احکامات دیدیئے: یوحیٰ۔ پروگرام دیدیا۔ ضابطہ دیدیا' انقلاب کا جو تصور تھا' وہ دیدیا' نظام جس قسم کو وہاں نافذ کرنا تھا' متشکل کرنا تھا' دیدیا' ماحصل بتا دیا کہ کوئی کسی کی محنت کو Exploit (سلب ونہب' لوٹ کھسوٹ) نہیں کر سکے گا۔ یہ سارا کچھ دیا۔ دینے کے بعد پوچھا: موسیٰ علیہ السلام! سن لیا؟ جی' سن لیا۔ پوچھا: اس کے متعلق تمہارا خیال کیا ہے؟

عصا کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تراجم اور تفاسیر

اب یہ پوچھا کہ وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰی (20:17)۔ یہ جیسے کہتے ہیں' تو کیوں نہ میں پہلے آپ کو یہ ترجمے جو

آپ کے ہاں ہیں، سنا دوں، اس قسم کے تضاد سے بات سمجھ میں آ جائے گی۔ سن لیجیے وہ ترجمے اور دیکھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: موسیٰ بات سن لی؟ جی، سن لی۔ ''کہن لگے تیرے ہتھ وچ کی اے [1]؟ اندازہ لگائیے، اتنا عظیم پروگرام دیا جارہا ہے، ہدایات دی جارہی ہیں۔ وہاں یہ کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس چیز کو سنا تو کچھ حیران ہوئے کہ یااللہ! بندۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر! کیا پروگرام آپ دیکھ رہے ہیں! فرعون سے ٹکراؤ، اتنا بڑا نظام، اتنا بڑا انقلاب، میں تنہا گڈریا! یعنی اس مقام پہ یہ اس گفتگو کی، اس پروگرام کی، اس مقام کی Seriousness (سنجیدگی) ہے اور ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ **قَالَ هِیَ عَصَایَ** (20:18)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ کہنے لگے: جی، یہ میرا سوٹا ہیگا اے یعنی یہ میرا عصا ہے۔ پوچھنے والے کا سوال دیکھیے، جواب دینے والا کا جواب دیکھیے۔ یہ سوال اور جواب ہماری ذہنی سطح کی تسکین کے لیے ہوسکتا ہے، نہ خدا کے شایانِ شان تھا، نہ خدا کے رسول کے یہ شایانِ شان تھا کہ یہ پوچھے کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور یہ کہے کہ سوٹا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے پوچھ لیا کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے، تو اس نے کہدیا کہ یہ میرا سوٹا ہے، بات ختم ہوگئی۔ آگے آتا ہے کہ **اَتَوَکَّؤُا عَلَیۡهَا** (20:18)۔ ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ جی، میں تھک جاتا ہوں تو میں اس پر ٹیک لگایا کرتا ہوں، یوں کھڑا ہوجاتا ہوں۔ اور پوچھا تو اتنا ہی تھا کہ تیرے ہاتھ میں کیا تھا، کہا: سوٹا ہے، عصا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد آیا ہے کہ **وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیۡ** (20:18)۔ ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ جو میری بھیڑیں ہیں، میں اس سے ان کے لیے درختوں کے پتے بھی جھاڑا کرتا ہوں۔ ایک عظیم انقلاب کے پروگرام کے بعد باتیں یہ ہورہی ہیں؟ ہم نے اے موسیٰ علیہ السلام! اس مقصد کے لیے تجھے چن لیا ہے اور وہ پوچھ رہا ہے: تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور یہ بتا رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کہ میرے ہاتھ میں عصا ہے اور خود آگے چل پڑتے ہیں اور پھر اس کے بعد جب یہ بات شاعروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور شاعری بھی وہ جو تصوف کی ہے تو پھر پوچھیے مولانا روم سے کہ کس طرح ٹھکا لا لا کے اوس نوں فیر گاوندے نیں! [2] اب یہاں چونکہ خدا سے مطالبہ ہورہا تھا، بات بڑی مزیدار، لذیذ تھی، موقعہ تلاش کیا، ''او نے اپنی گل پوچھی، تے اے اگاں نوں ترپے کہ چل ایس بہانے چار گلاں تے ہور ہوجان گیاں [3]۔'' وہاں یہ ہورہا ہے، یہ پوچھا جارہا ہے کہ **وَ لِیَ فِیۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی** (20:18)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میں اور بھی کئی کام لیتا ہوں۔

---

[1] کہنے لگے کہ بتا، تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

[2] پھر اسے کس طرح سروں میں لہرا لہرا کر گاتے ہیں!

[3] اس نے تو اتنی سی ہی بات معلوم کی تھی، یہ آگے چل پڑے کہ اس بہانے چار باتیں مزید ہوجائیں گے۔

عزیزانِ من! لمبی داستان آپ کو کیا سناؤں' آپ کو کیا پتہ کہ عصا کیا ہوتا ہے' اس سے کیا کیا کام لیے جاتے ہیں! یہاں کہا کہ میں اس سے اور بھی کئی کام لیتا ہوں۔ آگے ہے کہ **قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ○ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی** (20:19-20)۔ ترجمہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کہا: اچھا موسیٰ! اس کو پھینک دے' پھینک دیا۔ پھینک دیا تو دیکھا کہ وہ سانپ بن گیا۔ آگے قرآن میں آیا ہے کہ **قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ** (20:21)۔ ترجمہ یہ بتایا جاتا ہے کہ کہا: موسیٰ' ڈر نہیں' پکڑ لے۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں!! **سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی** (20:21)۔ کوئی بات نہیں تو اس کو پکڑ لے پھر ہم عصا کا عصا بنا دیں گے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ **وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ** (20:22)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اور اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں رکھ لو اور پھر نکالو۔ وہ بلا کسی عیب کے چمکتا ہوا نکلے گا۔

انبیائے کرام کی تعلیم کے دو اہم گوشے

قرآنِ مجید میں انبیائے کرامؑ کی تعلیمات کے دو مختلف گوشے دکھائے ہیں: نذیر اور بشیر۔ انبیاء کی نذارات یہ ہوتی ہیں کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہ کن ہوجاتا ہے' کہتے ہیں کہ غلط کام کے انجام سے ہلاک ہوجاؤ گے' تباہ ہوجاؤ گے' برباد ہوجاؤ گے' ختم ہوجاؤ گے۔ اس میں بڑی تنبیہ (Warning) ہوتی ہے' دھمکی ہوتی ہے' ڈراؤنا انداز ہوتا ہے اور اس کے بعد دوسرا گوشہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ وہ بشیر بھی ہوتا ہے' وہ صرف ڈراتا ہی نہیں' کہتا ہے کہ اگر صحیح نظام کے اوپر آجاؤ گے تو یہ خوشگواریاں ہوں گی' یہ رحمتیں ہوں گی' یہ انعامات ہوں گے' یہ زندگی خوشگواریوں میں گزرے گی۔ یہ دو گوشے انبیائے کرامؑ کے سارے قرآن میں آتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی وحی کا پیغام فرعون کے نام

پہلا گوشہ تو وہ تھا جس میں عصا کی بات تھی اور اس کو بتانا تھا کہ تیری روش کا نتیجہ کتنا تباہ کن ہوگا۔ اس کے بعد پھر اسے یہ بھی بتانا تھا کہ اگر صحیح نظام قائم کرلو گے تو اس کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہوگا۔ یہ ہے وہ چیز کہ یہ ''ید'' قوت ہی ہے لیکن اسے بتا دینا کہ میری جو قوت ہے' وہ فرعون کی قوت نہیں ہے' میرا ہاتھ نمرود[1] کا ہاتھ نہیں ہے' ہلاکو اور چنگیز[2] کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ یدِ بیضا ہے' یعنی

---

[1] نمرود کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔216 (فٹ نوٹ 3)

[2] ہلاکو اور چنگیز کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص۔310 (فٹ نوٹ 2)

تاریکیوں میں نورانیت پھیلانے والا ہے۔ میرے ہاتھ میں اگر یہ قوت آ گئی جو اس وقت تیرے ہاتھ میں آئی ہوئی ہے کہ سانپ بنے ہوئے ہو' اگر میرے ہاتھ میں یہ قوت آ گئی تو یہ دنیا جگمگا اٹھے گی۔ اسے یہ بتا دینا۔ یہ بیضا ہے۔ یہ **بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ** (20:22) ہے۔ نظام وہ ہوگا جس میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوگی' وہ جو حضورؐ نے بیضا کا بتایا تھا کہ "**لَیۡلُھَا وَ نَھارُھا**" اس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہوگی۔ درخشندہ نظام کی خوبی یہ ہوتی ہے' عزیزانِ من! کہ اس میں تاریکی آتی ہی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام

کیا الفاظ ہیں حضور ﷺ کی اس حدیث کے کہ **لقد ترکتم علی مثل البیضا لیلھا و نھارھا سو آء**! میں اس حدیث پہ قربان جاؤں۔ میں تم میں وہ ملتِ بیضا چھوڑ کے چلا ہوں جس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہوگی اور قرآن کہتا ہے کہ اگر اس مسلک کے اوپر قائم رہو گے تو **بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ** (20:22) اس میں دن اور رات میں فرق ہی نہیں ہوگا' بیضاء ہی رہے گا۔

یہ تو وحی کا پیغام تھا کوئی پھلبہری نہیں تھی

یہاں (20:22) میں غیر سوء کہا ہے۔ اس کا ترجمہ کر دیا کہ جی' وہ ہاتھ جو سفید نظر آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو پھلبہری نکلی ہوئی ہے: غیر سوءِ۔ کہا کہ نہیں' دیکھ لو! پھلبہری نہیں ہیگی۔ یہ وہ نظام ہوگا جس میں کسی قسم کی ناہمواری نہیں ہوگی۔ ''سوء'' ناہمواری کو کہتے ہیں۔ کہا کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہوگا۔ میں وہ نظام لے کر آیا ہوں۔ **اٰیَۃً اُخۡرٰی** (20:22) یہ دوسرے قوانین ہیں جو تم نے پیش کرنے ہیں۔ پہلے ان کو ان کے انجام' ان کے غلط نظام کی تباہیوں سے ڈرانا' اور پھر صحیح نظام کی درخشندگی ان کے سامنے پیش کرنا۔ یہ دوسری چیز ہے **لِنُرِیَکَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡکُبۡرٰی** (20:23) یہ سب کچھ ہم نے اس لیے تمہیں دیا ہے تا کہ ہم تمہیں وہاں اپنی کبریائی کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

عزیزانِ من! یہ تو اس لیے تھا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد کہا کہ **اِذۡھَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی** (20:24) فرعون کی طرف جاؤ' وہ حدود فراموش سیلاب بن چکا ہے' اس کی قوت پہ بند باندھو۔ یہ بند اس ایک عصا یعنی صحیح نظام کے زور پہ بندھے گا' جس میں قوت ہے' ایک یدِ بیضا ہوگا' انسانیت کی منفعت کے لیۓ' درخشندگی کے لیۓ' جو تم نظام قائم کرو گے۔ کیا ہوگا' وہ نظام؟ **لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی** (20:15) کوئی کسی کی محنت کو Exploit (لوٹ کھسوٹ) کر کے نہیں لے جائے گا۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا ہے کہ جاؤ فرعون کی طرف۔ عزیزانِ من! غور کر لیجیۓ' اس بنیاد کے بعد آپ دیکھ لیجیے کہ فرعون کے دربار میں

ساحرین کے ساتھ مقابلہ تھا اس کی اصل نوعیت کیا تھی؟ بقول ان کے وہاں تو یہ ٹھیک تھا کہ انہوں نے رسیاں پھینکیں' چھوٹے چھوٹے سانپ کے بچے بن گئے' انہوں نے بڑا پھینکا اور وہ بنا اژدھا[1] (26:32) اور پھر خدا کے سامنے طور کی چوٹی کے اوپر بھی یہی کچھ ہو چکا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ ایک صاحب نے یہ کہا تھا کہ جی' یہ وہاں ریہرسل ہو رہی تھی۔ عزیزانِ من! سمجھیے' یہ سارا کچھ وحی کے ذریعے سے' نبوت کی آنکھ سے' دکھایا جا رہا تھا' وحی کی رو سے بتایا جا رہا تھا۔ وہ تھا کیا؟

یہ جادوگروں کا کوئی دنگل نہ تھا بلکہ یہ ید بیضا تھا' روشن تعلیم تھی جو پیش کی جا رہی تھی

یہ ساری تفاصیل دی تھیں اور اس کے بعد کہا تھا کہ **اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ** (20:24) جاؤ فرعون کی طرف۔ وہاں آنے کے بعد' جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ وہ مقامات اب آئیں گے' تو آپ کے لیے سمجھنا کتنا آسان ہو جائے گا کہ یہ بات کیا ہو رہی ہے۔ اب وہ نہ اس قسم کا جادوگروں کا دنگل ہوگا' نہ اس میں سپولیے ہوں گے' نہ اس میں اژدھا[2] آئے گا' نہ اس میں کوئی چمکتا ہوا ہاتھ دکھائی[3] دے رہا ہوگا۔ اس کے سارے معنی آپ کے سامنے ہوں گے اور عزیزانِ من! سب سے بڑی چیز یہ کہ خود قرآن سے پوچھو کہ وہ جو وہاں تبدیلی آئی تھی کہ اس مناظرے کے میدان میں یہ سب کچھ پیش کیا اور وہ جو ساحرین تھے وہ سجدے میں گر گئے' انہوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام! ہم تیرے خدا کے اوپر ایمان لے آئے' یہ بات ہوئی تھی۔ اگر اس طرح سے رکھا جائے تو ذہن میں آئے گا

---

[1] **فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ** (26:32) اس پر موسیٰؑ نے وہ قوانین وضوابط پیش کیے جو اسے خدا سے ملے تھے اور جنہیں وہ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ یہ قوانین وضوابط کیا تھے' گویا ایک اژدھا تھا جو باطل کے معتقدات کو نگلے جا رہا تھا (ان کی رو سے بتایا گیا تھا کہ اہل فرعون کی غلط روش کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا (32-7:107-108;17-25;28:31)۔ (حوالہ پرویزؒ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص۔ 837 تا 838)۔

[2] **وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ** (26:33) اس کے بعد موسیٰؑ ان براہین نیرہ کو سامنے لایا جن کی رو سے واضح کیا گیا تھا کہ قوانین الٰہیہ کی اطاعت سے ان کا مستقبل کس قدر روشن ہو جائے گا اور ان دلائل کی درخشندگی اور تابناکی' ہر دیدہ بینا کو صاف نظر آ رہی تھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 838)۔

[3] **فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ** (26:44) چنانچہ انہوں نے اپنے باطل مذہب کی تائید میں نہایت رکیک اور بودی دلیلیں پیش کیں اور کہا کہ فرعون کے جاہ وجلال کی قسم' ہم آج ضرور میدان مار لیں گے۔ (یعنی دلیلیں تو بے حد کمزور تھیں لیکن چونکہ وہ فرعون کی جاہ وحشمت اور قوت وجبروت کو اپنی پشت پر سمجھتے تھے اس لیے انہیں اپنی کامیابی کا یقین تھا)۔ اس پر **فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ** (26:45) موسیٰؑ نے نظام خداوندی کی تائید میں محکم دلائل پیش کیے جو پروہتوں کی' فریب پر مبنی دلیلوں کو ایک ایک کر کے نگل گئے۔ اس لیے **فَاُلْقِىَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ** (26:46) وہ دلائل اس قدر واضح' بیّن اور محکم تھے کہ ان کی روشنی میں' پروہتوں پر موسیٰؑ کی دعوت کی صداقت بے نقاب ہو گئی اور انہوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 839)۔

کہ انہوں نے جو اتنا بڑا جادو دکھایا تو ان جادوگروں نے سمجھ لیا کہ ہاں صاحب! یہ بہت بڑا جادوگر ہے' جادو تو وہ کہتے ہی فریب کو تھے۔ جس شخص نے اتنا بڑا فریب کر کے یہ کچھ کیا اس کے خدا پر ایمان لانا' ایمان بھی اس درجے کا کہ فرعون کہتا ہے کہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں' اور وہ کہتے ہیں کہ **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72) جو تیرے جی میں آئے تو کر کے دیکھ لے' تو کر ہی کیا سکتا ہے' تیرا ہاتھ تو ہماری اس طبعی زندگی تک پہنچ سکتا ہے لیکن زندگی تو بہت آگے جاتی ہے۔ **اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ** (26:50) تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہمارے اندر کیا انقلاب پیدا ہوگیا ہے' ہمارا منتہائے نگاہ تو نہیں رہا' خدا ہوگیا ہے۔ یہ Change (تغیر) ان ساحرین کے اندر' اس جادو کی چھڑی سے پیدا نہیں ہوا تھا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کو اپنے خیالات وتصورات کے تابع کرنا شرکِ عظیم ہے

مجھ سے نہ پوچھیے' عزیزانِ من! میں تو کہتا ہوں کہ قرآن ہاتھ میں لے کر اپنی طرف سے کچھ کہنا شرکِ عظیم ہے' میں اس کے انجام سے واقف ہوں' خدا سے ڈرتا ہوں' آپ کو پتہ نہیں کہ میں جب قرآن ہاتھ میں لے کر بیٹھتا ہوں تو میری کیفیت کیا ہوتی ہے۔ یہاں تو ایک ایک ''صفحہ'' کا مجھے دینا پڑا حساب[1]۔ یہ جو چیزیں میں یوں بیان کر دیتا ہوں۔ اس کے لیے قرآن کی آیات کی سندیں میرے پاس ہوتی ہیں۔ سن لیجیے کہ قرآن کیا کہتا ہے کہ یہ جو Change (تغیر) ہوا تھا یہ کس طرح ہوا تھا۔ کیا یہ جادو کے زور سے ہوا تھا؟ سورۃ الاعراف میں یہ بات آئی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میں آپ کو حوالے دیدوں گا تا کہ آپ خود بھی جا کر وہ آیات نکال کر دیکھ لیں کہ کہاں کہاں یہ آیا ہے۔ مختلف مقامات میں قرآن نے اس داستان کو دہرایا ہے۔ پہلی چیز اس میں یہ ہے کہ **وَاَوْحَيْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ** (7:117)۔ یاد رکھیے' عربی زبان میں یہ جو ''القائے عصا''[2] ہوتا ہے' اس کے معنی ہوتا ہے ''کسی مقام پر رک کر پوری قوت کو Concentrate (مرتکز) کر کے پھر استعمال کرنا'' رکنا اس کے معنی ہوتا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ اس قوت کو لے کر تھوڑے وقت کے لیے رک جاؤ۔ پروگرام کی یہی ایک Strategy (حکمتِ عملی) ہوتی ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ اپنی اس قوت کو Concentrate (مرتکز) کر' اس میں ارتکاز پیدا کر اور پھر دیکھ کہ یہ پروگرام کس طرح سے چلتا ہے۔ یہ ہے جو قرآن نے کہا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کیا کرے گا' اس کے لیے آگے کہا ہے۔

---

[1] یہ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) کے اس شعر سے ماخوذ ہے: ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

[2] یہ بقول تاج العروس محاورہ ہے کہ القی المسافر عصاہ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مسافر نے اپنی لاٹھی ڈال دی لیکن یہ محاورہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ وہ منزل پر پہنچ کر ٹھہر گیا اور پڑاؤ ڈالا۔

لفظ افک کا' افترا کا' قرآنی مفہوم

قرآن نے کہا ہے کہ **فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ** (7:117)۔ یہاں پر یہ ''افک'' کا لفظ آیا ہے۔ افک کہتے ہیں ''ایک افترا کو''۔ دوسری جگہ (25:4) میں آیا ہے' تیسری جگہ (34:43) میں آیا ہے۔ گویا یہ وہ چیزیں تھیں جو انہوں نے خدا کے خلاف افترا کیا تھا: خود بنائی ہوئی چیزیں' مصنوعی تھیں' اور انہیں وہ خدا کی کتاب یا خدا کا دین کہہ کر پیش کر رہے تھے۔ بات تو یہ ہو رہی تھی کہ وہ ان چیزوں کو جو خود وضع کردہ تھیں' افترا تھا' افک تھا' اسے وہ خدا کی تعلیم اور خدا کی شریعت کہہ کر پیش کر رہے تھے اور حضرتِ موسیٰؑ خالص خدا کی توحید کو سامنے لا رہے تھے۔ یہاں کہا کہ **فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ** (7:117)۔ اس مناظرے کے اندر یہ جتنا بھی بناوٹی' وضعی' جعلی' مصنوعی پن ہے' اس کے لیے افک' افترا' کذب کے الفاظ ہیں۔ کہا ہے کہ جب خدا کی یہ سچائی ان کے سامنے آ گئی' تو حضرت موسیٰؑ کے وہ دلائل اس فریب اور باطل کو نگل گئے' ہڑپ کر گئے' کھا گئے۔ آگے دیکھیے کہا کہ **فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** (7:118)۔ حق Establish (ثبت) ہوگیا' جو کچھ وہ کر رہے تھے' وہ باطل ثابت ہوگیا۔

جادوگر یعنی فریب کار کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا

قرآن نے کہا ہے **وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی** (20:69) یاد رکھو' جادو کرنے والا کبھی کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس جادو کے زور پہ حق Establish (ثبت) ہوا تو خدا تو کہتا ہے کہ وہ کامیاب ہی نہیں ہوسکتا۔ اس میں استثنا نہیں ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جادو کریں گے تو وہ کامیاب ہونگے' وہ جادو کریں گے تو وہ باطل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ جادو کبھی پنپ نہیں سکتا' جادوگر کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ یہاں **حَیْثُ اَتٰی** (20:69) کے الفاظ آئے ہیں کہ وہ کسی رخ سے آئے' حق کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ **فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ** [1] (7:118)۔ یہ حق کس طرح Establish (ثابت) ہوا' حق کو ثبات کیسے ہوا' یہ ہے عزیزانِ من! نکتہ ماسکہ اس ساری داستان کا' جہاں سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیا وہاں یہ جادو ہو رہا تھا؟ یا قانونِ خداوندی کی رو سے کچھ کیا جا رہا تھا؟ جادو تو قانون کے خلاف ہوتا ہے۔ وہ تو وہ چیز ہوتی ہے جو آپ کے ہاں Cause & Effect (علت ومعلول) کا عام Law (قانون) ہے۔ وہ اس کے مطابق نہیں ہوتا۔ وہ جو یوں کرتا ہے' وہ یوں دکھا دیتا ہے' وہ تو قانون کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر آپ نے یہ سمجھنا ہو کہ یہ کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہے تو میری کتاب ''برقِ طور'' ہے اس کے آخر میں' میں نے سحر کے متعلق پورا باب لکھا ہے' اسے دیکھیے [2] گا لیکن بہر حال یہ چیز قاعدے قانون

---

[1] سو اس طرح حق ثابت ہوگیا' اور ان کا کیا کرایا سب اکارت گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔367)۔

[2] اس آویزش کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

کے مطابق نہیں ہوتی' وہ جو قاعدے کے مطابق ہوتی ہے وہ تو جادو کہلا ہی نہیں سکتی۔ یہ کس طرح سے حق کا غلبہ ہوا تھا؟ یہ ہے وہ مقام جو سامنے آئے تو پھر قرآن کے یہ سارے مقامات واضح ہوجاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تو یہ ایک ہی آیت سحر کے تصور کو باطل کر کے رکھ دیتی ہے

آپ کو معلوم ہے کہ کلمت اللہ کے نام (Nomenclature) سے یہ چیزیں قرآن میں آئی ہیں' مثلاً **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34)۔اور **لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64) قوانینِ خداوندی کے لیے یہ لفظ آیا ہے' قرآن کو اس نے کلام اللہ کہا ہے' کلمہ کے معنی ہی قانونِ خداوندی ہیں۔ سارے قرآن میں یہ چیز یونہی ہے۔ یہ جہاں وہ داستان ہے' جہاں یہ غالب آئے ہیں اور وہ جو ساحرین دربارِ فرعون ہیں' وہ ان کے ہاں کے علماء' مناظر [1] مباحثہ کرنے والے جو آئے تھے' انہیں جو شکست ہوئی ہے' وہاں قرآن کہتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ **وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ** (10:82) اللہ نے حق کو ثابت کر دیا' وہاں Establish (ثبت) کر دیا۔ یہ **بِكَلِمٰتِهٖ** (10:82) اس کے اپنے قوانین کی رو سے ہے۔ یہ سارا تصور جو سحر کا ہے' عزیزانِ من! اس کو ایک آیت باطل کر دیتی ہے اور وہ آیت ہے **وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ** [2] (10:82)۔ اس آیت کے آگے بات صاف ہوگئی۔ یہ نہیں کہا کہ خواہ ساحرین کے اوپر یہ بات کتنی ہی کیوں نہ گراں گزرے' خدا نے یہ کر دیا بلکہ یہ کہا کہ خواہ مجرمین پر یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے' خدا نے اپنے قوانین کی رو سے وہاں حق کو Establish (ثبت) کر کے دکھا دیا۔ حق کے مطابق ایک قانون مناظرے (مباحثہ) میں سامنے آیا' اس کے سامنے وضعی روایت چل ہی نہیں سکتی۔ انہیں مجرمون کہا ہے اور کہا یہ ہے کہ خواہ ان پہ حق کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرے' حق کو Establish (ثبت) کیا۔ یہ بکلمۃ اللہ ہے' یہ جو کچھ ہوا تھا۔

سحر اور کلمۃ اللہ ایک دوسرے کی ضد ہیں

قرآن نے جادو اور سحر کو کہیں کلمۃ اللہ نہیں کہا۔ وہ تو ہو ہی نہیں سکتا' وہ تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ سحر یا ساحر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے اور مومن کامیاب ہوتا ہے کیونکہ وہ سحر سے کام نہیں لیتا۔ وہاں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جو غلبہ حاصل ہوا تھا' وہ خدا کے قوانین' اس کے نظام' اس کے ضابطہ' اس کی ہدایات' اس کی وحی' کے مطابق ہوا تھا۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا لے کر گئے تھے فرعون کے پاس؟ کہا کہ **فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ** [3] (28:36)۔ وہاں

---

[1] یعنی مباحثہ کرنے والے' مناظرہ کرنے والے' کسی چیز پر غور و فکر کرنے والے (تاج العروس)۔

[2] خواہ اس حق کا ثابت و قیام اس پارٹی پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرے جس نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 480)۔

[3] جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے قوانین کو لے کر ان کے پاس گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 892)۔

(10:36,64) میں کلمات کہا ہے اور یہاں (28:36) میں آیات کہا ہے۔ یہ وہی ہے جسے میں نے قانون کہا ہے۔ ابھی وہ آیت میرے سامنے آتی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ **بِالْھُدٰی** (28:37) تھا' ہدایتِ خداوندی تھی جسے موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر گئے تھے تو یہ ہدایات جو ہیں یہ تو جادو کے ذریعے نہیں دکھائی جاتیں۔ انہیں تو ہدایت کہا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ انہیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے گئے تھے۔ کلمات اللہ کے ذریعے' آیاتِ خداوندی کی رو سے بات ہو رہی تھی' وہاں مناظرہ ہو رہا تھا' وہاں ان کے ساتھ مباحثہ ہو رہا تھا۔ مقابلے میں ان کے مذہب کے علما تھے' ان کے مشائخ تھے۔

یہاں حبل سے مراد ساحرین کی اپنی مذہبی تعلیم تھی

جب وہ آیات آگے آئیں گی تو میں بتاؤں گا کہ یہ ان کے ہاں کی وضع کی ہوئی ہیں۔ **حبالھم** (20:66;26:44) وہاں کہا ہے۔ یہ حبل کی جمع ہے۔ جس کے معنی رسیاں ہیں' تو پھر اس آیت **وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا** (3:102) کا ترجمہ کیا کرو گے؟ قرآن نے کہا کہ اے جماعتِ مومنین! تم سب اجتماعی طور پر حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑو۔ ہر ایک اس کی تفسیر کرتا ہے' خدا کی رسی۔ حبل تو ضابطۂ قوانین خداوندی کو کہتے ہیں تو وہاں (20:66;26:44) جب کہا کہ انہوں نے اپنی جو احبال تھیں' وہ پھینکیں' تو سیدھی سی بات ہے کہ وہ جوان کے ہاں جسے وہ اپنی شریعت بتاتے تھے' اپنا مذہب بتاتے تھے' وہ انہوں نے پیش کیا اور یہاں حضرت موسیٰؑ کی طرف سے جو پیش کیا گیا' وہ حبل اللہ تھا' خدا کا دیا ہوا ضابطۂ قوانین تھا۔ اس کے سامنے تو کچھ ٹھہر ہی نہیں سکتا' انہوں نے بری طرح سے شکست کھائی۔ ان علما نے بھانپ لیا کہ واقعی ہمارا یہ بنایا ہوا جو مذہب ہے' یہ مصنوعی ہے' افترا ہے' وضعی ہے' یہ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ صحیح حبل اللہ اسی شخص کے پاس ہے۔ وہ ہدایتِ خداوندی کے سامنے جھکے تھے' کلمات اللہ کے سامنے جھکے تھے۔

فرعون کی سمندر میں غرق ہونے کی روئداد اور عصا کی افادیت

اب وہ مقام آتا ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ یہ وہاں سے اپنی قوم کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ رات کے وقت یہ مصر سے نکلے تھے (26:52) اور ان سے کہا گیا تھا کہ اتنا سمجھ رکھو کہ صبح سے پہلے پہلے ان فرعونیوں کو پتہ چل جائے گا اور یہ تمہارے پیچھے آ جائیں گے (26:60)۔ اب یہ انہیں لے کر آگے نکلے ہیں تو وہ آگے بحر آ گیا' یہ Red Sea[1] ہے جسے بحرِ قلزم کہتے ہیں۔

---

[1] Sea running northwest from the Gulf of Aden to the Sinai Peninsula in Egypt, where it branches into the Gulf of Aqaba to the east and the Gulf of Suez to the west. It has been joined to the Mediterranean Sea by the Suez Canal since 1869. It is coloured red at certain times of the year owing to the reddish algae that appears in it (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, p.1286).

یہاں ذکر راستے کا ہے، سمندر کا نہیں

اب آگے یہ بحرِ قلزم ہے، اور پیچھے سے فرعون والے آ رہے ہیں۔ جب فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کہاں لے آیا تو ہمیں مروانے کے لیے! پیچھے ان کی فوج چلی آ رہی ہے، آگے سمندر آ گیا ہے، جہاز تو ہمارے پاس ہے نہیں، کیا ہوگا یہاں (26:61)؟ وہاں پھر یہ کہ رہے ہیں کہ ان کا وہ عصا کام دے رہا ہے۔ وہ آئے، انہوں نے کہا کہ نہیں، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ عصا سمندر میں مارا، سمندر دو ٹکڑے ہوگیا، یہ بیچ میں سے پار چلے گئے اور جب پار چلے گئے تو اس نے سمندر کے ان دو ٹکڑوں کو جلدی سے اکٹھا نہیں کیا۔ اگر کر دیتا تو وہ اس طرح تو پھنستے نہیں، ان دو ٹکڑوں کو ویسے ہی رہنے دیا اور اس کے بعد جب وہ بیچوں بیچ آئے تو سمندر کو جھٹ سے ملا دیا۔ پہلی بات یہ ہے عزیزانِ من! کہ جب فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا تو **قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤی اِنَّا لَمُدۡرَکُوۡنَ** (26:61) موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ او موسیٰ علیہ السلام! مارے گئے، پیچھے فرعون ہے اور آگے سمندر۔ **قَالَ کَلَّا** (26:62) موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ گھبراؤ نہیں، کوئی فکر نہ کرو، ہم مارے نہیں جائیں گے۔

یہ ہیں، عزیزانِ من! وہ مقامات جہاں سے قرآن سمجھ میں آتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کی آیات پر سے یونہی نہیں گزر جانا چاہیے۔ یہاں یہ بات آئی ہے کہ جس خدا نے مجھے اس طرح مصر سے نکلنے کا حکم دیا تھا، وہ اب بھی میرے ساتھ ہے۔ کہا کہ **اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ** (26:62) رب میرے ساتھ ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کو لے کے نکل جا، محفوظ مقام کے اوپر پہنچ جاؤ گے۔ وہ جو کہا ہے کہ رب میرے ساتھ ہے تو یہ نہیں ہے کہ اب دیکھ لیجیے، میں اور وہ دونوں اکٹھے ترے جاواں [1] گے۔

اس نے جو وعدہ کیا ہوا ہے، وہ وعدہ حق ہے، آج بھی وہ اسی طرح صحیح ہے جیسا اس وقت صحیح تھا، جب اس نے وعدہ کیا ہے، جب اس نے کہا ہے کہ تم حفاظت کے مقام پہ پہنچ جاؤ گے، تو وہ میرے ساتھ ہے، پہنچائے گا مجھے، ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ کیا کہا کہ کیا ہوگا، اس کے بعد؟ کیا یہ کہا کہ اس نے مجھے یہ عصا دیا ہوا ہے، میں ماروں گا اور سمندر میں وہ راستہ دو ٹکڑے ہو جائے گا؟ نہیں بلکہ یہ کہا کہ **اِنَّ مَعِیَ رَبِّیۡ** (26:62) رب میرے ساتھ ہے **سَیَہۡدِیۡنِ** (26:62) وہ یقیناً مجھے ایسا راستہ دکھائے گا جہاں سے ہم محفوظ طور پہ آگے پہنچ جائیں۔ یہ تو سیھدین ہے یعنی وہ مجھے راستہ دکھائے گا۔ وہاں آئے ہیں تو اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اب یہاں کوئی راستہ ایسا ہے جہاں سے ہم پہنچ جائیں۔ ٹھیک ہے، تمہارے ذہن میں نہیں ہے لیکن وہ

---

[1] اکٹھے چلتے چلے جائیں گے۔

ہمیں یقیناً راستہ دکھائے گا۔ یہ بات قرآن کہہ رہا ہے۔ بات تو صاف ہوگئی۔ اب وہ راستہ کیا دکھایا' قرآن بتا رہا ہے۔ آج تو یہ جو Red Sea یا بحیرہ قلزم ہے' آگے سے اسے نہر سویز[1] کاٹ کے بحیرہ روم (Mediterranean Sea) سے ملا دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں یہ نہرِ سویز نہیں تھی یہاں یہ بحیرہ قلزم بند ہو جاتا تھا' یعنی بحیرہ قلزم اور بحیرہ روم الگ الگ تھے' وہاں خشکی تھی' اور جہاں یہ Red Sea (بحیرہ قلزم) بند ہوتا تھا' اس سے ذرا پہلے آج بھی آپ دیکھیں گے کہ آگے سینا کا جو مقام ہے' وہ ایک مثلث[2] سی بنی ہوئی ہے' تھوڑے سے حصے پہ پانی ہے' پانی کے بعد وہ خشکی آ جاتی ہے۔ یہ وہاں پہلے ہی جست کے اندر فلسطین میں نہیں آ گئے تھے۔ یہ پہلے اس مثلث قطعہ میں آئے تھے۔ وہ مثلث ذرا سی خشکی تھی' تھوڑا سا ٹکڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ خدا نے جو راستہ ہے وہ اس قوم کو دکھایا۔ یہ مختصر سا راستہ ایک ایسے مقام پہ ہے جہاں بحیرہ قلزم بند ہوگیا[2] ہے۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی مدو جزر کے راستے کی شکل میں کی

دو مقامات پہ یہ چیز آئی ہے اور اس نے اسے واضح کر دیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے ہم نے یہ کہا کہ **اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا** (20:77) لے چل ان کو راتوں رات' اور جب وہاں پہنچ جاؤ تو وہاں تمہیں ایک خشک راستہ ملے گا' وہاں سے ان کو پار لے جانا۔ یہ قرآن بتا رہا ہے کہ وہ راستہ خشک ہوگا' وہاں سے لے کر جاؤ' سمندر کے بیچوں بیچ لے جانے کی بات ہی نہیں[3] تھی' نہ اس کو دو ٹکڑے کرنے کا سوال ہے: **طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا** (20:77) یہ یَبَسًا یہ خشک ٹکڑا' یہ خشک راستہ'

---

[1] یہ نہر 165 کلومیٹر (103 میل) لمبی ہے۔ فرانسیسی انجینئر فرڈیننڈ ڈی لیپس (Ferdinand de Lesseps) نے نہ صرف اس کی پلاننگ کی بلکہ 1859ء سے 1869ء تک اس کی تعمیر کی نگرانی بھی کی۔

(Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: Reader`s Digest Association Limited,p. 1513)

[2] اسے Sinai Peninsula کہتے ہیں۔ اس راستے اور مقام کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 213 تا 214۔

[3] یہودیوں کی طرف سے حال ہی میں تورات کا جو نیا ترجمہ شائع ہوا ہے' اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیرۂ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت سے اسے Sea of Reeds کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع تھا۔

Announcement made by Mr. Lisser Zussman, Executive Director of the Jewish Publications Society of America, Daily Telegraph, September 1962.

(حوالہ پرویز: مفہوم القرآن' طلوعِ اسلام ٹرسٹ' لاہور' ص۔ 715)

سمندر کے اندر کیسے ہوسکتا ہے؟ قرآن ہے' عزیزانِ من! یہاں تو ہم لوگوں کو علم نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم نے کبھی سمندر دیکھا ہی نہیں ہے۔ کراچی میں یہ چیز ہم نے بھی دیکھی ہے اور یہ چیز آپ نے بھی تو سنی ہوگی۔ یہ وہ ہے جسے سمندر کا مدوجزر کہتے ہیں۔ اس میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جو مد (High Tide) ہوتا ہے' وہ اس کا چڑھاؤ آتا ہے تو اس سے کتنی دور تک وہ جو پانی ہے' چلا آتا ہے اور اس کے بعد جب وہ اترتا ہے تو کتنی ہی خشکی چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد پانی اتنا پیچھے چلا جاتا ہے۔ جھوم جایئے' عزیزانِ من! قرآن جس طرح ان چیزوں کو Describe (بیان) کرتا ہے۔ اس کے لیے عربی زبان کے اندر یہ ''رھوا'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا یعنی رھوا ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس میں پہلے کبھی پانی ہو اور پانی پیچھے ہٹ کر جگہ کو خشک کردے۔ عربی میں اس کو رھواً کہتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (44:24) وہ خشکی کا مقام ہم تمہیں بتا رہے ہیں' جہاں ایک وقت میں تو پانی آجائے گا اور اس کے بعد وہ اس کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائے گا اور وہ اتنی جگہ خشک ہوجائے گی۔ جب یہ صورت پیدا ہوجائے تو وہاں سے ان کو پار لے جاؤ۔ قرآن کے مقامات ہمارے سامنے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ہے وہ جو کہا تھا کہ میرا رب مجھے راستہ دکھائے گا' تو نظر یہ آتا ہے کہ وہ راستہ بہرحال وحی کے ذریعے ہی سہی' اس نے وہ مقام دکھایا ہے۔ کہا ہے کہ وہاں یہ کیفیت ہوگی' وہاں سے تم ان کو لے جاؤ' جب دریا' سمندر (بحر) پیچھے ہٹا ہوا ہو۔

سمندر کے پھٹ جانے کی یہ ساری کہانی تورات کی بیان کردہ ہے' یہ قرآنی حقائق نہیں ہیں

آپ حیران ہوں گے' عزیزانِ من! تورات میں تو یہ سارے افسانے ہیں' کہ سوٹا[1] مارا اور سمندر پھٹ گیا۔ ہم بھی ہزار تیرہ سو برس سے اپنے ہاں یہی لیے جا رہے ہیں' کوئی دوسری بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے' عزیزانِ من! اگر یہ دو تین مقامات قرآن کے سامنے ہوتے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ میرا خدا مجھے ضرور راستہ دکھائے گا' کیونکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں سینا میں حفاظت سے پہنچا دے گا اور آگے یہ ہوگا۔ اس نے کہا ہے کہ اس میں سے خشکی کا وہ راستہ نکل آئے گا۔ کیسے نکلے گا؟ مدوجزر (اکبر و اصغر) (High and Low Tide) کے ذریعے سے' جب پانی پیچھے ہٹ جائے گا تو اس وقت وہاں سے پار ہوجاؤ۔ قرآن کے تین مقامات ہمارے سامنے تھے لیکن یہ تو جب تک زیبِ داستان کے لیے کچھ بڑھایا نہ جائے' وعظ اچ مزا نئیں اوندا ہیگا[2]۔ تورات میں یہ سب کچھ موجود تھا۔

---

[1] لاٹھی

[2] وعظ میں پہلوئے لطف آتا ہی نہیں ہے۔

ہم ہزار برس سے یہی کچھ کہتے اور سنتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ خدا نکردہ مجھے کہیں الہام ہوتا ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ وہ جو تصریفِ آیات کا قرآن نے کہا ہے' میں نے اس پہ عمل کیا' تیس چالیس سال تصریفِ آیات پہ گزارے ہیں۔ جب یہ چیز آئی کہ یہ کیسے ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ خدا راستہ دکھائے گا۔ اس نے راستہ دکھانے کا کہا ہے' سمندر کو پھاڑنے کا نہیں کہا۔ دیکھیے دو جگہ قرآن نے اور کہا ہے کہ راستہ خشک ہوگا اور خشک اس طرح سے ہوگا جیسا یہ مدوجزر سے پانی پیچھے ہٹ جاتا تھا: وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (44:24)۔ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہوا کیا تھا۔

آج کے دور کی ہسٹری' ان قرآنی حقائق کی شہادت فراہم کر رہی ہے

اب اس بات کے لیے آج کے دور کی ہسٹری (تاریخ) کافی ہے۔ آپ حیران ہوں گے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی صداقت کی جو شہادتیں ہیں' وہ کہاں سے مل رہی ہیں۔ تورات کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے' تین [1] چار برس ہوئے ہیں' یہ امریکا سے شائع ہوا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں جہاں سمندر کو دو ٹکڑے کر کے بیچ میں سے نکل جانے کی یہ چیز پہلے چلی آ رہی تھی' انہوں نے اس میں لکھا ہے کہ یہ ساری داستان وضعی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ مدتوں تک ہمارے ہاں کے محقق اس تلاش میں تھے کہ کیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر گئے تھے؟ کہنے لگے کہ وہ ساری بات سمجھ میں آ گئی' جو ہم نے تحقیق سے اس زمانے کا جغرافیہ دیکھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ حصہ جہاں یہ خشکی شروع ہوتی ہے' جہاں اب نہر سویز نکالی گئی ہے' وہاں صورت یہ ہے کہ وہاں یہ مدوجزر جاتا تھا' پانی پیچھے ہٹ جاتا تھا' وہاں سرکنڈا اُگا ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانے کے جغرافیے میں اس کو Sea of Reeds لکھا ہوا ہے۔ وہ سرکنڈا تو ایسے مقام پہ نہیں ہوتا' جہاں وہ پانی میں بالکل ڈوبا ہوا ہو۔ وہ تو ہوتا ایسے مقام پہ ہے کہ پانی آئے اور بہہ جائے۔ یعنی سرکنڈا وہاں اُگا ہوا ہو' اس میں پانی آئے تو بہرحال وہ کم گہرا ہو' پھر بھی پانی اس میں ہوتا ہے' پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہ جگہ خشک ہو جاتی ہے۔ اب انہوں نے اپنا تورات کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ افسانہ تھا جو اس میں لکھا گیا' کسی نے تحقیق نہیں کی تھی' اب ہماری تحقیق اس نتیجے پہ پہنچاتی ہے کہ یہ مقام Sea of Reeds تھا' یہاں مدوجزر کا پانی آتا تھا' پانی پیچھے ہٹ گیا تھا تو اس میں سے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکلے تھے۔ انہوں نے غلطی کی جو یہ سمجھ لیا کہ یہ مستقلاً خشک ہے' وہ فرعونی جب آئے تو اس مدوجزر کا پانی آگے آ گیا' یوں وہ ڈوب گئے تھے۔ تورات کے نئے ایڈیشن میں' عزیزانِ من! قرآن کے "رھوا" اور یبیسا کی تفسیر ہو رہی ہے اور ہم آج بھی وہ سوٹا [2] مار کر سمندر کو الگ الگ کر رہے ہیں:

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات مئی 1978ء کی 19 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

[2] لاٹھی

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے ❶

علمی طور پر ہماری زبوں حالی کی کیفیت کی ایک دو مثالیں

یہودیوں کی وہ پرانی سوٹا مارنے کی جو داستان تھی' وہ تو ہمارے ہاں چلی آ رہی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ تورات کے اس نئے ایڈیشن کے اندر خود انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے' ان حضرات میں سے کسی کے ہاں آج تک اس کا تذکرہ مجھے نہیں ملا' میں تلاش میں رہا کہ کیا یہ بھی اپنے ہاں کہیں لاتے ہیں؟ تو وہ لا کیسے سکتے ہیں؟ ان کے ہاں جو کسی ایک نے یہ لکھ دیا کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ سمندر کو پھاڑ کر چلے گئے تھے۔ اب یہ جو نئی تحقیق ہے یہ کہیں گے کہ صاحب! وہ تو اس کے خلاف جاتی ہے' یہ کہتے ہیں کہ ہوا کرے' ان کی تحقیق کیا ہے؟ وہ چاند پہ جانے کی اسی لیے تردید کرتے تھے کہ اگر یہ مان لیں کہ یہ ایک کرّہ ہے تو وہ جو شق القمر کا معجزہ رسول اللہؐ نے دکھایا تھا' آدھا ٹکڑا اس بغل کے نیچے سے نکل گیا' آدھا اُس سے' وہ اس کی تردید ہوتی ہے۔ یعنی وہ جاتے ہیں' چاند پہ جایا کریں' جھوٹ کہتے ہیں کیونکہ بخاری کی وہ حدیث غلط ثابت ہوتی ہے۔

ان کے ہاں ایک چیز مسلمہ کے طور پہ کہی جاتی ہے کہ حضرتِ عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ اس پہ جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں' اس سے محسوس کرنے والے کا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے۔ ایک عرصے تک میری کیفیت یہ رہی کہ میں یہ سوچتا تھا۔ میں تو ان چیزوں پہ لگا رہتا ہوں۔ عرصے کی تحقیق کے بعد' جب میں کہتا ہوں تو یہ نہیں ہے کہ میں نے کہیں سے کھدائی کر کے' نیچے سے کچھ کاغذ نکالے تھے' بلکہ انہی کی کتابوں میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ اس کی رو سے میں نے ان کی کتابوں سے حرفاً حرفاً سند کے ساتھ لکھ کر ثابت کر دیا کہ ان کی عمر نکاح یا رخصتی کے وقت 17 اور 19 سال کے درمیان ❷ تھی۔ بجائے اس کے کہ کچھ شکر گزار ہوتے کہ اتنا بڑا اعتراض حضورؐ پر ناموسِ پیغمبر پر عائد ہوتا ہے' اس شخص نے محنت کر کے کم از کم اس سے ہمیں بچا لیا ہے' کفر کا فتویٰ لگ گیا کہ اگر یہ تحقیق مان لی جائے تو وہ بخاری شریف اور مسلم کی جو حدیثیں ہیں جن میں وہ 9 سال اور 6 سال لکھا ہوا ہے وہ حدیثیں غلط ہو جاتی ہیں' ہم اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ حدیث غلط ہو جائے اور یہ صحیح مانا جائے۔ او بابا! میں نے اپنی طرف سے تو نہیں کہا' تمہاری ہی کتابوں کے اندر ہے لیکن ان کے ہاں تو صورت یہ ہے کہ یہ دو چیزوں

---

❶ ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
اقبالؒ: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص 217 (جواب شکوہ)

❷ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: طاہرہ کے نام خطوط کا مجموعہ' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1993' ص ص۔ 202 تا 213 (حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت)۔

کو ملاتے نہیں' بخاری کی حدیث پڑھائیں گے' انہی کی کتابوں سے میں نے یہ چیزیں لکھی ہیں۔ ان کی تاریخ کی کتابوں سے' میں نے ان کے ہاں کے حوالے سے' ثابت کر دیا کہ وہ 19 سال یا 17 سال کے درمیان تھیں جب حضورؐ سے نکاح ہوا تھا۔' یہ کتابیں وہ بھی پڑھاتے ہیں لیکن کیا کرتے ہیں؟ کرتے یہ ہیں کہ اسے الگ پڑھاتے ہیں' اسے الگ رکھتے ہیں' الگ الگ دو چیزوں کو رکھتے ہیں' کبھی اکٹھا نہیں کرتے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہندو پہلے سوچتا ہے بعد میں کرتا ہے' سکھ پہلے کرتا ہے بعد میں سوچتا ہے' مسلمان نہ پہلے سوچتا ہے نہ بعد میں سوچتا ہے۔ یہ دو چیزوں کو ملاتے نہیں ہیں۔ بخاری کی حدیث اپنی جگہ' یہ انہی کے ہاں کی جو یہ تاریخ کی کتابیں ہیں بلکہ یہ بھی جسے اسماء الرجال کہتے ہیں' حدیث کے جو راوی ہیں' ان کے حصے میں یہ چیزیں تھیں جو میں نے پیش کیں' وہ یہ بھی پڑھاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ چیز قرآن کی آیات میں موجود ہے کہ خدا نے راستہ دکھایا' خشکی کا دکھایا' ایسا دکھایا' جہاں پانی بھی ہو اور پانی پیچھے ہٹ جائے اور خشکی بھی ہو۔ یہودیوں نے اپنی تورات کے نئے ایڈیشن میں یہ کہہ کے کہ یہ لاٹھی مار کر سمندر کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی جو چیزیں تھیں' وہ افسانہ تھا' تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ واقعہ یہ ہوا تھا' ان کے ہاں تو وہ لکھا گیا' اِن کے ہاں ابھی تک وہ یہی کچھ پڑھایا جا رہا ہے کہ سوٹا ماریا' تے سمندر الگ ہو گیا[1]۔ او بابا! یہ ہے' وہ جو یہ کہتے ہیں' کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو ہمارے ہاں کی روایات اور تفسیریں ہیں' اگر وہ مان لیا تو یہ غلط ثابت ہو جائیں گی' یہ ان کے لیے قابلِ تسلیم نہیں۔

''ضرب فی الارض'' کا مفہوم

عزیزانِ من! وہ جو چیز ہے کہ **اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ** (2:60;7:160) وہ وہاں گئے اور پانی نہیں تھا' تو انہوں نے وہاں سوٹا مارا اور چشمے جاری ہو گئے۔ اوبا! عربی زبان کے اندر ''ضرب فی الارض'' کے معنی ہوتا ہے: لے کے چلنا' یہاں ہے کہ **اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ** (2:60;7:160) انہوں نے کہا کہ پانی نہیں ہے' صحرا میں تھے۔ خدا نے کہا: اپنی جماعت کو لے کر چٹانوں کی طرف چلا جا' اور اگر آپ نے اس کو یہ سوٹا ہی کہنا ہے تو اس کے لیے یہ عصا بھی تھا جو وہ اس زمانے کا ہتھیار ہوا کرتا تھا۔ ذرا سا بھی ہاتھ میں ہو تو بڑے کام کی چیز ہے۔ وہاں جاؤ' اس سے وہاں جا کے ذرا کریدو' پہاڑیوں کے اندر سے دیکھو تو سہی وہاں پانی ہے' چشمہ نکل آئے گا۔ یہ معنی عربی زبان کی رو سے بالکل صحیح ہیں۔ ''ضرب فی الارض'' قرآن کے اندر متعدد مقامات میں آیا ہے۔ ''ضرب'' کے معنی مارنا ہی نہیں ہے' عربی زبان میں اس کے استعمال بھی سینکڑوں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

---

[1] لاٹھی ماردی تو سمندر الگ ہو گیا۔

بھئی! تم صحرا میں پھر رہے ہو' پانی نہیں ملے گا' اپنی جماعت کو لے کر پہاڑیوں کی طرف چلے جاؤ اور وہاں جا کر دیکھو' جگہ جگہ چشمے نظر آ ئیں گے۔ میں نے عرض یہ کیا ہے کہ جہاں قرآنِ کریم کے اندر یہ مقامات آ ئیں' وہاں پھر عربوں کے ہاں کے محاورے کے مطابق قرآن نے اپنے ہاں جو یہ الفاظ استعمال کیے ہیں انہیں سامنے رکھیے گا اور ان مفاہیم و معانی کی رو سے ان آیات پہ اگر آپ غور کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی چھوٹی موئی سی چیز آپ کو نہیں کرنا پڑے گی۔ یاد رکھیے! قرآن آپ کی عقل' فکر' شعور' تدبر' تفکر کو اپیل کرتا ہے' وہ توہم پرستیوں کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ جو چیز کلمات اللہ کی رو سے اس نے کہا ہے کہ یہ حق Establish (ثبت) ہوا ہے' اور کلمہ تو کہتے ہی قانون کو ہیں' عزیزانِ من! بات ساری سمجھ میں آ جائے گی۔

آج کی نشست میں' میں نے پھر وہ جو مقامات ہیں' ان کو سرسری طور پہ بیان کر دیا ہے' اب جہاں وہ آ ئیں گے وہاں کچھ زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑے گی' اسکی روشنی میں وہ مقامات سمجھ میں آ جائیں گے۔ اللہ کرے کہ میں نے قرآن کا مفہوم آپ حضرات کے سامنے اس انداز سے پیش کر دیا ہو کہ آپ کو بھی وہ اپیل کر جائے۔ بہرحال میں نے قرآن کو اسی طریق پہ سمجھا ہے' اس کے باوجود اگر کوئی اس بات کی ضد کرتا ہے کہ نہیں' عصا کے معنی سوٹا ہی تھا' وہ سانپ ہی بنا تھا اور اس نے مارا تھا' ٹھیک ہے تم اپنے طور پہ جو سمجھنا چاہو' میں تو بہرحال قرآن کو اس انداز سے سمجھا ہوں' اسی انداز سے قرآن کو سمجھا رہا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

چھٹا باب: **سورة الشعرآء**(آیات 52 تا 74)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1978ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 52 سے ہو رہا ہے: (26:52)۔

سابقہ درس کی یاددہانی

آپ کو یاد ہوگا کہ یہ سلسلۂ کلام حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش کے متعلق محیط ہے اور گزشتہ کئی درسوں سے یہ مسلسل چلا آ رہا تھا۔ داستان بھی مسلسل چلی آ رہی تھی اور راستے میں اس سے متعلق تضمنات supplementaries ایسی آ گئی تھیں کہ ان کی وضاحت ضروری تھی۔ ان کی وضاحت کے بعد اب ہم پھر سلسلۂ کلام کو مسلسل لے رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ فرعون نے بالآخر یہ مناسب سمجھا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام چونکہ مذہب سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں' اس لیے ان کا ٹکراؤ اپنے ہاں مذہبی پیشواؤں سے' کرا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے بڑے ہی شان و شوکت کے ساتھ مناظرے کی ایک محفل منعقد کی اور اسے پورا یقین تھا کہ انہیں اسے شکست ہو جائے گی۔ جب سلسلہ ہی سارا مذہب کا ہے تو مذہب کے میدان میں اسے شکست ہو جائے گی' یہ فتنہ ختم ہو جائے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس ثابت ہوا۔ شکست اس کے ہاں کے جو پنڈت تھے' پروہت تھے' انہیں ہوئی۔ حضرتِ موسیٰؑ غالب آ گئے۔ اس پہ اس کا غصہ بہت بھڑک اٹھا' اس نے انتقام کے لیے اور کچھ سوچنا شروع کیا۔ ساحرین کا ایمان ہمارے سامنے آ چکا کہ انہوں نے کس جرأت اور جسارت سے اسے کہا کہ **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72) تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لے' **اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا** (20:72) تیری دسترس تو ہماری اس طبعی زندگی تک ہی ہے اور زندگی تو ان طبعی حدود کے اندر گھری ہوئی نہیں ہے۔ یہ تو اس سے بہت آگے بھی جاتی ہے۔ اس لیے وہاں تو تیری دسترس نہیں ہے۔ اصل میں ہمارے اندر ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارا نصب العینِ حیات **اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ** [1] (26:50) ہے۔ انقلاب یہ آ چکا ہے کہ ہمارا منتہائے نگاہ تو نہیں رہا' کوئی اور ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس میں دیکھا گیا کہ ادھر سے انہوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ یہ کفر

---

[1] ہماری تمام توجہات' اپنے نشوونما دینے والے کی طرف مرکوز ہیں' صحیح منزل آشکارا ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہے اور ہمارا ہر قدم اس کی طرف اُٹھ رہا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔840)۔

بالطاغوت تھا اور اس کے بعد جسے قرآن ایمان باللہ کہتا ہے' وہ اس پہ آ گئے ۔ اس کے بعد تو فرعون کے لیے کوئی اور چارہ ہی نہ رہا' آخری چارہ کار تو یہی تھا کہ اس کو ان علما سے بھڑا دیا جائے ۔ یہاں بھی شکست کھائی تو پھر وہ اپنے ان حربوں پہ اتر آیا۔

اب قرآنِ کریم میں اس کے فوری بعد ہے کہ **وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ** (26:52) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات یہاں سے لے کر نکل جاؤ اور یہ بھی کہا کہ نکلتے وقت تو شاید انہیں علم نہ ہو لیکن وہ تیرا پیچھا کریں گے۔ یہ بھی پہلے ہی بتا دیا۔ میں جو کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق تصریفِ آیات ہی ہے' تو دیکھنا چاہیے کہ ایک مقام پہ اس نے کسی بات کے متعلق جو کچھ کہا ہے' اس کے متعلق دوسرے مقامات میں کیا آیا ہے اور کہاں آیا ہے۔ یہ سلسلہ آپ جوڑیں گے تو پھر قرآن کی بات واضح طور پر آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ اب یہاں یوں نظر آتا ہے کہ اِدھر اُن کو شکست ہوئی اور اُدھر **وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى** (26:52) ہم نے موسیٰ علیہ السلام پہ وحی کی کہ **اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِىۡۤ** (26:52) ہمارے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ' گویا درمیان میں کچھ نہیں ہوا۔ بات یہ نہیں ہے۔ دوسرے مقامات میں جائیں تو نظر آئے گا کہ اس دوران میں یہ سارا پروگرام دونوں طرف سے جاری رہا تھا۔ چنانچہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل سے کہو کہ یہ اپنے گھروں کو ہی قبلہ بنا لیں۔

قرآن کی آواز کو بلند کرنا اگر مشکل ہو جائے تو اس کا علاج

یہاں سے یہ پتہ چلا کہ قبلے کے معنی کیا ہیں۔ قبلے کے معنی تربیت گاہیں ہیں۔ تمہیں باہر اجتماعی طور پر یہ کچھ نہیں کرنے دے گا اور اس تربیت کی بڑی ضرورت ہے اس لیے گھروں کے اندر یہ چیز شروع کر دو۔ ایک لفظ کے اندر قرآن ہمیں پروگرام بتا گیا کہ جب حالات ایسے ہو جائیں کہ یہ خدا کا نام' قرآن کی آواز' باہر کی دنیا میں بلند کرنا' استبداد اور ظلم کی بنا پہ مشکل یا ناممکن ہو جائے' تو یہ نہیں ہے کہ تمہارا پروگرام ختم ہو گیا' پاؤں توڑ کر بیٹھ جاؤ بلکہ یہ ہے کہ تم اپنے گھروں کو قبلہ بنا لو۔ تم اپنے پروگرام کی یہ تربیت گھروں کے اندر شروع کر دو۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ ان کے گھروں کو قبلہ بنا دو۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ تربیت ہوتی گئی' اُدھر وہ بھی یہ سوچتے گئے کہ اب اس فتنے کا علاج کیا کیا جائے۔ وہ بنی اسرائیل کو جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ حاکم اگر محکوم قوم کو اپنے سے جانے دے تو حکومت کس پہ کرے گا۔ اپنی قوم پہ تو حکومت کر نہیں سکتا۔ حاکم کے لیے محکوم قوم کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا۔

فرعون کا پروگرام اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا تھا

اب اس درمیان میں جو کچھ ہوتا رہا اس کے متعلق ایک اور کڑی (Link) ہمارے سامنے آتی ہے۔ سورۃ المؤمن ہے۔ قرآنِ کریم نے اس سورۃ کا نام ہی المؤمن رکھا ہے کہ وہاں ایک مردِ مومن کی آواز ہمارے سامنے آتی ہے اور جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ان ساحرینِ دربارِ فرعون کا یہ ایمان بھی ہمارے لیے قابلِ تقلید ہے۔ اسی طرح سے یہ ایک فرد ہے اور نظر آتا ہے کہ یہ فرد فرعون کی کابینہ تک کوئی اندر کا ہے یا پارلیمان کا کوئی ممبر ہے کیونکہ بات وہاں کی پارلیمان میں' مجلسِ مشاورت میں' ہو رہی ہے۔ وہاں بات یہ ہو رہی ہے کہ **وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ** (40:26) فرعون اپنے وزرا سے' مشیروں سے' کیبنٹ کے منسٹروں سے' یا پارلیمنٹ کے ممبروں سے جہاں بھی یہ بحث ہو رہی تھی' کہہ رہا ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو' مجھے اجازت دو' میرے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالو' میں اسے قتل کر دینا چاہتا ہوں۔ گویا نظر یہ آ رہا تھا کہ یہ سارا پروگرام چلا آ رہا تھا اور یہ اپنے آخری حربے پہ اتر آیا تھا کہ اسے قتل کر دینا چاہیے' میں اسے قتل کر دوں گا۔ اور وہ پارلیمان والے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ گویا یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اِدھر سے مناظرہ ختم ہوا اور اُدھر یہ آیت **وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ** (26:52) آئی۔ یہ نہیں تھا کہ ادھر مناظرہ ختم ہوا اور ہم نے کہا کہ ''آج رات لے کر نکل جاؤ''۔ یہ اسی رات نکلنے کا سوال نہیں تھا۔ اس کے لیے بڑی تربیت کی ضرورت تھی۔ ادھر یہ بھی غافل نہیں بیٹھے ہوئے تھے' ان کی بھی نگاہیں تھیں۔ یہاں تک معاملہ پہنچا ہوا تھا کہ اس نے کہا کہ مجھے اس کو قتل کرنے دو' تم دیکھ نہیں رہے کہ یہ کوئی مذہبی بات نہیں ہے۔ **اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ** (40:26) مجھے خدشہ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ تمہارے پورے کے پورے نظام کو بدل دے گا۔ دین کے معنی ہی نظامِ زندگی ہیں۔ یہ تمہارے نظام کو بدل دے گا' اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے گا اور اگر ایسا نہ کر پایا تو کم از کم یہ یہاں فساد ضرور برپا کر دے گا۔

مومن ہجرت تو قبول کر لیتا ہے مگر فساد Create (پیدا) نہیں کرتا

یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ جو قوتیں آتی ہیں وہ حکومت کی جگہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے' نظام کی جگہ اپنا نظام مسلط کرنے کے لیے' آتی ہیں لیکن اگر وہ اتنا نہیں کر پاتیں تو کم از کم وہ اتنا ضرور کر جاتی ہیں کہ جو موجودہ نظام ہے' اس میں انارکی (انتشار) پیدا ہو جائے' فساد پیدا ہو جائے۔ نہ کھیلاں گے نہ کھیلن دیاں گے [1]۔ یہ چیز ہوتی ہے فساد والی۔ خدا کا دین مسلط کرنے والا فساد نہیں

---

[1] نہ کھیلیں گے' نہ کھیلنے دیں گے۔

برپا کرتا' وہ غلط باطل نظام کی جگہ صحیح نظام لانا چاہتا ہے۔اگر اس مقام پہ وہ ممکن نہیں ہوتا تو ہجرت کر کے کسی دوسرے مقام پہ چلا جاتا ہے' جہاں کی فضا زیادہ سازگار ہوتی ہے' فساد Create (پیدا) نہیں کرتا۔ مکے کی زندگی میں یہی تین سو یا جتنے بھی صحابہؓ تھے' جنہوں نے بدر کے میدان ❶ میں انہیں اتنی عظیم شکست دی تھی' آپ دیکھیں گے کہ یہاں اس مکے کی زندگی میں ان کی طرف سے فساد کی کوئی چیز برپا نہیں ہوئی۔نظام بدلنا تھا' یہاں بدلنے کے لیے مواقع نہیں تھے' فضا سازگار نہیں' جگہ مکان چھوڑ دیئے' دور چلے گئے۔مقصد تو نظامِ خداوندی کا تسلط تھا' نہ کہ کسی طرح فساد یا انارکی یا Law & Order (امنِ عامہ) کو درہم برہم کرنا تھا۔

فرعون نے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کا عندیہ یہ ہے کہ یہاں کے نظام کی جگہ اپنا ایک دوسرا نظام مسلط کر دے گا اور اگر ایسا نہ کر پائے تو کم از کم یہاں فساد ہی برپا کر دے۔ جب اس نے یہ کہا تو **وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ** (40:27) اس پر موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کے عزائم دیکھے تو اسے کہا کہ میں تمہارے اِن عزائم کے خلاف پناہ میں آتا ہوں۔کس طرح کی پناہ میں آتا ہوں؟ قوانین خداوندی کے قلعہ کی پناہ میں آتا ہوں اور وہی حقیقت میں پناہ ہے' جہاں حقیقی پناہ مل سکتی ہے۔ یہاں الفاظ عجیب آئے ہیں: **عُذْتُ بِرَبِّي** (40:27) میں اپنے رب کے قوانین کی پناہ میں آتا ہوں اور وہ رب **وَرَبِّكُم** وہ تمہارا بھی رب ہے۔ یہ ہے پیغمبرانہ دعوت۔فرعون کہتا تھا کہ **أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ** (79:24) میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں' سب سے بڑا پروردگار' سب سے بڑا نشوونما دینے والا' ان داتا ہوں۔ یہاں **بِرَبِّي** (40:27) کہا۔ بات ہوگئی تھی کہ میں اپنے رب کے قوانین کی حفاظت میں آنا چاہتا ہوں لیکن نہیں' پیغمبرانہ دعوت ہے' اس لیے کہا کہ **بِرَبِّكُم** (40:27) وہ تمہارا بھی رب ہے۔تمہارا دعویٰ ربوبیت باطل ہے۔ میرا ہی رب نہیں ہے' تمہارا بھی وہی رب ہے۔تم کسی کے رب نہیں ہو۔حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک لفظ کے اندر آگے چلے گئے۔ میں کس کے خلاف اس پناہ میں آنا چاہتا ہوں؟ **مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ** (40:27) صرف فرعون ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص سے جو کبریائی چاہتا ہے۔کبریائی تو قرآن نے کہا ہے کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ حاصل کریں' حق ہے ان کا' خصوصیت ہے ان کی۔ وہ دین کو مسلط نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ خدا کے نام پہ کبریائی حاصل نہ کریں۔ دیکھیے دو لفظوں میں کتنا میں فرق بیان کر دیا۔ کہا: **مُتَكَبِّرٍ**' متکبر کون تھا؟ **لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ** (40:27) جو سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کے سامنے حساب نہیں دینا ہے' میں ❷ Accountable to None ہوں۔ یہ ہے تکبر کہ مجھے کسی کے سامنے حساب نہیں دینا' Final Authority میں ہوں' Sovereignty میری ہے' اقتدارِ اعلیٰ میرا ہے' مجھے کسی کو حساب نہیں دینا۔تکبر اس کو کہتے ہیں' ورنہ جیسا میں نے کہا ہے کہ جو کبریائی ہے' جو تکبر ہے' وہ تو خدا کی سب سے بڑی صفت ہے۔

---

❶ جنگ بدر سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء

❷ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔

کبریائی کا الحق ہونا لازم ہے

مومن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان کو کبریائی ملتی ہے لیکن بغیر الحق نہیں ملتی بلکہ حق کے ساتھ کبریائی ملتی ہے۔ بغیر الحق کبریائی کس کو ملتی ہے؟ جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کو حساب نہیں دینا۔ اب جہاں بھی یہ صورت پیدا ہو جائے' وہ نظام کسی شکل کا' کسی قسم کا کیوں نہ ہو' جو یہ کہے کہ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں' مجھے کسی کو جواب نہیں دینا' میرا مواخذہ نہیں ہوگا' یہ ہے وہ تکبر جسے ابلیسی یا شیطانی تکبر کہتے ہیں۔ ایک تکبر یہ ہے' ایک کبریائی یہ ہے جو برگسان (Bergson, Henri (1859-1941) نے کہا ہے کہ یہ ''Controll over things, not over men'' ہے' یعنی ان کا یہ کنٹرول چیزوں کے اوپر ہوتا ہے' انسانوں کے اوپر نہیں اور Accountability (جواب دہی) تو بڑی چیز ہے۔ بات ہی اصل میں یہ ہے کہ ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب۔ جب یہ چیز پیدا ہو جائے تو وہ تکبر نہیں ہوتا۔ اس جیسا تو منکسر المزاج ہی کوئی نہیں ہوتا جس کو یہ پتہ ہو کہ مجھے ایک ایک لفظ کا بھی جواب دینا ہے۔ وہ ایک فقرہ جو عام طور پہ آپ نے سنا بھی ہوگا' بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اس کو عام کیا' وہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644/45) کا قول ہے کہ ''اگر دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی جوابدہی بھی میرے ذمے ہوگی''۔ یہ جوابدہی کہ مجھ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی' یہ ہے اصل چیز۔

اب یہاں آپ دیکھیے کہ یہاں وہ خدا نہیں بن جاتا' کبریائی اس کے پاس وہیں رہتی ہے' Final Authority 'Sovereignty' اختیارِ اعلیٰ' اس کے پاس رہتا ہے لیکن بغیر کسی کو حساب دیتے ہوئے یہ اپنے آپ کو حاکمِ مطلق نہیں سمجھتا: مجھے اس کا بھی حساب دینا ہوگا' اس کا بھی مواخذہ ہوگا۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ❶ کے آخری جو الفاظ تھے' وہ یہ چیز تھی۔ یہ مواخذے کا حساب عجیب چیز ہے۔ شہادت کے وقت بس یونہی لیٹے ہوئے تھے' ایک تنکا پڑا ہوا تھا' آپؓ نے اس کو اٹھایا۔ آپ سوچیے تو سہی

---

❶ اس حادثہ کی تفصیل اتنی ہی ہے کہ 26 ذی الحجہ 23ھ' موذن نے فجر کی نماز کی اذان دی۔ صحابہؓ مسجد نبوی میں جمع ہو گئے۔ حضرت عمرؓ امامت کے لیے کاشانۂ خلافت سے باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ نمازیوں کی دو ایک صفیں سیدھی نہیں۔ انہیں اشارہ سے سیدھا کیا۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے ابھی تکبیر کہی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا اور نہایت تیز خنجر سے ان پر متعدد وار کیے۔ آپ کی آنتیں کٹ گئیں۔ حادثہ کی تفصیل ختم ہوگئی۔ قاتل کا خنجر سینۂ عمرؓ میں نہیں قلبِ کائنات میں پیوست ہو گیا۔

ایک مزدور صہیبؓ رومی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور حجرہ حضرت عائشہؓ میں حضور نبی اکرمؐ اور صدیق اکبرؓ کی معیت میں دفن کر دیئے گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کے دن ان پر حملہ ہوا اور دوسری صبح 27 ذی الحجہ کو آپؓ دفن کیے گئے لیکن دوسری روایت میں ہے کہ وہ اتوار کے دن یکم محرم 24ھ کو دفن کیے گئے۔ بعض روایات میں آپؓ کی تاریخ وفات 8 یا 10 محرم بھی بیان کی گئی ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ 23ھ میں ہوئی (پرویزؒ: شاہکار رسالت' ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور' 1987ء' ص ص 419' 424۔

عمر رضی اللہ عنہ کا مقام کیا تھا' اس کی زندگی اس قسم کی سپیدہ سحر کی طرح' بے داغ ہی نہیں' نورانیت سے بھری ہوئی زندگی تھی۔ عزیزانِ من! وہ کہہ رہے ہیں' آخری وقت میں اس کی راہ میں جان دی جارہی ہے اور تنکا اٹھا کر کہتے ہیں کہ اے کاش! عمرِ ابن خطاب امیر المومنین نہ ہوتا' گھاس کا یہ تنکا ہوتا تو اس سے حساب تو نہ مانگا جاتا۔ انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہ کیا کہہ رہے ہیں' آپ کے تو نیکی کے پلڑے میں اتنا کچھ ہے' وہ جھکا ہوا ہے۔ کہنے لگے: میرے عزیز! تمہیں اس بارگاہ کے معیار کا پتہ نہیں ہے' عمر رضی اللہ عنہ وہاں اگر برابر سرابر بھی چھوٹ جائے تو خوش قسمتی سمجھے گا اپنی۔ یہ احساس ہے۔ انؓ سے پوچھا گیا کہ خلافت کس کو کہتے ہیں؟ کہنے لگے: میں تو یہی جانتا ہوں کہ اس بات کا جواب دینا کہ لیا کس سے تھا' اور کیسے تھا' اور اس بات کا جواب دینا کہ دیا کس کو تھا اور کیسے تھا۔ بس یہ خلافت ہوگئی۔ اس بات کا جواب دینا اور یہی ایمان ہے۔ دیکھیے' کس طرح سے قرآن دو لفظوں میں ایک کہانی کہہ رہا ہے' عزیزانِ من! ان کہانیوں کے اندر آپ دیکھیے ایک ایک لفظ میں کتنے کتنے غیر متبدل حقائق اور اقدار بیان کر جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **بِـرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ** (40:27)۔ میں نے اس میں آپ سے کہا کہ یہاں جو ''ربکم'' کا اضافہ ہے' معاف رکھیے گا' کہانیاں ہم نے بھی لکھی ہیں' کوئی کہانی لکھنے والا یہ اضافہ نہیں کرے گا' اس کی ضرورت نہیں' یہ زائد ہے' اور جو زائد لانا ہے' ادب میں وہ تحریر کا' نقص ہوتا ہے لیکن یہ تو زائد نہیں۔ بات تو اس نے یہ کہنی تھی کہ میرا ہی رب نہیں تمہارا بھی رب ہے اور آگے جب یہ کہا کہ **مِّـنْ كُـلِّ مُتَكَبِّرٍ** (40:27) ہر سرکش اور متکبر کی دست درازیوں سے' تو بات یہاں ختم ہوجاتی ہے' ہم اگر کہانی لکھتے تو ہم متکبر کہہ کر بات ختم کردیتے لیکن یہاں بات ختم نہیں ہوئی۔

متکبر کس کو کہتے ہیں؟

قرآن نے کہا کہ اب بتاتا ہوں کہ متکبر ہوتا کون ہے؟ وہ **لَّا يُـؤْمِـنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ** (40:27) جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کو حساب نہیں دینا' وہ متکبر ہے۔ اس سے پناہ مانگی جارہی ہے جو سمجھتا ہے کہ میں نے کہیں حساب نہیں دینا۔ اسے استبداد کہتے ہیں' اسے تکبر کہتے ہیں' عزیزانِ من! کہ مجھے کہیں حساب نہیں دینا۔ یہ بنیادی فرق ہے اور یہاں میں نے کہا ہے کہ یہ غالباً فرعون کی پارلیمنٹ میں جیسے Discussion (بحث) ہورہی ہے' وہاں یہ بات ہے۔ وہاں ایک شخص اٹھتا ہے **وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَـوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ** (40:28)۔ قومِ فرعون کا ایک رجلِ مومن' اس وقت تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا' اور ایسا وقت آ گیا جب اس نے دیکھا کہ اب چھپانے کا وقت نہیں رہا۔ فارسی میں ہم بچپن میں پڑھتے آئے تھے۔ اب تو وہ کتابیں ہی نصاب میں نہیں رہیں' عزیزانِ من! بڑی چیزیں تھیں وہ۔ اب غور کیجیے گا کہ یہ کیسی تعلیم تھی اور یہ کیسے حقائق تھے! میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ

ستر برس یا پینسٹھ برس پہلے کبھی پڑھی ہوگی' اللہ کا احسان ہے' کہ بچپن میں پہلی کتابیں یہ پڑھایا کرتے تھے' آج تک وہ یاد ہیں۔

چوں کارِ بے فضولِ من براید
مرا در وے سخن گفتن نہ شاید

اگر ایسی بات ہورہی ہو کہ میرے دخل دیئے بغیر ہی وہ بات ٹھیک چلی جارہی ہے تو مجھے اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

وگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

لیکن اگر میں دیکھوں کہ اندھا چلا جارہا ہے اور آگے کنواں ہے' اس وقت اگر میں خاموش بیٹھا رہتا ہوں تو یہ گناہ ہے۔ دربارِ فرعون میں کس طرح یہ لوگ باتیں کہہ جاتے تھے' تو یہاں اب یہ وقت آ گیا۔ قومِ فرعون کے اس رجلِ مومن نے دیکھا کہ اندھا ہے اور آگے کنواں ہے' اب خاموش بیٹھنا گناہ ہے۔

فرعون کے دربار کا ایک مردِ مومن قرآنِ حکیم کے آئینہ میں

عزیزانِ من! یہاں سے قرآن کی کشادہ نگہی بھی دیکھیے۔ دربارِ فرعون کا مردِ مومن ہے' جسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مسلمانوں میں سے بھی نہیں ہے۔ یہ اتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔ قرآن اپنے الفاظ کے اندر' ایک لفظ بھی زائد نہیں رکھنا چاہتا' یہ قیامت تک کے لیے محفوظ کتاب ہے۔ عزیزانِ من! اس میں پورے ایک رکوع میں اس مردِ مومن کی تقریر کو لفظاً لفظاً Quote (درج) کیا ہے' اس مردِ مومن کو اتنی سعادت بخشی ہے کہ اس کی جو پوری تقریر ہے وہ قرآن کے دفتین میں آ گئی ہے اور قیامت تک کے لیے محفوظ ہوگئی ہے۔ اس تقریر کی کتنی اہمیت ہوگی! اس نے اس Cause (مقصد) کو اس طرح Plead (وکالت) کیا ہے' جو مسئلہ ہے اس کے اوپر اس طرح سے روشنی ڈالی ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کچھ کہتے تو نظر آتا کہ یہ مومن کا بیان ہے' مخالف کا بیان ہے' دشمن کا بیان ہے۔ اپنوں میں سے یہ شخص اٹھ کر یہ سارا کچھ کہتا ہے اور پھر عزیزانِ من! جو استبداد ہے' وہ تو ہمیں نظر آتا ہے۔

معاف رکھیے' میں نے کہا تھا کہ ایک رکوع ہے' اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ ایک سے بھی زائد ہے' کوئی ڈیڑھ رکوع کے قریب ہے۔ یہ بڑی بات ہے' اور وہ آخری بات کہتا ہے کہ **فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ** (40:44) شاید آج تمہاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں' تم ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہو' اس کے بعد کبھی یاد کرو گے کہ کسی کہنے والے نے کیا کہا تھا اور آگے ہے کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے سامنے' اس طرح سے دوٹوک' لگی لپٹی رکھے بغیر' ان باتوں کو کہہ دینا جو اس کے بھی

خلاف جاتی ہے' کا انجام کیا ہوگا۔ یہ انجام جاننے کے بعد کہا کہ **وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ** (40:44) کوئی بات نہیں' میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور اس کے بعد وہ دربار سے نکل جاتا ہے۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہیں داستانیں' عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ بات یہ نہیں ہوئی تھی کہ مناظرہ ختم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیدیا کہ آج رات یہاں سے نکل جاؤ۔ کیا اسی رات کوئی نکلنے دیتا تھا؟ اور کیا اسی رات ابھی تیاری تھی؟ نہیں' یہ سب کچھ درمیان میں ہورہا تھا۔ جب معاملہ آخر تک پہنچ گیا ہے تو پھر وہاں یہ بات ہوئی۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب یہاں مزید نہیں ٹھہرنا' یہ اپنے پروگرام کے مطابق ہورہا ہے' اور پورے سکون کے ساتھ ہورہا ہے۔ اب یہاں سے نکل جاؤ **اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ** (26:52) یہ تمہارا پیچھا کریں گے۔

ہزار ذلتوں کی ایک ذلت کسی کا محکوم ہونا ہے

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا ہے کہ آخر میں تم نے یہ کرنا ہے' یہ نہیں ہے کہ ادھر کہا ہے اور اسی رات کو وہ چلے گئے' باقی قصہ قرآن درمیان میں لاتا ہے **فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ . اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَۃٌ قَلِیْلُوْنَ . وَاِنَّھُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ . وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ** [1] (26:53-56) ہر وہ متکبر مستبد بادشاہ' حاکم' ڈکٹیٹر' صاحبِ حکومت جس کو باز پرس کا نہ خطرہ ہو' نہ احساس' وہ یہی کہتا ہے کہ یہ ذلیل لوگوں کی مٹھی بھر جماعت ہے۔ محکوم ہونا بھی ہزار ذلت کی ایک ذلت ہے' عزیزانِ من! جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی [2] فرعون کے پاس آئے ہیں تو انہوں نے آکر کہا کہ ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ اُس نے درباروالوں سے کہا کہ ذرا ان کی جرأت ملاحظہ فرمائیے' ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری محکوم قوم کے فرد ہو اور ہم سے بات کرنا چاہتے ہو۔ محکوم قوم کے فرد ان کی نگاہوں میں انسان ہی نہیں رہتے' عزیزانِ من! یعنی صرف ان کا یہ جرم ہے کہ یہ ایک محکوم قوم کے فرد ہیں اور ہم سے بات کرنے کے لیے آگئے ہیں۔ یہ اس نے کہا ہے۔ یہاں بھی یہ کہا ہے کہ یہ قلیل سی جماعت' ذلیل سی جماعت' ہماری ہی محکوم ہے اور جو حرکتیں یہ کررہے ہیں' ان کا اظہار ایک ہی لفظ سے کیا ہے کہ **وَاِنَّھُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ** (26:55) یہ ہمارے غصے کی آگ کو بھڑکا رہے ہیں۔ انہیں علم نہیں کہ یہ مٹھی بھر جماعت ہے اور میرے پاس مسلح لشکر ہے۔

---

[1] (حضرت موسیٰؑ کی تعلیم اور بنی اسرائیل کی تنظیم کا اثر ملک میں پھیل رہا تھا۔ اس کے ازالے کے لیے) فرعون نے مختلف شہروں میں ہرکارے دوڑائے (اور لوگوں سے کہا کہ) یہاں ذلیل لوگوں (یعنی ہماری محکوم قوم' بنی اسرائیل) کی ایک حقیر سی جماعت ہے جو اپنی فتنہ سامانیوں اور سازشوں سے ہمارے غصے کی آگ کو بھڑکا رہی ہے (لیکن تم لوگ مطمئن رہو۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس لیے کہ) ہمارے پاس بڑے بڑے مسلح لشکر ہیں۔ (ہم انہیں کچل کر رکھ دیں گے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 840)۔

[2] حضرت ہارون علیہ السلام

قرآنِ حکیم کے تحریری انداز کے متعلق ہماری کوتاہ نگہی

یہاں اگر' عزیزانِ من! قرآن کے نسخے ہیں تو اگلی آیت دیکھیے گا' یوں پڑھتے جایئے گا نظر بظاہر جیسے کہ عام قرآن فہمی ہمیں سکھاتے ہیں' قدم قدم پہ وہ بات آئے گی کہ کیا کرتے ہیں کہ جی' قرآن میں تو کوئی تسلسل نہیں ہے' قرآن کے اندر تو بس کٹی پھٹی سی چیزیں ہیں ایک ٹکڑا یہاں سے لیا اور درمیان میں کوئی اور بات آ گئی' پھر وہ ٹکڑا آ گیا' پھر وہاں کا قصہ آ گیا' پھر ادھر کا قصہ آ گیا' اس قسم کی تحریر ہے۔ اب ان بیان کرنے والوں سے کون کہے کہ آپ نے تو شاید ساری عمر میں کبھی کچھ لکھا ہی نہ ہو لیکن اگر آپ نے کچھ کبھی لکھا ہے اور اسکے متعلق کوئی آ کر کہدے کہ صاحب! آپ کی تحریر میں تو ربط ہی کوئی نہیں ہے' بھانت بھانت کی باتیں کر رہے ہو' کبھی یہ ٹکڑا' اس کے بعد دوسرا ٹکڑا' اس کے بعد تیسرا ٹکڑا۔ پھر اپنی تحریر کے متعلق آپ کا ردِعمل کیا ہوگا؟ اٹھا کے پھینک دو گے۔ تحریر میں ذمہ داری کی کیفیت' عزیزانِ من! اپنی عرض کر رہا ہوں کہ ساری عمر اس میں گزری ہے' اور تحریر کے نقائص تو ایک طرف' مجھ سے کوئی آ کر کہدے کہ تمہاری تحریر میں فلاں جگہ ربط نہیں رہا ہے' اسی وقت اس کی' اگر واقعی نہیں رہا ہے' تصحیح کر کے اعلان کرونگا۔ یہ اتنا بڑا نقص ہوتا ہے۔ یہاں سارے قرآن کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ صاحب! اس میں ربط نہیں ہے۔ جس قرآن کے متعلق وہ عرب کے فصحا سے چیلنج کر رہا ہے کہ تم اس قسم کی دس آیات لا کر بتاؤ۔ کیا بے ربط تحریر کے متعلق یہ دعوے کیے جائیں گے؟ اور وہ نہیں لا سکے' آج تک نہیں لا سکے۔ اِدھر یہ جو قرآن کے دعویدار ہیں' ان کی کیفیت قرآن کے متعلق یہ ہے کہ اس میں کوئی ربط ہی نہیں ہے۔

اب یہاں وہ کہا کرتے ہیں کہ دیکھو جی' ادھر فرعون کی یہ بات ہو رہی ہے کہ ہمارے غصے کی آگ کو بھڑکا رہے ہو' یہ ہوتے کیا ہیں' ہم کچل کے رکھ دیں گے' ہمارے پاس اتنی مسلح فوج ہے' اور آگے یہ ہے کہ **فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ مِّنۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ. وَّكُنُوۡزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيۡمٍ** (26:57-58) ہم نے ان کو ان کے باغات سے' ان کے چشموں سے' ان کے خزانوں سے' ان کے بلند مرتبے والے مقامات سے نکال دیا۔ کہا جائے گا کہ ان کے اندر ربط کیا ہے؟ کون ان کو بتائے کہ وہ اونچی سطح کے ادب کو بھی نہیں سمجھتے۔ یہ انتہائی بات ہے کہ اس نے انتہائی غرور کے اندر' تکبر کے اندر' یہ بات کہی تھی کہ ہم ہیں' ہماری فوجیں ہیں' ہمارا غصہ ہے۔ یہ انداز یہاں ہے' جو بلند انشاء والے صاحبِ تحریر ہیں' وہ اس کو Appreciate (پسند) کریں گے کہ یہ کیا بات ہے! کہا یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کر رہا تھا اور ہماری مشیت کے فیصلے یہ کہہ رہے ہیں کہ ان سب کو' ان سب مقامات سے' نکال دیا جائے گا' جن کے گھمنڈ کے اوپر یہ اس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔

یہ جگہ ہی نہیں رہے گی' یہ مکان نہیں رہے گا' یہ دولت نہیں رہے گی' یہ حکومت نہیں رہے گی' دیکھو تو سہی! عزیزانِ من! یہ جو انداز ہوتا ہے کہ **فَاَخۡرَجۡنٰهُمۡ** (26:57) ہم نے نکال دیا' یہ تحریر کے اندر اور خاص طور پہ افسانہ' ناول یا اس قسم کی جو تحریریں ہوتی ہیں' جن میں محاکات کے انداز سے کچھ لکھا جاتا ہے' اس کا ایک انداز ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کوئی صاحبِ ادب اس کو Appreciate (پسند) کرے گا۔ اس اندازِ بیاں میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اس کا جو بیان ہے' وہ زمانہ حال میں ہوتا ہے' وہ Present Tense (حال کے زمانہ) میں' آتا ہے۔ یہ جو ہونے والا واقعہ ہے' اس کو سامنے لاتے ہیں' اور درمیان میں یہ بات ہوتی ہے کہ مثلاً ہم یہ کریں گے' وہ یہ کہہ رہا تھا اور ہمارا قانونِ مشیت یا قانونِ مکافات ادھر اعلان کر رہا تھا کہ یہ ان تمام مقامات سے نکال دیئے جائیں گے' وہ سارے سامان چھن جائیں گے' جن کی بنا پہ یہ اس قدر تکبر میں آیا ہوا ہے' سنو! نہ ان کی یہ بادشاہت رہے گی' نہ یہ چشمے رہیں گے' نہ باغات رہیں گے' مناصب و مدارج یا یہ مقامِ کریم رہے گا' انہیں ان تمام سے نکال باہر کیا جائے گا (26:58)۔ کہا کہ **كَذٰلِكَ** (26:59) پھر سن لو کہ ایسا ہو چکا ہے' یہ سب کچھ ان سے چھن چکا ہے' یہ کچھ یونہی اندھا دھند دھاندلی سے نہیں ہوتا' ایسا ہوا کرتا ہے' ایسا ہو کر رہے گا۔ کذٰلک نے تو یہاں جان ڈال دی۔ یونہی ہم Abruptly (یک لخت) ایسا کچھ نہیں کر جائیں گے' **كَذٰلِكَ** (26:59) اسی طرح سے ہوگا' اسی طرح سے ہوتا ہے' ہوتا رہے گا۔ جہاں بھی کسی کا باطل' استبداد ہمارے قانونِ مکافات سے ٹکرائے گا' وہاں یہ ہوگا۔ یہ ان مقامات سے نکال دیئے جائیں گے تو کیا یہ منفیانہ عمل ہی ہوگا کہ ان کو نکال دیا جائے گا؟ بنی اسرائیل کو اس سے کیا فائدہ ہوا کہ ان کو نکال دیا' ان کی جگہ وہی مصر کی کوئی اور طاقت آ گئی؟ عزیزانِ من! یہ اتنی بات نہیں **وَاَوۡرَثۡنٰهَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ** (26:59) اور اسی محکوم قوم کو' جسے یہ کہہ رہا ہے کہ بڑی ذلیل سی قوم ہے' اس کا وارث بنا دیا جائے گا۔ درمیان میں تین آیات کے ٹکڑے سے آگے **فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ** (26:60) کہا تھا۔ اس سے پہلے **وَ اِنَّكُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ** (26:52) کہا تھا کہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا' یہ فرعونی پیچھے آئیں گے۔ درمیان میں یہ آیتیں (26:53-59) آ گئیں اور اس کے بعد کہا کہ **فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ** (26:60) وہ رات کو نکلے اور صبح ہوتے ہی لشکرِ فرعون ان کے پیچھے چل دیا۔ **فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰٓى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ** ❶ (26:61)۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بس اس قوم کو ہی لے کر نکلے تھے' اس قوم میں نہ ایمان کی پختگی آئی تھی۔ نہ اتنی تربیت ہوئی تھی' آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب یہ آزاد بھی ہو گئے' سینا کی وادیوں میں بھی چلے گئے' تو وہاں یہ قومِ بنی اسرائیل کیا کیا حرکتیں کرتی تھی۔

---

❶ جب فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا کہ لو! ہم پھنس گئے (سامنے پانی ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اب ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 841)۔

پہلی بات تو یہی نظر آ رہی ہے کہ خدا کے دو پیغمبر ہیں' وہ خدا کی وحی کی بنا پر ان کو وہاں سے لے کر نکل رہے ہیں۔ ٹھیک ہے آگے وہ سمندر ہے' میں نے غالبًا پچھلے ہی درس [1] میں یہ عرض کیا تھا کہ یہ کہاں سے پار ہوئے تھے' کہاں گئے تھے۔ یہ وہی Red Sea یا بحرِ قلزم کی آخری شاخ ہے' جہاں اب نہرِ سویز کھودی گئی ہے' اس زمانے میں نہرِ سویز نہیں کھودی گئی تھی۔ بہرحال آگے آ گیا پانی یعنی سمندر اور پیچھے انہوں نے دیکھا کہ فرعون کا لشکر آ گیا۔ اب اگر تو یہ یقین و اطمینان ہوتا کہ خدا کا ایک نبی بھی آ رہا ہے' وہ تھے تو ہمارے ہی جیسے' انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! ہم مارے گئے' پکڑے گئے۔ اور اُدھر وہ صاحبِ یقین ہے **قَالَ كَلَّا** (26:62)۔ **كَلَّا** عربی میں بڑی عجیب چیز ہوتی ہے' پورے اطمینان و یقین کے ساتھ جو بات کہی جائے یہ اس کے لیے آتا ہے۔ کہا کہ گھبراؤ نہیں' ہرگز ایسا نہیں ہوگا''۔ نظر آ رہا ہے کہ سامنے سمندر ہے' پیچھے فرعون کا لشکر ہے' درمیان میں یہ مختصر سی جماعت ہے' ہر چرکا [2] دینے والا' اس وقت یہی کہے گا کہ ہاں صاحب! یہ ہو گیا مگر وہ شخص [3] یہ کہتا ہے کہ **كَلَّا** (26:62)۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ کیوں ایسا نہیں ہوگا؟ کہا کہ **اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ** (26:62) میں اکیلا نہیں آ رہا' یہ میرا فیصلہ نہیں ہے' میرے ساتھ میرا رب ہے' فرعون کے ساتھ اس کے لشکر ہیں' میرے ساتھ میرا رب ہے۔ اب آئی وہ بات جو میں نے پچھلے درس [1] میں کہی تھی کہ اس کے بعد تو اگلی بات ہمارے ہاں یہ کہتے ہیں کہ وہ گئے اور ان سے کہا کہ اپنا یہ عصا سمندر پہ مارو' انہوں نے یہ سمندر پہ مارا اور وہ پھٹ گیا اور اس کے اندر سے یہ نکل آئے' یعنی خدا اتنا بڑا معجزہ دکھائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ جو کہا ہے کہ میرے ساتھ میرا رب ہے' وہ جو رب کی نوعیت ہے' جو خدا کا ساتھ ہونا ہے وہ کیا بات ہے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔

خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف راستے کی نشاندہی کی تھی

عزیزانِ من! ایک ایک لفظ ہے جس پر جھوم جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ قرآن ہے۔ کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم پکڑے گئے' مارے گئے۔ اب یہ تھا کہ ہراساں ہیں' سمندر جو ہوا آگے' پیچھے مڑ نہیں سکتے' فوجیں آ رہی ہیں' راستہ تو بند ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ کوئی بات نہیں' میرا رب میرے ساتھ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ میرا وہ رب کیا کرے گا؟ کہا کہ **سَيَهْدِيْنِ** (26:62) وہ راستہ دکھا دے گا۔ رب نے راستہ دکھایا تھا' رب نے وہاں معجزہ نہیں دکھایا تھا کہ سوٹا مارو' سمندر پھٹ

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: اسی کتاب کا پانچواں باب' ص ص۔ 113 تا 138

[2] زخم لگانے والا' نقصان دینے والا۔

[3] یہ اشارہ حضرت موسیٰؑ کی طرف ہے۔

جائے گا۔ راستہ دکھایا ہے۔ ایک لفظ میں قرآن ساری بات کہہ گیا اور عزیزانِ من! خدا کی جو صفت ہے‘اس کا مفہوم بھی سمجھ میں آ گیا۔ اب اس زمانے میں تو پیغمبر اور خدا کی براہِ راست آپس میں بات ہوتی تھی‘ وہ براہِ راست پیغمبر کو اپنی بات بتاتا تھا۔ اب خدا تو ہمیں براہِ راست نہیں بتاتا۔ جہاں سیھدین جیسا مقام آئے گا‘ اور ہمیں بظاہر کوئی راستہ نہ ملے تو وہاں پریشانی ہوتی ہے‘ جہاں راستہ سامنے ہو تو اس وقت کبھی ذہنی پریشانی نہیں ہوتی‘ آدمی اسی وقت تدبیر سوچتا ہے۔ آدمی کی تدبیر غلط بھی ہوسکتی ہے‘ یہ نہیں ہوتا کہ ہُن کی ہووے گا‘ ہُن کی کرے[1]۔

قرآنِ حکیم زندگی کی گزرگاہوں کی نشاندہی کرتا ہے‘ معجزوں سے کام نہیں چلاتا

آپ دیکھتے ہیں کہ پریشانی اس کو کہتے ہیں جہاں کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ اب تو ہمارے ساتھ خدا یوں براہِ راست بات نہیں کرے گا جیسے حضرتِ موسیٰؑ سے کی تھی‘ وہ تو آخری بار اس نے آخری پیغمبر ﷺ سے کردی لیکن اس کا اعجاز یہ ہے کہ اب قیامت تک زندگی میں جہاں جہاں ایسے مشکل مقامات آئیں گے کہ آگے سمندر ہو‘ پیچھے فرعون ہو‘ راستہ نظر نہ آئے‘ اس وقت خدا کی یہ کتاب انسان کو راستہ دکھاتی ہے۔ یہ ہے اعجاز۔ کرامات نہیں دکھاتی۔ معجزہ ہی اگر دکھانا تھا تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام تک محدود تھا‘ ہمیں اس کا کیا فائدہ ہوا‘ ہمارے لیے اس میں کونسی ہدایت کی بات ہوئی‘ دکھا دیا تو کیا ہوا: سوٹا مارا سمندر پھٹ گیا‘ اب ہمارے سوٹا مارنے سے تو سمندر نہیں پھٹتا۔ پھر ہمارے لیے کیا ہے کہ جہاں اس نے کہا ہے کہ راستہ دکھا دیا؟

متقی کا قرآنی مفہوم اور ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات

اس نے اس کو کتابِ ہدایت کہا۔ اس کا پہلا ہی وصف یہ کہا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2) زندگی کی شاہراہ پر‘ خطرات کی گھاٹیوں سے‘ جو یہ چاہیں گے کہ ہم محفوظ چلے جائیں‘ یہ ان کو راستہ دکھاتی ہے۔ ''متقین'' کے معنی ہوتے ہیں: خطروں کی گھاٹیوں سے محفوظ منزل تک پہنچنا۔ متقی اسے کہتے ہیں جسے اس بات کا احساس ہو‘ جو یہ چاہے کہ میں خاردار جھاڑیوں سے دامن بچا کر چلوں۔ ایک دفعہ حضرتِ عمرؓ (581-644/45) سے پوچھا گیا تھا کہ متقی کسے کہتے ہیں۔ انہوںؓ نے کہا کہ کبھی تم ایسے راستے پہ چلے ہو کہ خاردار جھاڑیاں ہوں‘ پگڈنڈی چھوٹی سی ہو؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عربوں کا لباس اتنی اتنی دور تک جاتا تھا‘ ڈھیلا ڈھالا تھا۔ کہنے لگے کہ وہ اپنے کپڑوں کو اِدھر سے اُدھر سے‘ یوں لپیٹتے ہیں‘ اس جھاڑی سے بچتے ہیں‘ یوں بچتے بچاتے اس میں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس طرح سے زندگی کے راستے پہ نکلنے والے کو متقی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہزار برس سے قرآن کی تفسیریں

---

[1] اب کیا ہوگا‘ اب کیا کیا جائے۔

پہلی آیت پہ اٹکی ہوئی ہیں: **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2) یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہیں اور متقی بھی ہمارے تصور والے ہیں' یعنی مومن سے بھی اگلا درجہ' تو ان کو ہدایت کی ضرورت کیا ہے؟ یہ کہتا ہے کہ **هُـــــدًى لِّـلْمُتَّقِيْنَ** (2:2) متقیوں کے لیے ہدایت ہے' وہ جو پہلے ہی گھوڑے پہ بیٹھا ہے' اس کو گھوڑے کی ضرورت کیا ہے؟ متقین کے لیے ہدایت چہ معنی دارد؟ اور اگلی بات یہ کہ ہم تو پھر متقی نہیں ہیں' ساری دنیا ہی متقی نہیں ہے' تو یہ ان کے لیے تو پھر ہدایت نہیں ہے' جن کے لیے ہدایت ہے وہ سنبھالیں' ہمارے لیے تو اس میں ہدایت ہی نہیں ہے۔ یہ پہلی آیت میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ارے ہم سے نہیں' عربوں سے پوچھ لیا ہوتا' اپنے ہاں کی اس تاریخ سے ہی پوچھ لیا ہوتا' مگر ان چیزوں سے تو ان کو بیر ہے۔کس عمدگی سے بات سمجھا دی کہ متقی کہتے کسے ہیں: جو یہ احساس کریں کہ مجھے خطرات سے بچ کے منزل پہ پہنچنا ہے' اس کے لیے یہ ہدایت ہے۔ اور جو اس کا خیال ہی نہ کرے' وہ کہے کہ کوئی بات نہیں ہے صاحب! کانٹے ہوئے تو کیا' غلط راستہ ہوا تو کیا' صحیح راستہ ہوا تو کیا مجھے تو چل نکلنا ہے۔اسے آوارہ کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! آوارہ کے لیے راستے کی نشاندہی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی' ضرورت اس کے لیے ہوتی ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہے اور وہ چاہے کہ راستے میں ڈاکو' راہزن' کوئی خاردار جھاڑیاں' کوئی سانپ' کوئی بچھو' کوئی جنگلی درندے وغیرہ نہ آ جائیں اور میں صحیح سلامت منزل تک پہنچ جاؤں۔اس احساس سے سفر کا آغاز کرنے والا متقی کہلاتا ہے۔اسے قرآن راستہ دکھاتا ہے۔آج بھی کہ خدا کی جو بات براہِ راست نبی کے ساتھ تھی' آج ہمارے ساتھ خدا کی بات قرآن کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ خدا نے اس کو کلام اللہ کہا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کبریٰ یہی ہے کہ **كَـلَّـمَ الـلّٰـهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا** (4:164) خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ جب وہ اس قرآن کو کہتا ہے کلام اللہ' جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ خدا ہی ان سے کلام کر رہا ہوتا ہے۔ وہ ہم سے ہمکلام ہوتا ہے جب ہم قرآن پڑھتے ہیں' جو کچھ نبی کو خدا سے ملتا تھا' مومن کو وہ کچھ کتاب اللہ سے ملتا ہے' اور ملتا اس وقت ہے جب وہ قرآن پڑھتا ہے۔اقبالؒ (1877-1938ء) نے کہہ دیا تھا کہ مومن کا مقام یونہی نہیں نظر آتا وہ تو......

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ کلام اللہ ہے۔وہ جو **سَيَهْدِيْنِ** حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو کہا تو یہ آج بھی ہمارے لیے ہے۔ اگر اس رب کے اوپر ایمان ہے' اگر اس کی کتاب پہ ایمان ہے' تو وہ ہر دوراہے پر' ہر مشکل مقام پر' جہاں کوئی راستہ دکھائی نہ دے' جہاں نظر آئے کہ یہ سامنے موت ہے پیچھے دشمن ہے' کہا کہ وہاں بھی ہم راستہ دکھاتے ہیں۔حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو براہِ راست دکھایا تھا ہمیں قرآن کی وساطت

سے دکھایا ہے' تو بات تو ایک ہی تھی۔ یہ ہے **سَيَهۡدِيۡنِ** (29:69)۔اور وہ تو وہاں ایک ہی راستے کی ضرورت ہوگی' دکھایا ہوگا' ہمارے متعلق تو وہ یہ کہتا ہے کہ **الَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا** (29:69). جو ہماری طرف آنے والے راستے کے لیے جدوجہد کرتا ہے' قرآن میں جا کے' تلاش کرتا ہے' ہم اسے ایک راستہ نہیں' کئی راستے دکھا دیتے ہیں۔

سُبُل کا قرآنی مفہوم

یہ وہی **نَهۡدِيَنَّ** (29:69) ہے جو یہاں (26:62) میں **سَيَهۡدِيۡنِ** آیا ہے۔ ہدایت کے معنی یہ ہیں۔عزیزانِ من! میں یہ عرض کردوں کہ یہاں **سُبُلَنَا** کہا ہے: کئی راستے کہا ہے۔پھر کہا جائے گا کہ قرآن تو کہتا ہے کہ **اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ**[1] (1:5). ایک صراط مستقیم گویا وہ تو ایک صراط سکھاتا ہے: ایک راستہ' مگر یہاں وہ سُبُل کہتا ہے: یعنی اتنے سارے راستے۔یہ قرآن کے اعجاز ہیں' عزیزانِ من! صراط' عربوں کے ہاں شاہراہِ اعظم کو' The Highway کو کہتے ہیں' سبیل کی جمع سبل ہے۔اس کے معنی ہوتا ہے' پگڈنڈیاں' چھوٹے چھوٹے راستے' جن میں شرط یہ ہے کہ ہر راستہ جا کر صراط یعنی شاہراہ اعظم کے اندر ملے۔ کیا بات ہے! زندگی کے مختلف مقامات میں مختلف چھوٹے چھوٹے راستے ہونگے' تدبیریں مختلف ہونگی' پروگرام مختلف ہونگے لیکن منتہا ہر راستے کا صراطِ مستقیم ہوگا' یعنی ہر راستہ اسمیں جا کر ملے گا۔ یہ ہے' **سَيَهۡدِيۡنِ** خدا راستہ دکھائے گا۔

قرآنِ حکیم میں نبی اکرمؐ کے ہمراہ غارِ ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رفاقت کا ایک دلکش پہلو

یہاں ایک اور بڑی حقیقت پرور چیز سامنے آتی ہے' چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ دہرائے ہیں کہ **اِنَّ مَعِيَ رَبِّيۡ** (26:62) گھبرانے کی بات نہیں ہے' میرا رب میرے ساتھ ہے۔ یہاں واحد کا صیغہ ہے۔ایک مقام اور بھی ہے جہاں کہا گیا تھا کہ ''رب ساتھ ہے''۔ یہ ہجرت کی رات کا مقام تھا۔ یہ (26:62) میں بھی ایک رات کا ہی مقام ہے۔ ہجرت کی رات کا یہ مقام سورۃ توبہ کے اندر ہے یہاں ایک ہی جگہ ''ساتھ'' کا لفظ آیا ہے اور وہ جو ساتھی تھا' اس ساتھی کی معیت سے وہ یارِ غار ایک محاورہ بن گیا۔ وہ حضرتِ ابوبکر صدیق (634-573ء) وہاں تھے۔ کچھ باہر سے خطرے کی آہٹ محسوس ہوئی' خطرے کا احساس پیدا ہوا' اپنی جان کے لیے نہیں' وہ جو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا' اس کی وجہ سے خطرہ پیدا ہوا۔ جو رفیق تھا اس کی بھی نگاہ ہے' اس نے بھانپ لیا کہ پریشانی کی کوئی چیز ہے۔

---

[1] اس آیت کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006۔

عزیزانِ من! ان دونوں مقامات میں تفاوت دیکھیے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ یہ بات نہیں ہے کہ میں دونبیوں میں تفاوت کر رہا ہوں' اگرچہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (2:253) فضیلت ہے' انبیائے کرام میں بھی۔ میں تقابل نہیں کر رہا۔ اب دیکھیے گا کہ بات کتنی گہری ہے! حضور ﷺ نبی اکرم نے فرمایا کہ **لَاتَحْزَنْ** (9:40) مت گھبراؤ **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** (9:40) ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ **اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ** (26:62) میرا رب میرے ساتھ ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔ کیا بات ہے صاحب! نظر آ گیا کہ حضرت موسیٰ ﷺ کی اس قوم کے اندر ابھی ایمان کی پختگی والا کوئی ایسا نہیں تھا جس کے متعلق حضرتِ موسیٰ علیہ السلام یہ کہتے کہ ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے' وہاں رب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہی کے ساتھ تھا' رب کی معیت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل تھی' اس لیے انہوں نے یہی کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے' راستہ دکھائے گا۔ یہاں ساتھ وہ ہے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے برابر کا درجہ فرمایا ہے کہ **لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** (9:40) یہ ہے مقامِ صدیقی رضی اللہ عنہ' عزیزانِ من! اور یہ ہے رسول کی شہادت۔ وہ دو ہی تھے اور قرآنِ کریم میں ان دونوں کے لیے یکساں ایک لفظ ''معنا'' آیا ہے۔ سوچیے تو سہی کہ خدا کی معیت سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے فرق۔ وہ صاحبِ ایمان ہے جو ساتھ ہے۔ اس کا بھی خدا پہ ایمان ہے' اس لیے اپنے ساتھ ملا لیا' وہاں یہ دونوں ہی ایمان کے درجے کے اوپر ہیں۔

ہمارے ہاں عصا کا ترجمہ سوٹا اور ''اضرب'' کا ترجمہ مارنا کیا جاتا ہے جو درست نہیں ہے

اب آ گیا وہ لفظ' جس کے متعلق میں نے پچھلے درس❶ میں عرض کیا تھا کہ **فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى** (26:63) ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی۔ ارے وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہم کو راستہ دکھائے گا۔ یہاں یہ کہتے ہیں کہ ہم نے وحی کی۔ اس میں کہا ہے کہ **اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ** (26:63)۔ اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ہم نے کہا کہ ''اپنے سوٹے سے سمندر کو مار''۔ ارے مارہی کیوں یعنی کوئی سَٹ مارنی ہیگی اے❷ اسے تو یونہی ذرا سا چھولے اور پھر اگر یہی کرنا تھا تو پھر خدا کو اس کی کیا پڑی تھی کہ اس کو کہے کہ ''سوٹا ہی مار' تاں پھٹے گا❸' خدا سمندر کو حکم دیتا پھٹ جا تو سمندر پھٹ جاتا۔ یہاں عصا کا ترجمہ سوٹا کیا اور ''اضرب'' کا مار۔ اب یہ بحثیں چلی آ رہی ہیں۔ میرے بھائی! اگر لسانِ عربی سے نہیں پوچھنا تو قرآن سے پوچھ لو' کتنے ہی مقامات

---

❶ اس کی مکمل تفصیل اسی کتاب کے ''پانچویں باب'' (ص ص۔ 113 تا 138) میں کی گئی ہے۔ وہاں دیکھ لیجیے۔

❷ اسے کوئی چوٹ لگانی ہے۔

❸ لاٹھی مارو گے تو یہ پھٹے گا۔

پراضرب فی الارض آیا ہے۔ضرب فی الارض کے معنی ہی ''سفر کرنا' لے کر جانا' مسافت طے کرنا ہیں۔'' عرب اس ضرب کو بے شمار معنوں میں استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ ضرب فی الارض ہے۔ وہ اس سفر کرنے کو اس لیے کہتے تھے کہ انسان پاؤں سے زمین کو یوں مارتا ہوا جاتا ہے۔ یہ ضرب اس لیے کہتے تھے۔ وہ تو ہمارے ہاں کے ضرب المثل بھی کہتے تھے' ان سے سنیے جو ترجمہ کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ مثال مار دیجیے یعنی ان کے ہاں اردو میں ترجمہ ملاحظہ فرماؤ: مثال مارنا۔قرآنِ کریم میں ہے کہ **واضرب لھم مثلاً** (36:13) اُن کے لیے ایک مثال بیان کرو۔ بیان کرنے کے لیے اُن کے ہاں ضرب یعنی مارنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں مثال دینا کہتے ہیں۔ ضرب فی الارض قرآن میں متعدد مقامات پہ استعمال ہوا ہے۔ عصا کے معنی میں نے بتا دیا تھا کہ ''جماعت'' کے ہوتے ہیں۔ ان سے یہ کہا کہ وہ تو یہ کہتے تھے کہ آگے سمندر ہے تو مارے جائیں گے' موسیٰ علیہ السلام سے ہم نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے' اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جو راستہ جاتا ہے' اُدھر کو چلو' راستہ ہم بتائیں گے' تمہیں آگے راستہ سمندر میں سے ملنا ہے۔ **اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ** (26:63) اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف چل نکل۔ یہ ہے اس کا ترجمہ۔ میں نے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ قرآن کے یہ دونوں مقامات ساتھ ملا لیجیے' پتہ چلے گا کہ راستہ کیا دکھایا۔

خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ''رھوا'' کی طرف جانے کی رہنمائی دی

سورۃ طٰہٰ میں قرآن نے کہا ہے کہ تم وہاں جاؤ گے۔ جس طرف سے ہم کہتے ہیں اس طرف سے نکل جاؤ۔ وہ ڈائریکشن تھی۔ ہدایت کے معنی بھی ڈائریکشن دینا ہوتا ہے۔ ہم نے نشاندہی کی' ڈائریکشن دی تو وہاں یہ ہے کہ **طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا** (20:77) وہاں تمہیں خشک راستہ مل جائے گا۔ اور خشک کس قسم کا؟ یہ پہلے ہی سے خشک ہوا نہیں ہے' اس کو **رھواً** (44:24) کہا ہے' سمندر کے کنارے پہ ایسا مقام جہاں پانی آئے بھی اور پانی پیچھے بھی ہٹ جائے تو وہ جگہ خشک رہ جائے۔ اس کو رھوا کہتے ہیں۔ کہا کہ ان کو ایسے مقام سے لے کے نکل جاؤ۔ میں نے پچھلی دفعہ [1] عرض کیا تھا کہ یہودیوں نے امریکہ میں خود اب تورات کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے' اس میں انہوں نے جہاں یہ چیزیں کہی تھیں کہ سوٹا مارا' سمندر' پھٹا' وہاں انہوں نے تورات کے نئے ایڈیشن کے اندر لکھ دیا ہے کہ نہ بابا! اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی' وہ انہوں نے Sea of Reeds لکھا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اب نہرِ سویز ہے' وہاں خشکی تھی اور درمیان میں پانی کا ذرا سا ٹکڑا تھا' وہاں سمندر کا پانی مدوجزر سے پیچھے ہٹتا تھا' آگے آتا تھا اور وہاں سرکنڈا اگا ہوا تھا' اس کو Sea of Reeds کہتے تھے تو اس مقام کی نشاندہی کی گئی تھی' جہاں سے پانی ہٹا ہوا

---

[1] اسی کتاب کا پانچواں باب۔

ہؤوہاں سے چل نکلو' مسافت ہی کون سی تھی کوئی بحرا لکاہل پار نہیں کرنا تھا جس کے اندر دو مہینے لگ جاتے' وہ اتنی سی تو جگہ تھی۔ کہا کہ وہاں جاؤ۔

فانفلق کا قرآنی مفہوم

اب اس کے بعد آ گے: **فَانْفَلَقَ** (26:63) آ گیا۔ یہ جو ساتھ ''ف'' ہے' اس کے معنی انہوں نے ''پس'' کر دیئے اور ہر جگہ یہی معنی کر دیئے: ''پس وہ پھٹ گیا''۔ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ''ف'' ہر جگہ پس کے معنی میں ہی نہیں آتا' ''اور'' کے معنی میں' نئی بات شروع کرنے کے معنی میں' یہ حرف آتے ہیں' یعنی یہ نئی بات ہے کہ یہ ہوا۔ کہا تھا کہ انہیں راتوں رات لے کے نکل جاؤ' کہ صبح ہوتے ہی وہ تمہارے پیچھے آئے گا۔ فلق کے معنی تو یہ ''فلق السمآء'' ہوتا ہے' پو پھٹنے کے معنی میں یہ لفظ آتا ہے' خود ہمارے ہاں ان ترجموں میں **قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ** (113:1) آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ فلق صبح کے نمودار ہونے کے لیے آتا ہے۔ تو انہوں نے پیچھا کیا کرنا تھا' یہ رات کو نکلے تھے' جب صبح نمودار ہوئی' پو پھٹی تو یہ دیکھا۔ قرآن تو ساری تفصیل یوں نہیں کرتا کہ یہ اس میں سے یوں گئے اور وہ پیچھے آ کے یوں کھڑے ہو گئے قرآن کریم نے تو یہ بتایا کہ **فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ** (26:63)۔ انہوں نے اس کا ترجمہ کر دیا کہ سوٹا مارا اور سمندر پھٹ گیا اور وہ ایک تو اُدھر کھڑا ہو گیا' ایک تو وہ اِدھر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو وہ جو دو جماعتیں ہیں' ان کا ذکر آ رہا ہے کہ صبح نمودار ہوئی تو اس کی روشنی میں یہ دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس پار پوری کی پوری جمعیت کھڑی ہے' فرعون کا لشکر اس کی جمعیت اِدھر کھڑی ہوئی ہے' اس دوران درمیان میں پھر پانی آ گیا **وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ** (26:64) وہ جو فرعون اور اس کے ساتھی تھے' وہ ذرا قریب آئے' یعنی یہ دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھے تھے کہ یہ جو پار ہو گئے ہیں' ہم بھی پار ہو جائیں گے۔ وہ آگے بڑھے تو مقام وہ آ گیا جس میں سمندر کا جو پانی تھا پھر مدوجزر کے ذریعے سے آ ملا۔ یہ ہے جو قریب ہونا ہے۔

معجزے کی شکل میں تو غور وفکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

کہا کہ **وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ** (26:65) موسیٰ علیہ السلام اور اس کے جو ساتھی تھے وہ پورے کے پورے غرق ہونے سے بچ گئے۔ **ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ** (26:66) اور یہ جو ان کے پیچھے آ رہے تھے' وہ غرق ہو گئے۔ فرعون تو ساتھ تھا' وہ انہیں Lead (راستہ دکھا کر رہبری) کر رہا تھا۔ جب میں وہاں آؤں گا جہاں قرآن میں فرعون کے غرق ہونے کی داستان کا مقام آیا ہے' وہاں بڑی حقیقت کشا باتیں آئی ہیں' وہ وہاں بتاؤں گا۔ وہ وہاں غرق ہو گئے یہاں کہا کہ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً**

(26:67) اس میں بھی غور کرنے والوں کے لیے بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ معجزے میں تو غور کرنے والے کے لیے نشانی نہیں ہوتی' معجزہ تو عجز سے ہے۔ معجزہ تو وہاں ہوتا ہے' جہاں غور اور فکر عاجز آ جاتا ہے' تو معجزے میں کیا نشانی ہوتی ہے غور کرنے والوں کے لیے؟ نشانی تو یہ تھی کہ ایسے مقامات میں پار کیسے کیا جاتا ہے۔ اندھی تقلید سے دوسرے کے پیچھے پیچھے چلنے سے تو غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ سمجھنے کی بات تو یہ تھی۔ کہا کہ **وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (26:67) لیکن اس کے باوجود اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اس بات پہ ایمان نہیں لاتے کہ یہ اس طرح سے خدا کے قانون کے مطابق یہ سب کچھ ہوا تھا' وہ معجزے کا معجزہ ہی مانتے رہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہمارے متعلق ہے تو یہ ہے کہ ہم اس بات پہ ایمان نہیں رکھتے کہ یہ اس طرح سے جو خدا ان طریقوں سے راہنمائیاں کرتا ہے تو ہم یہی مانتے چلے آئیں گے کہ نہیں' وہ سوٹا مار کے سمندر کو پھاڑ دیا۔ پھاڑ دیا ایک دفعہ پھر اس کے بعد تو آج تک نہ پھٹا اور دوسری بات اگر ان کے متعلق ہے تو ٹھیک ہے وہ تو اس بات پہ ایمان نہیں لانے والے تھے' حالانکہ اتنی کوشش کی' حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دلائل و براہین سے سمجھایا' مناظرے کی محفل میں یہ سب چیزیں پیش کیں لیکن وہ ایمان نہیں لائے۔ یہاں تو یہی ہے کہ **وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ** (26:68) اور خدا صاحبِ غلبہ بھی ہے' رحیم بھی ہے۔

ذاتِ خداوندی متکبر کے لیے صاحبِ غلبہ اور دوسروں کے لیے رحمت ہے

وہ فرعون جو غلط راستوں پہ چلنے والا تھا' وہ جس کو مستبد کہا' متکبر کہا' اس کے لیے تو وہ عزیز ہے' صاحبِ غلبہ ہے۔ اور یہ جو اس کے راستے پہ چل کے بچ گئے ہیں اس کے لیے وہ کارگہ رحمت ہے۔ یہاں **لهو العزيز الرحيم** دونوں کے لیے آ گیا۔ کہا ہے کہ وہ اتنی قوتوں کا مالک ہے کہ مخالفین پر پورا پورا غلبہ پا کر نظامِ حق وصداقت کے حاملین کی نشوونما کا سامان کرتا ہے اور یہ جو ڈوبے ہیں یہاں تو یہی کہا ہے۔ ایک اور مقام ہے' وہاں عجیب الفاظ ہیں' خدا کا قانونِ مکافات' عجیب چیز ہے' اس کے عزیز ہونے کی جو بات ہے' وہ میرے کمرے کے اندر سامنے آیت لکھی ہوئی ہے کہ **اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ** (85:12) تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ اور اگر قانون عدل پر مبنی ہو تو اس کی گرفت سخت ہوتی ہے' سخت ہونی چاہیے' اگر وہاں بھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو پھر ظالم اور مجرم تو یونہی ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ یہ گرفت کس کے لیے سخت ہونی چاہیے؟ اصل مقصد اور بات ہی یہ ہے۔ وہاں ظالم اور مجرم کے لیے یہ گرفت ڈھیلی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر حق کے مطابق' قانونِ خداوندی کے مطابق' جرم کی سزا کے لیے ہوئی ہے تو گرفت سخت ہونی چاہیے۔ اور اسی لیے وہ دوسرا مقام ہے جہاں قومِ ثمود کے متعلق ہے۔ وہ **نَاقَةُ اللّٰهِ** (11:64) کا قصہ ہے۔ وہاں پھر یہ آیا ہے کہ **دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ** (91:15)۔ یہاں دمدم کا لفظ

آیا ہے کہ پھر خدا نے اس قوم پر روڈ رولر پھیر دیا۔

رحمانیت کے لیے انسان کو عرقِ انفعال کے قطرات پیش کرنا ہوں گے

اس آیت کے بعد اگلی ہی آیت میں کہا کہ **وَلَا یَخَافُ عُقْبٰـهَا** (91:16) اس پر خدا اس بات پہ نہیں کانپا کرتا' اس کا ہاتھ تھرتھرایا نہیں کرتا کہ ''اے کی ہوگیا''❶؟ اس وقت تو اس کو یہ خیال نہیں ستاتا کہ اس کے بعد 'ہائے سارے مرگئے' کی ہویا❷! یہ جو اس قسم کی جذبات کی چیز ہے' اگر یہ عدل میں آ جائے' عزیزانِ من! تو جرم کی سزا مل ہی نہیں سکتی۔ رحم وہاں ہے جہاں اس مجرم یا ملزم کی پیشانی پہ قطراتِ انفعال ہوں' ندامت کے قطرے ہوں' سچے دل سے وہ تائب ہورہا ہو' وہاں اس کے لیے وہ رحم اور بات ہے۔ اگر وہ وہاں بھی اسی طرح سے مجرم کا مجرم ہے' متکبر کا متکبر ہے تو **اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ** (85:12) تیرے رب کی گرفت بڑی شدید ہوتی ہے اور اس شدت کے لیے کہا ہے کہ **وَلَا یَخَافُ عُقْبٰـهَا** (91:16) ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ بات ظلم اور بے انصافی کی نہیں تھی بلکہ یہ اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو سامنے آ گیا۔ وہاں تو یہ کہا تھا اور یہاں (28-44:25) میں تو اور بھی حسین تریں الفاظ ہیں۔ یہی قصہ ہے فرعون کے ڈوبنے کا۔ کہا کہ **کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ . وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ . وَّنَعْمَةٍ کَانُوْا فِیْهَا فٰکِهِیْنَ . کَذٰلِکَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ** ❸ (28-44:25)۔ یہاں استبدادِ قومی کا فلسفہ بیان ہو رہا ہے کہ جب ایک قوم اس طرح سے ہلاک ہوتی ہے تو دوسری قوم' جو اس سے بہتر ہوتی ہے' وہ اس کی مالک آ بنا کرتی ہے۔

ظہورِ نتائج کے وقت پھر مہلت کہاں؟

یہ جو قوم ہے' جس سے یہ سب کچھ چھن جاتا ہے' پھر اس کی حالت' عزیزانِ من! یہ ہو جاتی ہے کہ ہر ایک کو بظاہر اس پہ رحم آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں' قانونِ مکافات کی رو سے ایسا نہیں ہے۔ جب مجرم کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو اس کے بعد یہ ہے کہ پھر اس قومِ فرعون کا حال یہ ہوا کہ (44:29) جب ظہورِ نتائج کا وہ وقت آ گیا تو پھر اس کے بعد مہلت نہیں دی جاتی' انتظار نہیں کیا جاتا۔

---

❶ اُف! یہ کیا ہوگیا؟

❷ صف افسوس! سبھی مر گئے' یہ کیا ہوگیا!

❸ (دیکھو!) اہل فرعون نے کس قدر باغات اور چشمے اور فصلیں اور رفیع الشان محلات اور گونا گوں سامان آسائش جس میں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے' پیچھے چھوڑے۔ اس طرح وہ اپنا ساز و یراق چھوڑ کر تباہ ہوگئے' اور ہم نے دوسرے لوگوں کو اس کا وارث بنا دیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1160)۔

پھر وہ اس طرح سے تباہ ہوتی ہیں اور الفاظ یہ ہیں کہ ان کی تباہی پر نہ پھر آسمان روتا ہے' نہ زمین روتی ہے۔ کیا الفاظ ہیں! عزیزانِ من! قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا حادثوں سے تباہ ہوجانا اور بات ہے' حوادث تو چیز ہی اور ہوتی ہے لیکن جب اپنے اعمال کے نتائج سے کسی قوم کی ہلاکت ہوتی ہے تو جو کچھ ان کا انجام ہوتا ہے اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ جاؤ' ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں کو پڑھ کے دیکھو۔ وہاں لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے کیا کیا تھا اور کیا حشر ہوا؟ اور اس مقام پہ یہ ہے کہ جب یہ تباہی یوں آتی ہے تو پھر اس پہ نہ آسمان روتا ہے' نہ زمین روتی ہے۔ وہاں کا یہ قصہ ہوا۔

یہ جو اس سورۃ میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستانِ آویزش تھی' اس آیت پہ اس کا اختتام ہوتا ہے۔ دیگر مقامات پر اس کی یہ چیزیں آئیں گی' اس کی مزید تفصیلات اور کڑیاں بھی آئیں گی لیکن اس سورۃ میں یہ حق و باطل کی آویزش کی داستان یہاں ختم ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی اس داستان کے بعد ایک نئے سفر کا آغاز

عزیزانِ من! اب آگے بات آتی ہے کہ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ (26:69) اسی طرح' اے رسول! انہیں داستان حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی سناؤ۔ اب ایک اور آویزش کی داستان سنو' جیسا کہ اب آپ کو معلوم ہے اور میں بار بار یہ بتاتا ہوں کہ یہ قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ نبی کا جیسا میں نے کہا ہے ایک مسجد کا وعظ نہیں ہوتا' وہ ایک بڑا عظیم انقلابی شخص ہوتا ہے' بہت بڑا انقلاب لے کر آتا ہے' ہر باطل نظام کی جگہ ایک نظامِ خداوندی کو مسلط کرنے کا داعیہ لے کر آتا تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ پھر ٹکراؤ کس کس سے ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں تو دیکھ لیا کہ دنیا میں انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لیے تین ہی استبداد کے شکنجے ہوتے ہیں: ملوکیت [1] کا استبداد' مذہبی پیشوائیت [2] کا استبداد' اور سرمایہ پرستی کا استبداد [3]۔ وہاں یہ تینوں فرعون اور ہامان اور قارون کی شکل میں تھے' اِن کے مقابلے میں صاحبِ ضربِ کلیم تھے' وعظ کرنے والے نہیں تھے' محض کلام کرنے والے نہیں تھے۔ اگر آج کی اصطلاح میں لے لیں تو یہ علم الکلام کا دور نہیں تھا۔ ہمارے ہاں یہ کلام علم الکلام بن گیا ہے۔ علامہ

---

1. فرعونیت
2. ہامانیت
3. قارونیت

اقبالؒ (1938-1877ء) نے کہا ہے کہ ''ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم الکلام''۔ یہ کلام بھی شاعری اور قوالی کی ہی ایک قسم ہے۔

اب یہاں ایک اور پیغمبر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی داستان آتی ہے۔ انبیائے کرام کے زمرے میں ان کا بڑا عظیم مقام ہے۔ ایک تو یہی چیز ہے کہ یہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دو ہی تو شاخیں ہیں جن کی نبوت کے تذکرے قرآن میں ہیں ورنہ نبوت تو ہر قوم میں آئی تھی تو ان دونوں قوموں کے مورثِ اعلیٰ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ایک بیٹا اسحاق علیہ السلام ہے' جس کی نسل میں سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام تک یہ بنی اسرائیل کے انبیائے کرامؑ ہیں' اور وہاں یہ سلسلہ ختم ہوا ہے تو دوسرے بیٹے جو اسماعیل علیہ السلام ہیں ان کی شاخ میں یہ سدرۃ المنتہٰی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں' تو بہت بڑا مقام ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کعبے کا مقام اور اس کی فضیلت

اتنا ہی مقام نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دو بڑی شاخوں کے جدِ امجد تھے۔ جب میں آگے چلوں گا' بتاؤنگا کہ مقامِ ابراہیمی علیہ السلام کیا ہے۔ یہ وہاں نظر آئے گا۔ تو وہ چیز جو اس سے پیشتر مقامی سی تھی' انہوں نے اس کعبے کو بین الاقوامی بنانے کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کعبے کو قِيٰـمًـا لِّلنَّاسِ (5:97) کہا ہے۔ ان کا خطاب انسانیت سے ہے۔ یہ جتنے انبیائے کرام ادھر آئیں گے' آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں قومی خطاب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو پہلا ٹکراؤ تھا' وہ ٹکراؤ یہی تھا۔ وہ مخالفین اسے قومی مفاد تک محدود رکھنا چاہتے تھے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے عالمگیر انسانیت کے لیے عام کرنا چاہتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے اس عالمگیر انسانیت کے نظام کے تصور کی طرح ڈالی ہے اور ایک محسوس مرکز تو بنا ہی دیا۔ اب سوچ لیجیے کہ ان کا ٹکراؤ کس کس سے ہوا۔ اس ٹکراؤ کی بنیادی نوعیت یہ اختلاف ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آئے ہیں تو عام اصطلاح میں غیر قوم کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے' فرعون دوسری قوم کا فرد ہے' بنی اسرائیل جسے آج کہتے ہیں اپنی قوم نسلی اعتبار سے سہی تو کم از کم دوسری قوم کے ساتھ ٹکراؤ تو ہوتا ہے۔ یہاں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھے ہیں' جہاں اپنوں کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے اور یہ وہ ٹکراؤ ہے جس کی مماثلت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے یہاں بھی اپنوں کے ساتھ یعنی قریش کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا' اپنوں کے ساتھ ٹکراؤ ہو رہا ہے۔ اپنوں میں سب سے پہلے گھر میں باپ آتا ہے۔

حکومت میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل

ساحرینِ دربارِ فرعون کے ایمان کی اولیت کے ضمن میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس زمانے کے یہ پروہت ہوتے تھے' یہ مذہبی پیشوا ہوتے تھے' یہ مندر کے پجاری یا مسجد کے مُلّا نہیں ہوتے تھے' مملکت میں ان کا مقام اور منصب بڑا بلند ہوتا تھا۔ یہ تو بڑے

شاطر ہوتے تھے۔ براہِ راست حکومت نہیں کرتے تھے۔ یہ بادشاہ کے کندھے پہ بندوق رکھ کر گولی چلاتے تھے۔ بندوق انہی کی چلتی تھی۔ یہ تھیوکریسی عجیب چیز ہے۔ گائے کے سینگ تو یہ کھشتری کو' بادشاہ کو' پکڑا دیتے تھے اور دودھ آپ دوہتے تھے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے وقت قرآن بھی بتاتا ہے اور تاریخ بھی بتاتی ہے کہ نمرود بادشاہ[1] فرعون سے کچھ کم نہیں تھا' اس زمانے میں اپنی مملکت کے اندر ہر بادشاہ آخری سربراہ ہوتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد سے وجہ مخالفت

اس بادشاہ کی مملکت کے سب سے بڑے منصب دار' مذہب کے پجاری' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے باپ تھے اور یہ منصب وراثت میں آیا کرتا تھا۔ اب یہ سیدھی سی بات ہے کہ اتنا بڑا منصب ان کے حصے میں آنے والا ہے۔ اس میں انسانی رویوں کی دونوں ہی بنیادی چیزیں آ گئیں۔ ان میں ایک ہے جسے جلب منفعت کہتے ہیں کہ اس کے اندر فائدہ کتنا ہے' اور دوسری ہے جسے دفع مضرت کہتے ہیں کہ اس کی مخالفت کے نقصان رساں اثرات کس قدر ہیں' ان سے کس طرح بچا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس مخالفت میں باپ کس طرح معاف کر دے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں کہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' جو کچھ تم ان سے کہہ رہے ہو' جو کچھ یہ مسلک اختیار کر رہے ہو' یہ باطل ہے' بادشاہ کو جا کر تلک لگاتے ہو' یہ بھی باطل ہے' تمہاری ساری کمائی حرام کی ہے۔ پھر کیا باپ انہیں آسانی سے چھوڑ دے گا؟ اور پھر جب بادشاہ کو پتہ چلے گا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ اس بادشاہ کی ملازمت حرام ہے' اس کی کمائی حرام ہے' اس کے ساتھ رہنا حرام ہے' تو وہ بادشاہ کیا کیا کرے گا؟ پھر جو قوم میں مسلک تھا' وہ تو پورے کا پورا بت پرستی کا ہے۔ اس وطن کے اندر رہتے ہوئے یہ اس کے خلاف ہے' باپ کے خلاف ہے' اپنی پوری قوم کے خلاف ہے' قوم کے مستقل حاکم کے خلاف ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اگر تقابلی اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی آویزش بہت بڑی صبر آزما تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ بات ہی قرآن نے یہاں سے شروع کی ہے اور اس کے لیے بھی میں دیگر مقامات سامنے لاؤں گا تو آپ دیکھیں گے کہ کس جرأت سے' کس بیباکانہ انداز سے' آپ نے یہ بات کی: اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ وَقَوْمِہٖ مَا تَعْبُدُوْنَ [2] (26:70) یعنی اس نے اپنی انگلی ہی دکھتی ہوئی رگ کے اوپر رکھی ہے۔ یہ جو مقام ہے'

---

[1] نمرود کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورہ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔216 (فٹ نوٹ 3)

[2] جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔842)

Emotionally (جذباتی طور پر) بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ کسی کے بت کے متعلق، کسی کے خدا کے متعلق، یہ کہہ دینا کہ او! یہ ہے کیا جس کی تم پرستش کیا کرتے ہو؟ اہانت اور اتنی بڑی اہانت، توہین اور اتنی بڑی توہین!

مذہبی سوچ پر، کسی کے جذبات کی توہین، بڑے خطرناک نتائج پیدا کرتی ہے

یہاں تو غنیمت ہے کہ اب وہ لڑنے والے نہیں، اب بھی جو انڈیا سے، آتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ اس اہانت وتوہین کے اثرات کس قدر نقصان رساں ہیں اور جب ہم وہاں ہندوستان میں تھے تو ہمارے ساتھ تو روز یہ ہوتا تھا۔ خود ہمارے ہاں، ہمارے شہر [1] میں، یہ چیز ہوتی تھی: یہ دو قسم کے ٹکراؤ تھے، یہ تعزیہ نکلتا تھا۔ تعزیئے ہمارے ہاں بڑے مشہور تھے۔ راستے میں ایک پیپل کا درخت آیا کرتا تھا۔ پیپل ہندوؤں کا دیوتا ہوتا ہے۔ ہوا یہ کہ پیپل کی شاخ بڑھ کر بازار پہ یوں آ نکلی ہوئی تھی۔ تعزیہ آ رہا تھا۔ اس کے اوپر کی جو چوٹی تھی وہ ٹکراتی تھی۔ تعزیہ جا نہیں سکتا تھا۔ اب انہوں نے کہا کہ وہ درخت کی ایک شاخ ہی تو ہے تو یہ کٹ گرے۔ یہ کیا، اور اُدھر ہجوم کر کے ان ہندوؤں کا سارا شہر نکل آیا کہ تم دیوتا کو ہاتھ لگا کر دیکھو۔ یہاں بیخ یہ تھی کہ تمہارے دیوتا کے سامنے ہم اس تعزیئے کو جھکا نہیں سکتے۔ اب جب دیوتاؤں میں ٹکراؤ ہو تو پھر یہ کچھ ہوتا ہے۔

پیپل دیوتا ہے۔ اب ایک کے لیے دو دیوتا ہوں تو پھر مصالحت کس طرح ہوتی ہے۔ اس کے لیے بھی سنیے۔ آپ کو پتہ ہے کہ لالہ جی نے ایک پیپل کا پودا لگا دیا تھا، ایک چوکیدار مالی رکھ لیا تھا: تمہارا کام ہے کہ اس کی حفاظت بھی کرو اور پانی بھی دیا کرو۔ وہ لالہ جی روز آ کے دیکھ لیتے تھے، ڈنڈوت بھی بجا لاتے۔ وہ اچھا بڑھ پھول رہا تھا۔ ایک دن آ کے دیکھا کہ پیپل کا وہ پیڑ ٹنڈ منڈ ہو چکا تھا۔ پوچھا کہ ارے! یہ کیا کیا تم نے؟ کہاں گئے ہوئے تھے، کہاں مر گئے تھے؟ کہنے لگا: حضور! میں تو یہیں تھا، میں تو کہیں جاتا ہی نہیں ہوں، میں تو دن رات اسی کے پاس رہتا ہوں۔ لالہ جی نے کہا کہ او تمہارے دیکھتے ہوئے یہ ہوا؟ ہاں جی، میرے سامنے یہ سب کچھ ہوا۔ کہنے لگے: او کیا ہوا؟ وہ مالی کہنے لگا: جی سانڈ آیا، اس نے آ کے اسے یوں ایک منہ مارا اور کھا گیا۔ اور تم دیکھتے رہے؟ مالی کہنے لگا: جی دیکھتا نہ تو کیا کرتا، سانڈ بھی آپ کا دیوتا، پیپل بھی آپ کا دیوتا، میں کس کو مارتا، کس کو چھڑاتا؟ ہاں تو وہاں یہی دیوتا تھا جس کی شاخ بڑھی ہوئی تھی۔ یہ جو آپ سنتے ہیں کہ دو سو ادھر سے مر گئے، چار سو ادھر سے مر گئے، کیا سوچا کہ یہ کس چیز پہ مرتے ہیں؟ اس پر کہ معبود کی ایک شاخ تراشی ہوئی ہے! اور عزیزانِ من! اِدھر یہ صاحب [2] اٹھتے ہیں، اور ان سے بھی اور ساری قوم سے

---

[1] بٹالہ، انڈیا میں

[2] یہ اشارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہے۔

بھی یہ کچھ کہتے ہیں کہ او! یہ ہے کیا جس کی تم پرستش کیا کرتے ہو؟ اور یہ کہتے ہیں' جو سب سے بڑا مہامنتری اس کا باپ ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ **قَالَ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ** [1] (26:70)۔ یہ عربی والے جانتے ہیں کہ اس ''ما'' کے اندر کتنی قیامت ہے! عام طور پہ بے جان چیزوں کو' جن کے اندر جان تک بھی نہ ہو' اسے کہتے ہیں۔ وہ انہیں خدا مانتے ہیں' یہ کہتا ہے: یہ ہے کیا؟ او کیا ہیں' جنہیں تم پوجا کرتے ہو! **قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ** [2] (26:71)۔ اس نے کہا کہ یہ تو تم بھی دیکھتے ہو کہ یہ اصنام ہیں۔ عزیزانِ من! میں دوسرے وقت میں بتاؤں گا کہ اصل میں اوثان [3] یا وثن کہتے کس کو تھے۔ اور کہتے ہو کہ پوجتے ہیں' ہم اور پوجتے رہیں گے' یہی ہوگا' اسی پہ جمیں رہیں گے۔ انہی کی پرستش کرتے رہیں گے' تم بتاؤ کہ تم کون ہو یہ کہنے والے؟ ایک لفظ میں **فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيۡنَ** میں یہ سب کچھ بتا دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جب فرعون کی طرف آئے ہیں تو خدا نے کہا تھا کہ جاتے ہی لٹھ نہ مار دینا' پہلے اس سے نرمی سے بات کرنا:

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

نبی تو اتنی سی Opportunity (موقعہ) کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ اب یہاں بھی آخر میں جا کر ہم دیکھیں گے کہ یہ ضربِ ابراہیمی علیہ السلام' تیشہ ابراہیمی علیہ السلام کیا کرتا ہے۔

---

[1] اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 842)

[2] انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور انہی کی پرستش کرتے رہیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 842)۔

[3] ص ن م (جمع اصنام) بت۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں حکما کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے' صنم کہلاتی ہے۔ لہٰذا اصنام وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانونِ خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں (پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔ 1051) اور وَثَنَ بِالْمَكَانِ. وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا۔ الوَاثن. مقیم اور جما ہوا' جو حرکت نہ کر سکے۔ اسی سے وَثَنٌ بت کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا (تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن) اس کی جمع اوثان (29:17) ہے۔ تاج العروس اور کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ وَثَنٌ چھوٹے صنم (بت) کو کہتے ہیں۔ ''اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور' یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ کہلاتا ہے۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں' بدترین قسم کا وَثَنٌ ہے جس کی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے (پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔ 1685)۔''

نبوت کا اندازِ بیان ہمیشہ دلائل پر مبنی ہوتا ہے

آپ دیکھیں گے' عزیزانِ من! نبوت میں بات ہمیشہ دلائل سے ہوتی ہے۔ اس میں پہلی چیز ہی یہ ہوتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے سورۃ الحدید میں کہا تھا کہ یہ جو پروگرامِ نبوت ہے' یا تبلیغِ نبوت ہے' یا اس کے اقداماتِ تسلسل میں تدریس کی جو کیفیت ہے' اسے قرآن نے ایک آیت میں یوں بیان کیا ہے کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ** (57:25) ہم نے اپنے رسول بینات سے بھیجے گویا ہر رسول کی کیفیت یہ تھی' ان کا پروسیس' ان کا طریق کار یہ تھا' آخر تک پہنچنے کے لیے پہلی چیز بـالبنیت تھی یعنی دلائل کے ساتھ یہ پروگرام تھا' شروع میں ہی لٹھ مار کے نہیں تھا بلکہ دلائل کے ساتھ تھا۔ وہ اپیل عقل وفکر کو آ کر کرتا ہے۔ بالبینت واضح دلائل کو کہتے ہیں۔ دلائل کے بعد اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ دلائل کی رو سے قائل ہو جائیں تو ان سے کام لو ورنہ قائل ہونا تو صرف ذہنی چیز ہوتی ہے۔ اس لیے پھر وہ ان سے مل کر ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے' مدنی زندگی ہوتی ہے' وہاں قوانین کی ضرورت پڑتی ہے' اس کے لیے کہا کہ **وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (57:25) اس کے لیے ان کو قانون دیا جاتا ہے۔

ایمان بزورِ شمشیر کسی کے دل میں داخل نہیں کیا جاسکتا

اگر قانون الفاظ کی شکل میں رہے تو وہ وعظ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ **وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25)۔ یہ نظامِ عدل ہوتا کہ وہ ان قوانین کو نافذ کرے' پھر اس کے مطابق یہ لوگ چلیں' جو بینات کی رو سے ایمان لا چکے ہیں۔ ایمان لٹھ بازی سے نہیں لایا جائے گا۔ اس کے اندر دو طبقے' دو گروہ موجود رہیں گے' ایک وہ جو دلائل و براہین کی رو سے ان حقائق کے اوپر' ان صداقتوں پہ ایمان لا چکے ہیں اور ایک وہ جو ایمان نہیں لائے ہیں' ان سے زبردستی ایمان نہیں منوایا جائے گا' زبردستی کے ایمان کو ایمان ہی نہیں کہتے' وہ تو اقبالِ جرم ہوتا ہے جو یہاں تھانے میں سامنے کیا جاتا ہے اور عدالت میں جا کر آدمی مکر جاتا ہے' ایہو جیا ایمان ہوندا اے[1]۔ دوسری یہ قوم ہوتی ہے جن کو عام طور پر Non-Members (غیر ممبر) کہا جاتا ہے۔ ان کی حفاظت کا ذمہ آپ لیتے ہیں۔ یہاں دلائل سے منوانا' قوانین کی رو سے نظام معاشرت متشکل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگلی چیز یہ آتی ہے کہ اس میں وہ لوگ آ جائیں جو اپنے مفاد اور جذبات کے لیے یہاں کسی طرح سے بھی قانون شکنی کریں' سرکشی اختیار کریں تو اس کے لیے کہا کہ **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ** (57:25) اس نے ضابطۂ قوانین کے

---

[1] یہ ایسا ہی ایمان ہوتا ہے۔

ساتھ شمشیر خارہ شگاف (حدید) بھی نازل کی۔ اس میں بڑی صلابت اور سختی ہوتی ہے لیکن اس کی یہی سختی تو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہوتی ہے:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد ❶

عقل وشعور کے سامنے اسلاف پرستی انسان کو ہمیشہ لاجواب کر دیتی ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ قرآن نے اس پروگرام کی ترویج خود بتائی ہے' رسولوں کے لیے پہلی چیز بینات ہے۔ وہ دلائل سے آتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا ہیں یہ چیزیں جن کی تم پرستش کیے جاتے ہو! قرآن نے کہا کہ کرتے ہیں' کریں گے' اس سے ہٹیں گے نہیں "کون ہوتے ہو تم؟" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت نرمی سے کہا تھا جبکہ تیشہ ابراہیم ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں: **قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ . اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ** ❷(26:72-73)۔ یہاں کہا کہ ذرا سمجھاؤ تو سہی کہ جب تم ان سے بات کرتے ہو تو کیا یہ سنتے ہیں؟ اگر سنتے ہیں تو کیا بات کا جواب دیتے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھوں سے کوئی نفع یا کوئی نقصان ہے؟ جواب کچھ نہیں ہے۔ دلیلیں ہیں جن کا جواب نہیں ہے۔ جواب کیا ہے' وہ جو ہم دیتے ہیں کہ **قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (26:74) ہم نہیں جانتے کہ تم یہ کیا دلیلیں مانگتے ہو اور ہم کیا جواب دیتے ہیں۔ ہم بس یہ جانتے ہیں کہ ماں باپ' آباؤ اجداد' اسلاف یہ کرتے چلے آئے ہیں' ہم یہی کچھ کرتے چلے جائیں گے' دلیل و لیل ہم جانتے ہی نہیں' بس تقلید ہے جس کے اوپر ہم چلے آ رہے ہیں اور تقلید کو عربی زبان میں وثن ❸ کہتے ہیں یعنی ہر وہ شے جو اپنے مقام پہ ایسی جمی ہوئی ہو کہ تم اس کو ہلا نہ سکو۔ کہا کہ آباؤ اجداد کی تقلید سے ہم یہ کچھ کرتے ہیں' ہم تمہارے دلائل کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ اسی پہ جمے ہوئے ہیں کہ آباؤ اجداد کا یہ مسلک ہے۔ یہاں ان کی طرف سے یہ جواب ملا۔ آگے بات کیا ہوئی' یہ اگلے درس پہ اُٹھا رکھتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ الشعراء کی آیت 74 تک ہم آ گئے' 75 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

---

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938ء)

❷ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تم ان بتوں کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات سنتے ہیں؟ یا ان میں اس کی قوت ہے کہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچا سکیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 842)۔

❸ دیکھیے ص۔ 163 کا فٹ نوٹ 4

ساتواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 75 تا 104)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج جون 1978ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعراء کی آیت 75 سے ہو رہا ہے: (26:75)۔

خاندانِ نبوت کی دو عظیم ہستیوں کے ذکرِ خیر کی خصوصیات

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان ہے۔ قرآنِ کریم نے دو ہی ہستیاں ایسی دی ہیں جن کے متعلق تصریحی طور پر یہ کہا ہے کہ ان کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے: ایک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دوسرے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی۔ یہ میں آخر میں جا کر بتاؤں گا کہ ان کی درخشندہ سیرت کے وہ کون سے نمایاں گوشے ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان گوشوں میں ہمارے لیے اور آنے والوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے' بہترین نمونہ ہے۔ یہ میں تفصیل سے آخر میں بتاؤں گا تاکہ وہ گوشے سامنے آئیں تو پھر بات نمایاں طور پر سمجھ میں آجائے۔

کیا ماں باپ کی اطاعت فرض ہے؟

پہلی بات تو یہیں سے آگئی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باپ سے کہا کہ تمہاری سمجھ کو کیا ہوا ہے' اپنے ہاتھ سے ایک بت تراشتے ہو اور اُس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہو' خود بھی اسے خدا ماننے لگتے ہو اور قوم کو بھی یہ کہتے ہو کہ وہ اسے خدا تسلیم کرے۔ ہمارے ہاں جو یہ غلط تصور چلا آ رہا ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے جب کہ اسوۂ ابراہیم علیہ السلام جسے قرآنِ کریم نے خاص طور پہ ہمارے لیے کہا ہے کہ بہترین نمونہ ہے' تو اُس کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ اگر باپ غلطی کے اوپر ہے تو وہ اُسے بھی ٹوکتا ہے۔ یہ سوال ہی نہیں ہے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اور اس تصور میں' میں آخر میں جا کر بتاؤں گا کہ ہمارے ہاں کے معاشرے میں

خاص طور پر یہ چیز اس قدر نقصانات، تباہیاں، پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے کہ ماں نے کہہ دیا ”میں دودھ نہیں بخشاں گی، جدوں تیکر اینوں طلاق نہیں دیدیں گا“[1] اب ذہن میں یہ ہے کہ اس کی اطاعت کریں کیونکہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ ”جے ایہہ گل نہ منّی تے فیر گیا[2]“۔ پہلی چیز ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ باپ غلطی کے اوپر ہے تو اُس کو بھی روکا ٹوکا جاتا ہے۔ اگلی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ پوری کی پوری قوم باطل پر ہے، تو اگلا حصہ اُس میں یہ آیا کہ اُنہوں نے یہ کہا کہ یہ بت کیا ہیں، جن کو تم خدا بنائے بیٹھے ہو؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ **قَالُوۡا بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ** (26:74) ہم کچھ نہیں جانتے، ہمارے آباؤ اجداد یہ کچھ کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے اتباع میں یہ کرتے ہیں۔ گویا سند اسلاف کا مسلک ہے جو متواتر چلا آرہا ہے اور اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام یہ ہے کہ **قَالَ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ** (26:75) تم کہتے ہو کہ ہمارے باپ دادا، اسلاف، یہ کرتے چلے آرہے ہیں اور ہم ان کے مسلک کا اتباع کرتے ہیں۔ اُن سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم نے خود بھی اس بات کے اوپر غور کیا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اس سے اب دوسرا گوشہ سامنے آ گیا۔

کیا اسلاف کا مسلک دوسروں کے لیے سند کا درجہ رکھتا ہے؟

پہلا تو یہ تھا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں۔ یہاں اب اسلاف کا مسلک جب مذہب کے اندر سند بنتا ہے تو اس کے خلاف اسوۂ ابراہیم علیہ السلام یہ ہے کہ یہ کوئی سند نہیں ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ **اَفَرَءَیۡتُمۡ** (26:75)۔ یہ جو ”رأت“[3] ہے، یہ غور وفکر ہی نہیں، بلکہ آنکھوں سے دیکھنے کی ایک چیز ہے۔ گویا اپنی آنکھیں کھول کر دیکھو تو سہی، غور وفکر کے بعد مجھے بتاؤ تو سہی کہ کیا اس کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل بھی ہے یا کیا کبھی تم نے از خود غور وفکر کر کے بھی دیکھا ہے کہ یہ مسلک صحیح ہے؟ دوسری چیز ہمارے سامنے یہ آ گئی۔ اب یہ جو اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم حنیفاً کہتے ہیں تو ان کے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے لیے سند یہ ہے کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے اور یہ ہوتا چلا آرہا ہے، تواتر سے ثابت ہے، ان کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ پوچھیے کہ صاحب! کیا تم نے غور وفکر کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اسلاف سے یہ چیز چلی آرہی ہے، اس پہ غور وفکر قطعاً ممنوع ہے۔ اس کے باوجود تلاوتیں ہو رہی ہیں، رمضان میں قرآن دہرایا جا رہا ہے کہ **قَدۡ کَانَتۡ لَکُمۡ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ**

---

1. میں دودھ نہیں بخشوں گی جب تک تو اسے طلاق نہیں دے دیتا۔
2. اگر یہ بات نہ مانی، تو پھر؟ تو میرا بیٹا ہونے سے گیا۔
3. اس کا مادہ (Root) ”رأی“ ہے۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لیے اسوۂ حسنہ ہے' ان کی روش تمہارے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

حقیقی زندگی کے حصول کے لیے غور وفکر کا عمل بڑی اہمیت کا حامل ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اسلاف کے مسلک کے خلاف یہ دلیل دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا تم نے خود اس بات پر غور کیا ہے کہ جو تم کر رہے ہو وہ صحیح روش ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے' کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا کرتے چلے آ رہے ہیں' اس لیے ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر یہی دلیل اور یہی سند ہوتی تو کوئی نبی نیا دین پیش ہی نہ کرسکتا۔ نئے سے مراد یہ ہے کہ وہ مذہب جو ان کے ہاں چلا آ رہا تھا' اس کے خلاف وہ کوئی بھی ایک چیز کہہ ہی نہ سکتا' اگر سند اور دلیل یہ ہوتی کہ آباؤ اجداد یہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ جتنے حضرات آتے تھے' جو کچھ اُس وقت مذہب کے نام پہ غلط ہو رہا ہوتا تھا' ان کا پیغام اُس کے خلاف صدائے احتجاج ہوتا تھا' احتجاج کی صدا ہی نہیں بلکہ یہ عملاً اُس غلط مسلک' ان شعائر' ان نظریات' ان خیالات کے خلاف جو غلط تھے اور جن کی سند یہ تھی کہ وہ آباؤ اجداد سے متواتر چلے آ رہے ہیں انقلاب برپا کرتے تھے' اور یہ تو آپ قرآنِ کریم میں دیکھیں گے کہ ایک ایک صفحہ پہ یہ لکھا ہوا ہے۔ قرآن یہ کہتا چلا آ رہا ہے کہ یہ بھیڑ چال ہے' یہ حیوانات کا مسلک ہے' یہ انسانوں کے فرض کے خلاف ہے۔ دوسری یہ چیز ہمارے سامنے آئی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ o اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ (26:75-76) تم اور تمہارے پہلے اسلاف جو کرتے چلے آ رہے ہیں' کیا اس پر تم نے کھڑے ہو کر غور بھی کیا ہے کہ وہ حق پر مبنی مسلک ہے یا غلط مسلک ہے؟ اگر تمہارے غور وفکر کے بعد وہ ایسا نظر آئے تو ٹھیک ہے وہ مبنی برحق ہے' اُس کو اختیار کرو' لیکن اُس کی سند پھر یہ نہیں ہوگی کہ آباؤ اجداد یہ کرتے چلے آ رہے ہیں' اس لیے یہ کر رہے ہیں بلکہ یہ ہوگا کہ میں نے اس کے اوپر خود غور کیا ہے' تحقیق کی ہے' میرے پاس دلیل ہے' برہان ہے' ثبوت ہے' سند ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ اسلاف کا مسلک ہے' اس لیے ہم اس پہ غور وفکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور ہم اس کو حق پر مبنی مسلک سمجھتے ہیں تو یہ کوئی طریق نہیں ہے۔ کہا کہ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (26:77) تم انہیں جو کچھ سمجھتے ہو' سمجھتے رہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں انہیں اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہوں۔ میں خدائے رب العالمین کو دوست رکھتا ہے۔ اس کے برعکس یہ ہیں کہ گویا اپنے ہی ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہی نہیں' بلکہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو خدا لیتے ہیں اور خدا کے مساوی قرار دے لیتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (60:4) تمہارے

لیے ابراہیم علیہ السلام اوراس کے ساتھیوں کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ (60:4) جب اُنہوں نے للکار کر پوری قوم سے کہہ دیا' جس میں باپ بھی شامل تھا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (60:4) تم اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' میں ان سب سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں' علیحدگی کا اظہار کرتا ہوں' بریت کا اظہار کرتا ہوں كَفَرْنَا بِكُمْ (60:4) ہم تمہارے اس مسلک سے انکار کرتے ہیں' ہم سرکشی اختیار کرتے ہیں وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60:4)۔ ہم عام طور پہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! واقعی یہ لوگ غلطی پہ ہیں لیکن دیکھیے آپ ان کے خلاف خوامخواہ یہ کہتے رہتے ہیں' اس سے نفرت پھیلتی ہے۔ عزیزانِ من! اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام جو آپ کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے' وہ کہتا ہے کہ بدا' یہ چھپی ہوئی بات نہیں بلکہ میں اعلانیہ کہتا ہوں' کھل کر کہتا ہوں کہ تم میں اور ہم میں عداوت ہے بَغْضَآءُ' عداوت ہی نہیں ہے بلکہ یہ عداوت سے بھی اگلا درجہ ہے کہ جو چیز کھلے طور پہ بغاوت پہ اتر آتی ہے' غصہ ہے' نفرت ہے۔ ابدًا ہے' ہمیشہ کے لیے ہے۔ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4) اگر تم بھی حق پر مبنی یہ مسلک اختیار کر لو تو پھر اُس وقت یہ چیز ختم ہوگی۔ یہ ہے اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام۔ اس لیے کہا کہ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (26:77) ان سب کے خلاف میرے دل میں عداوت ہے۔ میرا دوست' میرا ساتھی' میرا رفیق وہ خدائے رب العالمین ہے الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ (26:78) جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور پھر زندگی کے صحیح راستوں کی طرف چلنے کے لیے راہنمائی عطا کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کئی ایک مقامات پر یہ کہا ہے کہ خدا نے ہر شے کو پیدا کیا اور ثم ھدی اس کی منزلِ مقصود کی طرف جانے والے راستوں کی راہنمائی کر دی۔ گویا خالقیت یا تخلیق ہی کی ذمہ داری نہیں تھی بلکہ اُس کے ساتھ جو اس کی منزل ہے' منتہیٰ ہے' اس تک جانے والے راستوں کی راہنمائی بھی وہی کرتا ہے۔ اس نے اس کی راہنمائی کی وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ o وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ . وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ (26:79-81) خدا وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہ صحیح راستے کی طرف میری راہنمائی کرتا ہے' اس نے مجھے ہدایت دی ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ وہ جو روز مجھے کھلاتا ہے' پلاتا ہے' جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے' وہ ہے جس نے مجھے زندگی دی اور جو مجھے موت دے گا اور اس کے بعد بھی مجھے زندگی عطا کرے گا۔

ہمارے ہاں تصوف کی ساری عمارت ''توکل'' کے غلط مفہوم پر استوار ہوتی ہے

اب اس آیت میں یہ جو چیزیں ہیں کہ وہی مجھے کھلاتا ہے' پلاتا ہے' شفا دیتا ہے' اس کے اوپر تصوف کے ''توکل'' کی عمارت قائم ہوگئی کہ دیکھیے ہم نے کچھ نہیں کرنا بلکہ خدا ہی کھلائے گا اور خدا ہی کرائے گا اور جب ایک ایک قحط میں دس دس ہزار بھوکے مر

جاتے ہیں تو یہ کہنا تو آسان ہوگیا کہ خدا ہی مارتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے' تو ٹھیک ہے' پھر علاج معالجے کی ضرورت ہی نہیں ہے: اس نے پیدا کیا ہے' زندگی دی ہے اور جب جی چاہتا ہے مار دیتا ہے۔ یہ چیز آپ کے سامنے اس بیس برس کے عرصے میں سینکڑوں مرتبہ آ گئی ہے۔ قرآنِ کریم کا یہ جو انداز ہے اس کو ذہن میں رکھیے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا جو کچھ کرتا ہے وہ انسانوں کے ہاتھوں ہی سے ہوتا ہے' وہ براہِ راست کچھ نہیں کرتا۔ جب وہ کہتا ہے کہ ہم کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے قوانین کے مطابق یہ ہوتا ہے۔ اتنی سی بات اگر سمجھ لی جائے اور اتنی سی بات کو سامنے رکھ کر قرآن کی آیات کو دیکھا جائے تو کہیں کوئی دشواری اور پیچیدگی پیدا ہی نہیں ہوگی۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ خدا کا یہ قانون ہے۔ **وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62) اور اس قانون میں تم کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے' وہ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے' قانون ساز تو اوپر وہ خود ہے کہ اُس نے سنکھیے میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ مار دیتا ہے' اس نے پانی میں صلاحیت رکھی کہ یہ زندگی دیتا ہے۔ اس نے ایک جگہ کہا ہے کہ پانی سے ہر شے زندہ ہوتی ہے' دوسری جگہ کہا ہے کہ ہم ہر شے کو زندہ کرتے ہیں۔ تو آپ ان دو ٹکڑوں کو ملایئے تو پتہ چلا کہ یہاں خدا پانی کے ذریعے سے زندگی کی نمود کرتا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ صاحب! خدا نے کہا ہے کہ ہم زندہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ براہِ راست جب جی چاہتا ہے زندہ کر دیتا ہے' اس کے لیے آپ قرآن کے باقی سارے ٹکڑوں کو بھی لیجیے۔ اس نے اس کے لیے اس خارجی کائنات کے اندر قوانین وضع کر کے دیدیئے ہیں۔ یہاں ہر چیز خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ طبعی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے' وہ اس کے Physical Laws (طبعی قوانین) کے تابع ہوتا ہے' انسان کی اپنی ذاتی اور تمدنی زندگی میں اس کی عطا کردہ اقدار اور اصولوں کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اب قرآن میں دیئے ہوئے ہیں۔

عزیزانِ من! جب بھی وہ کچھ کہتا ہے کہ ہم یہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے قوانین کے تابع ہوتا ہے ورنہ بقول ان کے قرآن میں تو یہ چیزیں بھی ہیں جو یہ بار بار دہراتے رہتے ہیں کہ وہی گمراہ کرتا ہے (معاذ اللہ) حالانکہ وہ وضاحت اور صراحت سے کہتا ہے کہ جو گمراہ کرنا ہے' یہ ابلیس کا کام ہے۔ آپ تو بڑے دھڑلے سے یہ چیز کہتے ہیں کہ خدا گمراہ کرتا ہے اور خدا ہی ہدایت دیتا ہے۔ گمراہ کرتا ہے اور پھر گمراہ ہونے والے کو جہنم میں بھی بھیج دیتا ہے۔ یہ تو وہ مسئلہ ہے جس میں تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے میری کتاب ''کتاب التقدیر'' موجود ہے' آپ اُس میں دیکھ لیجیے۔ قرآنِ کریم میں جہاں بھی یہ چیزیں آئیں تو ان کا مفہوم قرآن کی رو سے سمجھ لیجیے کہ یہ کچھ ہمارے قوانین کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً مریض ہوتے ہو تو ہمارے علت و معلول کے قانون کی رو سے شفا ملتی ہے۔ اُس قانون کے مطابق کرو گے تو یہ ہوگا کہ خدا ایسا کرتا ہے۔ اور اگر آپ نے وہ تعویذ' دھاگے' گنڈے' دم درود اور' ڈھولکیوں بجانے والے بلا لیے تو یہ خدا کے قانون کے مطابق نہیں ہو رہا۔ یہاں جو

بھی کوئی کام ہے وہ اگر اُس کے Cause & Effect (علت ومعلول) کے قانون کے ماتحت نہیں کریں گے تو یہ توہم پرستی ہے اور یہ خدا نہیں کر رہا بلکہ تم نے خدا کے ساتھ اور شریک کر رکھے ہیں' وہ کر رہے ہیں ۔ یہاں تو خدا زندگی بسر کرنے کا ایک زرّیں بنیادی اصول بتا رہا ہے: دنیا میں رہنا ہے تو جو قوانین تمہاری زندگی کے لیے بنائے گئے ہیں' ان قوانین کے تابع جو کچھ کرو گے وہ ہماری منشا اور مشیت کے مطابق ہوگا ۔ اگر ان قوانین سے الگ ہٹ کر کچھ کرو گے تو وہ ہمارے خلاف تم شریک اور معبود بنا لو گے ۔ یہاں خارجی دنیا کے اندر خدا کا بنایا ہوا' قانون علت ومعلول (Cause & Effect) ہے' اُس قانون کے مطابق اگر آپ علاج کراتے ہیں تو یہ خدا کے قانون کے مطابق' خدا کی ہدایت کے مطابق ہوگا' خدا کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق ہوگا ۔ اس سے مثلاً شفا ملتی ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے قوانین کی رو سے شفا عطا کی ہے' جو اُس نے خود بنائے تھے ۔ اور اگر آپ ان قوانین کو چھوڑ کر دم درود پہ اتر آتے ہیں تو یہ خدا کے بتائے ہوئے قاعدے کی خلاف ورزی ہے ۔

وہابی کی شرک سے بیزاری مگر تعویذ گنڈا جاری

یہ بات جو ہمارے ہاں وہابی کہتے ہیں کہ دوسروں سے مرادیں مانگنا' تعویذ گنڈے وغیرہ کرنا شرک ہیں تو یہ وہابی بھی رسماً یا اعتقاداً یہ بات کہہ دیتے ہیں ورنہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ اس اعتبار سے واقعی شرک ہے کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ تم یہاں جو کچھ کرو ہمارے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق کرو' خواہ وہ خارجی کائنات کے قوانین ہوں یا اقدار کے قوانین ہوں ۔ اگر آپ ان کے مطابق علاج کراتے ہیں تو یہ توحید ہے اور اگر ان قوانین کو چھوڑ کر آپ کسی اور طرف علاج کے لیے جاتے ہیں خواہ وہ کسی قبر پہ جائیں یا قبر والوں کی طرف جائیں تو یہ شرک ہے ۔ یہ ہیں شرک اور توحید کے معنی ۔ یہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ تمام قسم کے مختلف گوشوں سے اپنی نگاہ کو ہٹا کر' ناک کی سیدھ میں' منزلِ مقصود کی طرف چلے جانا ۔ اس کو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے توحید کہا ہے ۔ یہ ہے وہ چیز جو کہی ہے کہ اگر میں بیمار ہوتا ہوں' علاج بھی کراتا ہوں' تو میں اُس خدا کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق علاج کراؤں گا ۔ یہ وہابی تعویذ' گنڈے' دم درود' دوسروں سے مرادیں مانگنے کو تو شرک کہتے ہیں لیکن ان کے اپنے ہاں تعویذ لکھے جاتے ہیں' ان کے ہاں وظائف بتائے جاتے ہیں ۔ یعنی اُنہوں نے رسم ہی رہنے دی کہ قبر پہ جانا اور وہاں جا کے مانگنا شرک ہے جبکہ اپنے ہاں یہ ساری چیزیں جو قانون کے خلاف جاتی ہیں' یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن اسے شرک نہیں کہتے ۔ خدا کہتا [1] ہے کہ تم نے جمعہ کی نماز پڑھ لی ہو تو چلو' پھرو جاؤ اور اکتسابِ رزق کرو' روٹی کماؤ اور کھاؤ' ورنہ بھوکے مر جاؤ گے ۔ یہ خدا

---

[1] یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (62:9-10)

کا بتایا ہوا قانون ہے۔ اگر آپ یہ نہیں کرتے اور توقع پہ بیٹھ جاتے ہیں تو آپ خدا کے بتائے ہوئے قاعدے کے خلاف جاتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ مجھے اس طرح بیٹھے رہنے سے رزق ملے گا تو یہ شرک ہے۔ کیا عرض کروں کہ ہم نے کس کس گوشے میں یہ شرک پیدا کر رکھا ہے!

انسانی کوتاہیوں کا علاج بھی قانون کے مطابق حسنات سے ہوگا

عزیزانِ من! اب آگے ہے کہ **وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓــَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ** [1] (26:82) انسان ہوں' بھول چوک ہو ہی جاتی ہے' عادتاً تو کوئی جرم نہیں کرتا' خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس صورت میں مجھے اس خدا سے توقع ہے کہ وہ اس کے نقصان دہ نتائج سے میری حفاظت کرے گا۔ حفاظت یہ نہیں ہے کہ خدا خود آ کر کہیں چھتری تان دے گا۔ اُس نے تو خود بتایا ہے کہ بھول چوک سے بھی اگر کوئی اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں تو ان کے نقصان دہ اثرات سے محفوظ رہنے کا خدا نے اصول بتا دیا ہے کہ **اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) اُس سے جو نقصان ہوتا ہے اُس سے زیادہ اچھا کوئی منفعت بخش کام کرو۔ اس سے اس نقصان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ جو کہا ہے کہ مجھے توقع ہے کہ اگر بھول چوک سے مجھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس کے نقصان سے وہ میری حفاظت کرے گا' تو یہ نہیں ہے کہ وہ براہِ راست حفاظت کر کے نقصان کی تلافی کر دے گا۔ اس کا طریقہ اُس نے بتایا ہے کہ پھر قانون یہ ہے کہ جہاں کہیں ایسی غلطی ہوگئی ہو کہ اس کا نقصان ہونا ہے تو اُس سے زیادہ اچھا منفعت بخش کام کرو' وہ اس کی تلافی بھی کر دے گا یعنی وہ گڑھا بھی پورا کر دے گا اور پانی آگے بھی چلا جائے گا۔ یہ ہے جو اُنہوں نے کہا ہے کہ مجھے توقع ہے کہ اگر کوئی خطا بھی ہو جائے تو اس کا قانون مجھے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھے گا۔ یہاں قرآن نے خطا کہا ہے' جرم نہیں کہا۔ **رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ** (26:83) چاہتا یہ ہوں کہ میرا نشوونما دینے والا مجھے لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات میں حق کے ساتھ قوتِ فیصلہ دے' مملکت دے اور ان لوگوں کے زمرے میں شامل کرے جن کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو چکی ہو۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی نسل میں ملکِ عظیم عطا کیا تھا۔

ایک نبی کی مملکت اور نمرود کی مملکت میں بنیادی فرق ہوتا ہے

جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ یہ انبیائے کرام محض وعظ کہنے کے لیے نہیں آیا کرتے تھے۔ ان کو ملکِ عظیم عطا کیا گیا تھا۔ قرآن

---

[1] اسی خدا سے میں اس کی امید رکھتا ہوں کہ مجھ سے کبھی کوئی بھول چوک ہو جائے تو وہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت اس کے مضر اثرات سے میری حفاظت کرے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 843)۔

کہتا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُم فِی الْاَرْضِ** (24:55) تمہارے ساتھ ہمارا وعدہ ہے کہ اگر تم ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ کرو تو ہم اس دنیا میں تمہیں مملکت' خلافت اور حکومت عطا کریں گے۔ حضرتِ ابراہیمؑ کی ذریت میں ملکِ عظیم عطا کیا گیا۔ یہ ہے وہ جو دعا مانگی یا آرزو کا اظہار کیا۔حکومت اور مملکت تو نمرود❶ کو بھی ملی ہوئی تھی۔اگر یہ بھی خالی مملکت ہی مانگتے تو دونوں میں کیا فرق تھا۔ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ **وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ** (26:83) وہ مملکت عطا کر اور اس کے ساتھ مجھے ان کے زمرے میں شامل کردے جو تیرے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق اس حکومت کو چلاتے ہیں۔ وہاں ہے کہ **وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (24:55) یہ شرط ہے کہ ہمواریاں پیدا کرنے والے کام ہوں' منفعتِ عامہ کے کام ہوں' اقدارِ خداوندی کے مطابق حکومت چلانے کا مسلک ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک فکرانگیز دعا

یہ دعا ہے کہ **وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ** (26:84) میری زندگی ایسی گزرے کہ میرے ہمعصر تو ایک طرف رہے' میرے بعد آنے والے بھی' جب میرا نام لیں تو وہ نیکی سے لیں' ایسی زندگی عطا کردے کہ اس کے بعد بھی میرے جو اسلاف باقی رہیں' وہ بھی بھلائی کے ساتھ میرا نام لیں۔آپ اسوۂ ابراہیمیؑ دیکھتے چلے جاتے ہیں کہ کیا تھا۔**وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ** (26:85) اوراس کے بعد اس دنیا کے اندر بھی اس قسم کی خوشگواریوں کی زندگی عطا فرما کہ ساری نعما' آسائشیں' نعمتیں بھی عطا ہوں۔مرنے کے بعد تو ہمارا اُس جنت پہ ایمان ہے۔عزیزانِ من! یہ دونوں زندگیوں کی جنتیں اور جہنمیں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے مشرک باپ کو صحیح راستے کی طرف راغب کرنے کی کوشش

اب قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوشش کا ذکر کیا ہے جس میں آپ علیہ السلام اپنے مشرک باپ کو صحیح راستے کی طرف راغب کرتے ہیں۔کہا کہ **وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ** (26:86)۔اب یہ بڑی چیز آ گئی۔اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ میرے باپ کو بھی بخش دے جو بڑا گمراہ ہے۔اب یہاں سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ باپ تو مشرک تھا' بت پرست تھا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ خود باپ سے کہہ رہے ہیں کہ بت پرستی کیوں کررہا ہے' خود کہہ رہے ہیں کہ وہ تو گمراہ ہے اور اُس کے بعد پھر مغفرت کی دعا مانگ رہے ہیں۔مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ مشرک کے لیے دعائے مغفرت جائز ہے یا نہیں؟ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت

---

❷ نمرود کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ النور' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص ص۔216 (فٹ نوٹ 3)

وہ غلط راستے پہ چل رہا ہے' تباہ ہو جائے گا' میں چاہتا ہوں کہ ایسی صورت ہو کہ وہ غلط راستہ چھوڑ دے اور صحیح راستے پہ آ جائے تا کہ تباہیوں سے بچ جائے تو اس میں کونسا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے کوشش کی ہے کہ باپ صحیح راستے پر آ جائے' انتہائی کوشش کی ہے۔ باپ ہی نہیں جو کوئی بھی گمراہی پہ ہو تو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اُس راستے کو چھوڑ دے اور صحیح راستے پہ آ جائے تا کہ بچ جائے۔

عزیزانِ من! یہ دعائے مغفرت' استغفار وغیرہ کے الفاظ قرآن میں نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ یہ رہے ہیں کہ اس وقت وہ غلط راستے پہ چل رہا ہے اور تباہ ہو جائے گا۔ میں چاہتا یہ ہوں کہ وہ اس راستے کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لے تا کہ اس سے بچ جائے۔ وہ کوشش کرتے رہے اور آخر میں جب دیکھ لیا کہ وہ صحیح راستے کی طرف نہیں آتا تو کیا اُس کے بعد بھی حضرتِ ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے رہے کہ وہ شرک کرتا ہے تو کرنے دیجئے' آپ اُسے جہنم میں نہ پھینک دیجیے۔ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ دو مقام سامنے رکھیے: ایک میں تو یہ ہے کہ بات تو یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلک غلط ہے جس پہ تم چلے آ رہے ہو' اس کو چھوڑ دو' یہ حماقت ہے' جہالت ہے کہ اپنے ہاتھ سے مورتی بناتے ہو اور اُسے خدا تسلیم کرتے ہو۔ قرآنِ کریم کے کئی ایک مقامات میں ہے کہ پہلے حضرتِ ابراہیمؑ بڑے حلیم تھے لیکن حلیم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخر تک یہی کیفیت ہو بلکہ اُنہوں نے بڑی سختی سے بھی کہا۔ ایسی سختی سے کہا کہ باپ نے کہا کہ اگر تم نے زبان بند نہ کی تو یاد رکھو! میں تمہیں مروا دونگا' سنگسار کروا دونگا' وطن بدر کروا دونگا۔ یعنی یہاں تک آ گئے کہ اُنہوں نے باپ کو سختی سے بھی کہا۔ باپ نے کہا کہ **قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ** (19:46) ابراہیم! تو باز نہیں آتا' تو یہی چاہتا ہے' یہی کوشش کرتا ہے کہ میں اپنے معبودوں کے خلاف ہو جاؤں' سن رکھو کہ **لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِیْ مَلِیًّا**(19:46) اگر تو باز نہ آیا تو میں تمہیں سنگسار کرا دونگا۔ چلا جا میری آنکھوں کے سامنے سے' نکل جا یہاں سے' چھوڑ دے اس گھر کو۔ **قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ** (19:47) کہا: ابا جان! آپ جذبات میں آ گئے' بات سمجھ نہیں رہے جو میں کہہ رہا ہوں' اس کے باوجود میں آپ کے غصے کے جواب میں غصہ نہیں کرونگا' میں یہی کہونگا کہ اللہ تمہیں تباہی سے بچائے۔

ہمارے ہاں لفظ ''استغفار'' کے غلط ترجمے کے اثرات

قرآنِ کریم نے ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ کہے ہیں کہ **سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ**(19:47) ۔اس کا ترجمہ ہمارے ہاں یہ کرتے ہیں کہ میں آپ کے لیے دعائے استغفار کرتا رہونگا۔ دعا کرنے کے یہ معنی غلط ہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ میں اس کے باوجود

کوشش کرتا رہونگا کہ خدا آپ کو صحیح راستہ دکھا دے' آپ اس تباہی سے بچ جائیں۔ اب یہ چیز جو (19:46-47) میں ہے' اس کے متعلق ہمارے ہاں یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے وعدہ کرلیا تھا کہ میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہونگا۔ چونکہ انہوں نے وعدہ کرلیا تھا اس لیے وہ خواہ آخر تک بت پرست کا بت پرست ہی کیوں نہ رہا لیکن یہ وعدے کے ایفا کے مطابق مغفرت کی دعا کرتے رہے۔ میں نے کہا ہے کہ ایک لفظ کے غلط ترجمے نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے تصریفِ آیات کو قرآن کے سمجھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آرزو تھی کہ **وَ مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّ عَدَهَاۤ اِيَّاهُ** (9:114) خدا ان کے باپ کو اس تباہی سے بچا دے جو اس کی غلط روش کی بنا پر اس کے سامنے آنے والی ہے۔ وہ اس بنا پر تھا کہ اُنہوں نے باپ سے کہا تھا کہ آپ اس بات پر اتنے غصے میں آ گئے ہیں تو کوئی بات نہیں ہے' میں کچھ انتقام نہیں لونگا' تم غلطی پہ ہو' جہالت پہ ہو اور میں یہی کوشش کرتا رہونگا کہ آپ سیدھے راستے پہ آ جائیں اور اس تباہی سے بچ جائیں۔ تو کہا کہ ابراہیمؑ کی جو کوشش تھی وہ اس بنا پر تھی۔ **فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ** (9:114) اور جب آخر الامر اُس نے دیکھ لیا کہ خدا کے خلاف اس کی عداوت بڑھتی چلی جا رہی ہے' اُس میں اور زیادہ محکم و مستحکم ہوتا چلا جا رہا ہے' واپسی کی کوئی امید ہی نہیں تو پھر انہوں نے اُس باپ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ اسوۂ ابراہیمیؑ تھا کہ جب تک تم خدائے واحد کے اوپر ایمان نہیں لے آؤ گے' تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی عداوت ہے۔ یہاں باپ سے بھی پہلے یہی کہا ہوا ہے' تو نظر آیا کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ مشرک کے لیے آخر تک دعائے مغفرت کرتے رہے کیونکہ وعدہ کر بیٹھے تھے۔ وہ یہ بات ہے کہ وہ اس کی کوشش کرتے رہے کہ وہ صحیح راستے پہ آ جائیں۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ صحیح راستے کی طرف نہیں آ رہے ہیں تو پھر وہ مقام آ گیا' جہاں کہا جاتا ہے کہ **لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ** [1] (109:6) ۔ جب اُنہوں نے دیکھ لیا: **فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ** (9:114) قیاس سے نہیں' محض اندازے سے نہیں بلکہ جب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ **اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ** (9:114) وہ خدا کا بدترین دشمن ہے اور عداوت میں بڑھتا چلا جا رہا ہے' اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے تو پھر **تَبَرَّاَ مِنْهُ** (9:114) اُنہوں نے اُس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

---

[1] تمہارا پروگرام الگ ہے' میرا پروگرام الگ۔ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو' مجھے اپنے پروگرام پر چلنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1491)۔

تمنا کی برومندی کے لیے الفاظ لب پر دعا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں

عزیزانِ من! یہ اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام ہمارے سامنے آیا۔ اس لیے یہ جو ہے کہ وہ آخر تک دعا کرتے رہے تو یہ بات غلط ہے۔ جسے آپ استغفار کہتے ہیں، وہ یہ بات نہیں ہے۔ اگر آپ نے واقعی کسی کو راہِ راست پہ لانے کے لیے کچھ کرنا ہے تو اُس کے لیے کوشش کیجیے۔ وہ کوشش خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ اگلی بات یہ ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے قلبِ سلیم کی آرزوئیں ہیں جو دعا کے الفاظ میں لب پہ آجاتی ہیں:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری ❶

عزیزانِ من! دعا یہ ہوتی ہے۔ شدتِ آرزو جب زبان پہ آجاتی ہے تو وہ دعا الفاظ کے ذریعے آتی ہے۔

روزِ قیامت کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی دعا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یہ ہے کہ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ❷ (26:87)۔ وہ جو کہا تھا کہ اگر کوئی خطا یا لغزش ہو جائے تو اُس کے نقصان دہ نتائج سے میری حفاظت کرنا، اس کے لیے کہا تھا کہ اگر ایسی صورت ہو تو میں ایسے اچھے کام کروں تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ اب یہاں کہا ہے کہ اس کے باوجود اگر ایسی صورت نہ ہو، ایسی خطائیں آگے جا کر بھی ساتھ چلیں، تو جب قیامت کے دن وہ میزان میں تُلیں تو پھر یہ نہیں کہا کہ اُس کی سزا نہ دینا کیونکہ وہ تو قانونِ مکافات ہے، یہ نہیں کہا کہ ان کی سزا نہ ملے کیونکہ تیرا قانون تو عدل کا ہے، سزا تو ملے لیکن مجھے وہاں رسوا نہ کیا جائے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔

آج کا دور تکریمِ آدمیت کی اہمیت سے نابلد واقع ہوا ہے

قرآنِ کریم کی بنیادی چیز، جسے آپ انسانیت کا بنیادی حق کہتے ہیں، یہ ہے کہ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر انسانی بچے کو انسانی بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ جہاں جس گوشے، جس انداز، جس نظریئے سے بھی کسی انسان کی تذلیل ہوتی ہو تو وہ خدا کے اس وعدے کے خلاف چیلنج ہو سکتا ہے۔ وہ خدا کے خلاف کھڑا ہو جائے گا کہ تو نے اسے واجب التکریم پیدا کیا ہے، میں اسے ذلیل کرتا ہوں۔ یہ خدا کے خلاف خدا بننے کا دعویٰ ہے۔ یہ چھوٹی چیز نہیں ہے، عزیزانِ من! یہ اس انسان کے لیے نہیں ہے کہ صاحب! اس کی تذلیل تم نے کی ہے۔ یعنی خدا یہ کہتا ہے کہ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ (17:70) کوئی

---

❶ لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری (اقبالؒ: بانگِ درا)

❷ اور جب لوگ، ظہورِ نتائج کے وقت اٹھائے جائیں، تو اس وقت میری رسوائی نہ ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔843)۔

اس میں استثنا نہیں ہے' بنی آدم محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ جو اعمال وافعال ہیں' وہ کچھ چیزیں ہیں' وہ اس کی اضافی ہیں۔ٹھیک ہے قانون کی رو سے سزا دینی ہے' سزا دیجیے۔قرآن کی رو سے جرم کرنے والا مجرم ہے۔ جرم اس کا قابلِ نفرت ہوتا ہے۔اس کے باوجود وہ انسان رہتا ہے۔ وہ انسانیت کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا اور انسانیت کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کا تکریم کا عنصر ہو۔ جہاں انسانیت کی تذلیل ہوگی' عزیزانِ من! خواہ وہ ایک کافر ہی کیوں نہ ہو' یہ خدا کے اس فیصلے کے خلاف علی الرغم چیلنج ہوگی: تو نے اسے واجب التکریم پیدا کیا ہے' دیکھ ہم اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ اس کی اہمیت آج ہمارے تصور میں بھی نہیں آسکتی ۔جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' ہماری قوم یا ہمارے کردار' ہم سب اس میں شامل ہیں۔ دوسرے کو ذلیل کر کے خوش ہونا یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔جو شخص بھی دوسرے کو ذلیل کرتا ہے وہ ذلیل کرنے کے بعد اپنے آپ کو بڑا قابلِ فخر سمجھتا ہے' اونچا سمجھتا ہے' اس سے بڑا خوش ہوتا ہے۔

دوسروں کو ذلیل کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت

آپ دیکھیے گا کہ اس کے اندر ایک یہ پہلو ہے کہ دوسرے کو ذلیل کرنے والا اس کی ذلت سے خوشی محسوس کرتا ہے' فخر محسوس کرتا ہے' بڑائی محسوس کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی مرض ہے ۔ ہمارے جیسی قومیں جن کا کوئی کام قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتا' وہ مجموعی طور پر اس نفسیاتی مرض کا شکار ہوجاتی ہیں۔ ان کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اب یہ نہیں ہوتا کہ انتقام لینے کا Object (نشانہ) کونسا ہے؟ جو بھی ایسا Object (نشانہ) سامنے آجائے' مثلاً جو بھی غریب' ناتواں' بے کس ان کے قابو آجائے' پھر کسی طرح سے اس کو جھنجھوڑ کے' ذلیل کر کے' وہ جو اس کی اپنی انا (Ego) کے اندر خلا پیدا ہوگیا ہوتا ہے' اس کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ہے نفسیاتی مرض۔

کشادہ ظرفی قلب ونظر کی فراخ دلی سے پیدا ہوتی ہے

جن قوموں کے کاروبار قانون قاعدے کے مطابق ہو رہے ہوں' نہ وہ کسی کے محتاج ہوں' نہ اس طرح سے استبداد کا شکار ہوں' ان کے قلب میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے اوپر انتقام لینے کے لیے نہیں تلے ہوتے' وہ دوسرے کو ذلیل کر کے خوش نہیں ہوتے لیکن یہ نفسیاتی مرض دوسرے کو ذلیل کر کے خوش ہونے والی چیز ہے ۔ یہ چیز مومن کے تو پاس بھی نہیں آتی۔

تکریمِ آدمیت کے متعلق حضرت عمر فاروقؓ کے دور کی ایک سبق آموز مثال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت (45/644-634ء) میں ایک حاکم تھے۔اس دور میں مملکت میں ذمی بھی ہوتے تھے۔ذمی غیر مسلم رعایا کو کہتے ہیں۔ایک دن کوئی بات ہوئی تو کسی شخص کے متعلق ان کے منہ سے غصے میں نکل گیا کہ اللہ تمہیں ذلیل کرے۔ دوسرے دن وہاں سے اٹھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ (45/644-581ء) کے پاس آ گئے اور استعفٰی پیش کر دیا۔کہا کہ میں حاکم بننے کے قابل نہیں ہوں۔کہا: کیا ہوا؟ کہنے لگے: میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں نے ایک انسان کو کہہ دیا کہ خدا تجھے ذلیل کرے۔میں اس کے قابل نہیں ہوں۔اس جرم کی تو جو سزا آپ دینا چاہتے ہیں' دیجیے لیکن میں اس منصب کے قابل نہیں۔میں اسلامی مملکت میں کسی منصب کے بھی قابل نہیں ہوں۔اس لیے کہ ہمارا بنیادی فریضہ تو انسانیت کی تکریم کو بحال کرنا ہے' انسانیت کی تکریم کے خلاف میں اگر کہتا ہوں کہ خدا تجھے رسوا کرے تو میں کس طرح اس منصب کا حقدار ہو سکتا ہوں۔بہتیرا کہتے رہے کہ یہ نہ کرو مگر وہ نہیں مانے۔ کہنے لگے: نہیں میں اس قابل نہیں۔یہ ہے اس کی اہمیت' عزیزانِ من! یہ تو عرب کا ایک محاورہ ہوتا ہے' یہ وہاں گالی بھی نہیں گنی جاتی۔کہنے لگے: میں اس منصب کے قابل نہیں۔یہ ہے' عزیزانِ من! تکریمِ انسانیت کی اہمیت قرآنی اقدار کی رو سے [1]۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

تو بادشاہ ہے' میں ایک فقیر۔تیرا میرا مقابلہ کیا ہے!

روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

جہاں میرے جرائم سامنے ہوں تو میں ان کے لیے جو عذر پیش کروں' اس کو قبول کر لینا۔

یا اگر بینی حسابم ناگزیر

لیکن اگر وہاں جو میرے یہ عذر ہیں' قابلِ معافی نہ سمجھے جائیں' تو حساب ضرور لینا' حساب دینا ہو تو

از نگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پنہاں بگیر

---

[1] یہ یاد رہے کہ انسانی ذات کی نشوونما صرف معاشرہ کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔اسی وجہ سے معاشرہ کی قدر و قیمت ہے' اگر معاشرہ کسی وقت فرد سے بڑھ کر قدر و قیمت اختیار کر لیتا ہے' (It assumes higher values than the Individual) تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں رہتا' طاغوتی نظام بن جاتا ہے جس کا مٹانا ہر اس شخص کا فرض ہو جاتا ہے جو شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت' تکریم انسانیت' کا احساس رکھتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نگاہوں سے پنہاں ہی میرا حساب لینا' انؐ کے سامنے نہ لینا۔میں ان کی نگاہوں میں شرمسار نہیں ہونا چاہتا' کیونکہ میری جگہ وہ شرمسار ہو جائیں گے کہ میرا اُمتی یہ کچھ کرتا ہے۔امتِ محمدیہ ﷺ کے ہم داعی ہیں' نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قائم کرنے کے مدعی ہیں' اور کیفیت یہ ہے کہ انہی میں کے ایک کا قول ہے کہ اگر آج کہیں انہیں رسول کا جانشین نہ بتایا جائے تو کبھی نہ یہ سمجھ سکیں کہ یہ مسلمانوں کی قومِ مسلمان ہے۔

روزِ محشر انسان کے ساتھ سوائے قلبِ سلیم کے کچھ نہیں جائے گا

قرآن یہ کہتا ہے کہ **لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ** (26:88) خدا کے قانونِ مکافات کے سامنے یہاں کا مال و دولت' بیوی بچے' کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہاں تو ایک ہی چیز ہے' جسے لے کر تو جائے گا اور پیش کرے گا؟ وہ ہے **اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ** (26:89) ایک قلبِ سلیم لے کر جائے گا۔ یہ قلب سلیم قرآنِ کریم میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں آیا ہے۔ یہ بات دو مقامات پہ آئی ہے۔ یہ قلبِ سلیم خود ہی جھک جانے والا نہیں ہے۔ یہ تو خدا کے احکام کے سامنے' اس کی اقدار کے سامنے' دل کا جھک جانا ہے اور اصل جھکنا تو دل ہی کا جھکنا ہے ورنہ یہ ہمارے ہاں کے رکوع اور سجدے جو ہم Mechanically (میکانکی طور پر) جا کر کرتے ہیں' اگر اس سے آگے بات چلی جائے تو آگے جو کہا ہے کہ یہ اگر اس لیے کرتا ہے کہ اس کے بدلے میں خدا مجھے جنت دیدے تو وہ کہتا ہے کہ ''اے خدا! یہ سوداگری نہیں تو اللہ سے سودے بازی کر رہا ہے''۔عزیزانِ من! قلب سلیم [1] ہی اصل چیز ہے' یہ دل کا جھکاؤ ہے۔انسان سے لغزشیں نسیان سے ہو جاتی ہیں۔ جو جھکنے والا قلب ہے وہ ہے قلبِ سلیم اور اصل میں قلب کے جھکنے سے ہی اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یہی ہے قلب سلیم۔

جنت اور جہنم کی حقیقت اور ماہیت

وہ کونسا دن ہے جس کے متعلق آگے تفصیل آئی ہے؟ کہا ہے کہ **وَاُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ** (26:90)۔اگلی دو آیات میں دو تین باتیں ایسی اہم آ گئی ہیں' عزیزانِ من! ان کا مقام تو وہ تھا جسے میں حیاتِ آخرت کے متعلق جو قرآن نے تفاصیل دی ہیں' بیان کروں لیکن جہنم اور جنت کے متعلق جو قرآن نے کہا ہے' اب میں پھر اُسے دہرا دوں' بار بار یہ چیز سامنے آئی ہے۔مرنے کے بعد کا وہ سارا حساب کتاب ہے' جو جنت ہے' جہنم ہے' اس پہ ہمارا ایمان ہے: اس کے بغیر تو ہم مومن ہو ہی نہیں سکتے لیکن

---

[1] جو اپنے اختیار وارادہ' خواہشات اور آرزوؤں کو' قوانین خداوندی کے سامنے جھکا ہوا رکھے' جو ان قوانین سے کبھی سرکشی اختیار نہ کرے۔

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اس جہنم اور جنت اور مکافاتِ عمل اور اس کی جزا اور سزا کو قیامت پر اٹھا رکھا ہے' اس دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔ قرآن کی رو سے تو جنت بھی یہیں سے شروع ہوجاتی ہے' جہنم بھی یہیں سے شروع ہوجاتا ہے۔ زندگی تو خود ایک جوئے رواں ہے' اس کے اندر تسلسل ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک پودے میں بیج سے نکلنے کے بعد کونپل نہ پھوٹے اور اسے چھ مہینے کے بعد جسے آخرت کی جنت کہتے ہیں' میں لے آئیں اور وہ لہلہاتا ہوا خوشگوار پودا بن گیا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ **وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى**(17:72) یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہاں بھی قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے معاشرہ جنتی بن سکتا ہے اور یہاں اس کی خلاف ورزی کرنے سے جہنم کا عذاب طاری ہوتا ہے۔ سنیے الفاظ! قرآن کے کتنے پیارے الفاظ ہیں: **وَاُزۡلِفَتِ الۡجَـنَّةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ** (26:90) وہاں جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی یعنی آج ذرا دور ہٹی ہوئی ہے' وہ ان کے قریب کردی جائے گی۔ جہنم کے متعلق جو آیا ہے' وہ ذرا زیادہ اہم ہے۔ اس لیے ہے کہ ہم خود جہنم کے اندر ہیں' لیکن جہنم کو دیکھ نہیں سکتے۔ کہا ہے کہ **وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ لِلۡغٰوِيۡنَ** (26:91) غلط کاروں کے سامنے جہنم نمودار ہوجائے گا' جہنم کو ابھار کر ان کے سامنے لے آئے گا' جہنم برزت یعنی بارز ہوجائے گا۔ مستور اور بارز دو چیزیں ہیں۔ ایک Potential ہوتا ہے' وہ ہوجاتا ہے جہنم' جو آج موجود ہے لیکن وہ غیر مرئی ہے' غیر محسوس ہے' تم اس کو دیکھتے نہیں ہو' اس دن یہ صورت ہوگی کہ وہ اس طرح نمایاں طور پہ سامنے آجائے گا کہ اندھا بھی اُس کو دیکھے گا۔ اب یہ چیز کہ وہ جہنم یہاں موجود ہے' قرآن نے کئی مقامات میں جہنم کے متعلق یہ کہا ہے کہ **وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ** (82:16) تم تو آج کی جہنم کو نہیں دیکھ رہے' وہ جہنم تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

غلط نظام کے تباہ کن نتائج غیر مرئی شکل میں ساتھ ساتھ مرتب ہو رہے ہوتے ہیں

آپ دیکھیے کہ غلط نظام کے اندر' جو تباہیاں' اس کے عواقب میں' اس کے نتائج میں' آرہی ہوتی ہیں' وہ اس وقت بھی مرتب ہو رہی ہوتی ہیں' اسے یوں کہیے کہ جہنم اس وقت ان کو دیکھ رہا ہوتا ہے' یہ کمبخت اُسے نہیں دیکھ رہے۔ کیا بات ہے قرآن کی کہ وہ تو آج بھی تمہیں دیکھ رہا ہے اور **وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ** (82:16) تم اس جہنم کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہو' تمہاری آنکھیں بند ہیں جو تم اس کو نہیں دیکھ رہے۔ کہا کہ ہم بس اتنا ہی کریں گے کہ اسے ابھار کر تمہارے سامنے لے آئیں گے۔ دوسری جگہ ہے کہ جسے جہنم کہا ہے' تم اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو' وہ تمہیں دیکھ رہا ہے' دیکھ ہی نہیں رہا بلکہ کیفیت یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جو معاشرہ کا غلط نظام ہو' اس نظام کی غلط کوشیوں کے جو نتائج آرہے ہوتے ہیں' وہ غیر محسوس طور پر' غیر مرئی طور پر' مرتب ہو رہے ہوتے ہیں اس

کے لیے الفاظ ہیں کہ **یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ** (29:54) وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم غلط کام کر رہے ہیں تو عذاب کیوں نہیں آ جاتا۔ کہا کہ **وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ** (29:54) ان کم بختوں کو پتہ نہیں کہ وہ تو ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ ابھی غیر محسوس ہے' یہ دیکھ نہیں رہے ہیں' آج یہاں اس دنیا میں جہنم انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ انہی کا ذکر ہو رہا ہے' اسی دنیا والے ہیں جو **یَسْتَعْجِلُوْنَکَ** (29:54) تم سے بار بار تقاضا کر رہے ہیں کہ اس عذاب کو لاتے کیوں نہیں ہو' اتنی دھمکیاں دے رہے ہو تو یہ اسی دنیا کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس دنیا میں ہی کہا جا رہا ہے کہ **وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ** (29:54) وہ تم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ نہیں' یہاں نہیں وہاں جا کر ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ ان کو جو عذاب کی جلدی کر رہے ہیں' چاروں طرف سے جہنم گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ گھیرے ہوئے تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت جب غلط نظام' غلط کوشیوں کے محسوس نتائج' تباہی بن کر سامنے آ جاتے ہیں تو اُسے کہا کہ جہنم جو پہلے مستور تھا' پوشیدہ تھا' وہ اب بارز ہو جاتا ہے' نمایاں طور پہ سامنے آ جاتا ہے لیکن اُس وقت بھی ایک بات کہی کہ یہ نمایاں تو ہوتا ہے' مگر وہ کون لوگ ہیں جن کے سامنے یہ نمایاں بھی ہو گیا' ان کے سامنے کھل کر بھی آ گیا؟ وہ ہیں صرف دیدۂ بینا یعنی وہ جن میں حقائق کے مشاہدہ کی صلاحیت ہے **وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى** (79:36) یہ ابھار کر بھی ہم ان کے سامنے لے آئیں گے مگر اس کی ایک شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شرط کیا ہے؟

کیا آج پوری نوع انسانی چاروں طرف سے جہنم میں نہیں گھری ہوئی؟

وہ شرط یہ ہے کہ یہ ان کو نظر آئے گا جو آنکھیں کھول کر دیکھیں گے۔ اُس وقت بھی جو آنکھیں بند کر لے گا' سامنے آیا ہوا جہنم بھی اُس کم بخت کو نظر نہیں آئے گا۔ وہ کسی دوسری طرف نگاہوں کو دوڑائے گا کہ اس کی وجہ سے ہوا۔ وہ بارز جہنم بھی کہتا ہے' مستور جہنم تو خیر نظر نہیں آتا۔ جو بارز جہنم ہے وہ بھی اُسی کو نظر آتا ہے جو آنکھیں کھولتا ہے۔ دیکھیے تو عزیزانِ من! جہنم چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے' بارز ہو کے سامنے آ گیا ہوا ہے' اکثریت وہ ہے کہ اس کے باوجود ان کو یہ جہنم نظر نہیں آتا۔ قرآن ہے' عزیزانِ من! بارز چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ بھی "**لمن یرٰی**" ہے یعنی اسی کو نظر آئے گا جو اسے آنکھیں کھول کر دیکھے گا' اس سے وہ قوم بچ جاتی ہے جب وہ ابھی شروع ہی ہو تو اس وقت ہی آنکھیں کھول کے دیکھے کہ وہ آ رہا ہے تو بچاؤ کی صورت ہو جائے۔ جب وہ محیط ہو جائے تو اس وقت بھی یہ کہ اس نے ہمیں گھیر لیا ہے' حتیٰ کہ وہ بارز ہو کے سامنے آئے تو کم بخت اس وقت تو آنکھیں کھول کے دیکھ لیا جائے کہ یہ جہنم ہے۔ کہتا ہے کہ اُس وقت بھی انہیں نظر نہیں آتا' یہ صرف دیدۂ بینا کو نظر آتا ہے۔

اقبالؒ کی نظر میں ایک واعظ کا وعظ

کیا خوب کہہ گیا ہے اقبالؒ (1938-1877ء):

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

واعظ جو دوسرے کو کافر بنا بنا کر خوش ہو ہو کر جہنم کی باتیں کر رہا ہوتا ہے' اس کو کبھی وعظ کرتے دیکھو۔ کہتا ہے کہ تباہی ہے' عذاب ہے' اور پھر جب اس میں وہ ڈالا جاتا ہے تو ''کچی چیاں وٹ وٹ کے فیر او کہندااے''[1] قبر سے شروع کر دیتا ہے کہ وہاں بچھو ہونگے' بڑے بڑے سانپ ہونگے' مار مار کے سجا دیتے ہیں۔ وہ بات یہاں سے شروع کر دیتا ہے اور پھر جہنم کا تو جب بھی ان کے ہاں دیکھو تو یوں لگتا ہے کہ اس نے ''پُٹھا لٹکایا ہوا ہے''[2] خوش ہو ہو کے بیان کرتا ہے:

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت

واعظ جہنم کی بات کر رہا ہے اور کافر بنا رہا ہے۔

حدیثِ خوشتر ازوے کافرے گفت

مجلس میں ایک کافر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے ایک بات کی جو اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات تھی' دلچسپ ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بات تھی۔ اُس نے کہا:

نداند آں غلام احوالِ خود را

یہ کم بخت خود اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا :

کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت

کہ دوزخ کو دوسروں کا مقام بتا رہا ہے۔ کم بخت اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا۔

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

---

[1] غصے میں دانت پیس پیس کر پھر وہ کہتا ہے۔

[2] الٹا لٹکایا ہوا ہے۔

بڑی لمبی باتیں کرتا ہے کہ قیامت میں میزان کھڑی ہوگی' اعمال نامہ آئے گا یہ سب کچھ ہوگا۔

ہزار حیف نہ بنی قیامتِ موجود

جو قیامت اس وقت موجود ہے اس کو نہیں دیکھ رہا۔ کہا کہ یہی وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (79:36) ہے۔ جہنم کو ابھار کے سامنے لے آئے گا لیکن قرآن نے کہا ہے کہ یہ جہنم بھی اُسے ہی نظر آئے گا جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا۔ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ o مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ (26:92-93) جب وہ جہنم چاروں طرف سے تباہیاں لا چکے گا پھر وہ پوچھے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ صاحب! ان کی بڑی قوت ہے' بڑا اقتدار ہے؟ کہاں ہے وہ' ذرا بتاؤ تو سہی!

جہنم میں جہنمیوں کے باہمی معاملہ کی روداد

اس جہنم کے متعلق' عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں دوسری جگہ بڑی اہم بات کہی ہے کہ اُس عذاب سے محفوظ رہنے کی کچھ تدبیر کرلو کہ جب وہ آیا کرتا ہے تو وہ صرف ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتا' وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ کہا کہ اُس وقت تم سے پوچھا جائے گا کہ کہاں ہیں' وہ جو دعوے کیا کرتے تھے کہ ہم تمہیں بچائیں گے؟ کہا کہ ان سے پوچھو کہ آج وہ خود بھی اپنے آپ کو اس عذاب سے نہیں بچا سکتے' دوسرے کی مدد تو بہت بڑی بات ہے۔ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ❶ (26:94)۔ کسی کو اوندھے منہ الٹا دینا' یہ ہے عذاب۔ یہ وہ جس کو 'الٹا لٹکا دیتے ہیں' کہتے ہیں۔ کہا کہ اس دن عوام اور ان کے گمراہ کرنے والوں' ان کے پیچھے چلنے والوں' کو ''اوندھے منہ' جہنم رسید کر دیا جائے گا''۔ آپ حیران ہونگے کہ قرآن نے پانچ سات مقامات پہ جہنم میں لیڈروں کا اور ان کے پیچھے چلنے والے Followers (پیروکاروں) کا مکالمہ بتایا ہے اور یہ بڑے ہی عبرت آموز مقامات ہیں۔ وہ آپس میں مکالمے کرتے ہیں۔ وہ اُن کو الزام دیتے ہیں' یہ اِن کو الزام دیتے ہیں کہ تم نے تباہ کرایا تھا۔ یہ مقامات آئیں گے تو میں قرآن کی آیات لاؤنگا۔ یہ اُن سے کہتے ہیں کہ کم بختو! ہمارے پاس کونسی طاقت تھی' تمہاری تو طاقت تھی جس کی بنا پہ ہم نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ تم ہماری طاقت ہمارے ہی خلاف استعمال کرتے رہے۔ وہ مکالمے بڑے عجیب ہیں جو قرآن لکھتا ہے۔ اِس کو بھی انہوں نے وہیں پہ اٹھا رکھا ہے کہ وہ اُس جہنم میں جا کر ہوگا۔ آج کے قانون کے مطابق ہر روز ہمارے سامنے وہ مکالمے اخباروں میں آتے ہیں۔

---

❶ سو اس دن' عوام اور ان کے گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں اور لیڈروں کو' اوندھے منہ' جہنم رسید کر دیا جائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔844)۔

ابلیس کا کردار پراپیگنڈا کے زور پر بڑا کارگر ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَجُنُوْدُ اِبْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ (26:95) ان کے سارے لاؤلشکر کو لاؤ۔ آپ کو معلوم ہے کہ ابلیس کے متعلق قرآن نے جو کہا ہے کہ وہ کرتا کیا ہے؟ کہتا ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ پراپیگنڈے کے ذریعے سے تباہ کرتا ہے۔ یہ سارے آپ کے ہاں کے جو یہ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات ہیں' آپ کو پتہ ہے کہ ابلیس کا پہلا ذریعہ ہی یہ Source (منبع) ہوتا ہے۔ دوسرا ذریعہ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ (17:64) ہوتا ہے۔ یعنی دولت کے اندر شرکت کر لیتا ہے۔ اگلی چیز وہ یہ کرتا ہے کہ (17:64) ان کی اولاد کو تعلیم اس قسم کی دیتا ہے کہ وہ پیدائشی جہنمی اور جرائم پیشہ پیدا ہوں۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ وہاں جہنم میں وَجُنُوْدُ اِبْلِیْسَ (26:95) ابلیس ایک نہیں ہوتا' اس کے ساتھ لشکر ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہونگے۔ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ (26:96) وہ کہیں گے کہ جی! وہ اور ان کے یہ لیڈر اس وقت سرِ دست آپس میں جھگڑنے میں مصروف ہیں۔ جب آپس میں جھگڑ رہے ہیں تو ہماری بات تو بعد میں آئے گی۔

لیڈروں کی پیروی کرنے والوں کا اعتراف

کیا بات ہے جہنم کا نقشہ! کہا کہ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (26:97) جہاں تک ہماری بات ہے ہمیں اعتراف ہے کہ خدا کی قسم' واقعی ہم بھی گمراہ تھے۔ ہم صحیح راستے پر چلنے والے ہوتے تو گمراہ ہی کیوں ہوتے۔ گمراہ ہم ہوئے تھے۔ ہم نے کیا گمراہی کی تھی؟ سنیے! عزیزانِ من! قرآن کیا بات کہہ گیا ہے! ہماری غلطی' ہماری خطا' ہمارا جرم' ہماری گمراہی' یہ تھی کہ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (26:98) ہم نے تمہیں خدا کا درجہ دیدیا تھا۔ ہم اپنا ان داتا' رازق' سمجھتے تھے اور اس طرح تمہیں خدائے رب العالمین کا درجہ دیتے تھے۔ سیاسی دنیا کے اندر' ان کے احکام' ان کے اوپر چلتے ہیں ان پر کسی اور کا حکم نہیں' انہی کی Sovereignty ہے' اقتدارِ مطلق ہے' حالانکہ خدا کہتا ہے کہ اقتدارِ مطلق ہمارے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے' فائنل اتھارٹی ہم ہیں' ہمارے احکام ہیں' ہماری کتاب ہے۔ یہاں ہمارے ہاں اقتدارِ مطلق کہیں نہ کہیں کسی اتھارٹی پہ جا کر رک جاتا ہے۔ مذہب کی دنیا کے اندر آیئے۔ جہاں بھی کسی کے متعلق پوچھیے تو کہتے ہیں ''کہ شریعت کا یہ حکم ہے جی' فقہ کا یہ حکم ہے جی' فلاں امام نے یہ فرمایا ہے' فلاں نے فتویٰ یہ دیا ہے' مفتی صاحب کا ارشاد یہ آیا ہے'' یعنی یہاں آپ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی انسان پہ جا کر بات رک جائے گی اور اس کو احکامِ خداوندی کہہ کر منوایا جائے گا۔ یہ انسانوں کو خدا کے برابر درجہ دینا نہیں تو اور کیا ہے اور پھر قبروں پہ جا کر مرادیں مانگتے ہیں' قبروں پہ مرادیں مانگنا' ٹھیک ہے' شرک ہوتا ہے۔

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ایک لفظ **تُسَوِّیْکُمْ** آیا ہے انہیں خدا کا درجہ دیدیتے ہو خدا بنا لیتے ہو اور یہاں رب العٰلمین ہے سب ربوبیت آئی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کے ہاتھوں سے روٹی مل جائے گی۔ اس طرح تم رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اور لوگوں کی عقل وفکر کو ماؤف کر کے انہیں مجبور کر دیتے ہو کہ وہ تمہارے پیچھے چلیں **وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ** (26:99) تم سخت مجرم تھے جنہوں نے ہمیں اس طرح غلط راستوں پر ڈال دیا۔ تم دن رات چاروں طرف سے یورش کر کے آیا کرتے تھے اور ہمیں ان تصورات کے اندر پختہ تر کر دیتے تھے اس لیے ہم گمراہ ہیں۔ **فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ٥ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ** [1] (26:100-101)۔ آج غمخوار ہونا تو ایک طرف، وہ بھی اس عدالت کے کٹہرے میں ساتھ کھڑے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ مقام بھی آتا ہے کہ دوست اور حمیم، جس پہ اتنا بھروسہ ہوتا ہے، دوست رہنا تو ایک طرف، وہ بھی سامنے کٹہرے میں ساتھ کھڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کو کہا ہے کہ وہ ساتھ کھڑا ہونے والا نہیں بلکہ وہ فریقِ مخالف بن کر کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ وہاں کہیں گے کہ اب تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

زندگی کا ایک لمحہ بھی واپس نہیں پلٹ سکتا

کہا کہ **فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** (26:102) ایک دفعہ ہی سہی واپس بھیج دو" تے فیر ویکھ اسی اوہناں دا کردے کی ہیکے آں"[2]۔ ایک دفعہ واپس بھیج دو۔ قرآن میں یہ چیز ہے۔ آخرت کی زندگی کے متعلق بار بار وہ کہتے ہیں کہ کہا جائے گا کہ تمہیں وارننگ دیدی تھی، تنذیر دیدی تھی، بتا دیا تھا کہ زندگی کا یہ جو ٹائم کا دھارا ہے، آگے بڑھتا ہے یہ پیچھے نہیں چل سکتا۔ یہ جاتا ہی آگے ہے پیچھے نہیں جایا کرتا۔ اس لیے اس دنیا کے اندر واپسی نہیں ہو سکتی۔ وہاں زندگی یا تو اگلی منازلِ زندگی طے کرتی ہوئی بڑھتی جائے گی، وہ جنت ہے اور یا وہ زندگی رک جائے گی، وہاں سقوط ہو جائے گا، منجمد ہو جائے گی۔ یہ جہنم ہے، واپس نہیں جا سکتے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ Time repeats itself[3] یہ بات غلط ہے۔ زندگی اس طرح سے Repeat (دہرایا) نہیں کرتی۔ وہ یہی معنی ہیں

---

1. (آج پتہ چلا کہ جو تم کہا کرتے تھے کہ ہم تمہارے سچے غمخوار دوست ہیں، اور ہر مصیبت میں تمہارا ساتھ دیں گے، وہ کس قدر غلط تھا)۔ اب کوئی ایسا نہیں جو اس مصیبت میں ہمارے ساتھ کھڑا ہو اور نہ ہی کوئی غمخوار دوست ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص 844 تا 845)۔
2. تو پھر دیکھ کہ ہم ان کا کیا حلیہ بناتے ہیں۔
3. وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے۔

کہ جس قسم کا کوئی نظام قائم کرتی ہے' اُس کے مطابق اُس کے نتائج نکلتے ہیں۔ جب بھی وہ قائم کرے' آج کرے' آنے والے زمانوں میں کرے' لیکن زندگی کا یہ دھارا پیچھے کی طرف پلٹ جائے' یہ نہیں ہوسکتا۔

لفظ آیت کا قرآنی مفہوم

اس کے بعد کہا کہ **اِنَّ فِـــیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً**(26:103) جو کچھ ہم نے یہ بیان کیا ہے' اس میں حقیقت تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ آیت کا لفظ قرآن میں بڑا عجیب ہوتا ہے۔ یہ علامات ہوتی ہیں جن سے آدمی نتائج اخذ کر لیتا ہے جیسا کسی صحرا میں آپ جا رہے ہوں' دور دور تک پانی نظر نہ آتا ہو' کہیں کسی جگہ کوئی پرندہ' کوئی کبوتر' کوا' اڑتا ہوا نظر آئے' آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کے اردگرد کہیں پانی ہوگا۔ یہ جو اس طرح کہیں زندہ پرندہ اڑتا ہوا نظر آتا ہے عربی زبان میں اس کو آیت کہتے ہیں۔ پانی کے ملنے کی نشانی ایک ایسی چیز سے جس کا بظاہر پانی سے تعلق نہیں ہے۔ اسی لیے جہاں آیات کہا ہے' لقوم یعقلون کہا ہے' لقوم یتفکرون کہا ہے کہ غور اور فکر کرنے والی جو قوم ہے' اس کے لیے یہ چیز نشانی بنتی ہے' اُس تک پہنچتے ہیں۔ دور سے اگر آپ کو کہیں دھواں نظر آئے تو آپ دیکھیں گے کہ نیچے آگ ہے اور آگ ہے تو کوئی نہ کوئی انسان ضرور ہوگا کیونکہ حیوانات تو آگ جلا ہی نہیں سکتے۔ میں نے کہا ہے کہ اس کو عربی زبان میں آیت یعنی نشانی کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ واقعات نہیں ہیں' یہ کسی نتیجے تک پہنچنے کی علامات ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ **وَمَا كَـانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ** (26:103) ان علامات سے نتائج تک پہنچنے کے لیے غور وفکر کی ضرورت ہے اور انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی اکثریت غور وفکر سے کام نہیں لیتی۔ اس لیے اس قسم کی داستانیں' واقعات' تاریخی شواہد بیان کرنے کے باوجود یہ حقیقت تک نہیں پہنچتے اور صداقت کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے کہ اس کی اولین شرط یہ ہے کہ جو علامات جو نشانیاں ہیں ان سے حقیقت تک پہنچنا چاہیے۔

قرآنِ حکیم کی یہ بیان کردہ آیات حقیقت تک پہنچنے کے لیے نشانیاں ہیں

قرآن تاریخی شواہد بیان ہی اس لیے کرتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے' اگر اس کے صحیح ہونے میں تمہیں کچھ شبہ ہے' میں نے یہی کہا ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام اپنے لیے تجویز کیا' اختیار کیا' اُس کا نتیجہ تباہی ہے۔ تم بات نہیں مانتے تو جاؤ چلو پھرو' تمہیں راستے میں اممِ سابقہ کی برباد شدہ بستیوں کے کھنڈرات ملتے ہیں' آنکھیں کھول کر دیکھو' تو ان کھنڈرات

کی ایک ایک اینٹ کے اوپر ان کا مآل اور انجام لکھا ہوا ہے۔ یہ اپنے ہاں روزانہ قومِ لوط کی' قومِ عاد کی' قومِ ثمود کی' قومِ فرعون کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ پھر یہ ان شاہراہوں پر بھی جاتے تھے' ان سے اچھی طرح سے مانوس تھے۔اب سوال یہ ہے کہ یہ کیوں تباہ ہوئے؟ ہم نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں کا معاشی نظام ایسا تھا کہ رزق کے سرچشموں کے اوپر بڑے بڑے صاحبِ اقتدار نے اپنی ذاتی ملکیت بنا رکھی تھی' غریبوں کی بھیڑیں بھوک پیاس سے مر جاتی تھیں۔ان کو بار بار سمجھایا گیا' بار بار کہا گیا کہ بابا! یہ جو اس قسم کی طبقاتی کشمکش ہے' اس قسم کا جو امتیاز ہے اس کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے۔ روز روز یہ باتیں کرتے تھے لیکن ان باتوں میں سامری آ جاتا تھا۔ وہ حقیقت کی طرف آنے ہی نہیں دیتا' جونہی انہوں نے بات کی' اُنہوں نے کہا کہ وہ ناقۃ اللہ خدا کی اونٹنی ایک تھی' کہنے لگے: وہ خدا کی اونٹنی کیسی تھی؟ کہنے لگے: وہ ایک چٹان تھی' اُس چٹان پہ حضرت صالحؑ نے سوٹا مارا تھا تو اس میں پھر ایک اونٹنی نکلی تھی۔ وہ تھی اللہ کی اونٹنی۔ ان سے کہا کہ اُس نے تو کہا ہے کہ یہ **ناقة الله** (11:64) ہے۔**تاكل فى ارض الله** (11:64) یعنی یہ خدا کی زمین ہے اور یہ خدا کی اونٹنی ہے' نہ تیری نہ میری' نہ امیر کی نہ غریب کی' خدا کی اونٹنی خدا کی زمین' خدا کی زمین پہ خدا کی اونٹنی کو چرنے دو۔ ان کو کیا بتائیں' عزیزانِ من! جو یہ کہتے ہیں۔ یہ سامریت ہے:

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

وہ اونٹنی اگر چٹان میں سے نکلی تھی تو اس کے ساتھ تو خدا نے ارض اللہ کہا ہے' یہ ارض کس چٹان سے نکلی لیکن ''تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں''

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

یہ آیات **لقوم یعقلون' لقوم یوقنون' لقوم یتفکرون** ہیں: ان کے لیے آیات ہیں' تاکہ ان سے حقیقت تک پہنچیں۔ یہ ہے تاریخی شواہد بیان کرنے کا قرآن کا مقصد **وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ** (26:104) اور پھر تیرا رب' ایک تو رب ہے' عزیز ہے۔ عزیز کے معنی بڑی قوتوں والا' جو قانونِ مکافات ہے: یہ **اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ** [1] (85:12) ہے۔ پھر

---

[1] خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1434)۔

عزیز کے ساتھ رحیم بھی ہے' لیکن اگر اس روش سے باز آ یا جائے' اس روش کی بجائے دوسری روش اختیار کی جائے تو وہ رحیم بھی ہے۔ پھر اس صورت میں اس کی رحمتیں' اس کے سامانِ نعما' سامانِ آسائش' لوٹ کر' پلٹ کر' آ سکتے ہیں' ہمیشہ کے لیے مایوس نہیں ہو جانا چاہیے۔

سورۃ الشعرآء کی آیت 104 تک آ گئے' عزیزانِ من ! حضرتِ ابراہیمؑ کی داستان اس آیت پہ' کم از کم اس مقام' پہ ختم ہوئی۔ اگلے درس میں' ایک تو میں اسوۂ ابراہیمیؑ کے مختلف گوشے سامنے لا کر پیش کرونگا اور بتاونگا کہ ہم ان کا اتباع کس طرح سے کر رہے ہیں اور پھر اگلی داستان' اگلے نبی سے' شروع ہو جائے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

آٹھواں باب: سورۃ الشعرآء (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے اہم نکات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1978ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 105 سے ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے سابقہ درس میں یہ عرض کیا تھا کہ جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی داستانِ جلیلہ ختم ہوگی تو اس سلسلے میں ان کی زندگی کے قرآنِ کریم نے جو اہم نکات اور گوشے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں، میں ان کی کچھ مزید وضاحت کرونگا۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم نے تمام انبیائے کرامؑ کی زندگیوں کو پیش ہی اس لیے کیا ہے کہ یہ بتایا جاسکے کہ انہوں نے جس طرح احکام واصول واقدارِ خداوندی پر عمل کیا ہے وہ ایک محسوس شکل میں تاریخی شہادت کے طور پر ہمارے سامنے آجائے۔

یاد رکھیے! یہ جو اقدارِ خداوندی ہیں، یہ پہلے نبی سے آخری نبی تک وہی رہی ہیں۔ یہ غیر متبدل ہیں، ابدی ہیں، مگر ہر زمانے میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ان پر عمل کی شکلیں مختلف ہونگی۔ یہ چیزیں جو ہمارے سامنے بطور تاریخی شواہد آئیں گی، یہ ان کی عملی شکلیں ہوتی ہیں، اصولی اعتبار سے وہ سب ایک ہی ہیں۔ اسے موجودہ قانون کی اصطلاح میں یوں سمجھیے کہ ایک Substantial Law (قرار واقعی قانون) ہوتا ہے مثلاً قانون کے مطابق جرم ثابت ہو تو یہ سزا دی جائے اور ایک Procedural Law (ضابطے کا قانون) ہوتا ہے کہ وہ Procedure (ضابطے کا قانون) کیا ہے جس کے ماتحت یہ سارا کچھ طے ہو اور عدل کے مطابق انصاف کیا جائے۔ تو یہ عملی شکلیں Procedural Law (ضابطے کا قانون) ہے۔ یہ چیزیں تقاضوں کے اعتبار سے بدل سکتی ہیں۔ مثلاً ایمرجنسی کے زمانے میں ہوتا کیا ہے؟ وہ لمبا چوڑا (سرسری تعیناتی) عدالتوں کا جو عدل ہائے قانون کا سلسلہ ہے، اس کو سمٹا دیا جاتا ہے، مختصر کر دیا جاتا ہے۔ یہ جس کو Summary Post (سرسری تعیناتی) کہتے ہیں، یہ ان کی وہ سمٹی ہوئی شکل سمجھ لیجیے۔ اور جب حالات پھر معمول پہ آتے ہیں تو پھر ان کو پھیلا دیا جاتا ہے لیکن وہ جو بنیادی اساسی قانون ہے، Substantial Law (حقیقی قانون) ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قانون تو بدل سکتا ہے، آئین خداوندی نہیں بدلتا

وہ جو خدا کی طرف سے ہمیں آئین ملا ہوا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون تو چونکہ انسان بناتے ہیں اس لیے وہ ان کو بدلتے بھی رہتے ہیں۔ یہ جو حضرات انبیائے کرامؑ کی یا امم سابقہ کی داستانیں ہمارے سامنے آتی ہیں، اصل میں وہ ہمیں Procedural Law (ضابطے کا قانون) دیتی ہیں، قانون تو وہی تھا جو پہلے دن سے آیا اور وہ آخر تک رہا ہے۔ اس میں بھی بعض مقام ایسے اہم آجاتے ہیں کہ ان میں وہ جو Substantial Law (قرار واقعی قانون) ہے، وہ نمایاں طور پر جھلک کر، سامنے آجاتا ہے۔

ماں باپ کی اطاعت کو فرض قرار دے لیا گیا

کہا جاتا ہے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے، یہ بات بظاہر تو چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن یہ چھوٹی سی نہیں ہے۔ ساری دنیا کے مذاہب میں دیکھ لیجیے یا جن کو آپ Universal Ethics (عالمگیر ضوابط اخلاقیات) کہتے ہیں، انہیں دیکھ لیجیے۔ ان میں ماں باپ کی اطاعت کو بغیر استثنا کے ہر مقام پہ فرض قرار دیا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس کو ایسا مسلمہ مانا جاتا ہے کہ جس میں نہ کسی قسم کے فکر کی، نہ کسی قسم کے اعتراض کی کوئی گنجائش ہے اور پھر دیگر مذاہب میں اور اقوامِ سابقہ میں تو یہ بہت بڑی حد تک چلا گیا۔ اس کے لیے ہندوؤں کے ہاں رام کی زندگی کو بطور اسوہ پیش کیا جاتا ہے اور رامائن [1] تو ہے ہی یہ چیز۔

ہندوؤں کے ہاں رامائن کی کہانی کی سرگشت

آپ کو یاد ہے کہ جب سے بھی رامائن مرتب ہوئی ہے، اسے ہزار ہا [1] سال تو ہو گئے۔ وہ مقدس کتاب گنی جاتی ہے، بات اس

---

[1] ہندوؤں کے ہاں رامائن اور مہا بھارت بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے زمانہ تصنیف کی تعیین بھی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ پنڈت لیکھرام صاحب تاریخ دنیا میں مہا بھارت کی تصنیف کا زمانہ 310 ق م بتاتے ہیں اور رامائن کو آٹھ لاکھ برس کی پرانی تصنیف قرار دیتے ہیں لیکن یورپئین مورخین (مثل ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ) کا خیال ہے کہ رامائن کی تصنیف کا زمانہ مہا بھارت کے بعد کا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق ہے کہ رامائن 1000 ق م کے یا اس سے بھی بعد کی تصنیف ہے اور مہا بھارت قریب 1200 ق م میں لکھی گئی لیکن ان دونوں کتابوں میں سن عیسوی کے سینکڑوں سال بعد تک الحاقات ہوتے رہے...... رامائن کے متعلق مسٹر گووند داس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ قریب تیسری صدی ق م کا ہے (ہندوازم، ص۔ 137) اگرچہ ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے مہاراج رام چندر کا زمانہ آج سے قریب بیس لاکھ سال پیشتر کا مانا جاتا ہے۔ رامائن مختلف مصنفوں نے لکھی ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آخیر پر رامائن کے قریب بیس مختلف نسخے فقط بنارس کے ایک کتب خانہ میں موجود تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں واقعہ متعلقہ کی بابت بہت کچھ اختلاف پایا جاتا تھا لیکن دیاس، کالیداس، ہیم چندر جی وغیرہ کی رامائن کے مقابلہ میں دالمیکی کی رامائن بہت مشہور ہے۔ رامائن اور مہا بھارت کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ ''یہ کتابیں سینکڑوں برس کے عرصہ میں جا کر متشکل ہوئیں اور اس کے بعد ان میں اضافے ہوتے رہے۔ (The Discovery of India, P.75)۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے پرویزؒ: معراجِ انسانیت (معارف القرآن جلد چہارم)، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ص۔ 87 تا 88)۔

میں صرف ایک ہی ہے کہ راجہ دسرتھ [1] نے اپنے بڑھاپے میں ایک اور شادی کی۔ یہ جو دوسری بیوی تھی اس نے چاہا کہ اس کا بیٹا راجہ بنے۔ قاعدے کے مطابق پہلا' پہلوٹھی کا بیٹا' جو رام تھا' وہ ولی عہد مقرر ہو چکا تھا اور لوگوں میں وہ بڑا ہر دل عزیز تھا لیکن نئی بیوی نے بوڑھے خاوند سے یہ وعدہ لے لیا اور وہ وعدے اس زمانے کے یہ ہوتے تھے کہ ''قول دیجئے' میں ایک بات کہونگی مانیں گے؟'' وہ بات بعد میں ہوگی اور منوا پہلے ہی لیا کہ مانیں گے۔ ''جی ہاں' مانیں گے' فرمائیے کیا کہتی ہیں آپ؟ کہ جی میرا جو چھوٹا بیٹا ہے وہ اقتدار کی گدی پہ آئے گا'' اس نے کہا کہ ''وہ تو رام موجود ہے۔'' اس نے کہا کہ ''رام کو دیس نکالا دیدیجیے۔'' اب وہ قول دے چکے ہیں۔ اندازہ لگائیے' یہ اسوہ پیش ہوتے چلے جا رہے ہیں' یعنی ایک شخص اپنے بڑھاپے میں اپنی بیوی کی بات سننے سے پہلے ہی قول دیدیتا ہے کہ ہاں جو تم کہو گی' مانوں گا اور اس کے اوپر جم کے بیٹھا ہوا ہے کہ ہاں صاحب! مجھے ماننا پڑا۔ اب پھر کیا کریں؟ رام بیٹے کو بلایا اور کہا کہ ''بیٹا! یہ ہو گیا ہے۔'' باپ بھی رو رہا ہے' بیٹا بھی رو رہا ہے لیکن کہتے ہیں کہ

رگو کا طریق یہی چلا آئے
پران جائے پر بچن نہ جائے

ہمارے خاندان کی روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ جو قول دیدیا ہے' ہم اس سے نہیں ہٹ سکتے' جان دے سکتے ہیں۔ بیٹے سے کہا کہ ''تم میرے ساتھ تعاون کرو گے؟'' اس نے کہا کہ ''آپ کے قول کی اطاعت مجھ پہ فرض ہے۔'' یہ جانتے ہوئے کہ غلط فیصلہ ہے لیکن باپ نے چونکہ حکم دیدیا ہے' اس لیے وہ رام بن باس کو چلے گئے۔ اس کارنامے کی بنا پہ کہ باپ کی اطاعت اس حد تک کی' رام کو ایشور مانا جاتا ہے' پرستش کی جاتی ہے' وہ ایشور کا اوتار بن گیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ باپ غلط ہے پھر بھی اطاعت کی۔ ان کے نزدیک تو یہ اطاعت گویا انتہا تک پہنچ گئی۔ ایک غلط بات ہے اس غلط بات پہ چونکہ باپ نے حکم دیا ہے اس لیے وہ اطاعت ہو گئی۔

ہندوؤں کے نزدیک رام ایشور کے اوتار ہیں' ان کی پرستش ہوتی ہے' ایشور کا نام محترم ہے۔ یہ رام داس وغیرہ جو آپ دیکھتے ہیں' یہ وہی چیز ہے۔ رام ایشور کا نام ہو گیا' صرف یہ کارنامہ ہے ان کی زندگی کا۔ یہ تو ایک نمایاں مثال میں نے دی ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں' اخلاقیات کے ضابطے میں' ماں باپ کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے۔ غلط بات باپ کہے اور اس کے سامنے سے کوئی آدمی اعتراض کر بیٹھے یا اس کا حکم نہ مانے تو اس کا تو تصور بھی نہیں آتا' یہاں تک کہ اس کا بھی تصور نہیں آتا کہ یہ بات

---

[1] رامائن کی رو سے راجہ دسرتھ (مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار) کی تین بیویاں اور ساڑھے تین سو لونڈیاں تھیں (ہندوازم' ص۔133) ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی تھی جب ان کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے (ص۔134) جب مہارانی سیتا کا سوئمبر رچایا گیا تو ان کی عمر پانچ ہزار برس کی تھی اور جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی ہوئی تو ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا (ص۔134۔The Discovery of India) رامائن میں اس قسم کے قصے اور کہانیاں ہیں۔

مذہب کے خلاف ہے' اخلاقیات کے خلاف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بہترین نمونہ قرار پائی

یہاں ایک شخصیت کی زندگی کو قرآن اسوۃ حسنہ کہتا ہے کہ **قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ** (60:4)۔ تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام [1] اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔اس نمونے کا آغاز ہوتا ہے کہ **اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ** (26:70) جب اس نے باپ سے کہا تم کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو؟ تو جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ایک عام باپ نہیں ہے' وہ اس زمانے کی سلطنت کا سب سے بڑا پجاری' آدارِاعظم [2] ہے۔ یہ بادشاہ سے زیادہ اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔اتنا بڑا منصب ہے۔ یہ منصب بیٹے کو وراثت میں بھی مل جاتا ہے۔

ماں باپ کے لیے بچوں کی تربیت کا اصول اور اس کا نتیجہ

باپ کی اس اطاعت کے بجائے وہ باپ سے اس حد تک کہتا ہے کہ تم کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو۔اس کے جواب میں باپ کہتا ہے کہ یادرکھو! اگر تم نے اپنی اس روش پر اصرار کیا تو میں تمہیں سنگسار [3] کردونگا' نکل جاؤ یہاں سے میری آنکھوں کے سامنے سے [4]۔اس کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ کوشش کرتا رہونگا کہ آپ صحیح راستے پر آجائیں [5]۔ یہ باپ اور بیٹے کا

---

1. تورات کا بیان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی آٹھویں پشت (حضرت نوح علیہ السلام' سام' ارفکسد' سلح' عبر' فلج' رعو' سروج' نحور' تارح' حضرت ابراہیم علیہ السلام) میں نحور پیدا ہوئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دادا تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا خاندان کلدانیوں (بابل) کے شہر اُور (UR) میں آباد تھا۔ کلدانیوں (بابل) کا تمدن تاریخ کے اوراق میں ابھرے ہوئے حروف میں نظر آتا ہے۔تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں عراق اور شام کی باہمی جنگ کا قصہ مذکور ہے۔جس میں شنعا (بابل) کے بادشاہ کا نام امرافیل درج ہے۔خیال ہے کہ یہ بادشاہ وہی ہے جو حموراپی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قوانین بابل کے مینارہ پر کندہ ملے ہیں۔اس قیاس کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عہد 2200 ق م قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی قوم بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔آپ علیہ السلام ترتیب زمانی کے اعتبار سے حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ھود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے بعد آتے ہیں۔(ماخوذ از پرویزؒ (1994ء)' جوئے نور۔لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ؛ص ص۔97-98)
2. آوار بمعنی پجاری (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ لاہور' 1994' ص۔98)۔
3. لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ (19:46) یادرکھو' اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے چھوڑ دوں گا۔
4. وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (19:46) اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر مجھ سے الگ ہوجا۔(پرویزؒ (1994ء)' جوئے نور۔لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' ص۔100)
5. (19:47-48)

تعلق ہے۔قرآن کہتا ہے ابراہیمؑ کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ساری دنیا کے ایک مسلمہ اصول' قاعدے' قانون' روایت کے خلاف ایک چیز وہ شخص کرتا ہے' اسے ہمارے ہاں قرآنِ کریم میں اسوۂ حسنہ بتایا جارہا ہے اور بات بڑی صحیح ہے۔ بچے جب تک پرورش کے اعتبار سے' تربیت کے اعتبار سے' تعلیم کے اعتبار سے' ماں باپ کی نگرانی میں رہتے ہیں' انہیں ماں باپ کی ہدایت کے مطابق چلنا چاہیے کہ ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ غلط اور صحیح میں خود فیصلہ کرسکیں لیکن جب وہ پختگی تک پہنچ جائیں تو انہیں اپنی زندگی کے فیصلے آپ کرنے چاہئیں۔اگر یہی چیز ہو کہ جس روش پہ وہ چلتے آ رہے ہیں' حکماً اطاعتاً اسی کے اوپر چلتے چلے جائیں تو اگر یہ کہیں طریقہ رہتا تو آج کا انسان بھی اسی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا جیسے چھ ہزار سال پہلے کا انسان کرتا تھا۔یعنی انسان نہ ہوتا بھیڑ ہوتا' جو پہلی بھیڑ تھی وہ جو کچھ کرتی تھی' آج کی بھیڑ بھی ماں باپ کی اطاعت کے فریضے کے اعتبار سے وہی کچھ کررہی ہوتی۔نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ بھیڑ کی بھیڑ رہتی' کچھ آگے بڑھ ہی نہ سکتی۔

سورج کی ہر کرن انسان کو ایک نئی منزل کی طرف ترغیب دیتی ہے

قرآن ہر نئی نسل کو پچھلی نسل سے آگے دیکھنا چاہتا ہے۔وہ فرد کی زندگی میں بھی ارتقا چاہتا ہے' انسانیت کی زندگی کے اندر بھی ارتقا چاہتا ہے۔اور اگر یہ ہو کہ جو پچھلی نسل یا ماں باپ کے یا اسلاف کے عقائد' تصورات' زندگی کے نظریات ' وہی ہیں' انہی کے مطابق چلنا ہے تو آپ ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے۔آگے بڑھنا تو ایک طرف' روتے رہیں گے کہ صاحب! ہم اسلاف کے نقش قدم پہ کیسے چل سکتے ہیں: سبحان اللہ' وہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جی' ''اسی تے بندے بشر ہوئے نا'' ۔یعنی ان سے پست تر۔ جب بھی کسی سے بات سنیے کہ صاحب! یہ زمانہ اس قدر فسق و فجور کا' تاریکیوں کا' جہالتوں کا ہے' زمانہ تو وہ تھا۔ ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھیں گے۔ میں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ تاریکی کا راستہ اگر آپ کے پاس ہو اور آپ کے ساتھ وہ لالٹین ہو' وہ آپ کے پیچھے رکھی ہوئی ہو اور آپ چلیں تو آپ کے اپنے سائے سے وہ راستہ زیادہ تاریک ہو جائے گا۔اس روشنی کو آپ کے آگے ہونا چاہیے۔ یہاں جتنے پرانے والدین ہوئے ان میں اسلاف آ گئے' جتنے پرانے ہوتے چلے گئے اتنے زیادہ مقدس ہوتے چلے گئے۔ او کیندے ہیگے نیں پئی پرانا گُڑ جیہڑا ہے او تریاق بن جاندا ہیگا[1] ۔ جب آپ کی زندگی میں' وہ آپ کے سامنے ہیں پھر ان پہ اعتراض ہوتے ہیں' مباحثے ہوتے ہیں' مناظرے ہوتے ہیں' کفر کے فتوے بھی لگتے ہیں' جونہی انہوں نے آنکھ بند کی' وہ حضرت علیہ الرحمۃ ہوئے' اسلاف میں ان کا شمار ہوگیا' اب ان کا اتباع آپ کے لیے فرض قرار پا گیا۔ یہ ہے آج کی روشِ زندگی۔

---

[1] بزرگ کہتے ہیں کہ گڑ جتنا پرانا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ تریاق بنتا چلا جائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا پہلا واقعہ

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا پہلا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ تم یہ کیا کرتے ہو؟ تو **قَالُوا** وہ کہتے تھے کہ **بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (26:74) ہمارے اسلاف کی یہ روش تھی' یہی طریقہ تھا' ہم اس کے مطابق چلتے جائیں گے۔ جواب ملتا ہے کہ **قَالَ اَفَرَاَيْتُمْ** (26:75) کیا تم نے بھی On Merit (اہلیت کی بنیاد پر' حُسن و قبح کی بنا پر) اس بات کو پرکھ لیا ہے کہ وہ صحیح راستہ ہے؟ "**اَفَرَاَيْتُمْ**" میں ساری بات ہے۔ عزیزانِ من' اس لیے نہیں کہ وہ اسلاف کا راستہ ہے یا باپ حکم دے رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ **اَفَرَاَيْتُمْ** نئی نسل میں کتنا بڑا Self Confidence (خود اعتمادی) Create (پیدا) کرتا ہے اور کس مقام پہ وہ اس نئے بچے کو پہنچا رہا ہے'۔ کتنی بڑی ذمہ داریاں اس کو دے رہا ہے۔ اس طرح Self Confidence (خود اعتمادی) سے وہ انسانیت کی صف میں آگے بڑھنے کے قابل ہو سکے گا۔ Self Confidence (خود اعتمادی) پہلی چیز ہے۔ جب قرآن نے اسوہ ابراہیمی کو ہمارے لیے بہترین نمونہ قرار دیا تو ان کی زندگی کا یہ واقعہ ہے جو ہمارے سامنے آیا ہے اور یہ ہے وہ پہلی چیز۔

بچوں کی زندگی کے لیے ایک سنہری اصول

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بات تو بڑی چھوٹی سی ہے لیکن انسانیت کے ارتقائی منازل کے لیے ہے کتنی اہم۔ یہ Self Confidence (خود اعتمادی) بنیادی پتھر ہے۔ عمر بھر کے لیے' بڑے ہو جانے کے بعد' جوان ہو جانے کے بعد' اپنی ذمہ داریاں سنبھال لینے کے بعد بھی' اگر آپ بچے کو یہیں رکھیں گے کہ نہیں صاحب! جو بھی بات ہو وہ آ کر پوچھے کہ ابا جان! فرمایئے میں کیا کروں' امی جان! کیا حکم ہے آپ کا' تو اس طرح تو وہ بچہ وہی تین سال کا بچہ رہتا ہے' اس میں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ غلطی کرتا ہے' کرنے دیجیے۔ ٹھوکر کھاتا ہے تو تصحیح ہو گی' اصلاح ہو گی' اُس کے اندر پختگی آئے گی' فیصلے کی قوت آئے گی' اپنا راستہ آپ تلاش کرے گا۔ وہ [1] تو یہاں تک کہتا ہے:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

---

[1] یہ اشارہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

گر از دست تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است ❶

(پیامِ مشرق)

کہتا ہے کہ اپنے تیشے سے اپنا راستہ آپ تلاش کر۔ یہ ٹھیک ہے، کہ کسی وقت اس میں تم سے غلطی بھی ہو جائے گی، خطا بھی ہو جائے گی۔ کوئی بات نہیں، یہ بات ہے کہ تم نے خود اپنا راستہ تو تلاش کیا ہے، اس کا جواب تمہیں ضرور مل جائے گا۔

انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں فرق

انسانیت کی صف میں وہی قومیں زندہ ہوتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں، عزیزانِ من! جو اپنے تیشے سے اپنے راستے خود تلاش کرتی ہیں۔ اسلاف کے راستے پہ تو حیوان چلتا ہے۔ ان کے اسلاف (Self) وہی ہوتے ہیں، بھیڑ کا سلف بھیڑ ہی ہوتی ہے، وہ آگے نہیں بڑھ سکیں۔ آج کا انسان وہ انسان نہیں جو غاروں اور درختوں پہ رہتا تھا۔ اس لیے کہ اس نے اسلاف کے اتباع کو چھوڑا ہے۔ پہلی چیز، یہ اسوۂ ابراہیمی آپ کے سامنے آ گیا۔ صاحب! اب اگلی چیز آتی ہے: ملوکیت، استبداد، آمریت، ڈکٹیٹر شپ، انسان کی حکومت۔ یہاں یہ بات آتی ہے کہ وہ بادشاہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ کیا کہتے ہو، تم پرستش کرواتے ہو، تمہارا اقتدار کیا ہے؟ بادشاہ کہتا ہے کہ ہمارا اقتدار یہ ہے کہ ہم حکم دیتے ہیں کہ اس کو گولی مار دو، گولی مار دی جاتی ہے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ اسے پھانسی کے تختے سے نیچے اتار دو، تو اتار دیا جاتا ہے ❷۔ ہمارا اقتدار یہ ہے۔ جب یہ مقامات آئیں گے تو میں ان الفاظ کی تشریح کروں گا۔ وہاں کوئی مناظر یا مولوی صاحب ہوتے تو منطق میں الجھ جاتے کہ آپ کے صغریٰ یا کبریٰ کے اندر یہ منطقی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ باطل قرار دیتا ہوں، تو وہ اس سے زیادہ منطقی دلیل لے آتے ہیں۔ ان کا مقصد منطق سے قائل نہیں کرنا تھا، اس کا منہ بند نہیں کرنا تھا، بلکہ اس کا اطمینان کرنا تھا۔ اس سے یہ کہا کہ جس کو تم نے یہ کہا ہے، اسے اقتدار نہیں کہتے، اسے آمریت کہتے ہیں، اقتدار دیکھنا ہے تو یہ سورج صبح کے وقت مشرق سے نکلتا ہے، اس کو ذرا مغرب سے نکال کے تو بتاؤ❸۔ کہو کہ ہے یہ

---

❶ اپنے تیشہ سے اپنی زندگی کا راستہ خود تراش۔ دوسروں کے تراشے ہوئے راستہ پر چلنا عذاب ہے (دوسروں کا محتاج نہ بن) اگر تیرے ہاتھ سے کوئی انوکھا کام سرانجام پائے، اگر وہ گناہ بھی ہو تو ثواب ہوگا۔

❷ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ (2:258) میری مملکت میں موت اور زندگی کے فیصلے میرے حکم سے ہوتے ہیں۔

❸ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ (2:258)

اقتدار؟[1] قرآن کہتا ہے **فَبُهِتَ** [2] (2:258)۔ اس کا کیا ترجمہ کروں! یہ **بُهِتَ** کا لفظ تو ہمارے ہاں آتا ہے کہ پلے لکھ نہ رہیا ہؤ منہ تکدارہ گیا' اگوں گل نہ ہوئی [3]۔ اس لفظ کے اندر یہ سارے ترجمے آتے ہیں۔ دوسرا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے۔

غیر محسوس دلیلوں کے بعد بتوں کو توڑنے والی محسوس دلیل

پھر پوری قوم آ رہی ہے' ساری قوم کے ساتھ اعلانیہ ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے' نازک سے نازک ترین جذبات کے ساتھ ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سارا کچھ ہوا جو یہ کہتے ہیں صاحب! کہ انہوں نے مندروں میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ دیا[4]۔ ٹھیک ہے ان کو سمجھانے کے لیے کوئی اور دلیل باقی نہیں تھی۔ قرآن نے ساری دلیلیں دی ہیں' انہیں غیر محسوس دلیلیں دی ہیں۔ وہ اس پہ نہیں آئے تو یہ بتانے کے لیے محسوس دلیل دی کہ ان میں کوئی قوت نہیں ہے۔ اب جنہیں وہ خدا مانتے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ انہیں ہر قسم کا اقتدار اور اختیار حاصل ہے۔ ان کے متعلق ان کے سامنے انہیں یہ بتانا کہ اگر ان کو اقتدار حاصل تھا' تو کوئی شخص آتا ہے' وہ توڑ پھوڑ کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے' ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے تو اس وقت ان کا اختیار و اقتدار کہاں چلا گیا اور اس پہ وہ ایک کو باقی رکھ لیتے ہیں' جو سب سے بڑا[5] ہے۔ وہ کہتے ہیں: کس نے کیا[6] ہے؟ کہنے لگے: ان کے اختیار کو تو چھوڑ دیجئے' جو سب سے بڑا ہے اس سے اتنا تو پوچھ لو کہ یہ کس نے کیا ہے' تمہاری آنکھوں کے سامنے کیا[7] ہے۔ انہیں کہنا پڑا کہ ابراہیم! تجھے پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں

---

1. **فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ** (2:258) وہ (بادشاہ) جس نے انکار کی راہ اختیار کر رکھی تھی' اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 121)
2. بھت (ب ھ ت) حیرت زدہ ہو جانا' متحیر ہو کر خاموش ہو جانا۔ البھت کسی کو اچانک پکڑ لینا (تاج العروس)۔ ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔356
3. عزت خاک میں مل گئی' اپنا سا منہ لے کر رہ گیا' حیرت و حسرت سے منہ تکتا رہا' کوئی بات نہ سوجھی۔
4. **فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ** (21:58) اس نے بتوں کو توڑ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ صرف ایک بت جو ان میں بڑا سمجھا جاتا تھا' چھوڑ دیا۔
5. **فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ** (21:58)
6. **قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ** (21:59) انہوں نے کہا: ''ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کس کی؟'' (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 114)
7. **قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ** (21:63) حضرت ابراہیمؑ نے کہا جس نے یہ کیا تم اس کی بابت مجھ سے پوچھنے کی بجائے انہی بتوں سے پوچھو اور ان میں سے بھی اس سے جو ان میں سب سے بڑا ہے۔ اگر بول سکتے ہیں تو تمہیں جواب دیدیں گے۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 116)

کرتے' یہ سنا نہیں کرتے' یہ دیکھا نہیں کرتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ مجھے یہی کچھ سننا تھا اور کچھ نہیں کہ بت تو یہ ٹوٹے پڑے ہیں ان میں سے کسی میں یہ طاقت نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو بچا سکتا اور یہ سب سے بڑا ''خدا'' بت بنا سامنے کھڑا ہے' یہ نہ ان جھوٹے خداؤں کی حفاظت کر سکا۔ نہ مجھ پر ہی اپنا عذاب نازل کر سکا۔ کیا انداز ہے یعنی ان کی زبان سے یہ کہلوانا تھا کہ ابراہیم! تجھے تو آپ پتہ ہے' تیرے گھر میں تو یہ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کے پتھر کے خدا بنائے جاتے ہیں' تیرا باپ بناتا ہے' تجھے تو پتہ ہے کہ یہ بولا نہیں کرتے' دیکھا نہیں کرتے' سنا نہیں کرتے۔ تو بات آخر میں یہ ہوئی کہ فیر تہاڈا افٹے منہ [1]۔ خود اعتراف کرتے ہو کہ ان کی بے بسی اور بے کسی کا یہ عالم ہے اور ان کو خدا مان رہے ہو۔ کیا خوب انداز ہے!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پوری قوم کی مخالفت کا سامنا تھا

جذباتی قومیں اس عقل و فکر کی بات پہ نہیں آتی ہیں۔ اصل میں یہ ہے کہ یہ ان پروہتوں کے' پادریوں کے' ملّاؤں کے Priests (مذہبی پیشواؤں) کے اقتدار ہیں۔ یہ ان بتوں کی حفاظت نہیں ہوتی' یہ مندروں کا تقدس نہیں ہوتا بلکہ یہ تو

بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

ان کی آڑ میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مقام پہ پہنچانا چاہتے ہیں اور اس کے بعد ساری قوم کے خلاف چیلنج دے جاتے ہیں۔ پوری کی پوری قوم مخالف ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہاں Compromise (مفاہمت) کریں' ان کے ساتھ مصالحت کریں' وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں جلا دیں گے' مار دیں [2] گے۔

خدا کے پیغام کی خاطر میرے لیے کارِ جہاں دراز ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلانِ عظیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم اس حد تک آ چکے ہو کہ بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو سنو! میں بھی آرام سے بیٹھنے کے لیے نہیں ہوں' میں درخت نہیں ہوں کہ یہاں سے اکھیڑ دیا جاؤں گا تو میری جڑیں اکھڑ جائیں گی **اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ** (37:99) میں اس مقام میں جاتا ہوں' جہاں میرے رب کے نظام کے نفاذ کے لیے فضا سازگار رہے۔ میں اس سرزمین کا پابند نہیں ہوں' خاص خطہ زمین کے ساتھ میری محبت نہیں ہے کہ اگر وہاں باطل ہے تو باطل کی پرستش کرتا رہوں کیونکہ صاحب! یہ دھرتی ماتا

---

[1] تف! لعنت تم پر

[2] (21:68) انہوں نے (آپس میں) کہا اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس آدمی کو آگ میں ڈال کر جلا دیں اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 116)

میری ہے' یہ مادرگیتی تو دیوی ہے۔عزیزانِ من! ہمارے ہاں بھی حب الوطنی جزو من الایمان ہے' تحریکِ پاکستان کے زمانے میں یہ فقرے آیا کرتے تھے۔ یہ تو یونہی عربی کے تین لفظ ہیں۔ اندازہ لگایئے! اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ جب بھی اس نے دیکھا ہے کہ اس نظام کے قیام کے لیے یہ مقام سازگار نہیں رہا ہے' تو جو سرزمین بھی سازگار ہوئی ہے' وہ یہ کہتے ہوئے **اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ** [1] (37:99) وہاں چلا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ میں یہاں سے وہاں فلسطین جارہا ہوں' شام کے میدانوں میں جارہا ہوں بلکہ میں وہاں جارہا ہوں' جہاں اس نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے فضا سازگار ہے۔ کہا کہ اب اس قیام اور نظام کو مقامی نہیں رہنے دینا' یونیورسل بنانا ہے' انسانیت کے لیے مرکزیت قائم کرنی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین [2] میں اقامت پذیر تھے جسے آپ علیہ السلام کی ذات (بنی اسرائیل) کے لیے برکت والی زمین قرار دیا گیا لیکن خدا کے پروگرام کے مطابق دعوتِ ابراہیمی کو کسی خاص خطہ ارض میں محدود نہیں رہنا تھا۔ بڑا بیٹا حضرت اسماعیل علیہ السلام ہے' اسے فلسطین سے بہت دور سرزمین حجاز میں بسایا گیا تا کہ جب پہلی شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام اپنی تازگی و برومندی کھو بیٹھے تو یہ دوسری شاخِ اطہر' قدوسیانِ حظیرۂ اعلیٰ کا گہوارہ بن سکے۔ اب دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کے حصے میں شام اور فلسطین کی سرداریاں آئیں۔قرآن کہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اس کی نسل کو ہم نے ملک عظیم دیا تھا یعنی ملکِ عظیم ان کے حصے میں آیا تھا۔قرآن نے یہ جو بتایا تو جب میں وہاں آؤں گا تو یہ جو بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو لٹا دیا اور چھری پھیر دی اور جنت سے جبریل ایک مینڈھے کو لے آیا چونکہ آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی تھی' ''اونے تھلیوں پترنوں ہٹا دتا تے دنبہ اگے رکھ دتا۔ اکھاں کھلیاں تے تکیا۔اوکہن لگے: میں تے اسماعیل نوں ذبح کیتا سی اے کی آ گیا اے؟ کہن لگا: تینوں پتہ ای نہیں لگن دتا [3]۔اس کی وضاحت کروں گا کہ اس نے کہا کہ ایک ثانیے کے لیے چھری چلا دینا کیا بات ہوئی۔ یہ تو اس کے لیے ساری زندگی وقف کر دینا' نسلیں تک وقف کر دینا ہے۔ یہ شام اور فلسطین کے میدانوں کی شادابیاں' خوشگواریاں' سرداریاں' یہ سب دوسری شاخ کے حصے میں آئیں گی۔

لُٹا دے دولتِ کونین اور میرے لیے
بس اک تبسمِ عابد نواز رہنے دے

---

[1] میں اس مقام کو چھوڑ کر وہاں جارہا ہوں جہاں اس نظامِ ربوبیت خداوندی کی تشکیل کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1043)

[2] حضرت ابراہیم کے توطنِ فلسطین کے بعد ان کے برادرزادہ حضرت لوط علیہ السلام سدوم اور عمورہ کے علاقہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے جو اس خطہ ارض میں نہایت شاداب اور زرخیز علاقہ تھا۔ (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994ء فٹ نوٹ 1' ص۔129)

[3] اس نے نیچے سے بیٹے کو ہٹا دیا' اس کی جگہ دنبہ رکھ دیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں' دیکھا تو کہنے لگے کہ میں نے تو حضرت اسماعیل کو ذبح کیا تھا۔ یہ کیا آ گیا؟ کہنے لگا: تجھے پتہ ہی نہیں لگنے دیا۔

بُت کدوں کی اس دنیا میں کعبہ کی تعمیر کا عظیم مقصد اور اس کے حصول کے لیے زندگی بھر کی قربانی

کہا کہ آؤ اسماعیل علیہ السلام! وہ جو مکے کی بے برگ وگیاہ زمین ہے، تم وہاں بسا دیئے جاؤ گے۔ یہ ہے دنیا کے بت کدے میں وہ پہلا گھر خدا کا۔ اس کی تولیت، اس کی نگہبانی، اس کی حفاظت، ان کے سپرد کی، کیونکہ اسے انسانیت کا مرکز بننا تھا۔ بیٹے کو وہاں بسا دیا۔ مملکتِ عظیم کا مالک بیٹا خندہ پیشانی سے ہنستا ہوا جا بسا۔ اس نے نہیں کہا کہ وہ ساری سرداریاں، وہ بادشاہتیں، وہ سب کچھ چھوڑ کر، اسے اس بے برگ وگیاہ زمین کے اندر کیوں بسایا گیا ہے بلکہ کہا گیا کہ ایک مشن ہے، مشن کی تکمیل کے لیے میرے سپرد یہ کام ہوا ہے، میں یہ ہنستے ہوئے کرونگا۔ ہنستے ہوئے چھری کے نیچے نہیں لیٹ گیا تھا، یہ ایک دومنٹ کی قربانی نہیں تھی، یہ زندگی بھر کی قربانی تھی، پوری آنے والی نسلوں کی قربانی تھی۔ یہ پیش ہورہا ہے۔

مُردوں کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تشویش اور اس کا تفسیری حل

پوری ایک مردہ قوم کو زندہ کرنے کا مشن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کیا گیا۔ یہ اتنا بڑا اہم اور سنگین مرحلہ ہے کہ یہ بھی کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ یا اللہ! تُو نے حکم دیا ہے کہ ان کو زندہ کرنا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندہ ہوگی لیکن مجھے یہ بتا کہ **كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى** (2:260) [1]۔ تُو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ خدا نے کہا کہ اچھا ابھی بتاتے ہیں: چار پرندے پکڑ [2] لے۔ اب ہمارے ہاں پرندوں کی تفصیل ہماری تفسیروں کے اندر آتی ہے، کوئی کہتا ہے وہ کبوتر تھے، کوئی گدھ اور مور کہتا ہے، دوسرا کہتا ہے: اونئیں اونئیں، مورنئیں سی ہیگا او ککڑ ہیگا سی [3]۔ عزیزانِ من! ان سے پوچھو کہ تمہیں یہ پتہ کیسے چلا؟ ہمارے ہاں دلیل نہیں ہے کہ یہ چار پرندے کون سے تھے۔ اب آگے ہے کہ پھر انہیں ذبح کر دیا، پھر قیمہ کر دیا، پھر وہ قیمہ اس میں ملا دیا۔ ''او کھے توں اوکھا بناونا اے اوس کم نوں۔ ملا دتا، کبوتر دا موروچ، موردا ککڑ وچ [4]۔ مختلف پہاڑوں کے اوپر بوٹی بوٹی ڈال دو۔ آواز مار۔ کبوتر کبوتر، مرغی مرغی، گدھ گدھ، اور مور مور بن کر آ گیا۔ میرے اللہ! اس کتابِ عظیم کی تعلیم کی یہ تعبیر، یہ تشریح!! یاللعجب! عزیزانِ من! یقین مانیے اس

---

[1] اے پروردگار! مجھے دکھلا دے کہ تُو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

[2] قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ (2:260) ارشادِ الٰہی ہوا، اچھا، یوں کرو کہ جنگل میں سے چار پرندے پکڑ لو۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 164)

[3] نہیں، قطعاً نہیں بھئی! وہ مور نہیں، مرغ تھا۔

[4] اس کام کو مشکل سے مشکل تر بنانا ہے کبوتر کے ٹکڑے مور میں اور مور کے مرغ میں ملا دیئے۔

قوم کے اوپر جو مسلسل ہزار برس سے عذاب ہے' وہ صرف اس لیے ہے کہ اس نے خدا کی اتنی عظیم کتاب کو اس تاویل کے اوپر لا کر پھینک دیا ہوا ہے۔ وہ بڑا غیور واقع ہوا ہے اور یہ اس کی آخری کتاب ہے' اس کا آخری رسول ہے اور اس کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ ہم اس عذاب کے اندر مبتلا ہیں۔ توہین عدالت تو چھوٹی چیز ہے' اتنی بڑی عدالت کی اتنی بڑی توہین!! آئین کی توہین!!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ کہا کہ اے ابراہیم علیہ السلام! یہ سمجھانے کے لیے بات ہے۔ یہ جنگلی چیزیں (مثل) بٹیر جھاڑیوں میں بیٹھنے والے ہیں' ان کو پکڑ۔ تُو دیکھتا ہے کہ ان کو سدھانے والے کیا کرتے ہیں؟ وحشی جانور ہوتا ہے' آدمی کے پاؤں کی آہٹ سن کر بھاگتا ہے۔ انہیں سدھانے والا' رام کرنے والا روز اپنا مغز مارتا ہے' جان مارتا ہے' ہمت سے' استقامت سے' حوصلے اور بردباری سے' بلا تکان یہ کام کرتا ہے۔ اس کو غصہ نہیں آتا' اس کام میں تنگ نہیں ہوتا۔ عزیزانِ من! اس قسم کے پرندے کو سدھانا کوئی آسان کام نہیں ہے' جان مارنی پڑتی ہے' اس میں استقامت بڑی چیز ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مایوسی نہ ہو' اس کام کے اندر تسلسل ہو۔ کہا کہ اے ابراہیم علیہ السلام! تم نے دیکھا ہے کہ پرندے کو کیسے سدھاتے ہیں۔ یہی کچھ تم کرو ❶۔ سدھانے سے پہلے ان پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پاؤں کی آہٹ سے جنگل کی طرف اڑ کر چلے جاتے ہیں' وہ اس سدھائے ہوئے پرندے کو جنگل میں آزاد چھوڑتا ہے اور وہ اس کی آواز پہ' اس آزادی کو چھوڑ کر' اس کے پنجرے میں آجاتا ہے۔ بس تُو یہی کچھ کر ❷۔ قومیں اس طرح سے زندہ ہوتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوعِ انسانی کی امامت کے لیے چن لیا گیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا کہ ''قوماں گلاں کرن نال زندہ نئیں ہویا کردیاں' قوم دا قیمہ کیتا جائے تو اونئیں زندہ ہُندی'' ❸۔ عزیزانِ من! اسوۂ ابراہیم بتا رہا ہے کہ قومیں کیسے زندہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں دہرانے کے بعد قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ <u>وَ اِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ</u> ❹ (2:124)۔ ایک کے بعد دوسرا جانگداز مرحلہ ابراہیم علیہ السلام کے سامنے آتا چلا گیا اور

---

❶ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ (2:260) اور انہیں اپنے پاس رکھ کر' اپنے ساتھ ہلا لو' مانوس کر لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے مل جائیں)۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 164)

❷ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا (2:260) پھر ان میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو۔ پھر انہیں بلاؤ۔ وہ (آواز سنتے ہی) تمہاری طرف اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 164)

❸ قومیں صرف باتوں سے زندہ نہیں ہوا کرتیں۔ اگر قوم کا قیمہ کر دیا جائے تو وہ زندہ نہیں ہوا کرتی۔

❹ جب اللہ نے ابراہیم کے لیے اس کی مضمر صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع بہم پہنچائے تو معلوم ہوا کہ اس کی صلاحیتیں تکمیل پا چکی ہیں۔ (پرویزؒ (1994ء)۔ جوئے نور۔ لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)؛ ص۔ 135)

وہ اس کے اندر پورا اترتا چلا گیا۔ ہر پچھلے مرحلے کے بعد ایک اور زیادہ جانگداز مرحلہ آتا گیا اور وہ اس پہ پورا اترتا گیا۔ جب انتہا آ پہنچی تو ہم نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام! واقعی تم اس قابل ہو کہ **اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124) تیرے جیسی شخصیت ہے کہ جسے نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ کا منصب ملنا چاہیے‘ تُو اس کا مستحق ہے۔اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام یہ ہے۔

عزیزانِ من! امامت کا ترجمہ اب میں کیا کروں‘ اسے لیڈرشپ کہہ لیجیے‘ آپ سربراہی کہہ لیجیے‘ آگے بڑھنے والا کہہ لیجیے۔ ویسے تو آپ کو یاد ہوگا‘ میں بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ یہ لفظِ امام عربوں کے ہاں ہوتا تھا۔ آپ نے معمار دیکھتے ہیں۔ وہ مکان بناتے ہیں‘ دیوار بناتے ہیں۔ آپ نے وزیر خان کے چوک میں دیکھے ہوں گے‘ اس گلی سے گزرتے ہوئے وزیر خان کی مسجد کی جو پچھلی دیوار ہے‘ کیا اسے دیکھا ہے؟ ہم نے کیوں دیکھنا ہے؟ وہاں تو دنیا کے جو بڑے بڑے انجینئر‘ آرکیٹیکٹ ہیں وہ اس دیوار کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی دیوار ہے‘ اتنی اونچی دیوار ہے‘ اور پھر اتنی سیدھی دیوار ہے۔ ہمارا یہ معمار اس دیوار کو ایسا سیدھا کس طرح سے بناتا ہے؟ اس کے پاس ایک تاگہ اور ایک لٹو ہوتا ہے‘ بس یہ ہوتا ہے اس کے پاس۔ ایک ردا رکھتا ہے تو اس لٹو کو اتنا سا نیچے لٹکا کے پھر اس کے ساتھ دیکھتا ہے کہ آیا دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے۔ وہ لٹو ہے جس سے وہ دیکھتا ہے کہ کوئی اینٹ اِدھر اُدھر کج تو نہیں ہوگئی‘ ٹیڑھی تو نہیں ہوگئی‘ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے۔ یہ جو معمار کے پاس وہ لٹو ہوتا ہے‘ عرب اسے امام کہتے ہیں۔ ملت کی دیوار کہیں غلط تو نہیں اٹھ رہی‘ کون بتاتا ہے؟ لٹو ملت کی دیوار کے لیے یہ کچھ بتاتا ہے‘ امام کا اسوۂ حسنہ بتائے گا۔ اس کی زندگی سے‘ اس کے اس اسوہ سے‘ ملت کی دیوار ماپی جائے گی کہ صحیح جا رہی ہے‘ اگر ملت اس کے مطابق چل رہی ہے تو اس کی دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے۔ تے جے لٹو گھمن لگ پئے‘ [1] اس کے بعد پھر جو دیوار کا حشر ہوگا آپ جانتے ہیں۔ امام اس کو کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تیرے جیسی شخصیت تو **لِلنَّاسِ اِمَامًا** (2:124) ہے‘ یعنی نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ کی منصب دار ہے۔

پیغمبری کے لیے خدا کے معیار پر پورا اترنا ہوتا تھا

اب وہیں اگلی چیز آئی۔ یہاں تو یہ صورت ہے کہ باپ بادشاہ‘ بیٹا پیدائشی بادشاہ‘ باپ جاگیردار بیٹا پیدائشی جاگیردار‘ اور اب تو لیڈر کا بیٹا بھی لیڈر رہے۔ جب اتنی بڑی چیز کہی گئی کہ تجھے نوعِ انسانی کی امامت دیدی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے **قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ** (2:124) کہا کہ کیا آگے میری نسل اور جو بچے ہیں‘ ان کے حصے میں بھی یہ بات آئے گی؟ بات کو وہیں کاٹ کے رکھ دیا۔ کہا کہ **لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124) اگر وہ تیرے معیار کے اوپر پورے اتریں گے تو ملے گا‘ اگر اس سے اِدھر اُدھر ہٹیں گے تو میں کوئی

---

[1] اگر وہ لٹو (دیوار سے ہٹ کر) گھومنے لگے تو

مدد نہیں کرسکتا۔ لَایَنَالُ کھرا کھرا جواب دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا ہونا اس کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اسوۂ ابراہیمی یہ ہے۔ یہاں بتایا کہ اِذِابْتَلٰی اِبْرٰھِمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ (2:124) ایک ایک قدم کے اوپر جانگداز مرحلہ آیا اور وہ اُس پہ پورا ہوتا چلا گیا۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے حدیث کا معیار

ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم احادیث کی رو سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اگر حدیث کی Definition (تعریف) یہ ہے تو وہ کونسا مسلمان ہے جو اس کے سامنے سر نہیں جھکائے گا۔ حضور ﷺ کا نام آتا ہے تو بے اختیار ہمارا سر جھک جاتا ہے۔ کیا ارشادِ نبوی کے سامنے ہمارا سر نہ جھکے گا؟ مگر سوال تو یہ ہے کہ جسے آپ ارشادِ نبوی ﷺ کہتے ہیں کیا وہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے بھی یا نہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ تم یہ نہیں پوچھ سکتے' یہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں بس سمجھ لو کہ یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔ قرآن سمجھنا ہے تو اس کی رو سے سمجھیے۔ یہ آئی آیت کہ ابراہیم علیہ السلام کو ان مختلف چیزوں میں آزمایا اور وہ اس پہ پورا اترا اور امامت نوعِ انسانی کا مستحق قرار پایا[1] (2:124)۔ حدیث کی کتابوں میں بالخصوص ''مسلم'' میں اور اس کی بنا پر آپ کے ہاں جو تفسیریں ہوئیں اور ان میں بھی تفسیرِ ابن کثیر[2] میں جو عام طور پہ مل جاتی ہے' کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس میں کیا بتایا ہے؟ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے' جن کی بنا پر وہ نوعِ انسانی کی امامتِ کبریٰ کے مستحق قرار پائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کارہائے نمایاں کیا ہیں؟ سن رکھیئے' لکھ رکھیے کہ وہ یہ ہیں: مونچھوں کو کم کرنا' داڑھی کا بڑھانا' یہ میں مسلم کی حدیث کا ترجمہ کر رہا ہوں' کُلّی کرنا' ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' سر کے بال منڈانا اور اگر رکھنا ہوں تو مانگ نکالنا' ناخن لینا' زیرِ ناف بال لینا اور بغلوں کے بال لینا' ختنہ کرانا' پیشاب پاخانے کے بعد استنجا کرنا' جمعہ کے دن غسل کرنا۔ یہ وہ مقامات تھے جن پہ ابراہیم علیہ السلام نے عمل کر کے دکھایا اور خدا نے کہا: اوشاباش! کیا بات ہے تیری! عزیزانِ من! ہنسیے نہیں' میری طرح روییے۔ بس سکھ ای رہ گیا' جیہڑا اے کم نئیں کردا' باقی تے سارے کردے نیں[3]۔ یہ حدیث شریف کی بات ہے اور ان آیات کی تفسیر یہ کی جارہی ہے' اسوۂ ابراہیمی آپ کے لیے بہترین نمونہ بتایا جارہا ہے اور اس کے بعد یہ ہیں وہ دس کلیے[4] جو پیش کیے جارہے ہیں۔

---

[1] وَ اِذِابْتَلٰی اِبْرٰھِمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (2:124)

[2] حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر القریشی البصروی الدمشقی (774-700ھ): تفسیر ابن کثیر (4 جلد)' ترجمہ امام العصر مولانا محمد جوناگڑھی (1890-1941ء) 4 جلدوں میں): مکتبہ اسلامیہ لاہور' 2005ء۔ (حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر کی کنیت ابوالفداء اور لقب عماد الدین ہے۔)

[3] بس یہ ایک سکھ ہی رہ گیا ہے جو یہ کام نہیں کرتا' باقی تو سب کرتے ہیں۔

[4] (۱) مونچھوں کو کم کرنا' (۲) داڑھی کا بڑھانا' (۳) کُلّی کرنا' (۴) ناک صاف کرنا' (۵) مسواک کرنا' (۶) سر کے بال منڈانا اور اگر رکھنا ہوں تو مانگ نکالنا' (۷) ناخن لینا' (۸) زیرِ ناف بال اور بغلوں کے بال لینا' (۹) پیشاب پاخانے کے بعد استنجا کرنا اور (۱۰) جمعہ کے دن غسل کرنا۔

اگلی چیز قرآن نے یہ کہی کہ اگر تم نے یہ بننا ہے تو وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّى (2:125) اپنی زندگی کی آماجگاہ مقامِ ابراہیمی کو سامنے رکھ کر تیار کرو اور اس کے لیے اس کے پیچھے پیچھے چلو۔ مقام ابراہیمی علیہ السلام یہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ اس مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو اپنی آماجگاہ بنایئے۔ مگر انہوں نے مقام مصلیٰ کے لیے کعبے کے حریم میں اتنی سی جگہ پہ نشان کیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ مصلیٰ ابراہیمی علیہ السلام اس کو کہتے ہیں اور حج کے دوران میں وہاں دو نفل پڑھے اور کہہ دیا کہ قرآن کا جو حکم تھا پورا ہو گیا: جہاں ابراہیم علیہ السلام نے نماز پڑھی تھی' اسی مصلے پہ تم دو نفل پڑھ لو۔ وہ دس شرطیں پوری ہو گئیں۔ جو مقام ابراہیم علیہ السلام ہے' اس کا مصلیٰ یوں بن گیا تو کیا پھر نوعِ انسانی کی لیڈر شپ آپ کے حصے میں آ گئی؟ اور کچھ نہیں تو اقوام عالم کی چوکھٹوں کے اوپر گداگری تو آپ کے حصے میں آ ہی گئی ہے۔ کیا یہ ہے مقامِ ابراہیمی علیہ السلام اور امامتِ کبریٰ؟ اور آگے چلیے' بار بار دہراتا چلا جاؤں گا۔ اسوۂ ابراہیمی علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو زندگی ہے' اسے آپ کے لیے قیامت تک کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ حدیث کی تمام کتابوں میں بالخصوص ''بخاری شریف'' میں یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

قرآن نبی کے متعلق نہ بھی کہے' تو بھی عزیزانِ من! نبی کی صداقت ہی تو ہے جس کی وجہ سے ہم اس کے اوپر ایمان لاتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے ہے' دوسری تو اس کے پاس دلیل ہی کوئی نہیں ہوتی۔ رسول اللہؐ نے جب فرمایا کہ یہ قرآن میری فکر کی تخلیق نہیں ہے' خدا کی طرف سے ملا ہے' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہم اگر اس کو خدا کی کتاب مانتے ہیں تو صرف اس لیے کہ رسول جھوٹ نہیں بولتا' سچ کہتا ہے۔ رسول کے متعلق اگر یہ ہو کہ جھوٹ بولتا ہے

تو ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

اور پھر عجیب بات ہے قرآن نے خاص طور پہ ابراہیم علیہ السلام کو صِدِّيْقًا نَّبِيًّا [1] (19:41) کہا ہے۔ یعنی بڑا ہی سچا نبی' بڑا ہی سچا۔ خدا کا جلیل القدر نبی مگر بقول اُن کے وہ جھوٹ بولتا ہے' دوسرا نبی اس کی تائید کر کے اپنی حدیث میں اس کو شامل کر دیتا ہے۔ قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو بھی اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو بھی اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ اس حدیث کی رو سے دونوں نبیوں کی کیفیت یہ نظر آتی ہے کہ ایک اس بات کو بیان کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین دفعہ جھوٹ بولا تھا'

---

[1] مجسمہ سچائی اور اللہ کا نبی۔ ''صدیق''، بہت زیادہ سچ بولنے والا' بالکل سچا۔

یہ ان کی تائید کر رہے ہیں ۔ یہ بھی جب واقعہ آئے گا تو میں عرض کرونگا ۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ صاحب! کبھی یہ چیز بھی ہوگی ۔ حدیث میں ہے کہ جی' حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں سے جا رہے تھے' اپنی بیوی ساتھ تھی۔ وہ جو مصر کا بادشاہ تھا' وہ نوجوان عورتوں کو پکڑ لیا کرتا تھا اور اپنے محل میں لے جایا کرتا تھا۔ وہاں تو بڑی مشکل پیش آئی۔ انہوں علیہ السلام نے اس بادشاہ کے کارندوں کے سامنے کہہ دیا کہ جی' یہ میری بہن ہے ۔ آپ حیران ہونگے کہ اس کے باوجود وہ اسے پکڑ کر لے گئے ۔ اوناں کیا: سانوں ایہدے نال کی غرض اے کہ اے تیری کی لگدی اے[1] (معاذ اللہ)۔ جھوٹ بھی بولا اور اس کے باوجود وہ پکڑ کے لے گئے ۔ اور وہ جو ہے کہ انہوں نے کہا کہ چلیے' قوم چاند' سورج' ستاروں کی' پرستش کیا کرتی تھی' چاند' سورج' ستاروں کا' عرس منایا کرتی تھی' ان کا میلہ تھا تو انہوں نے یہ چیز کہی کہ ابراہیم علیہ السلام تم بھی چلو۔ انہوں نے کہا کہ اِنِّـــی سَـــقِیْـمٌ (37:89) تمہارے ان معبودوں سے' تمہاری اس روش سے' تمہاری اس پرستش سے' تمہارے اس عقیدے سے' تمہارے اس مذہب سے' میں سخت بیزار ہوں ۔ کیا بار بار آ جاتے ہو!! جنہیں تم پوجتے ہو ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت چمکتے ہیں' تھوڑی دیر کے بعد یہ غائب ہو جاتے ہیں' چھپ جاتے ہیں' ختم ہو جاتے ہیں' یہ اس قسم کے ہیں اور کیا میں انہیں اپنا خدا بنا لوں؟ مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ ایسا نہیں ہے' انہوں نے یہ کہا تھا کہ **اِنِّی سَقِیْمٌ**[2] میں بیمار ہوں۔ یہ جھوٹ بولا تھا۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا ان کے ہاتھ میں ابراہیم علیہ السلام کی نبض تھی جو کہتے ہیں کہ جھوٹ بولا ہے اور بخار چڑھیا ہویا نئیں ہیگا[3] ۔ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ اگر آپ اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''میں بیمار ہوں'' تو آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ بیمار نہیں تھے اور یہ جھوٹے تھے؟ بیمار کی تو بات ہی نہیں ہے۔ یہاں تو بات یہ ہے کہ انہوں نے بتوں کو توڑا ۔ انہوں نے پوچھا: کس نے توڑا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس سے پوچھ لیجیے' یہ بڑا بت ہے کہ کیا تم نے تو نہیں توڑا؟ انہوں نے کہا کہ جی' یہ بڑا ہے اس سے پوچھ لیجیے ۔ کہنے لگے کہ یہ بھی جھوٹ بولا ہے کہ میں نے نہیں توڑا۔

---

[1] انہوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ تمہاری کیا لگتی ہے۔

[2] یہ بخاری کی ایک حدیث ہے کہ ''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ نے فرمایا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین جھوٹ بولے تھے' جن میں سے دو تو حق تعالیٰ عزوجل کی ذات کے بارہ میں تھے۔ (1) ان کا یہ کہنا کہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ میں بیمار ہوں' (2) ان کا یہ کہنا کہ نہیں بلکہ یہ ان کے بڑے بت نے کیا ہوگا اور آپ نے فرمایا کہ ایک بار حضرت ابراہیم ایک جابر بادشاہ کے (ملک) کی طرف گزر رہے تھے اور حضرت سارہ ہمراہ تھیں۔ اس بادشاہ سے لوگوں نے کہا کہ اس شخص کے ساتھ ایک حسین عورت ہے۔ اس نے آپ کو بلایا اور حضرت سارہ کے متعلق پوچھا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میری بہن ہے (قال اختی) (حوالہ بخاری شریف۔ کتاب الانبیاء)

[3] اور بخار میں مبتلا نہیں ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا خدا کا کوئی نبی تین تین جھوٹ بول کر خدا کا نبی کہلانے کا مجاز ہے؟

جب یہ آیات آئیں گی تو میں تفصیل سے' قرآن کی روسے' یہ واقعات بیان کروں گا۔ یہاں میں ضمناً عرض کر رہا ہوں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ گنائے ہیں۔ جن کے ذہن میں انبیائے کرام علیہ السلام کی حرمت اور ناموس ہے' وہ تو تڑپ اٹھتے ہیں۔ میں خود تڑپ اٹھا تھا۔ دیر کی بات ہے' آج سے پچاس سال پہلے کی بات سمجھ لیجیے۔ میں نے اس کے خلاف ایک مضمون لکھا[1]؟ وہاں ایک بہت بڑے جلیل القدر مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے جوش رواۃ پرستی میں بہت کچھ لکھا۔ یہ پمفلٹ شائع ہوا۔ یہ جلیل القدر مولوی صاحب کہنے لگے کہ اس معترض کو دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹوں کے اوپر بلبلا اٹھا ہے' جب کہ ہم پانچ جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں[2] (استغفر اللّٰہ ربّی)۔ میں نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ قرآن نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰهِیۡمَ (22:78) تمہارا باپ ابراہیم علیہ السلام کہا ہے۔ اپنے پیودے سو جھوٹ وی ثابت کرومینوں کی[3] '' یا کہو کہ وہ ہمارا باپ نہیں ہے' تو ٹھیک ہے۔ اگر تم اس کو اَبِیۡکُمۡ مانتے ہو کہ تمہارا باپ ہے تو ٹھیک ہے' مجھے کچھ کہنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ تم سو جھوٹ ثابت کرو میری بلا سے۔ عزیزانِ من! یہ مذہب ہے آج۔ بڑی دلیل لائے کہ جی' دین کے حق میں جو جھوٹی بات کہی جائے وہ اصل میں جھوٹ[4] نہیں ہوتا۔ اس پہ کوئی جرم نہیں' ندامت نہیں۔ یاللعجب!!

اس کے برعکس ایک دوسری حدیث

جہاں یہ حدیث ہے' اس سے اگلی حدیث یہ ہے کہ قیامت میں مجرم لوگ یا جو امتیں ہیں وہ نبیوں کے پاس جائیں گی کہ چلیے' خدا کے حضور ہماری سفارش کرائیے' ہر نبی اپنی اپنی کوئی نہ کوئی لغزش گنا دے گا کہ میں نہیں جاسکدا[5] جی! میں نے تو یہ کیا تھا' میں

---

[1] کہ بجائے اس کے کہ ہم اس بات پر مصر ہوں کہ یہ سب حدیثیں رسول اللہ کی ہیں' چاہیے یہ کہ ہم اپنے مجموعہ روایات کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھ لیں اور جو چیزیں معاندین نے قرآنِ حکیم کے خلاف ان مجموعوں میں داخل کر دی ہیں' انہیں الگ کر دیں' اس پر (جیسا کہ ظاہر ہے) مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔ فتاوے شائع کر دیئے گئے کہ یہ شخص ''بے دین وملحد ہے'' کہ ''احادیث مقدسہ'' کو صحیح نہیں مانتا۔ (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور 1994ء' ص 173 فٹ نوٹ 1)

[2] ان پانچ جھوٹوں کی تفصیل اس محدث صاحب کے نزدیک یہ تھی۔ (1) بت شکنی کا واقعہ (2) انی سقیم کا واقعہ اور (4,3 اور 5) مرتبہ ستارہ' چاند اور سورج کو خدا کہنے کا واقعہ (پرویزؒ: جوئے نور طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1994ء' 174' بقیہ فٹ نوٹ 1)

[3] اپنے باپ کے سو جھوٹ بھی ثابت کردو تو بھی مجھے کیا!!

[4] یہ اشارہ اس حدیث کی طرف ہے کہ مافیھا کذبتہ الا ماحل بھا عن دین اللہ (یعنی رسولؐ اللہ نے فرمایا ''ابراہیمؑ کے ان تینوں جھوٹوں میں سے ہر ایک اللہ کے دین کی مدافعت وحمایت ہی کے لیے بولا گیا تھا'' (پرویزؒ: جوئے نور' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص ص۔ 175-174)۔

[5] جی! میں نہیں جاسکتا۔

نہیں جا سکتا' میں نے یہ کیا تھا' وہ حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس آئیں گے کہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں' خود خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم نے تمہیں خلیل بنایا ہے' تم تو چلو' کہنے لگے: او میں کیا جاؤں' میں تو اپنے لیے ہی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں' تین دفعہ جھوٹ بول چکا' کس منہ سے خدا کے سامنے جاؤں [1] ۔ میں نے کہا اگر دین ہی کی حمایت میں یہ چیز تھی تو ان کو اس طرح ندامت اور شرمندگی کی ضرورت کیا تھی' ان کو تو دھڑلے سے کہنا چاہیے تھا کہ مجھ سے زیادہ آپ کے دین کا محافظ کون ہے' سچائی تو ایک طرف' میں تو جھوٹ بول کر بھی تمہارے دین کو سچا ثابت کرتا رہا۔ یہ ہیں جی! ان آیتوں کی آپ کی تفسیریں۔ آپ سوچیے کہ ان حضرات کا ان تفسیروں سے کیا کیریکٹر سامنے آتا ہے؟ پہلی بیوی موجود تھی' حضرت سارہ انکا نام بتایا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ انہیں مصر میں ایک دوسری بیوی لونڈی ملی تھی۔ بقول ان کے لونڈی تو ضرور ساتھ رکھتے ہیں۔ ہاجرہؓ ان کا نام تھا۔ نظر آ رہا ہے کہ یہ روایتیں' یہ حدیثیں' یہ تفسیریں' یہ اس ٹائپ کا جو معاشرہ ہے' یہ غالباً اسے سامنے رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ عربوں کے ہاں (سوکن کی) شدت نہیں ہوتی تھی۔ یعنی یہ جو سوتن آپ کے ہاں کہتے ہیں' اس سوتن [2] کی وجہ سے جلن اور حسد' عرب عورتوں میں بہت کم ہوتی ہے۔ میں پھر کسی وقت عرض کرونگا کہ یہ کیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ ہاجرہ کو لے تو آئے' اب اتنے جلیل القدر نبی کے گھر کے اندر ذرا جھانک کر دیکھیے کہ وہاں کیا نظر آتا ہے۔

انسان کا کردار باہر کی بجائے گھر کے اندر زیادہ بے نقاب ہوتا ہے

انسان کا کردار آپ نے سب سے بہتر دیکھنا ہو تو گھر کے اندر جھانک کر دیکھیے۔ جس طرح دوپہر کے وقت گرمی کے زمانے میں عام طور پہ گھر کے اندر کرتہ وغیرہ اتار دیا جاتا ہے' اسی طرح اپنے کردار کے اوپر بھی جو نقاب اس نے پہن رکھے ہوتے ہیں گھر کے اندر وہ اتر جایا کرتے ہیں' بڑا بے نقاب کردار سامنے آیا کرتا ہے۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وہاں بھی Acting (اداکاری) کرتے رہتے ہیں لیکن عام طور پہ گھر کے اندر جو زندگی ہوتی ہے وہ بڑی بے نقاب ہوتی ہے۔

اب گھر کے اندر کی اس کی زندگی دیکھیے جس کے اسوہ کو قیامت تک مومنین کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ اس علیہ السلام کے گھر کے اندر بقول ان کے [3] دو سوکنیں اکٹھی ہوگئیں۔ یہ لونڈی کو لے آئے' گھر جہنم بن گیا۔ ایک دن تاؤ میں آ کر سارہ نے کہدیا کہ

---

[1] حوالہ: بخاری' تفسیر سورۂ بقرہ نیز پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص۔ 175۔

[2] سوتن: سوت۔ سوکن۔ ایک خاوند کی دو یا زیادہ بیویاں آپس میں ایک دوسرے کی سوت کہلاتی ہیں۔

[3] فتح الباری بحوالہ پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص۔ 169۔

میں تو اس کے ناک اور کان کاٹوں گی' یہ بیچاری گھر سے بھاگ گئی اور حدیث میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے گھاگرہ پہنا تھا' وہ ہاجرہؓ تھی' تو وہ لٹکتا ہوا گھاگرہ پہن کر گئی تاکہ پاؤں کے نشان مٹتے رہیں ❶۔ بدھوؤں کو یہ پتہ نہیں کہ پاؤں کا نشان تو مٹ گیا' تے گھگھرے دی جیہڑی جھال پئی ہوئی ہیگی اے۔ اوباقی اے ❷ یعنی ان کو افسانہ نویسی بھی نہیں آتی۔ پاؤں کے نشان مٹانے کے لیے ''گھگھرے دی جھال پچھے تری جانڈی ہوئی ہیگی اے'' ❸۔ اس کے بعد باب 9 میں یہی کچھ لکھا گیا ہے۔ (باب9' ص ص۔233 تا240)۔

بی بی ہاجرہ کے متعلق حضرت ابراہیم کے سامنے سارہ کا تکرار

وہ گھگھرا پہن کر نکلی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ گئے اور منا کے واپس لائے۔ سارہؓ نے کہا کہ نہیں' میں تو کاٹ کے رہونگی۔ اس نے کہا کہ بی بی! مجھے پتہ ہے تُو بھی ضد کی پکی ہے۔ وہ اماں حوا کی بیٹی ہے جو پسلی سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ حدیث ہے کہ پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے اس لیے عورت ٹیڑھی پیدا ہوتی ہے' ہزار اس کو سیدھا کرو' ٹوٹ تو جائے گی مگر سیدھی نہیں ہوگی۔ اور آج شاید آپ میرے منہ یہ نئی بات سنیں جو پہلے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ یہ جو مائی حوا تھی' یہ حضرت آدم کی پہلی بیوی نہیں تھی' پہلے اور بیوی بھی تھی۔ ''اوہدا اے ناں ای نئیں لیندے'' ❹۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ چھوڑو بی بی۔ اس نے کہا کہ نہیں' میں تو کاٹ کر رہونگی۔ میری بیٹیو! کانوں کو اور ناک کو ڈھانپ لیجیے۔ انہوں نے کہا کہ یوں کیجیے کہ ''ایہدے نک چھید دیو تے نتھ پا دیو' تے کن چھید دیو تے والیاں پا دیو''۔ ''آ جیہڑی تسی نتھاں تے والیاں پایاں ہویاں نیں'' وہ یہ ہوا تھا ❺۔ تیری قسم بھی پوری ہوگئی ''تے نک کن وی اوہدے بچ گئے'' ❻۔ اور اب تک ہمارے ہاں ناک اور کان چھیدی ہوئی لڑکیاں چلی آ رہی ہیں' صاحب! بات میرے سامنے آ گئی اور' آپ حیران ہونگے کہ وہ جو میں نے کہا تھا کہ حضرتِ ابراہیمؑ کے وہ تین جھوٹ دھڑلّے سے' ہزار برس سے' کتابوں کے اندر چلے آ رہے ہیں۔ ان کے خلاف اگر کوئی ایک لفظ بھی کہے تو اسکے خلاف منکرِ حدیث اور مرتد ہونے کے فتاویٰ لگ جاتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں آتا ہوگا کہ ان کو اس میں کیا مزا ملتا ہے یعنی ان کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ حاصل بڑا کچھ ہوتا ہے۔ اپنے جھوٹ بولنے کے لیے

---

❶ حوالہ کتاب الانبیاء' صحیح بخاری' جلد دوم' ص۔146۔

❷ گھاگرے کا لکیر سا جو نشان بنتا چلا گیا تھا وہ باقی تھا۔

❸ گھاگرے کا نشان پڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

❹ اس کا یہ نام ہی نہیں لیتے۔

❺ اس کے ناک کو چھید دو اور نتھ ڈال دو اور کان چھید دو اور بالیاں ڈال دو' یہ جو آپ نے نتھیں اور بالیاں پہنی ہوئی ہیں وہ یہ ہوا تھا۔

❻ ناک اور کان بھی اس کے محفوظ رہے۔

مقدس وجۂ جواز اور سند مل جاتی ہے۔مودودی صاحب کا یہ ارشاد ہے' ان کے ہاں کے ایک پرچے میں ہی بلکہ مسلسل یہ چیز لکھی ہوئی موجود ہے کہ سچ بولنا بڑی چیز ہے لیکن زندگی کی بعض ضرورتوں کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہوجاتا ہے۔یعنی یہی نہیں کہ جائز ہوجاتا ہے کہ کوئی بات نہیں' بلکہ واجب ہوجاتا ہے' وہاں سچ بولنا گناہ ہے۔سند کیا ہے؟ کہ جی ابراہیمؑ نے تو تین دفعہ بولا ہے' میں تو ایک ہی دفعہ کہہ رہا ہوں۔دیکھا آپ نے کیوں رکھی ہوئی ہیں یہ روایتیں ان مجموعوں کے اندر؟ اپنے جھوٹ کے لیے مقدس سندیں اور اتھارٹیز بنانے کے لیے یہ حدیثیں رکھی ہوئی ہیں۔

ہمارے ہاں کی معاشرتی زندگی میں عورت کے ساتھ کیا جانے والا سلوک

اب آگے آیئے۔اب یہ جو ہمارے ہاں ان بیچاری (حوا کی بیٹی تو میں نہیں کہونگا) یہی بنی آدم' قرآنِ کریم نے جب بنی آدم کہا ہے تو اس میں عورت مرد دونوں شامل ہیں' اس نے جہاں انسان کہا ہے تو اس میں سے عورت کو خارج نہیں کردیا۔ اس نے کہا ہے کہ ولقد کرمنا بنی ادم (17-70) پوری نوعِ انسانی کو واجب التکریم پیدا کیا ہے تو عورت اس کے اندر شامل ہے۔اس نے جہاں (یایھا الذین امنوا) کہا ہے تو یہ عورت مرد دونوں کے لیے ہے۔زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں مرد اور عورت دو جنسیں Feminine Gender اور Mascular Gender یکجا آجائیں تو اس کے لیے Verb (فعل) اور ضمیریں ہمیشہ Mascular (مذکر) آتی ہیں۔لیکن قرآن نے تو یہ سمجھ کے کہ ہم کس قسم کے واقع ہوئے ہیں ہمارا منہ بند کرنے کے لیے المومنین والمؤمنٰت بھی کہا ہے' والمسلمین والمسلمٰت والقٰنتین والقٰنتٰت (33-35) بھی کہا ہے۔'نکھیڑ کر' جسے کہتے ہیں اس نے یہ ساتھ کہہ دیا لیکن اس کے باوجود' عزیزانِ من! کتنے ہی ہم آگے چلے گئے' اسلام کو چھوڑ دیا' مدت ہوئی ماڈرن بھی بنے' اس کے باوجود ذہنی طور پر ہم آج تک عورت کو مرد کی سطح پہ نہیں لائے ہیں' اسے مرد کی سطح پر نہ لانے کی سند کیا ہے؟ یہ اسوۂ ابراہیمیؑ' کہ دو بیویاں ہیں۔دو بیویوں کے لیے یہ کہتے ہیں کہ یہ جائز اسی صورت میں ہے کہ عدل کرو۔اب یہ عدل ہو رہا ہے کہ ایک بیوی[1] کہتی ہے کہ ناک کان کاٹ دونگی اور وہ بیچاری[2] بھاگ جاتی ہے' ان کو پکڑ کے یا منا کے لاتے ہیں' اس[1] کی شرط پوری کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ اچھی بات' کاٹو نہیں چھید ہی کردو۔ یہ حدیث کیوں رکھی ۔ جسے آج کل تعزیراتِ اسلامی کہتے ہیں اس میں یہ ہے کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارو۔اب سو کوڑے' یہ میں بعد میں کبھی آؤنگا تو بتاؤں گا کہ وہ کوڑا کس کو کہتے تھے' وہ مارو۔انہیں فکر پیدا ہوگئی کہ صاحب! وہ سو کوڑے کھا کے تو زندہ رہنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی' کیا کیا

---

[1] یہ حدیث کے مطابق اشارہ حضرت سارہؓ کی طرف ہے۔

[2] یہ اشارہ حضرت ہاجرہؓ کی طرف ہے۔

جائے؟ انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں' خدا نے اس کے لیے راستہ دکھایا ہوا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر بڑھاپا ہو' کمزوری ہو' بیماری ہو اور یہ کچھ وہ جرم ثابت ہو جائے تو سو کوڑے کے بجائے ''اک بوکر لے [1] کے'' مار دو لیکن وہ جھاڑو لے کے مارو جس میں سو تنکے ہونے چاہئیں۔ وہ مار دیئے تو سو کوڑے پورے ہو گئے۔ ''رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔'' زنا کے مجرم بھی ہو گئے اور اسلامی تعزیرات بھی پوری ہو گئیں۔ بقول ان کے یہ ہے اسوۂ ابراہیمی !! بہت اچھا جی ! ہوا کیا؟ یہ کہ پہلی بیوی کے ہاں اولاد نہیں تھی' اس دوسری کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ یہ ہوا جلتی آگ پہ تیل کہ بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ اس پہلی کے ہاں بھی حضرتِ اسحٰق بیٹا پیدا ہو گیا۔ حضرتِ اسماعیلؑ دوسری کے ہاں پہلے پیدا ہوئے۔ قاعدے کی رو سے جو پہلوٹھی کا بیٹا ہوتا تھا یعنی سب سے بڑا بیٹا' وہ اس ملکِ عظیم کا وارث ہو جایا کرتا تھا۔ وہ یاد رکھیے جو ابھی میں نے دسرتھ اور رام کا قصہ بتایا تھا۔ اب وہی بات آئی' اس نے کہا کہ راج پاٹ کا مالک تو یہ اسماعیل ہو جائے گا میرا بیٹا تو نہیں ہو سکتا۔ یہ وہی تھا جو بیوی نے اپنے بوڑھے شوہر دسرتھ سے کہا تھا۔ آپ حیران ہونگے' ان کے ہاں سنسکرت کے بعض محقق ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو برہما ہے یہ اصل میں ابراہیم ہی ہے وہ ہمارے ہاں کی شخصیت تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ دیکھ لیجیے' وہ دونوں سوکنیں ہیں اور کہتی ہیں کہ میرا بیٹا ہی ولی عہد ہو۔ اب ابراہیمؑ بوڑھے ہیں' یہ وہی راجہ دسرتھ کی طرح ہے۔ اب کیا کیا جائے؟

حضرت ابراہیم کا لق ودق صحرا میں اپنی بیوی کو چھ ماہ کے بچے کے ساتھ چھوڑ کر چلے آنے کا قصہ وغیرہ

عزیزانِ من ! کیا بتاؤں !! چھ مہینے کا دودھ پیتا بچہ ہے' یہ بیوی ہے' اس بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے کہ راج پاٹ اس کو ملے گا' خدا کا اولوالعزم پیغمبر کیا کرتا ہے؟ وہ اس بیوی کو اور اس بچے کو ساتھ لیتا ہے' فلسطین کی شادابیوں سے نکل کر اس مکے کی وادیٔ غیر ذی زرع میں لے جاتا ہے۔ وہ تفسیر لکھی ہے کہ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ بقول ان کے کوئی اردگرد آبادی ہی نہیں تھی' صحرا تھا' ویرانہ تھا' بیابان تھا' پانی تک نہیں تھا۔ وہ بیوی کو اور اس بچے کو لا کر اس لق ودق صحرا کے اندر اکیلے تنہا چھوڑ گئے' پانی کا ایک تھوڑا مشکیزہ سا دے گئے۔ جا رہے ہیں تو بیوی آوازیں دے رہی ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں' ہمیں کہاں چھوڑ رہے ہو' یہاں تو ایک درندہ آ جائے تو بچے کو پکڑ کر لے جائے گا۔ یہ اتنا سا پانی کا مشکیزہ ہے' عرب کا صحرا ہے' بتاؤ تو یہ اس کے اندر کتنے وقت کے لیے کافی ہوگا؟ بچہ بلک بلک کر مر جائے گا۔ انہوں نے مڑ کے نہیں دیکھا' وہ پھر چلائی' مڑ کر دیکھا' کہا کہ کیا کروں میں' خدا کا حکم جو ہوا۔ وہ خدا یعنی 'بازی بازی باریشِ بابا ہم بازی۔ بات حضرتِ ابراہیمؑ تک رکھتے تو چلیے ہم کہتے کہ انسان کے متعلق ہے۔ مگر یہاں تو خدا کا حکم کہا ہے کہ چھ مہینے کے بچے اور بیوی کو لے کر اس طرح لق ودق صحرا کے اندر چھوڑا اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر چلے آئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ پھر کیوں کیا گیا؟ وہ جو پہلی بیگم صاحبہ ہیں ان کی رضا جوئی کی خاطر کہ ان کا جو بیٹا ہے

---

[1] ایک جھاڑو لے کر

وہ ولی عہد ہونا چاہیے۔ میں یہ دہراتا چلا جاؤں کہ حضور ﷺ کی زندگی کی کو اور حضرت ابراہیمؑ زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! جو کچھ آج کل ہمارے گھروں میں' بالخصوص جتنا یہ مذہب پرست طبقہ ہے' ان کے گھروں کے اندر جو کچھ ان کی بیویوں کے ساتھ' اولاد کے ساتھ ہوتا ہے' وہ یہ ہے جو کچھ وہاں ہوتا ہے۔ میں نے انسانوں سے سنا ہے۔ ہم دلی میں رہا کرتے تھے' اس کے ساتھ ہی ایک مکان تھا وہاں دلی کے ایک بہت بڑے مفتی اعظم رہا کرتے تھے۔ جس طرح مہینہ ختم ہوتا ہے اور کلینڈر کا وہ صفحہ پھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے' ان کے ہاں بیویاں اس طرح' کلینڈروں کی طرح بدلی جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کتنی بدلنے کے بعد' وہ چار تو مستقل طور پہ بہرحال رکھی جاتی ہیں۔ جوان بیوی' وہ لائی ہوئی تھی' وہ بیمار تھی' اندر جو کچھ ہوتا تھا ہم تو بہرحال نہیں سنتے تھے' (ان کا اور ہمارا زینہ مشترک تھا) غصے میں آتے آتے زینے میں کھڑے ہو کر اس سے کہتے ہیں کہ سنو بی بی! شریعتِ حقہ کی رو سے آپ کا نان ونفقہ تو ہمارے ذمہ ہے بیماری کا علاج ہمارے ذمہ نہیں ہے' اس کے لیے آپ کو اپنے بھائی کو لکھنا ہوگا۔ ان کے ھروں کی زندگیاں' آپ دیکھیں گے' اتنی گھناؤنی ہوتی ہیں۔ اسوۂ ابراہیمیؑ تو یہ ہوا!! کہ وہاں چھوڑ گیا اور آگے پھر زیبِ داستاں کے لیے ہے کہ پانی ختم ہوا' بچے نے چیخنا اور بلبلانا شروع کیا' حضرتِ ہاجرہ بھاگی بھاگی پہاڑی پہ چڑھتی تھیں کہ کہیں پانی نظر آئے' پھر بچے کی وحشت ستاتی تھی کہ کہیں کوئی لے نہ جائے' پھر بھاگ بھاگ کے آتی تھی اور اس کے بعد یہ ہے کہ جی! یہ بین الصفاء والمروہ کیا جاتا ہے۔ یہ سعی کا عمل اس کے اتباع کے اندر کیا جاتا ہے کہ ابراہیمؑ یوں چھوڑ گئے تھے۔

اپنی بیوی کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ کا اپنی بہو کے ساتھ کیے جانے والا سلوک

یہ اسوۂ ابراہیمیؑ بیان ہو رہا ہے۔ اچھا جی! چھوڑ گئے' بچہ بڑا ہوا اس نے شادی کی' وہ بیگم صاحبہ اجازت نہیں دیا کرتی تھی کہ جا کر ان کو دیکھ بھی آتے' بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی۔ اجازت ملی تو اس نے شرط لگائی کہ آپ جا تو سکتے ہیں لیکن سواری سے اترنا نہیں ہوگا' سواری پہ بیٹھے بیٹھے ہی خیر خیریت پوچھ سکتے ہیں' اتر نہیں سکتے۔ یہ ابراہیمؑ ہے جو بادشاہ کے حضور بھی کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ تیری غلط بات کو بھی میں ماننے کو تیار نہیں' بیوی کے سامنے کیا حالت بتائی جا رہی ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ میں ان روایات کی بنا پہ عرض کر رہا ہوں۔ قرآن کی رو سے اتنا جلیل القدر نبی ہے اور اس کی کیفیت یہ کہ جی بہت اچھا! اجازت تو دو ''تہاڈی اینی بڑی مہربانی ہیگی''❶۔ چلے گئے' سواری پہ بیٹھے ہوئے ہیں' وہاں آ گئے' یہ آپ کی حدیثیں ہیں' عزیزانِ من! جن کی رو سے کہتے ہیں کہ اسوۂ ابراہیمیؑ کو سمجھو۔ اس وقت حضرت اسماعیلؑ گھر پہ نہیں تھے۔ انکی بیوی آپؑ کی بہو' گھر پہ تھیں اس نے کہا کہ ابا جان! تشریف لائیے' آئیے! سفر کے مارے میں دیکھ رہی ہوں آپ کے بال مٹی سے اٹے ہوئے ہیں' منہ ہاتھ دھو لیجیے' میں آپ کا سر دھلاتی ہوں۔ کہنے لگے: بیٹی! میں اتر تو نہیں سکتا سر بھی دھونا ضروری ہے۔ وہاں سواری پہ بیٹھے بیٹھے اِدھر ہی پہلے اِدھر سر جھکایا' اس نے ادھر کا حصہ دھو دیا' پھر اُدھر جھکایا پھر اُدھر کا حصہ دھو دیا۔ اس نے تو اتنی خاطر تواضع کی' جاتے جاتے کہنے

---

❶ آپ کی اتنی بڑی مہربانی ہے۔

لگے کہ اسماعیلؑ آئے تو کہنا کہ تمہارا باپ آیا تھا اور وہ کہہ گیا تھا کہ بیٹا! چوکھٹ جلدی سے بدل لو۔ چلے گئے۔ بیٹا آیا۔ اس نے کہا کہ ابا جان! تشریف لائے تھے' میں نے بہتیرا کہا کہ آیئے پانی وانی پیجیے' تو کہتے ہیں کہ میں نے اترنا نہیں ہے' بہرحال میں نے اس کے باوجود ان کا سر دھویا' کنگھی کی' منہ دھلایا' وہیں پانی وانی پلایا۔ اس نے کہا: بہت اچھا! کہنے لگے پھر کچھ کہہ گئے تھے' کہنے لگے کہ انہوںؑ نے کہا تھا کہ اسماعیل آئے تو کہنا کہ بیٹا! جلدی سے چوکھٹ بدل لو۔ کہنے لگے: ہاں ٹھیک ہے' میں سمجھ گیا' کہنے لگے: کیا سمجھ لیا؟ سنیئے' عزیزانِ من! کیا سمجھ لیا؟ انہوں نے کہا تھا کہ بیوی کو طلاق دیدو[1] اور اسماعیلؑ نے اسی وقت بیوی کو طلاق دیدی۔ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے!! یہی ہو رہا ہے نا آج تک آپ کے ہاں۔ پھر سعادت مند بیٹا وہ ہوتا ہے کہ جب بھی بہو کی چوڑیوں کے اوپر صاحب' صاحبہ کا پاؤں پڑتا ہے تو آتے ہی وہ کہتے ہیں کہ ''میرا پتر ہیگا ایں ناتے میں اکوای گل کہنی ہیگی۔ جے نئیوں منّی تے دودھ نئیوں بخشاں گی''۔[2] امی جان! آپ فرمایئے تو سہی' میں تو آپ کا سعادت مند بیٹا ہوں' آپ کے قدموں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے' کہیے تو سہی۔ ''اے کلیان جیہڑی ہیگی اے' ایہنوں گھروں کڈ' ایتھے کھلو کے' تین طلاقاں دے اینوں''۔[3] ماں باپ کی اطاعت فرض ہے' ماں کے پاؤں نیچے جنت ہے' وہ تین طلاقیں لے رہی ہے' وہ کھڑی دیکھ رہی ہے۔ ارے! یہ کس طرح سے جائز ہے؟ کہا کہ جی اسوۂ ابراہیمیؑ کو قرآن نے آپ کے لیے فرض قرار دیا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ یا اللہ! او! کسی کو تو رہنے دو' کسی کو تو بخشو۔ یہ اسوۂ اسماعیلیؑ ہے۔ اس نے باپ کا سر دھلایا ہے' خدمت کی ہے' جنگل میں رہ رہی ہے' کہیں واپس گئی نہیں ہے' اس کو وہاں بیٹھے بیٹھے مار رہا ہے' وہ بٹا بھی بڑا ہو گیا ہے' اسے پتہ نہیں کہ کسی وقت باپ وہاں آ نہ جائے۔ اس کی ماں تو مر چکی ہوئی تھی یعنی جو حضرتِ اسماعیلؑ کی والدہ تھیں وہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی تھیں۔ اس پہ غصہ نکل رہا ہے۔ وہ جاتے جاتے بغیر کچھ بتائے کیوں یہ حکم دے جاتے ہیں؟ بیٹا سنتا ہے' بغیر اس بیوی سے پوچھے ہوئے کہ انہوں نے یہ کیوں کہہ دیا ہے اسے طلاقیں مل جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ تمہارے لیے ابراہیمؑ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے اس کی تفسیر دیکھنی ہے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو بہترین نمونہ ہے تو ان کتبِ احادیث اور تفاسیر میں دیکھو۔ وقت تھوڑا سا ہے' گرمی بھی زیادہ ہو رہی ہے' میں درس لمبا نہیں کرنا چاہتا ورنہ میں اور مثالیں بھی دے سکتا ہوں۔ یہ اس زندگی کے نمونے ہیں' جسے قرآن نے اسوہ قرار دیا ہے۔ ہمیں ان روایات میں یہ گوشے ملتے ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ

---

1. فتح الباری۔ ماخوذ از پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994 ص ص۔ 171-170۔
2. اگر میرا بیٹا ہو تو اس رشتہ کی وجہ سے مجھے تم سے ایک ہی بات کہنی ہے۔ اگر تم نے نہ مانی تو میں دودھ نہیں بخشوں گی۔
3. یہ منحوس جو ہے اس کو گھر سے نکال دے' اسی جگہ کھڑے کھڑے اس کو تین طلاقیں دے دو۔

نے قیامت تک مومنوں کے لیے بہترین اسوہ قرار دیا ہے۔ کبھی کبھی آپ پوچھا کرتے ہیں کہ صاحب! پھر ہمارے ہاں یہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ کیوں ہو رہا ہے' اس کی سند کیا ہے' اس کی دلیل کیا ہے؟ ان چیزوں کی یہ سند اور دلیل ہے۔ ہر روز آپ کے ہاں یہ قصے ہیں' یہ طلاقوں والا قصہ تو میں نے عرض کیا ہے کہ عام ہے۔

ہمارے ہاں ازدواجی رشتوں کی انجمنیں' عورت کے ساتھ کی جانے والی زیادتیاں اور شریعت کے فتوے

عزیزانِ من! دنیا کی کوئی قوم انسانیت کی صف پہ نہیں آ سکتی تاوقتیکہ وہ عورت کو انسان نہ سمجھے۔ یہ خدا کے فیصلے کے خلاف چیلنج ہے' بغاوت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے پوری نوعِ انسانی کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں (معاذ اللہ) تم غلط کہتے ہو' کہ یہ جو باقی آدھی انسانیت ہے' یہ بھی واجب التکریم ہے' اور پھر یہ آپ کے ہاں کے شریعت کے احکام بنتے چلے گئے۔ آپ نے اس کو حلقۂ زوجیت کے اندر لینا ہے' بیوی بنانا ہے' نکاح کرنا ہے تو اس کے لیے لڑکی کی رضا مندی نہایت ضروری ہے یعنی اس وقت اس کی رضا مندی نہایت ضروری ہے' اس معاہدے کے لیے جو ازدواجی زندگی کے لیے طے پا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رضا مندی کے لیے پھر کس طرح سے اس کو فریب دیا جاتا ہے' نابالغ چھ چھ مہینے کی بچی ہے' اس کا نکاح کر دیا جاتا ہے۔ پوچھا کہ صاحب! اس کی تو رضا مندی ضروری ہے' کہنے لگے کہ باپ نے جو رضا مندی دیدی۔ ''او نکاح باپ دا ہون لگا کہ ایہد ا ہون لگا اے''[1]؟ ولی کی اجازت ہے۔ اتنا ہی نہیں' بالغ لڑکی کا نکاح بھی ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ یعنی معاہدہ اس نے کرنا ہے' دستخط اس کے ''پیؤ[2] دے'' بھی لیے جا رہے ہیں: چلیے جی رضا مندی ضروری ہے اور اس کے بعد اس معاہدے کو جب توڑنا ہے تو یہی نہیں کہ اس کی رضا مندی ضروری ہے' اسے پوچھا بھی نہیں جاتا' بتایا نہیں جاتا' وجہ نہیں بتائی جاتی' نیلام گھر کی طرح ایک دو تین کھڑا کھڑا' وہ کر دیتا ہے۔ بیچاری کا سر سفید ہوا ہے' بال بچوں والی ہے' میرے علم میں ایسے ایسے واقعات آتے ہیں کہ میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ میری تو کیفیت' عزیزانِ من! اس ڈاکٹر کی طرح کی سی ہے' ہر روز اس بابا کے پاس یہ بچیاں آتی ہیں' میں نے دیکھا ہے کہ سر کے بال سفید ہوئے چلے ہیں' آ کے کہتی ہیں بھائی جان! جاؤں کہاں؟ ماں باپ کا گھر نہیں ہے' کوئی بھائی باپ بھی نہیں ہے' یہ بچے میرے ساتھ ہیں' اس عمر میں کہاں جاؤں؟ کہنے لگی: مولوی صاحب کے پاس گئی تھی کہ کوئی مداوا بتائیے۔ میری بچیو! مجھے معاف رکھنا' مجھے یہ چیزیں بتانی پڑتی ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہاں شکل تو نکل سکتی ہے' شریعت نے جہاں یہ کہا ہے وہاں شریعت تو آپ کی بہت مصالحت والی ہے'

---

[1] نکاح باپ کا ہو رہا ہے یا اس کا ہو رہا ہے؟

[2] دستخط باپ کے

[3] سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903-1979)۔

بڑی مصلحتیں ہیں' اس میں بڑے منافع ہیں۔ پوچھا کہ جی وہ شکل کیا ہے؟ کہ جی! آپ کو وہ حلالہ کرنا ہوگا مولوی صاحب! وہ کیا ہوتا ہے؟ معاذ اللہ' بچو! کانوں میں انگلیاں دے لو اور مجھے معاف کردو (کہ تمہارا بابا کیا کہتا ہے)۔ ایک شب کے لیے کسی دوسرے مرد کے پاس رہو۔ وہ سر سفید والی بیوی' جس کے ننگے سر کو آسمان کے تاروں نے بھی نہیں دیکھا تھا' اس کو یہ کہتا ہے: یہ شریعت تو خدا کی بتائی ہوئی ہے' اس میں تو بڑی مصلحتیں ہیں' اس نے راستہ بتایا۔ یہ راستہ بتا رہا ہے!!!۔ پوچھا گیا کہ وہ تو نکاح کے زمانے میں اتنے اصول بتائے جا رہے تھے' شرطیں لکھی جا رہی ہیں' اس کی Approval (منظوری) لی جا رہی ہے' اس کے دستخط لیے جا رہے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ جو اس معاہدے کو توڑ رہے ہو' دو فریقین میں معاہدہ ہوتا ہے' برابر کی سطح پہ وہ معاہدہ ہوتا ہے' اس وقت اس کو یہ نہیں کہ پوچھا نہیں جاتا' بتایا نہیں جاتا' یکطرفہ فیصلہ ہے۔ بڑے سے بڑا ڈکٹیٹر بھی ایسا فیصلہ نہیں کرے گا کم بخت!۔ اور یہ کھڑے کھڑے وہ فیصلہ کیا جاتا ہے' اس کی زندگی اور اس کے بچوں کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ صاحب! یہ چیزیں بھی کیوں رکھی تھیں۔ آپ کے ہاں کے یہ مفسر مودودی صاحب فرماتے ہیں' ان کے ہاں کے جماعت کے جو بہت بڑے بڑے اکابرین تھے' انہوں نے 1970ء میں ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ان کے خلاف انہوں نے فرد جرم ایک عائد کیا' اس میں یہ بھی ایک چیز تھی کہ تم جھوٹ بولتے ہو' ایک یہ تھا کہ جب آپ نے جماعت بنائی تھی تو آپ نے اس وقت بڑے بڑے بلند اصول دیئے تھے جن کے مطابق یہ جماعت کام کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے اور یہاں آنے کے بعد جب آپ حصولِ اقتدار کے پیچھے پڑے ہیں' وہ سارے اصول آپ نے ایک ایک کر کے توڑ دیئے ہیں۔ یہ کیوں کیا؟ کہنے لگے کہ بھائی! میں کون ہوں یہ کرنے والا' رسول اللہ ﷺ نے بھی تو ایسا کیا تھا' جب آپ ﷺ کو ضرورت تھی امت بنانے کی' مملکت حاصل کرنے کی' تو اصول یہ مساواتِ انسانیہ دیا تھا' ایک سطح کے اوپر کھڑا ہونا' ان کے ہاں کسی قسم کا بھی کوئی فرق نہیں' رنگ کا' خون کا: قرابت داری کا کوئی امتیاز نہیں۔ اور جب یہاں مملکت ہاتھ میں آئی تو حضور ﷺ نے فرما دیا کہ یہ بادشاہت تو میرے خاندان میں رہے گی: الائمہ من القریش' کہا کہ مساواتِ انسانیہ کا وہ عظیم اصول جو ابتدائی زندگی میں جماعت سازی میں' کیا تھا' رسول اللہ ﷺ نے توڑا یا نہیں؟ میں نے توڑ دیا تو کیا قیامت کی' میں نے تو سنتِ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کیا ہے۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ صاحب! یہ طلاق کے معاملے کے اندر عورت بیچاری کو تو کچھ دخل ہی نہیں ہے' یہ جو اس معاہدے کی طلاق طلاق طلاق ہوگئی' اس معاہدے کو دونوں فریقین نے ایک سطح پہ کھڑے ہو کے باندھا تھا' اس میں یہ اکیلا کیوں توڑ رہا ہے؟ کہنے لگا کہ رسول ﷺ ایک اصول توڑ سکتا ہے' تو یہ نکاح کی شرط توڑ دیتا ہے تو کیا ہوگیا۔ چل بھئی سند یہ ملی!!!۔ اور کہا کہ تم کہہ رہے ہو کہ صاحب! کوئی وجہ تو بتایئے کہ اس بیچاری کو کیوں طلاق دی' کہا کہ کیا حضرتِ اسماعیلؑ نے اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت وجہ بتائی تھی؟ یہ تو

انبیائے کرامؑ کا اسوۂ حسنہ ہے جس کی پیروی ہم کر رہے ہیں۔ یہ روایات بالبداہت بتا رہی ہیں کہ غلط ہیں' یہ نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہوسکتیں۔ ان حدیثوں کی کتابوں کے اندر انہوں نے یہ کیوں رکھی ہوئی ہیں؟ کیا اس لیے رکھی ہوئی ہیں؟ کہ جہاں اپنے اس قسم کے کارناموں کے متعلق کوئی جواز کی وجہ' کوئی سند' کوئی دلیل دینی ہو تو اس قسم کی حدیث لاکر کھڑی کردی؟ کہتے ہیں کہ بتاؤ! حضرتِ اسماعیلؑ نے بیوی کو بتایا تھا؟ اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو حکم دیدیا تھا؟ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ ماں یا باپ کہتا ہے کہ بیوی کو طلاق دیدو تو اسوۂ ابراہیمیؑ کا اتباع ہے یا نہیں؟ اور بغیر وجہ بتائے طلاق دینا حضرتِ اسماعیلؑ کی زندگی کا یہ واقعہ ہے یا نہیں؟ اور اگر آپ 'نہ' کریں تو منکرِ حدیث' ملحد' مرتد' بے دین پرویز۔ کہاں جایئے عزیزانِ من!۔

علامہ پرویزؒ کی طرف سے سیرت پر لکھی ہوئی کتب پر تبصرہ

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ ایک چیز قرآن نے جو بتائی' میں تو ابراہیمؑ کے اسوۂ حسنہ کی آیت پہ آ رہا ہوں' میرا خیال ہے' میں ہمت نہیں کرسکوں گا جہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق دوسری آیت ہے۔ دو ہی مقام ہیں۔ اسوہ حضور ﷺ کی زندگی کے متعلق بھی ان روایات میں جو کچھ کیا ہوا ہے جرأت نہیں ہوسکتی کہ اس کو بیان کیا جائے۔ اور انہوں نے اپنے اس قسم کے جو فعلِ شنیع ہیں' ان کی وجۂ جواز یا سند پیش کرنے کے لیے ان چیزوں کو ان کتابوں کے اندر داخل کیا اور رکھا جا رہا ہے۔ کراچی میں میرے پاس' پاکستان بننے کے بعد' بہت بڑی اتھارٹی کی طرف سے یورپ سے ایک کتاب آئی' وہ تو جانتے تھے کہ یہ بھی کچھ جانتا ہے' یہ کتاب حضور ﷺ کی زندگی کے متعلق ایک مستشرق کی لکھی ہوئی تھی اور اس میں انہوں نے لکھا کہ اس کے اندر ایسی ایسی باتیں حضور ﷺ کے متعلق کہی گئی ہیں کہ اس کی بنا پہ اس کتاب کو Ban (ضبط) کرنا چاہیے۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اسے Ban (ضبط) کرنا چاہیے؟ میں نے کہا یقیناً Ban (ضبط) کرنا چاہیے' لیکن اسے بین کرنے سے پہلے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن کو Ban (ضبط) کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس شخص نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے اس نے ریفرنس دیا ہے' حوالے لکھے ہیں' یہ حوالے آپ کی حدیثوں کی کتابوں کے لکھے ہیں' میں نے حوالے چیک کر لیے ہیں' ایک ایک حوالہ صحیح ہے۔ یہ جو ریفرنسز اس نے دیئے ہیں اس کی بنا پہ اگر یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کو Ban (ضبط) کیا جائے تو وہ ساری کتابیں اس قابل ہیں جہاں سے اس نے یہ ریفرنس لیا ہے کہ ان کو Ban (ضبط) کیا جائے۔ میں نے کہا کہ وہ تو اس کا سرچشمہ وہاں سے لے رہا ہے' اس کا جرم کیا ہے؟ اگر وہ کہیں غلط حوالہ دیتا پھر تو اس کے خلاف آپ ایکشن لیتے۔ وہ بالکل صحیح ہیں' ترجمے تک آپ کے ہاں کے دیئے ہوئے ہیں' حوالہ جات آپ کی کتابوں سے دیئے ہوئے ہیں' کتابیں میرے پاس ہیں' یہ لیجیے میں آپ کو کتابیں دیتا ہوں' کیجیے ان کو بھی ضبط۔ پھر اس کے بعد نہ وہ کتاب ادھر آئی' نہ ان کی چٹھی کا وہ بیان آیا۔ یہ کتابیں اسی طرح سے پڑھائی جا رہی ہیں۔ اسوۂ ابراہیمیؑ

عزیزانِ من! وہ تھا کہ اگر باپ کے سامنے، شخصی حکومت والے بادشاہ کے سامنے، پوری کی پوری قوم کے سامنے، غلط بات ہو رہی ہے تو اسے چیلنج دو۔ اندازہ لگایئے! اس مشن کے لیے، اپنی اولاد تک کو، اس طرح سے ساری زندگی کو وقف کر دینا، خود وطن تک چھوڑ دینا، بادشاہت چھوڑ دینا، حکومت چھوڑ دینا، کتنا اعلیٰ مشن ہے! جس شخص کو وہاں کہتے تھے کہ اس کو آگ میں جلا دو، اس وقت بھی اس نے جھوٹ نہیں بولا، وہ یہاں آ کر یہ جھوٹ بولے گا!!!۔ قرآن اسے صدیقًا نبیًا کہہ رہا ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ قرآن نے جو اسوۂ حسنہ کہا ہے کہ یہ اصل اتباع ہے تو یہ کہاں سے لیں گے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا جیسا میں نے پہلے بھی کبھی کہا تھا کہ اسکول میں ڈرائنگ کی یا آرٹ کی وہ کلاس ہو اور اس میں وہ ٹیچر یا پروفیسر بچوں سے کہے کہ اس ماڈل کے مطابق اپنے اپنے ہاں آپ سکیچز بنایئے، اسوہ کے معنی ماڈل ہوتا ہے اور وہ ماڈل وہاں نہیں رکھے تو وہ جو سکیچز بنیں گے وہ پھر کیا ہونگے؟ وہ ماڈل پھر حنفی شافعی حنبلی شیعہ سنی [1] ہوگا۔ اس ٹیچر کے متعلق آپ کیا کہیں گے، اس امتحان کے متعلق آپ کیا کہیں گے کہ اس ماڈل کے مطابق اپنا سکیچ بنایئے اور وہ ماڈل سامنے نہیں ہے۔ کیا خدا یہ کہتا کہ اسوۂ حسنہ تمہارے لیے ابراہیمؑ کی ماڈل زندگی ہے اور ماڈل وہ دیتا نہیں، کہتا ہے کہ وہ ماڈل آپ تلاش کرو۔ جس نے یہ کہا ہے اس نے وہ پورا ماڈل قرآن کے اندر دیا ہے، اور جس نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو ماڈل کہا ہے اس نے حضور ﷺ کی پوری سیرت قرآن کے اندر دی ہوئی ہے، عزیزانِ من! میں نے جو اپنی کتاب سیرت معراجِ انسانیت ﷺ، مرتب کی ہے اس کی بنیاد ہی اس پہ ہے کہ قرآنِ کریم کی آیت اور اس کے ماتحت رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس کی تفسیر، یہ ہے طریقہ۔ تو اس سے آپ قرآن کو سمجھیے قرآن کے ان دعاوی کو سمجھیے کہ ابراہیمؑ کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ ہے۔

---

[1] آئمہ فقہا: چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لیے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی، یعنی:

1- امام اعظمؒ (کوفی) (80-150ھ)

2- امام مالکؒ (یمنی، مدنی) (93-1790ھ)

3- امام شافعیؒ (عسقلانی، مکی) (150-204ھ)

4- امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) (164-241ھ)

اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے۔

(ماخوذ از پمفلٹ: فقہی قوانین کی دینی حیثیت: ادارۂ طلوع اسلام، لاہور، ص۔9)

عزیزانِ من ! ہم آئندہ درس پھر اگلی آیت سے لیں گے ۔ایک بات اور ہے کہ جس طرح کتاب میں بعض اوقات کتابت کی غلطیاں رہ جاتی ہیں' اسی طرح بات کرنے میں بھی' تقریر میں بھی' بعض دفعہ کچھ تسامح ہو جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میرے سامعین ایسے ہیں کہ میرے ایک ایک لفظ کے اوپر توجہ دیتے ہیں ۔کبھی اس قسم کا تسامح یا غلطی سہواً ہو جاتی ہے تو گرفت کرتے ہیں پھر مجھے اس کی اطلاع بھی دیدیتے ہیں' میں ان کا شکرگزار ہوں ۔بعض چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کچھ یونہی لفظی سی بات ہوتی ہے' بعض چیزیں واقعی کبھی اس طرح سے' غلطی سے' نسیان سے' واقعہ کے خلاف ہو جاتی ہیں ۔مثلاً جیسا انہوں نے کہا کہ پچھلی دفعہ تم نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا تھا کہ وہ مصر سے دریا عبور کر کے ایبی سینیا[1] گئے' یہ غلط ہے' مجھے صحرائے سینا' میں کہنا تھا' میں ان کا شکرگزار ہوں ۔ میں نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ ٹیپ کے اندر بھی یہ چیز آ جائے' کبھی اس کے بعد بھی اگر آپ احباب اس قسم کی کوئی چیز مجھ سے سنیں تو مجھے اس کی اطلاع دیدیا کریں' میں آپ کا شکرگزار ہوا کروں گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اس کی تصحیح وہیں' اسی مقام پہ کر دی گئی ہے۔

نواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 105 تا 122)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1978ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الشعراء کی آیت 105 سے ہو رہا ہے:

(26:105)۔

حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی رسول آئے تھے

ذکر آ رہا ہے حضرتِ نوح علیہ السلام کا۔ قرآنِ کریم نے سلسلۂ رشد و ہدایت کا آغاز حضرتِ نوح علیہ السلام سے کیا ہے۔ قرآن میں یہ ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام بھی سب سے پہلے نبی نہیں ہیں، جن کا ذکر ہے بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ ان سے پہلے بھی اسی قوم میں اور رسول آئے تھے اور اُس قوم نے ان کی بھی تکذیب کی تھی۔ ویسے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں تھی جس میں خدا نے اپنے رسولوں کو نہ بھیجا ہو۔ اس لیے کہ خدا نے جب یہ وعدہ کیا تھا کہ ہماری طرف سے ہدایت آئے گی اور جو اس ہدایت کا اتباع کرے گا **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** [1] (2:62)۔ بنی آدم یعنی نوعِ انسان سے یہ کہا تھا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ نوعِ انسان سے ایک وعدہ کیا جائے، ذمہ داری لی جائے اور اُسے صرف ایک خاص خطۂ زمین تک محدود کر دیا جائے۔ خدا نے کہا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں تھی جس میں ہم نے ہادی کو نہ بھیجا ہو لیکن قرآنِ کریم نے دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ان انبیائے کرام میں سے بیشتر تو وہ ہیں جن کا ہم نے تصریحاً ذکر نہیں کیا اور چند ایک وہ ہیں جن کا ہم نے صراحت سے ذکر کیا ہے اور صراحت سے انہی کا ذکر ہے جن سے زمانۂ نزولِ قرآن میں عرب اور اس کے گردونواح میں بسنے والی قومیں یہودی عیسائی اور خود عرب مانوس اور شناسا تھیں۔ یوں کہیے کہ Semitic Race (سامی النسل) میں جو انبیائے کرام علیہم السلام آئے ہیں ان کا صراحت سے نام لے کر قرآن نے ذکر کیا ہے، دوسروں کا صراحت سے نہیں کیا۔ بات صاف تھی کہ اگر عربوں سے کہا جاتا کہ صاحب! کنفیوشس (C.551-479BC) نے اپنی قوم سے یہ کہا تو وہ پہلے پوچھتے کہ یہ کنفیوشس ہے کیا؟ تو اتنا وقت اس میں صرف ہو جاتا اور بحث اس پہ چھڑ جاتی۔

مذہب میں انبیائے کرام کو ایک واعظ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے

قرآن کا مقصد کوئی خاص History (تاریخ) بیان کرنا نہیں ہے، وہ تو دین بیان کرتا ہے اور یوں جو دین کی بات آ گئی ہے تو بنیادی طور پر اسے سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے ہاں جب دین کو مذہب بنا دیا تو انہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی واعظ بنا دیا: بس وہ آتے تھے اور لوگوں سے وعظ کہتے تھے اور پھر وعظ کے بعد کہتے تھے کہ دیکھو بھئی! میں نے کہا ہے کہ خدا کے لیے ایسا کرو۔

---

[1] نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہوگا، نہ حزن، وجۂ افسردگی بنے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔22)۔

ان کا وعظ بھی زیادہ سے زیادہ ان چیزوں تک محدود رکھا جاتا تھا' جسے عام طور پر Universal Ethics (عالمگیر اخلاقیات) کہا جاتا ہے۔ ابوالکلام❶ مرحوم کے الفاظ میں وہ ''عالمگیر صداقتیں'' تھیں' جن کے متعلق اُس نے کہا ہے کہ وہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اب بات دوسری طرف چلی جائے گی ورنہ انہیں بتایا جاتا کہ جن لوگوں کی خاطر اُس نے یہ مفاہمت اختیار کی تھی' کہ تمام مذاہب میں عالمگیر صداقتیں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں' یہ عالمگیر اخلاقیات (Universal Ethics) ہیں جسے اس شخص نے خود ان کے ہاں کے دھرم میں عالمگیر صداقتیں کہا ہے۔

مذاہبِ عالم میں عالمگیر صداقتوں کی حقیقت کی وضاحت

ان صداقتوں میں انہیں کہا جاتا ہے کہ جھوٹ نہ بولو' سچ بولو' چوری نہ کرو' فریب نہ دو' ہمسائے کو نہ ستاؤ' زنا نہ کرو۔ انہیں Universal Ethics یا عالمگیر صداقتیں کہا جاتا ہے۔ میں انہیں کیا بتاتا! انہیں تو میں نے اُس زمانے میں بتایا تھا' بالمشافہ بھی بتایا تھا' لکھ کے بھی بتایا❷۔ وہ تو بات ہی کچھ اور تھی۔ خود ہندوؤں کے دھرم کی کتابوں کے اندر ان Ethics (اخلاقیات) کے خلاف اتنا کچھ لکھا ہوا ہے کہ حیا اپنی آنکھیں زمین میں گاڑ لیتی ہے۔ میں نے کبھی اپنے درس میں یہ جسے ''Comparative Study of Religion'' کہتے ہیں' یا جسے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کہتے ہیں' نہیں کیا۔ میں نے تو یہ باب کبھی بھی نہیں باندھا۔ ہمیں اب ان چیزوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو میری کتاب ''مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں'' کا مطالعہ کر لیں۔ اُس میں آپ ہندو دھرم کے متعلق دیکھیے گا' ہندو دھرم کیا' باقی مذاہب کے متعلق بھی دیکھیے گا کہ ان میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔

اصل بات تو نظامِ استحصال کو مٹانے کی ہوتی ہے

میں بات یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے انبیائے کرامؑ کو واعظ کی پوزیشن دے کر کھڑا کیا ہوا ہے۔ عزیزانِ من! یہ واعظ نہیں تھے۔ یہ حضرات آتے تھے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے جو باطل پر مبنی نظام ہیں' جن میں انسانیت کا استحصال کیا جاتا ہے' انہیں الٹ کر حق پر مبنی نظام قائم کیا جائے۔ یہ بہت بڑی انقلابی شخصیتیں تھیں۔ یہ جو چیزیں آتی ہیں کہ قوم نے ان سے کہا کہ اگر تم نے یہ نہ کہا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے' قتل کر دیں گے' ملک بدر کر دیں گے تو کہیے کہ اگر کوئی شخص اُس سے کہے کہ بھئی! جھوٹ نہ

---

❶ احمد محی الدین ابوالکلام آزادؒ (1888-1958ء)

❷ اس کے لیے یہ پمفلٹ دیکھیے: پرویزؒ: کیا عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہیں؟ ادارہ طلوع اسلام' لاہور' اس کا انگریزی ترجمہ اس کتاب کے مدیر کے قلم سے ?Are All Religions the Same کے نام سے ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' لاہور سے دستیاب ہے۔

بولا کرو تو جھوٹا بھی اس کے سامنے یہ نہیں کہے گا کہ اگر تم نے دوبارہ یہ بات کہی تو یاد رکھو تمہارے دانت نکال دونگا۔ یہ تو کوئی ایسی چیزیں نہیں تھیں جس کی بنا پہ یہ کچھ کیا جاتا۔ وہ بات یہ تھی کہ ان کا جو زندگی کا باطل پر مبنی مسلمہ نظام ہوتا تھا' جس میں وہ خون آشامی کرتے تھے' استحصال کرتے تھے' اسے مٹانا ہوتا تھا اور یہ گروہ جن کے مفاد اس نظام سے وابستہ تھے' وہ آخر تک مخالفت کرتے تھے اور یہ مقابلہ کرتے تھے۔ اس کے بعد اگر وہیں حالات مساعد ہوتے تھے تو اسی جگہ اس نظام کو قائم کرتے تھے' اگر ایسی صورت نہیں تھی تو کسی ایسی سرزمین میں چلے جاتے تھے جہاں اس نظام کے قیام کے لیے حالات سازگار ہوں۔ یہ تھے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام۔ بات سمجھنے کی ہے۔ ابھی سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ کیا لے کر آتے تھے۔

دین اصولوں کا نام ہے جواب صرف قرآنِ حکیم میں محفوظ ہیں

قرآن نے کہا یہ ہے کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا ہے۔ اُس دین پر عمل کرنے کے جو طور طریق تھے' وہ حالات کے مطابق بدلتے رہتے تھے۔ انہیں جزئیات کہتے ہیں' جنہیں بعد میں احکامِ شریعت کہا گیا ہے۔ یہ دین نہیں ہے' دین زندگی کے چند اصولوں کا نام ہے اور وہ شروع سے آخر تک وہی غیر متبدل رہے اور قرآن نے آ کر وہ محفوظ کر دیئے اور وہ قیامت تک کے لیے اب ہمارے لیے دین ہیں۔ گویا حضرتِ نوح علیہ السلام یا پہلا نبی جو خدا کی طرف سے آیا' جو دین اس نے دیا تھا' اصولی طور پر وہی دین قیامت تک کے لیے محکم رہے گا' اساسی طور پر وہی خدا کا دین ہوگا اور اب وہ قرآن میں محفوظ ہے۔ یہ دین کیا ہے؟ مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی جو دعوتیں تھیں ان کو آپ اکٹھا کر لیجیے تو یہ پورے کا پورا دینِ خداوندی اپنے سامنے آ جاتا ہے۔ آج [1] نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کے لیے سر پھٹول ہو رہی ہے۔ جو یہ نہیں بتا سکے کہ نماز کا طریقہ کونسا ہے' ہر ایک کا اپنا اپنا ہے' وہ یہ کیا بتائیں گے کہ یہ نظام کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کی جو یہ انقلاب آفریں دعوتیں ہیں' وہ ہر نبی کے زمانے میں جو چیز زیادہ اہم ہوتی تھی' اس کا ذکر قرآن نے کیا ہوا ہے۔ انہیں آپ اگر یکجا کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ پورے کا پورا اکمل دین آپ کے سامنے آ جائے گا۔ اور پھر آپ اس کے بعد یہ دیکھیے گا کہ کیا یہ چیزیں جو انبیائے کرامؑ نے کہی تھیں یہ اساطیر الاولین تھیں یعنی پرانے زمانے کے قصے کہانیاں تھیں' جن کا ہم سے کوئی تعلق نہیں یا ہمارے دور میں بھی نظامِ انسانی کے متعلق جو اہم مسائل آپ کے ہاں آئے ہوئے ہیں' یہ ان سے متعلق تھیں۔

حضرتِ نوح علیہ السلام کی بات شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ قصص کے لحاظ سے سب سے پہلا رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہی ہے۔

---

[1] یاد رہے یہ بات جون 1978ء کی 16 تاریخ کو کہی گئی تھی۔ اس وقت پاکستان کی سیاسی فضا میں نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔

آج دنیا میں اہم ترین مسائل دو ہیں: ایک یہ کہ قومیت کا مدار کیا ہے؟ آخرالامر انہوں نے جو مدار قائم کیا اس کے لیے انہوں نے کہا کہ جغرافیائی حدود کے اندر یا وطن کے اندر بسنے والے تمام لوگ ایک قوم ہوتے ہیں۔ اس قومیت کے نظریئے نے طبقاتی کشمکش پیدا کر رکھی ہے اور دنیا کو جس قدر جہنم بنا رکھا ہے' اس کے شعلوں کی لپیٹ میں خود مغرب کے مفکرین اس بری طرح سے آ گئے ہیں کہ وہ چیخ رہے ہیں' انہیں اس سے نکلنے کے لیے راستہ نہیں ملتا۔ راستہ تو ان انبیائے کرام علیہم السلام نے دینا تھا۔ یہ ان سے انکار کرتے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک قومیت کا مدار کیا ہے جس سے اس طبقاتی کشمکش کا علاج ہو سکے؟

قومیت طبقاتی تقسیم اور نسلی امتیاز کے مسائل

پہلا مسئلہ جو آج بھی ہمارے دور کا اہم ترین مسئلہ ہے' یہ ہے کہ قومیت کا مدار کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ حضرتِ نوحؑ' پہلے نبی کی پہلی دعوت کا پہلا اعلان یہ ہے کہ قومیت کا مدار کیا ہے؟ کیا یہ پرانے قصے ہیں؟ کیا یہ اس زمانے کی باتیں ہیں یا آپ کے اس دور کے اہم ترین مسئلے کا حل ہے؟ دوسرا Problem (مسئلہ) اس دور میں ہمارے ہاں یہ ہے کہ طبقاتی کشمکش کا علاج کیا ہے؟ یہی دو اہم ترین مسئلے ہیں اور پہلے نبی سے' پہلی ہی انقلابی دعوت کے اندر' جو اعلان آ رہا ہے وہ طبقاتی کشمکش کے خلاف ہے اور اس کا علاج بتایا ہے۔ غور کیجیے گا اس سے قرآن کی عظمت سامنے آتی ہے' دین کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ پہلے نبی کا قصہ جو تاریخی اعتبار سے' جو آج سے شاید چھ ہزار سال پہلے کا ہو' اُس زمانے کے نبی کے قصے میں قرآن جو دو اہم باتیں سامنے لایا ہے' وہ اس دور کے اہم ترین Problems (مسائل) ہیں اور آج ان کا حل کہیں نہیں مل رہا۔ وہ حل دعوتِ حضرتِ نوح علیہ السلام میں یا قرآن کے اندر مل رہا ہے۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات دراصل دین کی ہی دعوت ہے

یہ ہے وہ اہمیت ان حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے قصوں کی' جسے ہم قصے کہتے ہیں اور یہ ہے وہ اہمیت جس کے پیش نظر قرآن کریم نے ان داستانوں کو اپنے دامن میں قیامت تک کے لیے محفوظ کیا ہے۔ یہ تاریخی قصے نوشتیں نہیں ہیں' یہ تو دین کی دعوت کے اعلانات ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے ہیں' جو قرآن نے بتائے ہیں۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ قومیت کا معیار کیا ہے؟ شروع سے آخر تک عقل انسانی میں آپ دیکھیں گے کہ پہلے قبائلی زندگی تھی' وہ بھی نسل کے اعتبار سے تھی' اور سمٹی ہوئی شکل میں تھی۔ ذرا آگے بڑھی ہے تو قبائل کے اعتبار سے خاندان اور آگے بڑھا' تو نسلی امتیاز کی رو سے تقسیم انسانیت ہوئی اور آگے بڑھے تو وطنیت کی رو سے انسانیت کی تقسیم ہوئی۔ عقلِ انسانی آج تک یہی معیار مقرر کر سکی ہے اور بقیہ ہر معیار کو اس نے ناکافی ہی نہیں بلکہ ناکام

ثابت کر کے' یہ دیکھ کر کہ اس سے مسئلے کا حل نہیں ہوتا' خود ہی مسترد کرتی چلی گئی ہے اور آج اس مقام پہ آ کر کھڑی ہے۔ اس کے برعکس دعوتِ حضرت نوح علیہ السلام نے پہلے دن سے اعلان کیا کہ یہ سارے معیار غلط ہیں۔قومیت کا معیار نظریئے یعنی آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔

آئیڈیالوجی کے اشتراک کی ایک ٹھوس مثال

آئیڈیالوجی کے اشتراک کی ایسی ٹھوس مثال باپ اور بیٹے کے تعلق کی ہے۔اس مثال کے سمجھنے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی کسی سقراط کے دماغ کی ضرورت ہے۔نسل کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب تر تعلق کوئی نہیں ہوسکتا ہے' وطن کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب تر تعلق کونسا ہوسکتا ہے' زبان کے اعتبار سے اس سے زیادہ قریب تر تعلق کونسا ہوسکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ جب اس بیٹے کے متعلق حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ کم از کم یہ تو میرے اپنوں میں سے ہے' تو اُسی وقت یہ ہدایت خداوندی آئی کہ نوح علیہ السلام غلط کہتے ہو' محض بیٹا ہونا' اس چیز کے لیے مستلزم نہیں ہے کہ وہ تمہارے اپنوں میں سے ہو' تمہارے اپنوں میں سے وہ ہے' جو تمہارے نظریئے کو مانتا ہے۔ بیٹا بھی نہیں ہے' بیٹا غیروں میں سے ہے۔اس لیے جس طرح سے غیر تباہ اور غرق ہونگے' تیرا بیٹا بھی اسی طرح سے ہوگا تا نکہ یہ اس نظریئے میں' اس آئیڈیالوجی میں' تم سے ہم آہنگ نہ ہوجائے۔ بیوی کے متعلق بھی یہی چیز آ گئی کیونکہ دوسرا رشتہ بیوی کا ہوتا ہے' جسے انسان کا چولی دامن کا ساتھ کہتے ہیں۔اس کی زیادہ تشریح تو وہاں آئے گی جہاں یہ بیٹے کا معاملہ ہمارے سامنے آئے گا۔اس سورۃ میں وہ سامنے نہیں آ رہا' دوسرا آ رہا ہے لیکن پہلی چیز جو کہی گئی ہے' پہلی دعوت جو دین کی ہے' اُس میں سب سے پہلی آواز جو بلند کی جاتی ہے' وہ ہے قومیت کا مدار۔اس میں یہ باپ اور بیٹا بھی ایک قوم کے فرد نہیں ہوسکتے اگر وہ آئیڈیالوجی اور نظریئے میں ہم آہنگ نہیں ہوتے' میاں اور بیوی بھی ایک قوم کے فرد نہیں ہوسکتے اگر نظریئے میں ان کا اشتراک نہیں ہے۔

آئیڈیالوجی کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک سنہری قول

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول دو لفظوں میں ہے کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ (14:36) میرا وہ ہے' جو میرے پیچھے چلتا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔اگر بیٹا نہیں چلتا' وہ بھی اپنوں میں سے نہیں ہے' وہ غیر قوم کا فرد ہے۔اتنی لمبی چوڑی بحث ہمارے ہاں ہو رہی ہے صاحب! کہ دو قومی نظریہ کیا ہے اور پھر چار قومیتیں یہاں ہیں اور پھر اب تو پتہ نہیں کتنی قومیتیں بنتی چلی آ رہی ہیں۔کیا کہا جائے؟ کس سے کہا جائے؟ نہ کوئی سننے کے موڈ میں ہے' نہ کوئی غور کرنے کے موڈ میں ہے' ہم تو اس دور میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں شور وغوغا

ہی ہے' عزیزانِ من! ورنہ قرآن سامنے رکھنے والوں کے لیے یہ کوئی ایسا Issue (مسئلہ) ہی نہیں تھا جو متنازع فیہ یا Discussion (بحث و مباحثہ) کے قابل ہوتا۔ ارے پہلی دعوت میں پہلی بات جو باپ اور بیٹا کی آپس میں سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے تم دونوں ایک قوم کے فرد نہیں ہو۔ اور دو قومی نظریہ کیا ہوتا ہے۔ یہی پہلی بات ہے اور یہی ایک دعوت سارے انبیائے کرام علیہم السلام میں مشترک رشتے کی طرح چلی آئے گی۔ یہاں باپ نے بیٹے سے کہا اور ابراہیم علیہ السلام نے باپ سے کہا' حضرتِ لوط علیہ السلام نے بیوی سے کہا' حضرتِ عیسٰی علیہ السلام نے اپنے جتنے ساتھی تھے' سب کو کہا' نبی اکرم ﷺ نے آکر عالمگیر برادری سے کہا۔ اب کس طرح سے نکھر کر دو حزب بن گئے: حزب اللہ اور حزب الشیطٰن۔ دو ہی حزب رہ گئے' دو ہی پارٹیاں رہ گئیں۔

مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیوں کا وجود ہو' وہ شرک ہوگا

آج بڑے طنز سے یہ کہا جا رہا ہے کہ دیکھو جی' یہ پرویز صاحب اٹھے ہیں' کہتے ہیں کہ اسلام میں نہ مذہبی فرقے ہیں' نہ سیاسی پارٹیاں ہیں۔ 'پرویز صاحب کہہ رہے ہیں' پرویز صاحب نے جب قرآنِ کریم کی بیس آیات نقل کردیں اس کے بعد بھی یہ کہتے ہوئے شرم نہ آئی کہ 'پرویز صاحب کہہ رہے ہیں' خدا نہیں کہہ رہا' پرویز تو خدا کی آیات پیش کر رہا ہے۔ بڑی عجیب بات تھی۔ بلا تشبیہ عرض کرونگا کہ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ سے کہا ہے کہ یہ قریش جن کی مخالفت سے تم دل گرفتہ ہوتے ہو' یہ ظالم تمہاری تکذیب نہیں کرتے' یہ ارشاداتِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں۔ پرویز نے تو قرآن کی آیات پیش کی تھیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ صاحب! اگر سیاسی پارٹی نہ ہوئی تو پھر انتخابات کیسے ہونگے۔ یعنی انتخابات کی غرض سے وہ چیز جسے قرآن شرک کہتا ہے' وہ ضرور رکھنی چاہیے۔ بکرے کا گوشت نہیں ہے تو پلاؤ پکانا تو ضروری ہے' اونٹ کا گوشت ڈال دیا جائے کیونکہ گوشت کے بغیر پلاؤ پک نہیں سکتا' پکانا ضروری ہے۔ پہلی دعوتِ نوح علیہ السلام یہ ہے کہ باپ اور بیٹا ایک قوم کے فرد نہیں ہوسکتے اگر ان میں نظریئے کا اشتراک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی زیادہ تفصیل تو میں وہاں بیان کرونگا جہاں یہ بات آئے گی۔

آج پوری دنیا طبقاتی تقسیم کے جہنم میں بری طرح گرفتار ہے

ہمارے سامنے جو آیات اس وقت ہیں' ان میں دوسرا پرابلم سامنے لائیے۔ وہ ہے طبقاتی کشمکش -- اور وہ اس وقت ساری دنیا کے لیے وجۂ سوہانِ روح بن رہا ہے۔ اس طبقاتی کشمکش کا کوئی حل نہیں مل رہا۔ Occupation (پیشے) کے اعتبار سے' کام کے اعتبار سے' آمدنی کے اعتبار سے' انسانوں کی تقسیم ہے۔ پہلی حضرتِ نوح علیہ السلام کی دعوت میں آپ دیکھیے۔ یہ دو چیزیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کا نام دین ہے۔

آئیڈیالوجی کے تحت آج کے مسلمانوں کی حالت زار

مجھے نماز روزے حج زکوٰۃ سے انکار نہیں ہے لیکن جب آپ ان کو ارکانِ اسلام کہتے ہیں' تو ان پر چھت کھڑی ہونے کی ضرورت ہے۔ رکن کے معنی ستون یعنی Pillar' ہوتا ہے Pillar (ستون) تو ٹھیک ہے Pillars (ستون) کے اوپر پھر چھت ڈالنی چاہیے۔ جبھی تو عمارت بنے گی۔ اب چھت تو کوئی ہے نہیں' صرف Pillars (ستون) ہیں۔ یہ ارکانِ اسلام دین کی عمارت یا چھت کے لیے Pillars (ستون) تھے۔ Pillars (ستون) کھڑے ہیں' جیسے ایران اور روما کے ان پرانے کھنڈرات میں آپ نے دیکھا ہوگا' یہ نظر آتے ہیں۔ وہ Pillars (ستون) ہیں۔ مرورِ زمانہ سے وہ عمارتیں اور وہ چھتیں تو گر گرا چکی ہوئی ہیں صرف Pillars' (ستون) ہیں' وہ بھی خستہ حال شکل میں کھڑے ہیں۔ آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ (محکمہ آثارِ قدیمہ) نے ان کے اوپر لاکھوں روپیہ صرف کر دیا کہ یہ کسی طرح سے محفوظ رہیں' یہی ہے مذہب کہ ''تھمیاں دی ضرور حفاظت کیتی جاوے چھت بھاویں ہووے یا نہ ہووے''❶۔ یہ آئیڈیالوجی چھت ہے۔ یہ ارکان اس چھت کو سنبھالنے کے ستون تھے۔

دین یہ بات بتاتا ہے کہ طبقاتی کشمکش کا حل کیا ہے۔ اور نظر یہ آتا ہے کہ یہ مسئلہ آج کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ آدم کے ساتھ ہی ابلیس اسٹیج پہ آ گیا تو اُس کے معانی یہ ہیں کہ انسان نے جس وقت اپنی تمدنی زندگی اختیار کی' وہ جو ابلیسیت تھی' وہ ساتھ ہی آ گئی۔ یہ ابلیسیت تھی جس نے یہ طبقاتی اور قومیتی کشمکش پیدا کی۔ ابلیس کا کام ہی خواجۂ اہلِ فراق ہے' اسی لیے اقبالؒ (1877-1938ء) نے اس کے لیے یہ کہا تھا۔ وہ خواجۂ اہلِ فراق اچھا لفظ ہے۔ اب قرآنِ کریم کہتا ہے کہ اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بھی سرگزشت ہے کہ **كَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ اۨلۡمُرۡسَلِيۡنَ** (26:105) نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی خدا کے رسولوں کی تکذیب کی۔ اب یہاں دیکھیے' میں نے کہا تھا کہ یہ پہلے نبی یا رسول نہیں ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ قومِ نوح علیہ السلام نے بھی خدا کے رسولوں کی تکذیب کی اور یہاں تو وہ قومِ نوح علیہ السلام غرق ہو جاتی ہے تو گویا اس سے پہلے اس قوم کے اندر نبی آتے رہے۔ یہاں یہ سلسلہ حضرتِ نوح علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ **اِذۡ قَالَ لَهُمۡ اَخُوۡهُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ** ❷ (26:106)۔ اس قوم میں جو رسول آ رہا ہے' وہ کوئی غیر نہیں ہے' باہر سے نہیں آ رہا' وہ ناصح مشفق ہے' ان کا بھائی ان میں سے آیا' کوئی دشمن نہیں آیا' انہی کے بھائی بندوں میں سے ایک رسول آیا اور سارے رسول اُنہی میں سے ہوا کرتے تھے' انہی میں اپنی جو زندگی گزارتے تھے' اسے

---

❶ ستونوں کی ضرور حفاظت کی جائے خواہ چھت ہو یا نہ ہو۔

❷ (اسی طرح نوحؑ کی بھی سرگزشت ہے) اس کی قوم نے بھی خدا کی تکذیب کی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 845)۔

اپنے دعویٔ نبوت کی شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ان کے بھائی بندوں میں سے ایک رسول نوح علیہ السلام آیا ہے۔ اُس نے یہ بات کہی کہ **اَلَا تَتَّقُوۡنَ** (26:106)۔ اب یہ **تَتَّقُوۡنَ** کیا ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

''تتقون'' کا قرآنی مفہوم

یہاں قرآنِ کریم نے پوچھا ہے کہ **اَلَا تَتَّقُوۡنَ** (26:106) کیا تم زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟ ہمارے ہاں ترجمہ ہوا کہ کیا تم متقی بننا چاہتے ہو یا نہیں؟ عزیزانِ من! متقی کی Definition یا تصور آپ کے ذہن میں ہے کہ کیا تم زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں، ان خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہو یا ان کے اندر الجھنا چاہتے ہو؟ میں یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ قرآن کہتا ہے کہ اگر بچنا چاہتے ہو تو سنو۔ حضرت نوح علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ میری بات غور سے سنو: **اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ** (26:107) میں ایک تو یہ کہ خود نہیں کہہ رہا، پیغامبر ہوں، کسی اور کا قاصد ہوں، پیغام دینے آیا ہوں۔ پیغام ہے امین۔ خود میں اس پیغام میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہونگا کہ وہ میرے پاس امانت ہے اور اُس پیغام کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہیں امن نصیب ہوجائے گا۔ سب سے بڑی چیز جو دنیا کے اندر ہے، وہ یہ امن ہے۔

انسانیت کی عزیز ترین متاع سکونِ قلب کا حصول ہے

عزیزانِ من! نوعِ انسانی کو امن نصیب ہونا ہے۔ ہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو امین کہتا ہے۔ اب آگے بڑی عجیب چیز ہے۔ جب میں اس پہ آؤنگا تو بتاؤنگا کہ یہ جو ''ا م ن'' ہے، امن ہے، ایمان تو یہیں سے ہے۔ مومن تو وہ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے امن کا ذمہ دار ہو۔ آپ کو پتہ ہے کہ خدا نے اپنی ایک صفت ''المؤمن'' بتائی ہے تو اگر مومن کے معنی مسلمان یا ایمان لانے والا ہے تو خدا کے متعلق تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ایمان لایا ہے۔ مومن کے معنی ہیں: امن کا ذمہ دار، امنِ عالم کا ذمہ دار، اور جن کی اپنی کیفیت یہ ہو کہ ایک ثانیے کے لیے بھی امن نصیب نہ ہو، انہیں دنیا کے اندر مومن کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عزیزانِ من! جو اپنے امن کے لیے دوسروں کے دست نگر ہوں، مومن نہیں کہلا سکتے ہیں۔ یہ تو مقام آدمیت کے اوپر بھی نہیں آئے۔ خدا نے تو آدم سے یہ کہا تھا کہ میں اپنے پیغامبر بھیجونگا، ہماری طرف سے ہدایت آئے گی تو **فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ** (2:38) جو اس کا اتباع کرے گا، اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ بہرحال رسول امین ہے اور یہاں کہا ہے کہ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ** (26:108) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ میں یہ کہنے آیا ہوں، یہ بتانے آیا ہوں۔

مرکز ملت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! ایک لفظ ہے جس نے مذہب اور دین میں جو فرق ہے' اسے نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کے کسی لفظ سے بھی ایسے نہ گزر جائیے۔ انہی الفاظ کے اندر سارے دین کے بڑے بڑے جو آسمان ہیں یوں سموئے ہوئے ہیں جیسے آنکھ کے تل میں پہاڑ سمویا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ** (26:108) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ ہر اہلِ مذہب یہی کہتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو' اللہ کی پرستش کرو' اللہ کا حکم مانو۔ اپنی اپنی جگہ وہ یہاں بیٹھا کر رہا ہے' وہ وہاں بیٹھا کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دین کیا ہے؟ ایک ہیئت اجتماعیہ ہے جس میں سارے مل کر کسی ایک نظام کی اطاعت کرتے ہیں' ورنہ مذہب کے اعتبار سے **فَاتَّقُوا اللّٰهَ** ہر ایک اپنی اپنی جگہ متقی ہوتا ہے۔ جسے ہم متقی کہتے ہیں' عبادت گزار کہتے ہیں' اس کو اجتماعی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ کہا کہ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ** (26:108) اپنے اپنے طور پہ نہیں' میں اس حیثیت سے اس نظام کا مرکز ہونگا کہ خدا کے احکام لے کر آیا ہوں۔ میری اطاعت کرو گے' تب تقویٰ شعار بن سکو گے۔ جب تک' عزیزانِ من! امت کے اندر وہ نہ ہو' جو اس کا مرکز بنے' دین اسلام کا نظام نہیں چل سکتا اور آپ کو یاد ہے کہ یہ مرکز ملت یا مرکز امت کی اصطلاح میں کیوں استعمال کر رہا ہوں۔

ضمناً یاد آ گیا کہ میرے خلاف جو پروپیگنڈے چلے آ رہے ہیں' ان میں خاص طور پہ یہ جو اصطلاح مرکز ملت کی ہے' خاص اہم ہے۔ شور مچا ہوا ہے کہ صاحب! یہ دیکھیے' اس نے مرحوم غلام محمد ملک (1895-1956) گورنر جنرل [1] جیسے کو مرکز ملت قرار دے کر کہا ہے کہ اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ کسی سے یہ کہہ دیجیے کہ اس قسم کے فاسق و فاجر کی اطاعت کو وہ خدا اور رسول کی اطاعت کہتا ہے' اُسے مرکز ملت بتاتا ہے' واقعی اس کا تو خون کھول جائے گا۔ کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ 1938ء سے آج تک طلوع اسلام موجود ہے' پرویز صاحب کی کتابوں کے ہزاروں صفحات موجود ہیں' کسی ایک میں ایک فقرہ ایسا بتا دیجیے جس میں اُس نے گورنر جنرل (ملک) غلام محمد (1895-1956) کو مرکز ملت کہا ہو۔ جھوٹ ہے جو بولے چلے جا رہے ہیں کہ کون ہے جو Verify (تصدیق) کرے گا۔ دین ایک نظام کا نام ہے۔ نظام میں ایک اتھارٹی ہوتی ہے۔ دین کی جو سنٹرل اتھارٹی ہے میں نے اس کا ترجمہ مرکز ملت کیا ہے۔ ترجمہ یہ ہوتا تھا سنٹرل گورنمنٹ۔ اگر میں کہتا تو توجہ اس گورنمنٹ کی طرف چلی جاتی۔ آپ کے ہاں خلافت راشدہ جو تھی اُس میں احکام صادر کرنے والی مرکزی اتھارٹی تھی' کوئی جسے آپ خلیفہ کہتے ہیں' امیر المؤمنین کہتے ہیں' میں نے اس کے لیے خلیفہ کا لفظ بھی استعمال نہ کیا کہ غلط معانی سے یہ لفظ بھی ہمارے ہاں پامال ہو چکا ہے' امیر المؤمنین بھی نہیں کہا کہ اس اصطلاح کے بھی مخصوص معنی ہو چکے ہیں۔

---

[1] پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل' ملک غلام محمد' جو 19۔ اکتوبر 1951ء سے 15۔ اکتوبر 1955ء تک پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔

بغیر کسی تحقیق کے پرویز کے خلاف الزام تراشی کی انتہا

میں اس دور میں اس قسم کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا تھا۔ میں نے سنٹرل اتھارٹی کا ترجمہ مرکز ملت کردیا۔ یہ بڑا Innocent (معصوم) سا ترجمہ ہے لیکن جنھوں نے گالیاں دینی ہوں وہ تو ہر بات کے اوپر گالیاں دیں گے۔ **اَطِیۡعُوۡنِ** (26:108) کے معنی یہ ہیں۔ یہ کیوں کہا؟ کہ جو خدا کا تقویٰ ہے' وہ اُسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ میری اطاعت کرو۔ وہ اطاعت کسی فرد کی اطاعت نہیں تھی' کسی ڈکٹیٹر کی اطاعت نہیں تھی' اس کے ساتھ ہی یہ ہے **اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ** [1] (26:107)۔ خدا کے احکام لانے والے کی اطاعت کے کیا معنی؟ اس کے احکام کی اطاعت اور احکام تو خدا کے ہیں۔ احکامِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کے Through (ذریعہ) ہے جس کا جو مرکز ہے' وہ آپ کے ہاں سنٹرل اتھارٹی ہے' خواہ آپ اسے ایک فرد قرار دیدیں یا ایک نظام قرار دیں' ایک کیبنٹ قرار دیدیں' ایک حکومت قرار دیدیں۔ وہ آپ کی صوابدید پہ ہے۔ قرآن نے اس کے لیے کوئی ہیئت مقرر نہیں کی۔ اس نے جو کہا ہے وہ یہ ہے کہ **اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ** (42:38) ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ مشاورت کے بعد جس قسم کا بھی نظام آپ قائم کریں' اس کی بنیاد یہ ہوگی کہ خدا کے احکامات کی اطاعت کرانے والی اتھارٹی ہو۔ یہ ہے جی' اسلامی نظام اور یہ ہے جو ہر رسول نے کہا کہ میری اطاعت کر کے' خدا کے احکام کی نگہداشت کرو' مگر اپنے اپنے طور پہ نہیں۔ اپنے اپنے طور پہ کرو گے تو مذہب ہوجائے گا۔ ایک سنٹرل اتھارٹی اُس میں مقرر کرو گے تو دین ہوجائے گا' نظام ہوجائے گا۔ یہ ہے فرق اسلام میں اور مذہب میں۔ اطیعون کے تصور سے اپنی اطاعت نہیں کرا رہے' احکامِ خداوندی کی اطاعت کرا رہے ہیں اور اپنے آپ کو رسول کہہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جی' اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے؟ دو دو لفظوں میں ساری بات ہے اور اگلی چیز جو ہر رسول نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ **وَمَاۤ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ** [2] (26:109)۔ یہ ہے بنیاد' عزیزانِ من! جو کچھ میں تم سے خدا کے احکام کی اطاعت کا کہہ رہا ہوں اور یوں کہہ رہا ہوں کہ وہ میری اطاعت کے ذریعے سے ہوگا تو اس میں ضرور بات ہوگی کہ صاحب! اپنی اطاعت چاہتا ہے۔ جی ہاں' اس میں اس کے بڑے مفاد وابستہ ہیں۔ اُسی سانس میں کہا کہ سنو! ''میں تم سے کسی قسم کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔'' یہ بڑی چیز ہے۔ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا' یہ ان کا شرف ہے۔ وہی شخص ان قوانین پہ چل سکتا ہے اور دوسروں کو چلا سکتا ہے جو ان سے کوئی بدلہ' صلہ' معاوضہ نہ لے۔

---

[1] مجھے خدا نے تمہاری طرف' امن وسلامتی کا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 845)۔

[2] میں تم سے اس کے لیے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 845)۔

دنیائے تصوف کو نظام سے کیا تعلق؟

اب یہاں سے تصوف کا ایک مسئلہ سامنے آتا ہے۔ تصوف ہے: ترکِ دنیا' ترکِ آلائش' ترکِ ترک۔ یہ ان کے ہاں کی انتہا ہے۔ یہ بے مدعا ہونا ان کے ہاں کی انتہا ہے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے کہ دل ہو اور اس کا کوئی مدعا نہ ہو: یعنی یہ جو مدعا ہے اور آرزوئیں ہیں' ان کی تخلیق کا نام زندگی ہے' جو دلِ بے مدعا ہے' وہ تو مردے کا ہوتا ہے' پتھر کا ہوتا ہے۔ زندگی کا ہے کی' نہیں ہوتی ہے اگر آپ کے سامنے کوئی مدعا' کوئی آرزو' کوئی تمنا' ہی نہیں رہے۔ یہ زندگی نہیں ہے' یہ تو موت ہے۔ یہ تصوف کی انتہا تھی۔ اب یہاں جو یہ کہہ دیا کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا' تو تصوف والے آئے کہ صاحب! دیکھا قرآن نے یہ کہا اور ادھر قرآن نے اُسی لمحے اُسی سانس میں کہا کہ یہ نہ سمجھ لو کہ میں کوئی اجر نہیں چاہتا یعنی **وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ** (26:109) میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اجر تو ضرور چاہتا ہوں مگر **اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ** (26:109) تم سے نہیں' اُس سے چاہتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جس سے اجر چاہتا ہوں؟ کہا کہ میرا ہی نشوونما دینے والا نہیں' جو تمام نوع انسانی کا پالنے والا ہے' اُس سے اپنے پالنے کا اجر چاہتا ہوں۔

زندگی تو تمنا کے سہارے سے ہی زندہ رہتی ہے

اس طلبیٔ اجر نے تصوف[1] کی جڑ کاٹ کے رکھ دی' زندگی کا مقصد بتا دیا۔ کہا کہ یہ بات غلط ہے کہ آپ کوئی کام کریں اور

---

[1] ہر ایسا فلسفہ یا تصورِ حیات جس سے نفیٔ خودی (انسانی ذات کی نفی) کا سبق ملتا ہے مسلکِ گوسفندی ہے یعنی ایسا مسلک ہے جسے محکوم اور کمزور اقوام اس لیے وضع کرتی ہیں کہ اس کے ذریعے طاقتور اور صاحبِ اقتدار قوم کو ضعیف و ناتواں بنا دیا جائے...... اس مسلک کا اولین موجد یونانی فلاسفر افلاطون تھا...... اس کے نزدیک یہ کائنات اور اس میں جو کچھ موجود ہے' فی الحقیقت موجود نہیں ہے۔ حقیقی وجود ایک اور دنیا کا ہے جسے عالمِ امثال کہتے ہیں۔ وہاں ہر شے فی الحقیقت موجود ہے اور اس دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ ان حقیقی اشیاء کا سایہ ہے۔ اس دنیا کی اشیاء کو وہ ''اعیان نامشہود'' (Indivisible Ideas) کہتا ہے۔ لہٰذا حقیقی وجود صرف تصورات (Ideas) کا ہے محسوس دنیا (World of Concrete) کا نہیں۔ دنیائے محسوسات صرف فریبِ نظر یا ''حلقۂ دامِ خیال'' ہے۔ بنابریں جو علم حواس (Senses) کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یعنی Perceptual Knowledge (حواسی علم) وہ بھی فریب (Deception) ہے۔ اعیانِ نامشہود یا حقیقی دنیا کا علم' باطن کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ چونکہ یہ تصورِ حیات سہل انگاری اور فقدانِ عمل کو حسن کارانہ جوہر (Virtue) بنا کر دکھاتا ہے' اس لیے دنیا کی ہر کمزور قوم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہودیت میں تصوف اس کے راستے سے آیا۔ عیسائیت تو تھی ہی اس کا چربہ' بدھ مت بھی اس سے متاثر ہوا۔ ایران میں مجوسیت نے اسے اپنایا۔ ہندوؤں کا ویدانت بھی اسی کا عکس ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ تصور ساری دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور انہوں نے زلزلہ انگیز اعلان اور انقلاب آفریں پیغام سے اس افیونی طلسم کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔ قرآن نے واضح الفاظ میں پکار کر کہہ دیا کہ **خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ** (39:5) خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا۔ یہ حقیقی (Real) ہے جو اسے باطل (Un- real) کہتا ہے' وہ حق سے انکار کرتا ہے' اس کا یہ دعویٰ علم پر مبنی نہیں' محض قیاسی اور ظنی ہے...... اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ہے ہی ایک اجنبی پودا۔'' پھر ''اسلامی تصوف'' اور ''عجمی تصوف'' کی تفریق ہی غلط اور بے معنی ہے۔ جس تصور پر تصوف کی بنیاد ہے جب وہ تصور ہی خلافِ قرآن ہے تو اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کس طرح اسلامی ہوسکتی ہے؟ (پرویزؒ: مجلسِ اقبال' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1996ء' ص ص۔ 134 تا 135)۔

اس کا کوئی اجر نہ چاہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل تو اسی چیز کی ضمانت دیتا ہے کہ آپ کے ہر عمل کا' ہر خیال تک کا' اجر ہے۔ اگر غلط ہے تو غلط اجر ہے' صحیح ہے تو صحیح اجر ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ان انسانوں سے صلہ نہیں مانگتا اور بے صلہ بھی کام نہیں کر رہا کہ یہ انسان کے لیے ناممکن ہے ' یہ سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) Impossibility (ناممکن) ہے۔ عزیزانِ من! اجر مانگتا ہوں' صلہ چاہتا ہوں' مگر تم سے نہیں چاہتا' اُس سے چاہتا ہوں' جس نے مجھے اس کام کے لیے بھیجا ہے۔ کیا بات ہے!

نظام کی کامیابی کا راز

عزیزان من! اگر آپ کے ہاں کے نظام کے خادم' کارندے' کارکن' Employees (ملازمین) کی صورت یہ ہو جائے کہ کام آپ کا کریں اور اس کا اجر اپنے ڈیپارٹمنٹ (محکمے) سے جا کر مانگیں تو نظام صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ بگڑا ہوا نظام وہ ہے کہ جس کام کے لیے انہوں نے اجر وہاں اپنے محکمے سے لینا ہے' وہ اجر آپ سے مانگتے ہیں۔ پہلے آکے ''جنا چر تسی اوہنوں نہ چار پیسے دیوؤ تے کوڑا نہیں چکدا'' ❶۔ اُسے وہاں سے تنخواہ مل رہی ہے لیکن وہ اجر تم سے بھی چاہتا ہے۔ اسے اوپر تک لے جایئے۔ اگر بات یہ ہو کہ جو کام میرے ذمے ہے' میں نے تو وہ کرنا ہے' اس کا اجر میں نے ان سے لینا ہے جنہوں نے یہ کام میرے ذمے لگایا ہے' تو نظام صحیح ہے اور اگر صورت یہ ہو کہ جن کا وہ کام کرنے آیا ہے' مثلاً ڈاکٹر گورنمنٹ کے ہسپتال کے اندر کھڑا ہے' اگر وہ مریض سے اجر مانگ رہا ہے تو یہ باطل کا نظام ہے۔ وہاں سے اپنا اجر لے' مگر ان کا کام اپنا سمجھ کر کرے۔ قرآن نے کتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ❷ (26:109)۔ رب العٰلمین کہہ کے کتنی بڑی مشکل حل کر دی صاحب!

خلافت علیٰ منہاج نبوت کا نظام قرآنِ حکیم کی مستقل اقدار کے سہارے ہی قائم ہو سکتا ہے

قرآن کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ❸ (26:110)۔ اسے پھر دہرایا کہ میں پھر تم سے وہی بات کہتا ہوں کہ میں کچھ نہیں مانگتا تم خدا کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ ایک نظام بناؤ' ایک ہیئت اجتماعیہ بناؤ' ابتدا میں اُس کی

---

❶ پہلے آ کر جب تک آپ اسے چار پیسے نہ دیں وہ کوڑا نہیں اٹھاتا۔

❷ (یہ نہ سمجھو کہ اس میں میرا کوئی اپنا مفاد مضمر ہے۔ بالکل نہیں۔ میں یہ تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں)۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ اس خدا کے ذمّے ہے جو تمام اقوام عالم کا پرورش کرنے والا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص۔ 845 تا 846)۔

❸ تم صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے میری اطاعت کرو (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 846)۔

سنٹرل اتھارٹی میں ہونگا کیونکہ میں خدا کے احکام لے کر آ رہا ہوں۔ اور سارے احکام ایک ہی وقت میں سارے نہیں مل گئے' جوں جوں حالات کا تقاضا تھا' یہ آتے رہے ہیں اس لیے میری اطاعت ضروری ہے۔ جب یہ احکام اکٹھے ہوجائیں گے اور میں چلا جاؤنگا تو اس کے بعد جو بھی آپ سے ان احکام کی اطاعت کرائے گا' پھر وہ اس کی اطاعت ہوجائے گی۔ یہ ہے جی' جسے آپ خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہتے ہیں۔ بات ابھی یہاں صاف نہیں ہوئی کہ انہوں نے ان سے کیا کہا تھا؟ کہا ہوگا کہ یہ ہیں وہ احکام خداوندی جن کی میں اطاعت کہتا ہوں: **قالوا انؤمن لک** ❶ (26:111)۔ اس آیت میں یہ جو لکؔ 'ل کے ساتھ ک' ہے' یہ بڑا اہم ہے۔ یہ ایمان لانا نہیں ہے بلکہ ''بات ماننا'' اس کے معنی ہوتے ہیں۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ حروف بڑا فرق پیدا کردیتے ہیں کہا ہے کہ کیا ہم تمہاری بات مان لیں بھئی؟ کیا اعتراض ہے جو میں بات کہہ رہا ہوں؟ اس پہ کوئی اعتراض کرؤ میں جواب دونگا۔ بات تو تمہاری بڑی معقول ہے' وہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

دوسروں کی نظر میں غلام قوم کی قدر و قیمت کوئی معنی نہیں رکھتی

آپ کو معلوم ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے تھے اور اس سے جا کر کہا تھا کہ میں خدا کا پیغامبر آیا ہوں تو یہ بات ہے اسے مان لو۔ اُس نے کہا تھا کہ کیا ہم ایسی قوم کے فرد کی بات مان لیں جو ہماری محکوم ہے؟ محکوم قوم اور غلام قوم کے فرد کی بات اس قابل ہی نہیں ہوتی کہ کوئی اس کو درخورِ اعتنا سمجھے۔ اُس نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی اس بات پہ اعتراض نہیں کیا تھا کہ تم جو کہتے ہو یہ غلط ہے' اس پہ مجھے اعتراض ہے۔ کہا یہ تھا کہ کہنے والا وہ شخص ہے' جو ہماری محکوم اور غلام قوم کا فرد ہے۔ کیا غلام قوم کے فرد کی بات اس قابل ہوسکتی ہے کہ جو حاکم قوم ہے' وہ اس کی بات سن سکے؟ آج بھی عزیزانِ من! وہ فرعون اور بنی اسرائیل کے نام تو نہیں رہے' فرعون اور بنی اسرائیل تو موجود رہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی غیر قوم ہی محکوم ہو' اپنی قوم بھی تو غیر قوم کی محکوم ہوا کرتی ہے۔ ہیئت حاکمیہ یا جو نیچے والے ہیں' یہ ان کی بات سمجھتے نہیں کہ یہ اس قابل ہیں کہ ان کی بات سنی جائے۔ اگر ان کو کچھ کہنا ہوگا تو Petition دینی ہوگی' ان کو درخواست دینی ہوگی' ان کو خدمتِ اقدس میں گزارش کرنا ہوتا ہے اور پھر جس طرح سے وہاں سے ڈانٹ پڑتی ہے' جس طرح چکر کاٹنے پڑتے ہیں' جس طرح وہاں Behave ہوتا ہے' بالکل ویسا ملزم کا تھانے میں ہوتا ہے۔

---

❶ انہوں نے کہا کہ تم کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کرلیں؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 846)

طبقاتی کشمکش میں انسانوں کی تفریقی نوعیت

اب یہاں کیا بات اُنہوں نے کہی کیونکہ یہ تو اسی قوم میں سے تھے' محکوم قوم کے فرد نہیں تھے۔اعتراض کیا ہے؟ وہ بات آ گئی جو میں نے شروع کی تھی یعنی وہی طبقاتی کشمکش۔قرآن نے کہا کہ **وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ** (26:111) تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں وہ تو وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہاں کے کمین ہیں۔ یہ کمین کیا ہوتا ہے؟ ہمارے ہاں گاؤں میں ان کو کمی کہتے ہیں۔کمی کیا ہے؟ کام کرنے والا۔اور واقعی گاؤں کی زندگی کے اندر دھوبی نائی جولاہا کمہار موچی کمّی ہوتے ہیں' اور آپ حیران ہونگے ان میں امام مسجد بھی شامل ہوتا ہے' رواج کے طور پہ ہی نہیں گورنمنٹ کے کاغذوں میں لکھا ہوتا ہے۔یہ جو ہمارے ہاں مردم شماری ہوتی تھی' اس میں خانے بنے ہوتے تھے۔اس میں جو کمیوں کا خانہ ہوتا تھا' ان میں یہ سارے لکھے ہوتے تھے۔ان میں امام مسجد بھی ہوتا تھا۔تو یہ ہیں کمی' کام کرنے والے۔

اب طبقاتی کشمکش آ گئی۔آج بھی آپ دیکھ لیجئے' یہ جتنے پیشہ ور لوگ ہیں' ان کے مقابلے میں ایک وہ ہیں جو کچھ کام نہیں کرتے اور عیش کرتے ہیں۔یعنی وہ تو قوم کے بلند ترین اشراف ہوگئے اور یہ جو کام کر کے اپنی روٹی کما رہا ہے یہ کمین ہوگیا۔اور بات آج کی نہیں ہے۔یہ پہلی داستان شروع ہو رہی ہے۔اس کا پہلا لفظ یہ ہے کہ نوح علیہ السلام جو تم بات کہہ رہے ہو' ہم اس پہ اعتراض نہیں کر رہے' اعتراض یہ ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں کی قوم کے کمی تھے' کمین تھے' پیشہ ور تھے' ان کو تم نے مساوات کا درجہ دے کر اپنے ساتھ بٹھا لیا ہے تو تمہاری بات ماننے کے بعد ہم ان کے ساتھ بیٹھ جائیں۔یہ ساتھ بیٹھنا محاورۃً ہی نہیں ہے۔گاؤں میں جا کے دیکھیے' خواہ وہ گاؤں کے باہر بڑ کے درخت کے نیچے ہی کیوں نہ بیٹھا ہو' چوہدری تو پلنگ کے اوپر بیٹھا ہوگا' صرف چوہدری کی ذات کے جو لوگ ہونگے' وہ خواہ غریب بھی ہوں' وہ تو دوسرے پلنگوں کے اوپر بیٹھ سکتے ہیں لیکن جو اس کی ذات سے ذرا نیچے کا ہوا' اس کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی نشست پہ بیٹھ جائے۔اُسے نیچے بیٹھنا پڑے گا۔وہ برابر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔اعتراض یہ تھا۔یہاں بھی' عزیزانِ من! جب آپ ایک درخواست لے کر افسر مجاز کے دفتر میں حاضر ہوتے ہیں ' کرسی خالی پڑی ہوئی ہے' آپ کی جرأت نہیں ہوتی کہ آپ اس کرسی پہ بیٹھ جائیں اور وہ بھی آپ کی طرف دیکھتے ہی پھر فیصلہ کرتا ہے کہ اس کو کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کردوں یا نہیں۔یہی تھا جو انہوں نے کہا تھا کہ **وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ** (26:111) اوٗ یہ تمہارے ساتھ ہیں۔پیشہ ور لوگ ہیں' کمی لوگ ہیں' کام کر کے کمائی کرنے والے ہمارے ذلیل طبقے کے ہیں۔اب دیکھیے یہاں ذلت اور شرف کا معیار کیا ہے: کام کر کے کھانے والے ذلیل قوم ہوگئے' دوسروں کی کمائی کا استحصال کر کے اپنے محل کی رنگینیوں کا سامان بہم پہنچانے والے شریف

ہو گئے۔ پہلے دن سے یہی بات چلی آ رہی ہے۔

عزیزانِ من! حضرتِ نوح علیہ السلام کا قصہ بیان ہو رہا ہے' کیا یہی نہیں کہ ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے؟ کیا یہ آج کی بات نہیں ہے؟ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ یہ ہے کہ اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ 'ارذل' ہیں' انہوں نے تمہاری بات پہ لبیک کہہ لیا' ایمان لے آئے' مان لیا تو کیا یہ اس بات کی کوئی سند ہو سکتی ہے کہ واقعی تمہاری بات معقول ہے' ماننے کے لائق ہے؟ وہاں ہے کہ **اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ وَمَا نَرٰی لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ** [1] (11:27) ۔ یہ چھوٹی عقل و فکر کے لوگ ہیں۔ یہ کہہ دینا کہ صاحب! دیکھیے ان لوگوں نے بھی تو غور و فکر کے بعد بات کو صحیح مانا ہے' کوئی سند نہیں ہے یعنی اس لحاظ سے جو غریب آدمی ہے' وہ عقل و فکر سے بھی عاری ہوتا ہے۔ پھر میں وہی پنجابی کا محاورہ لایا ہوں ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'': جس کے گھر کھانے کو ہو اس کا جو پاگل ہے وہ بھی دانشمند کہلاتا ہے اور غریب کتنی ہی عقل و دانش کا مالک کیوں نہ ہو' کوئی اس کی بات نہیں سنتا' بھری محفل کے اندر کوئی غریب کھڑا ہو کر کچھ کہے تو اسے کہتے ہیں کہ ''او بھئی جا او بھئی جا'' یعنی وہ اس قابل نہیں کہ اس کی بات بھی سنی جائے۔ یہ وہی بات ہے کہ ان کی رائے ہی کیوں ہو؟ گویا رائے تو چاندی اور سونے سے خریدی جاتی ہے' بازار میں بکتی ہے' اس لیے یہ ان کے گھر میں تو بھری پڑی ہے' اس لیے ان کی کوٹھیاں بھری پڑی ہیں۔ یہاں الرای [2] دیا ہے: غریب کی رائے ہی کیا!! یہاں دونوں ہی باتیں کہہ دیں کہ معاشرے میں ان کا مقام ہی کیا ہے؟ یہ ارذل ہیں ان کی رائے اس قابل ہی نہیں کہ اس پہ کوئی غور بھی کیا جائے۔

---

[1] یہ ہم میں سے ادنیٰ درجے کے (نیچ قوم کے) لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رو سے اختیار نہیں کیا یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں۔ ہمیں کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جس میں تمہیں ہمارے مقابلے میں کوئی برتری حاصل ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 497)۔

[2] اس کا مادہ ''رأی'' ہے۔ رُؤیۃ!۔ کسی چیز کا ادراک کر لینا۔ یہ لفظ آنکھوں سے دیکھنے یا عقل و بصیرت سے معلوم کرنے یا خواب و خیال میں دیکھنے اور تصور کرنے سب کے لیے آتا ہے۔ جوھری نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ صرف ایک مفعول آئے تو اس کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتے ہیں اور جب دو مفعول آئیں تو اس کے معنی جاننے یا علم حاصل کرنے کے ہوتے ہیں راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی ہوتے ہیں اور جب اس کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اس طرح دیکھنا (یا غور و فکر کرنا) کہ اس کے بعد انسان کو عبرت و موعظت حاصل ہو (تاج العروس)۔ صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ ''رَاٰی رُؤیَۃ!۔ آنکھ سے دیکھنے کو۔ رُؤیَا خواب دیکھنے کو اور رَاُیًا دل سے دیکھنے اور غور کرنے کو کہتے ہیں (محیط المحیط)۔ اَلرَّاْیُ رائے۔ خیال۔ جب کوئی بات یقینی نہ ہو، ظنی ہو، تو اس کے دو متناقص پہلوؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینا رائے کہلاتا ہے (تاج العروس)۔ عرب اسے اس معنی میں بولتے ہیں جس معنی میں ہم کہتے ہیں ''بتاؤ تو سہی''۔ ''ذرا خبر تو دو'' (لغات القرآن جلد دوم)۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1960، ص ص۔ 712 تا 713)۔

اصل سوال تو حق کے نظام کی صداقتوں پر عمل کرنے کا ہے

کہؤ عزیزانِ من! یہ کب کی بات ہو رہی ہے؟ آج کی ہو رہی ہے یا چھ ہزار سال پہلے کی ہو رہی ہے؟ آپ دیکھ رہے ہیں دین کس طرح سے ابدیت کنار ہوتا ہے۔ کیا یہ قومِ نوح علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے یا آپ کی قوم سے کہا جا رہا ہے؟ جواب ملتا ہے۔ کیا بات ہے!! **قَالَ وَمَا عِلۡمِیۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ** (26:112) کہا کہ مجھے اس سے واسطہ نہیں ہے کہ یہ لوگ کیا کیا کام کر کے اپنی روٹی کماتے ہیں۔ میں تو یہ کہونگا کہ یہ جو حق پر مبنی نظام ہے' یہ اس کی صداقتوں کے قائل ہیں۔ میں صرف اتنا ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرا واسطہ نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کیا یہ اپنے کام کاج میں بھی صحیح راستے پہ چلتے ہیں یا اس کے اندر کچھ غلطی کرتے ہیں؟ تو سنو **اِنۡ حِسَابُهُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ** (26:113) اگر تم عقل و شعور سے کام لو تو تمہیں یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ یہاں ایک معیار ہے جو میں نے قائم کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو صداقتوں کا اعتراف کرنے والا ہے وہ ہم میں ہے خواہ وہ غریب ہو' امیر ہو' کام کاج کرنے والا ہو۔ کام کاج کے اندر وہ اپنے انداز سے کیا کرتا ہے اس کا حساب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل میں ہے۔ ذرا شعور سے' عقل سے کام لو جو تم کہتے ہو۔ اور وہاں سے جواب ملتا ہے کہ نہیں' ان کو اپنے ہاں سے نکال دو ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ ان کو ان کی دعوت پر اعتراض نہیں ہے جو وہ دیتے ہیں کہ میرے نزدیک ان مستقل اقدار کے مقابلے میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

اس صاحبِ دولت اور برسرِ اقتدار طبقہ کو اعتراض یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں کے کمین ہیں اور ہم دونوں اکٹھے ایک سطح پہ آ کر تمہارے ساتھ بیٹھ جائیں' یہ ہم نہیں مان سکتے۔ کہا کہ اگر تمہاری یہ شرط ہے تو سن لو **وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (26:114) جس نے ان صداقتوں کو صحیح سمجھ لیا ہے' ایمان لے آیا ہے' تمہاری خاطر میں اسے نکال نہیں سکتا' دھتکار نہیں سکتا' الگ نہیں کر سکتا۔ تم آئے ہؤ تمہیں اپنی دولت پر بڑا مان ہے' تمہیں اپنے بہت زیادہ اشراف ہونے کے اوپر مان ہے' تمہیں اپنی جاگیرداری' سرمایہ داری کے اوپر مان ہے۔ تم یہ کچھ اپنے گھر رکھؤ مجھے اس کی پرواہ نہیں کیونکہ میں نے پہلے ہی اعلان کیا ہے کہ میں تم سے اس کا کوئی اجر نہیں چاہتا' تمہارا دبیل [1] تو وہ ہؤ جو تمہارا محتاج ہؤ جو تم سے کوئی اجر چاہتا ہؤ صلہ چاہتا ہو۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کہنے سے کتنی بڑی آزادی حاصل ہوگئی کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ جاؤ' مجھے تمہاری پرواہ نہیں ہے' ہاں البتہ یہ یاد رکھو کہ اگر تم نہیں مانتے ہو تو تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے' عزیزانِ من! جو پہلے یہ کہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ دوسرے مقام پہ ان کے ہاں کی یہ بحث اور ان کے جوابات تفصیل سے دیئے ہیں۔

---

[1] دبیل: ماتحت، تابع

یہاں بات یہ کہہ کر قرآن آگے بڑھ گیا کہ **قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ كَذَّبُوۡنِ** (26:117) نوحؑ نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہ میری ہر بات کی تکذیب کیے جا رہے ہیں۔ میں لاکھ ان سے کہتا ہوں' یہ کہے چلے جا رہے ہیں کہ نہیں تم جھوٹے ہو۔ کس بات کی تکذیب کر رہے ہیں یعنی کونسی بات تھی جس کی تکذیب کر رہے ہیں؟ اس کی کہ یہ کہہ رہا ہے کہ صحیح نظامِ زندگی جس میں انسانیت خطرات سے محفوظ رہ سکتی ہے' وہ مساوات انسانیہ ہے' وہ تکریمِ انسانیت کا معیار ہے۔ معیار کیا ہے؟ یہ کیریکٹر کردار ہے' دولت مندی نہیں' ذات برادری کا اونچا ہونا نہیں' سید پٹھان ہونا نہیں' صرف یہ ہے کہ تمہارا کردار اور کیریکٹر کیسا ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے اور وہ اس کی تکذیب کر رہے تھے۔ تکذیب کے معنی یہ نہیں ہوتا کہ تم جھوٹ بولتے ہو بلکہ اُس کو جھوٹا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر یہ نہیں آنا چاہتے' یہ ان کے برابر نہیں بیٹھنا چاہتے جو دولت میں ان سے کم ہیں۔ ان کے اعتبار سے ذات برادری یا گوت چھوٹی ہے۔

تفریقِ انسانیت کے یہ تصورات ہم نے ہندو دھرم سے لیے ہیں

میں نے کہا ہے کہ ہم تو سارے کے سارے یا ہم میں سے بیشتر ان ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں جن کے دھرم کی بنیاد ہی تفریقِ انسانیت کے چار ورنوں کے اندر ہے۔ انہوں نے انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے چار ورنوں میں تقسیم کر رکھا ہے: برہمن' کھشتری' ویش اور شودر۔ اب شودر یا ویش اس مقام پہ سمجھ لیجیے جس مقام پہ حضرت نوحؑ کے کام کرنے والے پیشہ وروں کا یہ قصہ چلا آ رہا ہے۔ وہ تفریق اس درجے پہ ہے کہ شودر اس سڑک پہ نہیں چل سکتا' جس سڑک پہ برہمن چل سکتا ہے' اُس کنویں سے پانی نہیں پی سکتا جو انہوں نے اپنے لیے مختص کر رکھا ہے۔ ان کے بقول خدا کی جو الہامی کتاب وید ہے' اس کا اشلوک اگر کسی شودر کے کان میں' راستہ چلتے ہوئے پڑ جائے' تو ان کے ہاں کے شاستر کے مطابق سیسہ پگھلا کر اس کے کان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ تو ہم ان سے مسلمان ہوئے۔

پرویزؒ کا خاندانی تعارف

میں نے' شاید آپ کو بتایا تھا کہ ہم بھی نومسلموں میں سے ہیں۔ ہمیں مسلمان ہوئے تھوڑی پشتیں ہوئی ہیں۔ ہمارے ہاں کے دادا نانا ابھی وہیں تھے اور واقعی ان کی یہ صورت تھی کہ چھینک آتی تھی تو وہ ''جے نندی کی'' کہتے ہیں۔ وہ بات یہ تھی کہ پشتوں سے جو چھینک کے ساتھ ''جے نندی کی'' کہنا چلا آ رہا تھا' وہ چلا آ رہا تھا کہ مسلمان ہو گئے۔ معاف رکھیے' کہنے کی بات ہے کہ میرے اپنے نانا مسلمان ہو گئے' سات بیویاں تھیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ میری ایک نانی ہندنی تھی۔ میری خالہ ہندنی

تھی۔ وہ سارے جتنے عقائد' نظریات' رسومات تھیں' وہ سب ہم لوگوں میں موجود تھیں۔

ہمارے ہاں ذاتوں کے بعد گوتوں کا پایا جانے والا تصور

عزیزانِ من! یہ وہی برہمن اور کھشتری' ویش اور شودر ہمارے ہاں موجود ہیں لیکن شکل مختلف ہے۔ شہری زندگی میں اب کچھ کمی آ گئی ہے۔ اب بھی اگر چہ یہ کمی ذاتوں وغیرہ کی آئی ہے' لیکن ہمارے ہاں جو دولت کا معیار ہے' وہ ان سے بھی زیادہ سخت ہوگیا ہے۔ وہاں انڈیا میں جا کر دیکھیے ایک تو راجپوت وہ ذات ہوتی ہے' وہ بہت بڑی ذات ہوئی۔ ''اجی کیہڑا راجپوت؟ ذاتاں دے اگے گوتاں آ ئیاں' کہ جی بھٹی ہونے آں۔ نہیں' اے بھٹی تے ہوندے ہیگے' پر کیہڑے بھٹی یعنی او گوتاں اچ فرق اون ڈیا ہیگا اے' ذات تے ٹھیک ہیگی اے''[1] اس کے نیچے جسے آپ Sub-caste کہتے ہیں آ گئیں اور وہ نیچے تک کتنی ہی ہوتی ہیں۔ یہ اتنی بڑی تفریق ہے۔ راجپوت اور ارائیں' معاف رکھیے گا' ان کا تو سوال ہی نہیں کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں۔ خود ایک ذات کے اندر نیچے کم بخت گوتیں ہوتی ہیں۔ کم بخت اور چلی جا رہی ہیں۔ اگر چہ زمانے کے تقاضوں نے ان کو کسی طرح سے کچھ پامال کیا ہے اور پارٹیشن (تقسیم) سے ایک بات یہ بھی ہوئی ہے کہ آبادیاں ایسی گھل مل گئیں کہ وہ اتنے زیادہ متشدد نہیں رہے۔

ان ذاتوں اور گوتوں کے بعد دولت کی تقسیم نے ہمارے ہاں قیامت برپا کر دی ہے۔ مزدور اور کارخانے کا مالک تصور میں بھی نہیں آ سکتا کہ ان میں کوئی مساوات ہے۔ فرق کیا ہے؟ یہ مزدور کام کر کے روٹی کماتا ہے' وہ کارخانے کا مالک اس کی محنت پر پلتا ہے۔ اس کم بخت کو تو ذلیل ہونا چاہیے' جو دوسرے کی محنت پہ پلتا ہے مگر نہیں جی! وہ واجبِ عزت ہے' یہ اس کی نگاہوں میں ذلیل ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں اس مسئلے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ یہ ہے طبقاتی کشمکش۔

کمیونزم کی ناکامی کی وجہ

طبقاتی کشمکش میں کمیونزم آیا' کارل مارکس (83-1818ء) نے اس کا اعلان کیا۔ یہ اس طبقاتی کشمکش کے خلاف ایک بہت بڑا اعلان تھا۔ شروع میں حضرتِ علاّمہ[2] نے لکھا اور میں نے تو اس کے اوپر سینکڑوں صفحات لکھے کہ ان کے پاس کمیونزم کی کوئی بنیاد نہیں ہے' اساس نہیں ہے کہ کام کیوں کیا جائے مگر اس طبقاتی کشمکش کا حل ان کے ہاں یہی ہے اس لیے وہ سردست سوشلزم

---

1. جناب! آپ کون سے راجپوت ہیں؟ اب ذاتوں کے آگے گوتیں آ گئیں۔ کہا کہ جناب! ہم بھٹی ہوتے ہیں۔ نہیں' یہ بھٹی تو ہوتے ہیں لیکن کون سے بھٹی؟ یعنی گوتوں میں اب یہ فرق ہوتا جا رہا ہے کہ ذات تو ٹھیک ہے۔
2. یہ اشارہ مفکرِ قرآن ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877ء) کی طرف ہے۔

لے آئے' کمیونزم پہ تو آ نہیں سکتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کارل مارکس (83-1818) نے کمیونزم کا تصور دیا تھا۔ کمیونزم کا یہ نظریہ تھا کہ ہر''ایک سے اس کی استطاعت کے مطابق کام لو اور اس کی ضرورت کے مطابق اس کی Wages (اجرت) دو''۔ یہ تھا بہت بڑا اصول ہے۔ انسانیت کا حل اسی میں ہے لیکن اس نے اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ اصول تو یہی ہے جو میں سمجھ سکا ہوں لیکن اس پہ عمل کس طرح سے کیا جاسکے گا' یہ میں نہیں بتا سکتا' گو آج مجھے یہ قابلِ عمل نظر نہیں آتا لیکن آخر میں ہونا یہی ہے۔ اُس نے یہ کہا ہے۔ ان کے ہاں کی یہ ڈکشن موجود ہے کہ آخرالامر انسانیت نے آنا اس پہ ہے۔ کیسے آئے گی؟ اس نے کہا کہ یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا' میرے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی۔ آپ کو شاید یاد نہیں' اس کی ہسٹری پڑھیے۔ اس کی پارٹی کے بہت سے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ گئے کہ انسانیت کی فلاح اور بہبود کا اصول اتنا بڑا بتاتے ہو اور یہ نہیں بتاتے کہ اس کے اوپر عمل کیسے ہوگا۔ تم تو خیالی پلاؤ پکا رہے ہو❶۔

کارل مارکس کا اپنی ناکامی کے متعلق کھلے بندوں اعتراف اور لینن کی سوشلزم کی تجویز

میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص❷ صاحبِ کردار تھا۔ اس کے بجائے ہمارے ہاں کا کوئی لیڈر ہوتا' تو وہ کہتا کہ میں کر کے بتاؤں گا' تم مجھے ووٹ دے کر دیکھو' کل ہی ایک ایک کو مکان' روٹی اور یہ اور وہ۔ دونگا ووٹ دتے دے' اوہدے بعد ٹھینگا دکھایا❸۔ عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص صاحبِ کردار تھا۔ اُس نے کہا کہ بھئی! مجھے اس کا حل معلوم نہیں ہو رہا' اس لیے میں اس کا اعلان کرتا ہوں۔ تم ساتھ چھوڑتے ہو' چھوڑ دو۔ میں تمہیں فریب میں کیوں رکھوں۔ اس کے بعد لینن (1924-1870ء) اور اس کے ساتھیوں نے یہ کہا تھا کہ اس سے نیچے کا جو سوشلزم کا درجہ ہے' سرِ دست اس کو لے آؤ۔ وہ بھی اس کا حل نہیں دے سکے۔ کام کا جذبہ محرکا انہیں بھی نہ مل سکا۔

Wages (اجرت) کا تعین طبقاتی کشمکش کے مسئلے کا حل پیش نہیں کر سکا

یہ جو Wages (اجرت) کا تعین ہے یعنی مزدوری مقرر کرنا' اس سے طبقاتی کشمکش کا حل ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے چند منٹوں میں بات دہرا لینے دیجیے۔ مزدور کی دن بھر کی اجرت مثلاً دس روپے ہے' راج کی اجرت تیس روپے ہے' اور سیئر کی پچاس روپے ہے'

---

❶ اس کی وضاحت کے لیے یہ پمفلٹ دیکھیے: پرویزؒ: جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور۔

❷ یہ اشارہ کارل مارکس (83-1818) کی طرف ہے۔

❸ اسے ووٹ دے دیئے تو اس کے بعد اس نے ٹھینگا دکھا دیا۔

انجینئر کی سو روپے [1] ہے۔ صاحب! یہ تعین کس معیار کی رو سے ہے؟ جہاں تک محنت کا تعلق ہے سب سے نیچے والا یعنی مزدور تو ان سب سے زیادہ کرتا ہے۔ پھر اگر دس روپے میں' اس مزدور کے بال بچوں کا پیٹ نہ بھرے اور جس کو سو روپیہ دے رہے ہیں وہ دس روپے میں ہی اپنا گزارہ کرلے' تو نوے روپے (Surplus Money) اس کے پاس بچ جائیں' تمہارے ہاں یہ معیار کیا ہے؟ آپ حیران ہونگے کہ سارے سوشلسٹ ملکوں میں بھی اسی طرح Wages (اجرت) ہیں جس طرح کیپٹلسٹ ملکوں کے اندر ہیں اور جب بھی یہ Wages (اجرت) مقرر ہوئیں' تفریق تو آ گئی' مزدور مزدور رہا' میٹ میٹ رہا۔ وہ جو انگریز آٹھ آنے زیادہ دیا کرتا تھا' تو وہ بڑا کاریگر تھا۔ وہ مزدوروں میں سے ایک کو آٹھ آنے زیادہ دے دیا کرتا تھا۔ اس کا نام میٹ رکھ دیا۔ آپ ذرا Wages (اجرتوں) میں فرق ڈال دیجئے' طبقاتی کشمکش آ موجود ہوگی۔ یہ اصول کہاں سے لیا تھا کارل مارکس نے؟ یہ نبی اکرم ﷺ کا دیا ہوا اصول ہے' برادرانِ من! کہ ''ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو' اس کی ضرورت کے مطابق اس Wages (اجرت) دو''۔

نبی اکرم ﷺ نے مالِ غنیمت کی اقدار کو بدل دیا: معاشی نظام وحی کی روشنی میں

جہاد میں جانے والے سارے یکساں طور پہ سپاہی آتے تھے۔ پہلے مالِ غنیمت کی تقسیم کا کچھ اور معیار تھا۔ حضور ﷺ نے یہ کیا کہ مجرد سپاہی تھا' جس کی شادی نہیں ہوئی ہوتی تھی' اس کو کم دیا اور بال بچے والے کو اس کے مقابلے میں زیادہ دیا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ یہ کس معیار کے مطابق تقسیم ہے؟ یہ تقسیمِ محمدی ﷺ ہے' عزیزانِ من! یہ ہے مساواتِ محمدی ﷺ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی ضرورت اس سے زیادہ ہے۔ لیکن کام ان کی استعداد کے مطابق ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جو Bachelor (غیر شادی شدہ) ہے' مجرد ہے جس کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ میدانِ جنگ میں ہوسکتا ہے کہ صوبیدار ہو' ہوسکتا ہے میجر ہو۔ وہ دوسرا بال بچے والا ہوسکتا ہے کہ صرف سپاہی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی ضرورت اس سے زیادہ ہے۔ یہ معاوضہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے کاموں کا معاوضہ نہیں ہے۔

بصیرتِ قرآنی کے تحت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اکبر کا فیصلہ یعنی وظائف کا تعین اور وضاحت

یہ بات حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ (634-573ء) نے واضح کی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بھی جب وظیفوں کی مقدار (Amount) مقرر کی ہے' تو اس وقت حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے (634-632ء) میں یہ لسٹیں

---

[1] یاد رہے یہ بات جون 1978 کی 16 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

مرتب ہوئی تھیں۔ اُس وقت بھی یہ سوال اٹھایا گیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تیرہ برس مکے کی زندگی میں ساری صعوبات اور تکالیف برداشت کیں' مدنی زندگی میں کم از کم بیاسی جنگوں کے اندر حصہ لیا' ان کے مقابلے میں یہ لوگ جواب آرہے ہیں' انہوں نے ابھی بہت تھوڑا سا کام کیا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ یہ تقسیمِ وظائف میں بعض اوقات برابر حصہ دے رہے ہیں بعض اوقات ان کو زیادہ دے رہے ہیں' اُن کو کم دے رہے ہیں۔ کیوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہ کا یہ وہی ارشاد ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (26:109) انہوں نے جو دین کی خدمات کی ہیں' اس کا معاوضہ تو خدا کے ہاں سے ملے گا' میں تو معاشی مسئلے کا حل بتا رہا ہوں۔ کیا بات تھی ان لوگوں کی! کیسے سمجھے تھے' یہ دین کو!!۔ کہا کہ ان سے پوچھ کر دیکھو کہ کیا انہوں نے زیادہ وظیفہ لینے کے لیے جہاد میں حصہ لیا تھا؟ اگر یہ لیا تھا تو ان کا جہاد جہاد نہیں ہے۔ انہوں نے تو اپنا فریضہ سمجھ کر' حکمِ خداوندی کی تعمیل سمجھ کر' حصہ لیا تھا۔ میں معاشی مسئلے کا حل یہ بتا رہا ہوں کہ بال بچے والے کی ضرورت مجرد کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے میں اسے زیادہ دونگا۔ یہ اصول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے' اور اس پہ عمل کیا ہوا ہے۔

جہاں کارل مارکس ناکام رہ گیا' اس سے آگے [1]

یہ اصول کارل مارکس (83-1818ء) کہاں بتا سکتا تھا لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (634-573) کی یہ جو چیز تھی کہ یہ ''جو انہوں نے خدمات سرانجام دی ہیں' ان کا معاوضہ خدا کے ہاں سے ملے گا' میں معاشی مسئلے کا حل بتا رہا ہوں'' اس پہ پھر کسی کی طرف سے اعتراض نہیں ہوا' سب مطمئن ہوگئے۔ کارل مارکس (83-1818ء) کے پاس یہ بنیاد نہیں تھی کہ اس کا معاوضہ خدا کے ہاں سے ملے گا۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف علامہ اقبالؒ (1938-1877ء) نے انقلابِ روس کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اے کہ می خواہی نظام عالمے...... جستۂ اورا اساسِ محکمے؟'' تُو دنیا میں ایک نظام کی طرح ڈال رہا ہے۔ اس کے لیے جو محکم بنیاد ہے کیا تم نے اس کی تلاش کرلی ہے؟ محکم بنیاد یہ ہے کہ اس کا صلہ خدا کے ہاں سے ملے گا''[2]۔ ایمان کی بنیادوں پہ' عزیزانِ من! یہ جو معاشی حل ہے' یہ طبقاتی کشمکش کا حل ہے۔ ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق کام کرے جو اسے تفویض کردیا گیا ہے: وَمَـــــآ

---

[1] یہ پرویزؒ کے ایک پمفلٹ کا نام بھی ہے۔ اسے ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

[2] داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کُن از اُمّ الکتاب (اقبالؒ: جاوید نامہ)

اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ❶ (26:109) یہ سوال نہیں کہ وہ ان سے اس کا اجر مانگے **اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ** (26:109) اس کا اجر تو تجھے وہاں سے مل جائے گا۔

اب اس طبقاتی کشمکش کا حل یہ ہے کہ جب وہ اجرت کے لیے آئے تو اس سے یہ پوچھا جائے کہ بھئی! تمہارا اور تمہارے بال بچوں کا گزارہ کتنے میں ہوجائے گا؟ ٹھیک ہے جی اتنے میں ہوجائے گا تو وہ اس کو دیدیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ کارل مارکس اور اس میں تعلق کیا ہے؟ یہ ہے' بنیاد عزیزانِ من! پوچھتے ہیں قرآن کا معاشی نظام کیا ہے اور اتنی اتنی موٹی کتابیں لکھی جاتی ہیں جبکہ اس کا یہ جواب چار فقروں میں آجاتا ہے: تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔

اگر معاشی نظام کی بنیاد Wages (اجرتوں) پر ہے تو ان کے تعین کا معیار کیا ہے؟

حضرت نوح علیہ السلام کا قول قرآنِ کریم نے نقل کیا ہے۔ کہا ہے کہ **قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ كَذَّبُوۡنِ** (26:117) حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے میرے نشوونما دینے والے! یہ میری تکذیب کرتے ہیں۔ تکذیب اس بات کی تھی جو آج بھی کی جارہی ہے کہ اجرت کے تعین کا معیار ضرورت نہیں ہے' اجرت کا تعین ضرورت کے لحاظ سے نہیں ہے۔ آج وہ تعین کون کرتا ہے؟ کارخانے دار کرتا ہے' مالک کرتا ہے' مزدور تو اپنی Wages (اجرتیں) مقرر نہیں کرتا' کارخانے دار کرتا ہے۔ یہ ہے اس دین کے اصول کی تکذیب کہ ضرورت کے مطابق ہر ایک کو دیا جائے۔ آج جس طرح آپ کے ہاں دین کی تکذیب ہورہی ہے' دوسروں کے ہاں کم ہوتی ہے سویڈن جیسی سیکولر حکومتیں بھی ایسی ہیں کہ جن کے ہاں رات کو کوئی شخص بھوکا نہیں سوتا۔ سچ کہا تھا کہ **اِنَّ قَوۡمِیۡ كَذَّبُوۡنِ** (26:117) یہ میری قوم میری ہر بات کی تکذیب کیے جارہی ہے۔ یہ ہے تکذیب' عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ ''او کہندے سی توں جھوٹ بولنا ❷ ایں''، یعنی وہ کہتے تھے کہ نہیں یہ بات جھوٹی ہے کہ تکریم اور عزت کا معیار وہ ہے جو تم کہتے ہو' بلکہ اس کا معیار دولت ہے' معیار جاگیرداری ہے' معیار سرمایہ داری ہے' معیار حکومت ہے۔ یہ اس چیز پہ نہیں آتے تھے **فَافۡتَحۡ بَيۡنِیۡ وَبَيۡنَهُمۡ فَتۡحًا وَّنَجِّنِیۡ وَمَنۡ مَّعِیَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ** ❸ (26:118) ہم وہاں تک پہنچے ہیں کہ یہ اس راستے پہ نہیں آئیں گے'

---

❶ میں تم سے اس کے لیے معاوضہ نہیں چاہتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔845)۔

❷ وہ کہتے تھے کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔

❸ تو ان میں اور مجھ میں قطعی فیصلہ کردے' اور مجھے اور میری جماعت کے لوگوں کو' جو تیرے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں' ان کی دست درازیوں سے محفوظ رکھ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 846-847)۔

میرے اس نظام کو یہاں قائم نہیں ہونے دیں گے' اس لیے مجھے اور میرے جو ساتھی ہیں' ان کو ایک طرف کر اور وہ جو دوسری طرف ہیں ان میں کچھ فیصلہ کن بات کر دے۔ ہم الگ ہو جائیں ان کی دست درازیوں سے محفوظ ہو جائیں۔ **فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ** ❶ (26:119)۔ میں نے کہا ہے کہ یہ بات پھر دوسری جگہ ہے کہ اس کے لیے کیا کیا گیا۔ یہاں تو یہی ہے کہ ان کو اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں بچا لیا اور جو باقی تھے' وہ سیلاب میں غرق ہو گئے۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً** (26:121) اس واقعہ میں حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ اگر اتنی سی بات ہی ہو کہ انہوں نے کشتی نہیں بنائی تھی' ڈوب گئے تھے تو کونسی بڑی نشانیاں ہیں! بات تو وہ ہے جو پہلے کہی گئی ہے کہ جو طبقاتی کشمکش ہے اس کو مٹانے کی جو صورت ہے اور طبقاتی کشمکش پر مبنی جو نظام ہے' وہ اپنے زور سے آپ ڈوب کر مر جاتا ہے: مشکل یہ ہے کہ **وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** (26:121) اس بات کو بہت سے لوگ مانتے نہیں ہیں۔ **وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** ❷ (26:122) مانیں یا نہ مانیں' ہمارے سورج کی یہ کیفیت نہیں ہے کہ لوگ اگر یہ مانیں کہ وہ چھ بج کر ستاون منٹ پر چڑھے گا اور وہ چڑھے اور اگر یہ کہیں کہ نہیں' اس پہ نہیں چڑھے گا اور وہ نہ چڑھے۔ ہم العزیز ہیں' ہمارے ہاتھ کے اندر قوت ہے' ہم میں اقتدار ہے' وہ سورج چڑھے گا' چڑھ کے رہے گا۔ جو اقتدار ہمارے ہاں ہے' ہلاکو خاں کا یا ڈکٹیٹر کا اقتدار نہیں ہے' الرحیم ہے' انسانیت کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے: 'مرگِ او اہل جہاں را زندگی است' ❸ اقبالؒ (1877-1938) مستبد ڈکٹیٹر سے کہتا ہے کہ تیری موت میں اہلِ ایمان کے لیے زندگی ہے۔ چند دن کے لیے سانس لے لے اور پھر اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ تمہارا انجام کیا ہوتا ہے۔ یہ ہے العزیز اور الرحیم ہونا۔ یہ ہے **وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ** (26:122)۔

داستانِ نوح علیہ السلام کا مآل وانجام

یہاں یہ داستان ختم ہوئی۔ دو باتیں اس میں یہ کہنے کی ہیں کہ بات تو انہوں نے یہی کہی تھی کہ یہ جو طبقاتی کشمکش یا معیارِ عزت وتکریم ہے' وہ دولت ہے' زمینداری ہے' سرمایہ داری ہے۔ یہ جو کام کرنے والے لوگ ہیں' جو غریب ہیں' یہ سب کچھ ہیں۔ اور تو کوئی جرم ان کے خلاف قرآن نے نہیں بتایا لیکن کہا یہ ہے کہ **اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى** (53:52) یہ قوم اظلم یعنی بدترین قسم

---

❶ چنانچہ ہم نے نوحؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سوار کیا اور انہیں بخیر وخوبی نکال کر لے گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 847)۔

❷ خدا کا قانون بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ آخر الامر غالب آئے گا اور خدا کی عالمگیر ربوبیّت کو پھیلاتا چلا جائے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 847)۔

❸ ایک ظالم کی موت ہزاروں مظلوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

کی ظالم ہے۔ اَطۡغٰی انتہا درجے کی سرکش ہے۔ یعنی جو قوم معیارِ قومیت' خون کا رشتہ' وطن کا رشتہ' زبان کا رشتہ' بنائے' طبقاتی کشمکش قائم رکھے' معیارِ عزت وفضیلت دولت حشمت اور جاگیرداری یا ذات اور گوت کا جو فرق ہے' اس کو رکھے' تو قرآن اس کو اظلم کہتا ہے' اَطۡغٰی کہتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی اس کے خلاف یہ دعوت تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اپنے لوگوں کیا کیا کہتے تھے؟ ان کے ذہن میں تھا کہ یہ ایسی بات کہہ رہا ہے کہ اگر لوگوں نے یہ Seriously (سنجیدگی سے) سن لی تو وہ واقعی اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ ان کے پاس معقول جواب نہیں تھا' Reason پہ مبنی جواب نہیں تھا' عزیزانِ من! انہوں نے کہا کہ اِنۡ ھُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِہٖ جِنَّۃٌ (23:25) یہ پاگل ہوگیا ہے۔ آج بھی عزیزانِ من! جو یہ کہتا ہے' اس کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہوگیا ہے' یہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے فرزانے تو یہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے مکر وفریب کی تدبیروں کے اندر پوچھو نہیں کتنے بڑے فرزانے ہوتے ہیں اور جو یہ بات کہنے والا ہوتا ہے اس کو ایک لفظ کہہ کے یہ پاگل قرار دیدیتے ہیں کہ پاگل ہے' ایہدی گل نہ سنو' پاگل ہیگا ای' پاگل اوئے پاگل اوئے ''فیر پچھے گلی محلے دے منڈے لگا دیندے نیں'' [1] یعنی یہ گلی محلے کے لونڈے اُس زمانے میں ہوتے تھے' آج آپ پہ فتوے لگ جاتے ہیں۔ معقول بات کا معقول جواب نہیں ہے۔ ''پاگل'' ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان کو پتہ نہیں ہے کہ یہ پاگل نہیں ہے۔ انجام کار بتائے گا کہ تم دونوں میں سے پاگل کون تھا۔

عزیزانِ من! وقت صرف چند منٹ رہ گئے۔ بات بڑی اہم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی تھی کشتی میں بیٹھے تھے اور اس طرح سے ان کی نجات ہوئی تھی اور وہ باقی ڈوب گئے تھے۔

کیا قوموں کی موت وحیات کا مدار ان کے اجتماعی اعمال اور اختیار کردہ نظام سے وابستہ ہوتا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جوان کا تکریمِ انسانیت کا معیار تھا' یہ جوان کا ظلم وستم تھا' اس کے لیے ہمارے ذہن میں تو یہ تھا کہ یہ اس قسم کے جو جرائم کرتے تھے' اس کے نتیجے میں خدا کی طرف سے ایک عذاب آتا تھا اور وہ عذاب میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ تمام قومیں جو اس طرح سے قرآن میں آئی ہیں ان کے متعلق ذہن میں یہی ہے کہ وہ کچھ جرائم کرتے تھے' یہاں وہاں کچھ نہیں ہوتا تھا' قاعدے قانون Cause & Effect (علت ومعلول) کی رو سے کچھ نہیں ہوتا تھا' خدا کی طرف سے ایک عذاب آجاتا تھا: مثلاً

---

[1] اس کی بات نہ سنو۔ یہ پاگل ہوگیا ہے (اس کے پیچھے یوں پکارتے ہیں) او پاگل! او پاگل! پھر اس کے پیچھے گلی محلے کے دوسرے لڑکے لگا دیتے ہیں (جو اس کے پیچھے یہی نعرہ بازی کرتے چلے جاتے ہیں)۔

سیلاب آ گیا' یہ غرق ہو گئے۔ پتھر برس گئے یعنی آتش فشاں پہاڑ سے لاوا نکلا' وہ غرق ہو گئے۔ خدا کی طرف سے عذاب آتا تھا اور یہ اس نبی کا معجزہ ہوتا تھا کہ وہ ایمان لانے والے بچ جاتے تھے۔ اب ختم نبوت کے بعد نہ نبی آئے' نہ معجزہ ہو' تو جب وہ معجزہ ہی نہیں ہونا' تو پھر خدا کا عذاب بھی ختم ہو گیا' پھر موج ہوئی' ڈر کا ہے کا!! ۔ یہ کیا تھا؟ یہ ان قوموں کا انجام ہوتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے غلط نظام یا اعمال سے یعنی ان کے داخلی کردار سے اس عذاب کا کیا تعلق ہے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ قوموں پر جو عذاب' جس شکل میں بھی آتا رہا' اس کا قوموں کے داخلی کردار یعنی ان کے غلط نظام یا اعمال سے کیا باہمی تعلق ہوتا تھا؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔

عزیزانِ من! اسے محض معجزہ کہہ کر آگے نہیں بڑھ جانا چاہیے کہ اب ہمارے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں رہے گا' معجزہ دکھانے والے بھی چلے گئے' جن کے ساتھ معجزہ ہوا وہ بھی چلے گئے' اب نبوت ختم ہو گئی' نبی آنے سے رہے' تو راوی عیش لکھتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ ان میں باہمی تعلق کیا تھا؟ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے' اس کے متعلق وقت چاہیے۔ اس لیے اسے ہم کسی آئندہ درس [1] پر اٹھا رکھتے ہیں۔ اگلا درس (26:123) سے شروع ہوگا۔ آج کا درس 122 ویں آیت پہ ختم ہوا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] اس یعنی ''خارجی حوادث اور قوم کے داخلی کردار میں باہمی تعلق'' کے لیے دیکھیے اسی کتاب کا دسواں باب (جون 1978ء کی 23 تاریخ کا درس)۔

دسواں باب: سورۃ الشعرآء (خارجی حوادث اور قوم کے داخلی کردار میں تعلق)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قوموں پر عذاب نازل ہونے کی بنیادی وجہ

عزیزانِ من! آج جون 1978ء کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 123 سے ہونا چاہیے تھا لیکن سابقہ درس کے آخر میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قوموں پر جو عذاب' جس شکل میں آتا رہا' اس کا قوموں کے داخلی کردار سے کیا تعلق ہے؟ یہ سوال بڑا غور طلب اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ اس سے کئی ایک سوالات بلکہ اعتراضات دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا رفع کرنا ضروری ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کہتا یہ ہے کہ اس قوم نے مثلاً قومِ نوح علیہ السلام ہی ہم پہلے لے لیتے ہیں' طبقاتی ناہمواریاں پیدا کیں' ذاتی اخلاق اور کردار کی بجائے دولت کو عزت اور مناصب کا معیار قرار دیا۔ اپنی محنت سے روٹی کمانے والوں کو کمین کہا' ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کیا۔ اس کے بعد یہ ہے کہ سیلاب آیا اور یہ قوم غرق ہوگئی۔ اسی طرح باقی اقوام کو دیکھیے۔ کسی قوم نے زمین پر لکیریں کھینچ کر انہیں ذاتی ملکیت میں لے لیا' غریبوں اور ان مویشیوں پر' اس کے دروازے بند کر دیئے۔ آتش فشاں پہاڑ سے لاوا آیا اور یہ قوم بہہ گئی۔ اسے خدا کا عذاب قرار دیا گیا۔ کسی قوم نے اپنا سیاسی نظام ایسا بنایا کہ محکوم رعایا پر عرصہ حیات تنگ کر دیا' زلزلہ آیا اور وہ قوم تباہ ہوگئی۔ کسی قوم نے جنسی بدنہادی (Sexual Anarchy) کے اندر انتہا کر دی اور ایک آندھی چلی اور یہ قوم تباہ ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو بدکرداریاں' بداخلاقیاں گنائی گئی ہیں' ان کا ان حوادث کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ قوم میں اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں' تو زلزلے کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ ان کی وجہ سے زلزلہ آیا اور قوم تباہ ہوگئی؟ زلزلے آج بھی آتے ہیں' آندھیاں آج بھی آتی ہیں' سیلاب بھی آتے ہیں اور اس میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ وہ بدکردار قوم ہی اس میں تباہ ہوتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں کے جو عام معیار ہیں' ان سے دیکھا جائے تو وہ

کفار کی قومیں جو انتہائی بدکردار ہیں، وہ تو ان حوادث سے محفوظ رہتی ہیں اور

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر ❶

تباہ حالیاں ہمارے ہاں ہیں۔ ہالینڈ ❷ کا پورا ملک سمندر کے نیچے ہے، انہوں نے سمندر میں تختے لگا کر، بند باندھ کر، پورا ملک سمندر کے نیچے سے حاصل کیا ہوا ہے اور اس کو پیچھے دھکیلتے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سیلاب آجاتا ہے تو سارے ملک میں تباہی پھیل جاتی ہے۔

قوموں کی بدنہادیوں کے نتائج کی مختلف شکلیں

یہ بڑا غور طلب سوال ہے کہ قوموں کی اِن اخلاقی بدکرداریوں کا ان حوادث سے کیا تعلق ہے اور اگر یہ تعلق ہے تو اس زمانے میں تعلق تھا آج تو وہ تعلق نظر نہیں آتا۔ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ عزیزانِ من! ان کا براہِ راست تعلق ان بدکرداریوں سے نہیں ہوتا۔ تعلق کیا ہوتا ہے؟ آپ کے ہاں سیلاب آتا ہے، ہر سال آتا ہے، اتنی تباہی مچاتا ہے کہ ملک اجڑ جاتا ہے، آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں، تباہیاں آتی ہیں، ہزاروں کی تعداد میں رقبے پہ تباہی آتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے اس کے بعد آپ لوگ اس کے متعلق کیا کرتے ہیں؟ کہ جی، دیکھا وہ اتنا سخت بند بنایا تھا، اتنے کروڑ روپیہ اس پہ صرف ہوا تھا، وہ ایک لہر آئی تو معلوم ہوا کہ وہاں جناب انجینئر صاحب نے، ان کے ٹھیکیدار نے، سیمنٹ کی جگہ ریت بھر رکھی تھی وہ بہہ گئی، وہ عملہ وہاں موجود ہی نہیں تھا، وہ سیمنٹ انہوں نے اپنے گھروں میں رکھ لیا تھا، اس لیے یہ چیز ہوگئی ہے۔ جو حفاظتی تدابیر اختیار کرنے والے تھے، انہوں نے

---

❶ اقبالؒ (شکوہ): رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

❷ Netherlands. Dutch Ne-der-land. A Kingdom of northwest Europe, often known as Holland. A low-lying area, much of it reclaimed from the Sea, with 40 per cent of the land below sea-level, it is a heavily agricultural state, but its economy has come to depend increasingly on industry and commerce. Dominated through its history by various European powers, it was, in the 16 th century, a leader in European culture, commerce, and colonialism. The Hague is the seat of government. Its area is 33812 square kilometres (13,055 square miles, polulation is 14,300,00 and capital is Amsterdam. (Reader`s Digest (1990). Universal Dictionary. London: The Reader`s Digest Association Limited, P.1036).

اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہیاں برتیں اور اس لیے یہ ہوا۔ یہ ساری چیزیں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ قوم کی بدکرداریاں ہیں۔ یہ بددیانتی ہے' یہ کام چوریاں ہیں' اس طرح سے اتنا روپیہ صرف کرنے کے باوجود اس میں سے کم از کم خرچ کرنا اور زیادہ سے خرد برد کر جانا' یہ اخلاقی' بدنہادیاں ہیں' ان کا تعلق تو اخلاقیات سے ہے۔ اور اگر کہیں آنے والا کوئی مورخ یہ کہے کہ اس قوم کے اندر اس قسم کی بداخلاقیوں کی وبا عام ہوگئی تھی اور اس کے بعد دیکھا یہ گیا کہ ہر سال سیلاب کا عذاب آتا تھا اور لوگوں کو تباہ کر دیتا تھا تو بات تو یہ ٹھیک ہوگی۔

ارضی وسماوی حوادثات سے محفوظ رہنے کے لیے محکم انتظامات کی ضرورت اور ان کی اہمیت

سیلاب کا براہِ راست تعلق ان اخلاقیوں' بدکرداریوں سے نہیں بلکہ یہ جو ارضی اور سماوی حوادث آتے ہیں' ان کا تعلق خالص فطرت کے قوانین سے ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ قوم ان حوادث سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے ہاں انتظام کیا کرتی تھی اور ان انتظامات کے محکم ہونے کے لیے قوم کے اندر جن کا تعلق اخلاقی ذمہ داریوں سے ہوتا ہے' وہ جتنا زیادہ بہتر بلند اخلاق ہونگے' اتنے ہی کم حوادث میں تباہیاں آئیں گی۔ زلزلے آج بھی آئیں گے۔ جن قوموں کے ہاں زلزلے آتے ہیں' وہ تدبیریں کر رہی ہیں' سوچ رہی ہیں اور اس قسم کے ان کے ہاں انتظامات ہوجاتے ہیں' پھر ان کے ہاں نقصان کم از کم ہوتا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ آج بھی لاوا اگلتے ہیں' آندھیاں آج بھی آتی ہیں' ان پہاڑوں سے پتھراؤ آج بھی ہوتے ہیں۔ جن قوموں کی حالت وہی ہے جو ہماری حالت ہے تو یہ سب کچھ ہوتا ہے' جن کے ذمے یہ سب کچھ ہے' پورا نظام پورے ملک کا لیجیے یا وہ محکمے لیجیے یا وہ افراد لیجیے کہ جن کے ذمے یہ کچھ کرنا ہے' وہ جس قدر اس میں کوتاہیاں اور بددیانتیاں برتیں گے' اسی حد تک آپ کا نقصان ہوگا۔ جو قوم یہ کچھ نہیں کرے گی اس کا یا تو نقصان ہوگا ہی نہیں یا کم از کم نقصان ہوگا۔ جہاں یہ صورت ہو کہ بیٹی کی شادی کے لیے وہ سسرال والے آئے کہ صاحب! دن دیجیے۔ کون سے دن دینے ہیں؟ وہ مئی جون کا مہینہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! اگست ستمبر کے بعد دن رکھیے گا۔ کہنے لگے: کیوں؟ کیا وجہ ہے اس کی؟ کہنے لگے کہ سیلاب کے بعد آسانی ہوجاتی ہے کیونکہ یہ انجینئر صاحب تھے۔ انجینئر کے بیٹے کی شادی سیلاب کے بعد بڑی آسانی سے ہوجاتی ہے۔

آپ تجزیہ کیجیے' آپ لوگوں کے ہاں صحت اتنی گر گئی ہے' دوائی کوئی صحیح نہیں ملتی' غذا صحیح نہیں ملتی' صفائی کا انتظام صحیح نہیں ہے۔ کروڑ در کروڑ روپیہ ان مدوں (Items) میں صرف ہوتا ہے۔ ان وباؤں کے بارے میں اگر کوئی بعد کا مورخ لکھے کہ اس قوم کی اخلاقی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ ایک وبا کے اندر ان کے ہاں لاکھوں انسان تباہ ہوگئے تو وہ ٹھیک کہے گا۔ جو وبا ہے اس کا

تعلق بے شک فطری قوانین سے ہے لیکن اس کی تدابیر بھی تو قوانینِ فطرت کے مطابق ہوسکتی ہیں ۔ یہ تدابیر انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہیں ۔ اور جب انسانوں میں غلط نظام یا غلط افراد کی وجہ سے اس قسم کی اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں تو وہ حوادث نقصان کر جاتے ہیں ۔ اب دیکھیے قرآنِ کریم میں ہم قصہ حضرتِ نوحؑ پہ آئے ہوئے تھے ۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ انہوں نے طبقاتی تقسیم ایسی کر رکھی تھی کہ جس سے جو لوگ قوم کے نچلے طبقے سے متعلق ہوتے تھے' انہیں کمین رذیل سمجھا جاتا تھا۔ اگر آپ انہیں معاشرے میں اس قدر ذلیل اور خوار تصور کرتے ہیں' ان کو انسانیت کی صف پہ ہی کھڑا نہیں کرتے' تو اس کے بعد معاشرے کے اندر بیسیوں قسم کی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں ۔ قوم کی تو یہ حالت تھی۔

اب اس کے بعد آپ دیکھیے کہ اس قسم کی بیسیوں خرابیوں کا اور سیلاب کا کیا تعلق ہے؟ یہ حضرتِ نوح علیہ السلام تھے اور ان کے ساتھ یہ ان کے متبعین تھے' جو ایمان لانے والے تھے' جن میں یہ خرابیاں نہیں تھیں ۔ اگر یہ سیلاب اس لیے آیا تھا کہ وہ جو خرابیوں والے لوگ ہیں ان کو تباہ کرے تو یہ جو اچھے کردار اور اعمال کے انسان تھے انہیں تو اس سیلاب سے محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ چاہیے یہ تھا کہ یہ وہیں رہتے' ان کے سامنے وہ ڈوبتے مرتے اور سیلاب انہیں کچھ نہ کہتا ۔ ان کے حسنِ عمل کی وجہ سے ان کو محفوظ رہنا چاہیے تھا ۔ اگر اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے وہ غرق ہوئے ہیں تو ان کے حسنِ عمل کا تقاضا تھا کہ یہ وہاں رہتے اور پانی ان کو نہ چھوتا' اگر خدا کا عذاب اسی طرح سے آنا تھا ۔ کیا یہ منطق کی صحیح بات ہے؟ لیکن قرآن کہہ کیا رہا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں کہ ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے ۔ اگر تم نے یہ کچھ کیا تو ملک سے نکال دیں گے' ملک بدر کر دیں گے' تباہ کر دیں گے ۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ فَلَا تَبۡتَئِسۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ** (11:36) اس مقام پر نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ جتنوں نے ایمان لانا تھا وہ لا چکے ہیں' یہ جو باقی تم دیکھتے ہو کہ کس قدر سخت قسم کے مجرم واقع ہوئے ہیں' اب ان کی طرف سے اس کا کچھ امکان نہیں ہے کہ یہ اس طرف آئیں' ایمان لائیں ۔ خوامخوہ کے لیے تم مایوس نہ ہو جاؤ کہ میں نے اتنی محنت کی ہے اور ان لوگوں کی یہ حالت ہے ۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم ان سے الگ ہو جاؤ۔

سیلاب سے بچنے کے لیے حضرت نوحؑ کی طرف سے کشتی بنانے کی تیاری

سیلاب آنے والا ہے اس کے لیے **وَ اصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَ وَحۡیِنَا** (11:37) اب تم ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ خدا کا ایک نبی ہے اور وہ اسکے متبعین ہیں' انہیں سیلاب سے محفوظ رہنے کے لیے

کہا یہ جا رہا ہے کہ کشتی بناؤ۔ زمانہ وہ تھا جب ابھی لوگوں کو کشتی بنانے کا ہنر بھی نہیں آتا تھا' کیونکہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ **بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا** (11:37)۔ ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق یعنی کشتی بنانے کا علم بھی حضرتِ نوح علیہ السلام کو وحی کے ذریعے دیا گیا۔ یہ ہے ایک چیز۔ اس میں دوسری چیز کیا ہے؟ عزیزانِ من! بس یہ ہے ایک خصوصیت جو اس زمانے میں ہوتی تھی کہ نبی کو قبل از وقت اس کا علم دیدیا جاتا تھا کہ فلاں حادثہ آنے والا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر آج موسمیات والے جو کچھ کرتے ہیں' ان میں بھی کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں لیکن نبی کے متعلق یہ خصوصیت تو قرآن نے ہر مقام پہ بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آنے والے واقعات کا علم قبل از وقت دیدیتا تھا۔

اب حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں انہیں علم دیا گیا ہے کہ یہ سیلاب (Deluge) اس طرح سے آنے والا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس [1] (Encyclopaedia of Religions and Ethics) میں دیکھیے۔ اس طوفان کے متعلق تو بڑا تفصیلی مقالہ [1] ہے۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ سیلاب کس طرح سے آیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ خلیج فارس کے کنارے سے' یہ آتش فشاں پہاڑ' اندر ہی اندر' بری طرح سے پھٹے اور انہوں نے شدت سے سمندر کے پانیوں کا رخ بدل دیا تھا۔ سیلاب نے تو بہر حال فطرت کے ایک قاعدے کے مطابق آنا تھا' ان کے ہاں ارد گرد یہ پہاڑیاں تھیں' نیچے میدان میں یہ واقعہ ہوا تھا لیکن جو سیلاب آنا تھا' اس میں تو مومن اور کافر' یہ سارے کے سارے' اس بستی میں بس رہے تھے۔ اس میں وہ خصوصیت کیا ہے؟ یہ کہ نبی کو اس کے متعلق پیشگی اطلاع دیدی۔ اس سے بچنے کے لیے پھر طریقہ کیا ہوا؟ طریقہ یہ ہے کہ جو کشتی بنائے' بچ جائے۔ نوح علیہ السلام کو ہم نے وحی کے ذریعے سکھایا کہ کشتی یوں بناتے ہیں۔ انہوں نے بنائی اور **بِاَعْیُنِنَا** (11:37) ہم دیکھتے رہے کہ صحیح طریقے سے کشتی بنا رہا ہے۔ ہماری وحی کے مطابق' ہماری زیرِ نگرانی کشتی بنانے کا یہ کام مکمل ہوا۔ اب یہ مومن بچ کیسے رہے ہیں؟ اس کے لیے کشتی بنائی جا رہی ہے۔ سیلاب سے کشتی کے ذریعے ہی بچا جا سکتا ہے۔

سیلاب سے بچنے کے سلسلہ میں کشتی بنانے پر تمسخر اڑانے والوں کا انجام

اب اگلی بات یہ ہے کہ وہ جو کفار تھے' جو مخالفین تھے' اگر وہ کشتی بنا لیتے تو وہ بھی بچ جاتے۔ بچانے والی چیز کشتی تھی' لیکن ہوا

---

[1] اس مقالہ نگار کا نام Suss (سَس) ہے۔ اس نے اس امر کی تحقیق کی ہے کہ اس طوفان (Deluge) کا طبعی سبب کیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ ''خلیج فارس کا ساحل کسی عظیم الشان آتش فشاں لہر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی ایک بہت طوفانِ بادِ تند (Cyclone) شامل ہو گیا۔
(Encyclopaedia of Religions and Ethics)

کیا؟ قرآن نے بتایا کہ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ (11:38) ان کے سامنے یہ کشتی بنا رہے تھے۔ اب وہ جن کے دماغ دولت اور قوت کے نشے سے بدمست ہو رہے تھے وہ دیکھ رہے ہیں' ان پہ تمسخر کر رہے ہیں کہ یہ بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہے۔ وہ انہیں بتا رہے ہیں لیکن وہ ہر بات کی تکذیب کر رہے ہیں' یعنی جن کو ذہن میں پہلے سے جھوٹا تصور کر لیا جائے تو اس کی کوئی بات بھی سنجیدگی سے کوئی نہیں سنتا۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ انہیں بتاتے تھے لیکن وہ تمسخر کرتے تھے۔ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ (11:38) وہ ان سے کہتے کہ آج تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو' عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ قانونِ خداوندی تمہارا مذاق اڑائے گا اور ایسا مذاق اڑائے گا کہ پتہ چل جائے گا کہ انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ یعنی وہ یہ دیکھ رہے ہیں۔

اب وہ سیلاب آ گیا۔ یہ کشتی میں سوار ہو گئے۔ وہ جو پیچھے رہ گئے تھے' انہیں کفار کہا گیا ہے' مخالف کہا گیا ہے۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے غرق ہونا تھا' ان میں حضرتِ نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی ہے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو' جو ایمان نہیں لایا تھا' آواز دی۔ قرآن بتاتا ہے کہ وَ نَادٰى نُوْحُ نِ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا (11:42) اور حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ آ جاؤ' کشتی میں بیٹھ جاؤ۔ اگر ان کا بیٹا کشتی میں بیٹھ جاتا تو یہ بھی بچ جاتا۔ وہ کشتی یہ نہیں کہتی کہ وہ ایمان والوں کو بچاتی ہے وہ چونکہ ایمان نہیں لائے' اس لیے وہ یہ کہتی کہ نہیں صاحب! یہ تو بے ایمان ہے' اس کو تو میں سزا دونگی اور تمہیں بچا لونگی۔ کشتی میں تو کوئی بھی بیٹھے گا' بچ جائے گا۔

خارجی کائنات کے اندر طبعی قوانین کا یہ سلسلہ دراز کافر اور مومن سب کے لیے یکساں ہیں

قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (11:40) مختلف چیزیں ہیں جن کی تمہیں ضرورت پڑے گی' مختلف قسم کے جانور وغیرہ' کے دو دو جوڑے ساتھ رکھ لو' یہاں سیلاب میں یہ سب تباہ ہو جائیں گے اور تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ انہوں نے یہ بکریاں' بھیڑیں' مرغیاں اور اس قسم کی چیزیں' بھی کشتی میں رکھ لیں۔ ان چیزوں کے معاملے میں مومن اور کافر کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بس جو کشتی میں بیٹھ گیا بچ گیا۔ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی کہ تُو بھی آ جا۔ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ (11:42) وہ ان سے ہٹ کر کسی ایک جگہ میں تھا۔ ان میں شامل نہیں ہوا تھا' وہ کفار میں سے ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ ان میں سے تھا جو پیچھے رہ گئے ہوئے تھے۔ ان کو حضرتِ نوح علیہ السلام آواز دیتے ہیں کہ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا (11:42) اے بیٹے! ہمارے ساتھ آ جاؤ وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (11:42) اور انکار کرنے والوں کا

ساتھ چھوڑ جاؤ۔ قَالَ سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ (11:43) اس نے کہا کہ نہیں' ابا جان! کوئی بات نہیں' میں اپنی حفاظت کا انتظام آپ ہی کرلونگا' میں اس چٹان کے اوپر بیٹھ جاؤنگا' پہاڑی کے اوپر چڑھ جاؤنگا' وہاں سیلاب نہیں آئے گا۔ وہ تو بیٹے نے انکار کیا ہے' ورنہ اگر وہ بھی ہاں کرتا اور بیٹھ جاتا تو جہاں مرغیاں اور بکریاں بچ گئی تھیں وہاں اُن کا بیٹا بھی بچ جاتا۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہے کہ فطرت کے قوانین کے تابع آپ جو چیزیں' جو حفاظتی سامان تیار کریں گے' اختیار کریں گے' استعمال کریں گے تو فطرت مومن اور کافر میں فرق نہیں کرتی۔ آدمی کی سطح پہ یہ چیزیں بنتی ہیں' انسان کی سطح پہ یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ جو ٹیکا ہے' اگر وہ ایک کافر بچے کو لگے تو وہاں تو وہ تباہی مچا دے اور مسلمان کے بچے کے لگے تو وہ اس وبا سے محفوظ رہ جائے۔ فطرت کے طبعی قوانین (Physical Laws) کا ان چیزوں پہ مدار نہیں ہے۔

عذاب کے مروجہ غلط تصور کے برعکس قرآن حکیم کا پیش کردہ تصور

اب یہ ایک واقعہ ہمارے سامنے آرہا ہے جس میں یہ تباہی یا عذاب کا لفظ آتا ہے۔ عذاب کا لفظ' ہمارے ہاں ایک عرصے کے بطور ایک اصطلاح استعمال سے' ہمارے ذہنوں میں کچھ اور ہی تصور لاتا ہے۔ عذاب کا لفظ ہم کہیں گے تو تصور آئے گا کہ خدا کی طرف سے کسی ایسے طریقے سے جس کا تعلق نہ قاعدے سے ہے' نہ قانون سے ہے' ان لوگوں کے اوپر کوئی وبال آتا ہے' جن کے متعلق بظاہر ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیوں ایسا ہوا؟ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ خدا کی مشیت ہے' خدا کا عذاب آتا ہے۔ عذاب کی جگہ اگر آپ تباہی کہہ لیں تو بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ سیلاب فطرت کے قوانین کی رو سے آتا ہے۔ حوادثِ ارضی وسماوی سے محفوظ وہ رہتے ہیں جو فطرت کے قانون کے مطابق حفاظت کا سامان کرتے ہیں۔ تباہی ان کی آتی ہے جو ان قوانین کی رو سے اس سے تحفظ کا انتظام نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ایک مثال اور ہے جو قرآنِ کریم نے بیان کی ہے۔ وہ اسی نوعیت کی ہے۔ وہ مثال ہے قومِ سبا کی۔ یمن قومِ سبا کا بڑا مشہور علاقہ تھا' بڑا زرخیز تھا' ان کی معیشت زراعت تھی' یعنی زراعت پہ ان کا دارومدار تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ لَقَدۡ کَانَ لِسَبَاٍ فِیۡ مَسۡکَنِہِمۡ اٰیَۃٌ (34:15) قومِ سبا کی داستان اور ان کے جو مساکن یعنی رہنے کی جگہیں تھیں' ان میں بھی سمجھنے والوں کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانی ہے۔ جَنَّتٰنِ عَنۡ یَّمِیۡنٍ وَّ شِمَالٍ (34:15) ان کے دائیں بائیں باغات ہی باغات تھے' بڑا سرسبز علاقہ ہے۔ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِ رَبِّکُمۡ وَاشۡکُرُوۡا لَہٗ بَلۡدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّ رَبٌّ غَفُوۡرٌ (34:15) سب چیزیں جمع ہوگئی ہیں یعنی خوشگوار رزق' بافراط وفراوانی سے یہ سب کچھ مل رہا ہے' حفاظت کا سامان بھی خدا کی طرف سے' ربوبیت دینے والے کی طرف سے' حاصل ہو رہا ہے۔

مغفرت کا قرآنی مفہوم

یاد رکھیے کہ یہ آپ جب کھیتیوں کو آج کل مثلاً اسپرے کر کے کیڑے مکوڑوں سے بچاتے ہیں' تو اسے عربی زبان میں مغفرت کہتے ہیں۔ ایسا کرنے والا غفور کہلاتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! رب کا لفظ ہے کہ خدا کا جو نظامِ ربوبیت تھا جس کی رو سے اس نے مخلوق کو پالنا ہے' تو اس نے انتظام ایسا بتا رکھا ہے کہ یہ چیزیں تباہیوں سے کس طرح بچ سکتی ہیں۔ آج ہمارے ہاں یہ کیڑے مارنے والی دوائیاں اسپرے کرتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ کیڑے مارنے والی چیزیں ذرا Crude Form (خام حالت) میں تھیں۔ اس صورت میں اس زمانے میں ہمارے زمیندار ''سواہ چھڑکدے ہوندے سی پودیاں اتے جاکے''[1] ۔ یہ ساری چیزیں مغفرت کی ہیں یعنی فطرت کے قوانین کی رو سے سامانِ حفاظت کی ہیں۔ ہاں تو کہا کہ قومِ سبا میں یہ سب کچھ تھا' معیشت کا سامان تھا۔ یہ جو آپ کے ہاں ڈیم بنے ہوئے ہیں' جنہیں بند کہتے ہیں' مثلاً پہلے پشاور کے قریب ایک چھوٹا سا تھا' پھر یہ بہت بڑا منگلا ڈیم بنا ہے' تربیلا اس سے کہیں بڑا بنا ہوا ہے۔ تو آپ کے ہاں کی زرعی معیشت کا دارو مدار آبپاشی پر ہوتا ہے' آبپاشی کے نظام میں یہ جو بند بنانا ہے' اس کا بڑا اہم حصہ ہے۔

قومِ سبا کی معیشت اور اس کے ظلم پر مبنی معاشرتی نظام کی بربادی کی وجوہات

قرآن بتاتا ہے کہ قومِ سبا کی معیشت زرعی تھی اور آبپاشی کے نظام کے لیے انہوں نے اپنے ہاں ڈیم (بند) بنا رکھے تھے' بڑے خوشحال تھے' ان کی کھیتیاں سونا اگلتی تھیں۔ انہیں دور دور تک جا کر' غالباً تجارت یا لوٹ مار کے ذریعے سے دولت اکٹھی کرنے کا چسکا پڑ گیا۔ قرآن نے اشارہ دیا ہے کہ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (34:19) ان کے اندر ایسی حرکتیں پیدا ہوئیں کہ وہ دور دور ملکوں میں چلے جائیں' جیسا میں نے کہا ہے کہ یا تو یہی چیز ہے کہ مثلاً تجارت کے لیے دور دور نکل جائیں لیکن تجارت بھی اگر صحیح نظام کے تابع کی جائے تو کوئی ایسی بری بات نہیں لیکن آگے ہے کہ وَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (34:19) انہوں نے ایسا طریق اختیار کیا جو ظلم پر مبنی تھا اور اپنے آپ پہ انہوں نے بڑی زیادتی کی۔ وہ یہ کہ اس قسم کا معاشی نظام چھوڑ کر کوئی دوسرے طریقے اختیار کیے۔ قرآن نے اس کی تفصیل تو نہیں بتائی لیکن ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ نے بتایا کہ یہ چیز صحیح طریقے پہ نہیں تھی۔ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ دولت آسانی سے ہاتھ آ جاتی تھی۔ دور دور نکل جانے کی بات قرآن نے کی ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کے لیے بتایا ہے کہ فَاَعْرَضُوْا (34:16) انہوں نے اس بات سے منہ موڑ لیا' اپنی توجہ معیشت کے دوسرے طریقوں یعنی

---

[1] پودوں پر راکھ چھڑکا کرتے تھے۔

لوٹ مار' ڈاکہ زنی' یا شاید اس قسم کے طریقوں کی طرف کرلی' جسے آپ اسمگلنگ کہتے ہیں۔ دور دور جانے کا لفظ قرآن میں ہے اور ساتھ میں ظلم کا لفظ بھی اس میں آیا ہے گویا وہ کوئی ناجائز طریقے تھے اور وہ اپنے ہاں سے دور نکل جاتے تھے۔ دور نکل جانے کا جو نتیجہ ہے' یہ ہے غور طلب نکتہ جو قرآن نے کہا ہے: **فَاَعۡرَضُوۡا** (34:16) یہ جو بند تھے ان کی طرف سے انہوں نے چشم پوشی کر لی۔ بند (Dam) کی تو کیفیت یہ ہے کہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال کرتے رہیے تو وہ محفوظ رہتا ہے۔ اس میں اگر کہیں دراڑیں پڑ جائیں یا کہیں سوراخ ہو جائیں تو وہ بھی بڑے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

آپ قرآن کا اعجاز دیکھیے' عزیزانِ من! ایک لفظ کو بیان کرتا ہے: **فَاَعۡرَضُوۡا** (34:16) وہ جو انہوں نے ڈیم بنا رکھے تھے' ان کی طرف سے انہوں نے اعراض برتا' چشم پوشی کرلی' ان کی نگہداشت باقی نہ رکھی' ان کی دیکھ بھال باقی نہ رکھی' ان کو Neglect (فراموش) کر دیا' انہوں نے اِدھر کی بجائے کسی اور طرف اپنا رخ کر لیا۔ گویا بات یہ کی کہ وہ ڈیم تو پانی کے بھرے ہوئے تھے ان کے لیے جو مغفرت کی بات پہلے کہی ہے کہ وہ وجہ حفاظت بھی ہوں' ان کی طرف سے انہوں نے اعراض برت لیا' اپنے اس معیشت کے نظام میں تبدیلی کی' تاکہ تن آسانیوں سے دور نکل کر' ظلم سے' وہ روپیہ ہاتھ آ جائے اور اس محنت سے وہ بچ جائیں۔ بات یہ کی ہے کہ وہ جو ان کے بند تھے' جو ڈیم بنائے ہوئے تھے' ان کی طرف سے انہوں نے اعراض برتا تو **فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سَيۡلَ الۡعَرِمِ** (34:16) ان کے اوپر سیلاب آ گیا۔ یہ جو عرِم ہے' یہ اس بند (Dam) کا نام تھا جو بہت بڑا ڈیم[1] تھا۔ اسے آج بھی عرِم کا ڈیم کہتے ہیں' اسے عربی زبان میں عَرِم بھی کہتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ دور دور نکل گئے' ان بندوں (Dams) کو Neglect (فراموش) کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بارش ہوئی' پانی آیا اور بند ٹوٹ گیا۔

اب اگر کسی ڈیم کا بند ٹوٹ جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ **وَ بَدَّلۡنٰهُمۡ بِجَنَّتَيۡهِمۡ جَنَّتَيۡنِ ذَوَاتَىۡ اُكُلٍ خَمۡطٍ وَّ اَثۡلٍ وَّ شَىۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِيۡلٍ** [2] (34:16) تباہیاں مچی ہیں' وہی پانی جو وہاں خوشگوار رزق اور طیّب پھل

---

[1] یہ بند دارالسلطنت مآرب کے قریب تھا۔ اسے سدِ مآرب کہتے ہیں۔ حجاز کے عرب بند (Dam) کو ''سد'' اور عرب یمن ''عَرِم'' کہتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحۃ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص 74 (فٹ نوٹ 2)

[2] وہ بستیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ ان کے باغات تباہ و برباد ہو گئے اور ان کی جگہ یہاں وہاں جنگلی جھاڑیاں اُگ آئیں' جن میں کڑوے کسیلے پھل لگتے تھے یا کچھ جھاؤ کے درخت اور تھوڑی سی بیریاں۔ یوں ان کی زندگی کی خوشگواریاں' بدمزگیوں میں بدل گئیں (اگر وہ اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھتے اور معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا نہ کرتے تو اس قسم کے فطری حوادث کا مقابلہ ہمت اور استقامت سے ہو جاتا اور انہیں دوبارہ بسنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی۔ قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھ کر' حسنِ انتظام اور معاشرہ میں عادلانہ نظام سے طبعی حوادث کا مقابلہ آسانی سے ہو جاتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 992)۔

دیتا تھا' وہ ان کو بہا کر لے گیا' ان کے باغات تباہ و برباد ہوگئے اور اسکے بعد تم اس زمین میں جا کر دیکھو' کہیں یہ بیریاں ہیں' کہیں ان کی جگہ' یہاں وہاں جنگلی جھاڑیاں آگ آئیں' جن میں کڑوے کسیلے پھل لگتے تھے' یا یہ جھاؤ کے پودے' سرکنڈے' بیکار قسم کی جھاڑیاں اب اس زمین میں اُگنا شروع ہوگئی ہیں۔ اور یہ ہے جسے خدا کا عذاب کہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس چیز کو عذاب کہا ہے۔ انہوں نے جو بند بنائے' ان کی مرمت' انکی حفاظت' ان کی نگرانی سے اعراض برتا۔ بند ٹوٹا' جتنی ان کی زرعی زمینیں اور باغات تھے وہ اجڑ گئے اور ان کی جگہ پھر یہ جھاڑیاں' یہ جھڑ بیریاں اور دوسری جھاڑیاں اور سرکنڈے یہ سارے' اس کے اندر قرآن نے بیان کیے کہ یہ وہاں اگنے شروع ہوگئے اور اس کے بعد کہا کہ پھر وہ قوم تباہ ہوگئی۔

عذاب اور میسرہ کا قرآنی مفہوم

آپ نے دیکھا کہ کس چیز کا یہ عذاب آ رہا ہے۔ معیشت کا وہ نظام بدلا جس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ زرعی نظام میں یہ بات نہیں تھی۔ اُدھر جسے آپ Easy Money (زرِسہل) کہتے ہیں' اس کا چسکا پڑ گیا' یہ وہی ہے جسے قرآن نے میسرہ کہا ہے جس کا ترجمہ ہم نے صرف جوّا کر دیا ہے اور جوّا (Gambling) کو ہم نے حرام قرار دیا اور Easy Money (زرِسہل) کی باقی ساری شکلیں شیرِ مادر کی طرح حلال اور طیب' حالانکہ لفظِ میسرہ میں یسر ہے اس کا مادہ ''ی س ر'' ہے' جسے بائیں ہاتھ کا کھیل کہتے ہیں۔ اس کا انگریزی زبان میں Easy Money (زرِسہل) بڑا اچھا ترجمہ ہے۔ کہا کہ انہوں نے یہ شروع کر دیا' اِدھر اس بند (Dam) کو Neglect (فراموش) کیا۔ پہلے تو زرعی نظام تباہ ہوا' بند ٹوٹا' جتنی زمینیں تھیں وہ برباد ہوگئیں' اب زمینوں میں وہاں جھاؤ اگ گیا۔ اسے خدا نے اپنا عذاب کہا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بداخلاقیوں' بدکرداریوں کا حوادث سے کیا تعلق ہے۔ وہ نظام جو ظلم پر مبنی تھا' اس کا بند ٹوٹنے سے اس طرح سے سیلاب آیا' سیلاب کی وجہ سے سب کچھ بہہ گیا۔ باقی قوموں کے متعلق بھی جو کچھ کہا ہے کہ فلاں قوم تھی' ان کے ہاں یہ چیز ہوئی' آتش فشاں پہاڑ نے لاوا اگلا اور وہ قوم تباہ ہوئی۔ وہ یہ بات ہوئی کہ قوم سہل انگاریوں میں پڑ گئی تھی' قوم کے سامنے توجہات کے مرکز اور چیزیں ہوگئیں' لوٹ مار میں لگ گئیں' بداخلاقیوں کے اندر غرق ہوگئیں۔ ساری کی ساری قوم ہی اس چیز کے اندر ڈوب گئی اور جب ڈوب گئی تو یہ جتنے بھی اسباب اور وسائل اور ذرائع تھے اور رزق کے' حفاظت کے' تمدن وغیرہ کے سامان تھے' وہ (نظرانداز) کر دیئے گئے' اس کا نتیجہ پھر آپ دیکھ لیجیے کہ کیا ہے۔

کیا آج ہماری قوم کی حالت یہی نہیں ہے؟

آپ کے ہاں بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس اصطلاح میں جسے خدا کا عذاب کہتے ہیں' کیا آپ کے اوپر یہ خدا کا عذاب نہیں

ہے؟ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ اس چیز کا نتیجہ ہے کہ پوری قوم کی قوم دیگر مشاغل میں مصروف ہوتی چلی گئی۔ ساری قوم Easy Money (زرِ سہل) کی طرف چل نکلی۔ قرآن نے خمر اور میسرہ کہا تھا اور ہم نے اس کا ترجمہ صرف شراب اور جوّا (Gambling) کرلیا۔ ''خمر'' ہر وہ شے ہے جو عقل کو ماؤف کردے' قوم خالص جذبات پر چلنے لگ جائے۔ ''میسرہ'' Easy Money (زرِسہل) ہے' جو وہ دولت ہے جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ اگر پوری قوم اس کے اندر غرق ہوجائے تو وہ جو محنت و مشقت اور تدبیر سے نئی نئی چیزیں ایجاد کرنا ہے' ایجاد شدہ چیزوں کی حفاظت کرنا ہے' دیکھ بھال کرنا ہے' ختم ہوجاتا ہے' انہی چیزوں سے تو قوموں کی ترقی ہوتی ہے' انہوں نے Neglect (نظر انداز) کیا' معاشرہ اس طرح سے Easy Money (زرِسہل)' شراب اور جوّا کی ان چیزوں کے اندر آ پڑا' خدا کا عذاب تو آ گیا۔ پہلی قوموں کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ وہ اس قسم کے جو حوادث آتے ہیں' وہ ان کی نظر میں ہوتے تھے' اس لیے کہ اس زمانے میں ابھی ان ارضی و سماوی حوادث سے بچنے کے انتظامات انسان نے اتنے زیادہ ایجاد نہیں کیے تھے یا تحقیق نہیں کیے تھے' ابھی Discover (بے نقاب) نہیں کیے تھے' اس لیے چھوٹے سے چھوٹا حادثہ بھی تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔ جہاں جہاں بھی یہ تباہیاں آئی ہیں قرآن نے یہی کہا ہے۔ نبی کے متعلق اتنی سی بات کی ہے کہ اسے قبل از وقت اس کے متعلق اطلاع دیدی جاتی تھی۔ یہاں تو وہ کشتی پہ سوار ہوگئے ہیں اور اُن میں وہ وہاں سے نکل ہی جاتے تھے۔

حضور نبی اکرمؐ کا عہد قدیم اور جدید میں ایک حدِ فاصل ہے

اس کے بعد ہمارے سامنے حضور نبی اکرم ﷺ کا دور آتا ہے۔ یہ جو ختمِ نبوت ہے' یہ اپنے اندر بڑے اہم حقائق رکھتی ہے۔ یہی نہیں کہ خدا کی طرف سے وحی آنے کا سلسلہ ختم ہوگیا بلکہ اقبالؒ (1938-1877ء) کے الفاظ میں نبی اکرم ﷺ کا ظہورِ قدسی زمانۂ قدیم اور زمانۂ جدید کے درمیان حدِ فاصل ہے' قدیم زمانے کے یہ تمام جتنے بھی مسالک اور روشیں اور جسے قرآن سنت اللہ کہتا ہے' اس دور میں آ کر انہوں نے اور شکلیں اختیار کرلیں۔ اب یہ دیکھیے کہ جسے ہم عذاب کہتے ہیں' قرآن کا یہ لفظ وہی ہے جو پہلے سیلاب اور آتش فشاں پہاڑ اور جھکڑ وغیرہ کی شکل میں آتا تھا' اِس دور میں ان چیزوں سے حفاظت کے سامان انسانوں نے دریافت بھی کیے' ایجاد بھی کیے' وضع بھی کیے اور دور یہ آ گیا جس میں انسان یہ کچھ کرسکتا ہے اور کرتا جارہا ہے۔

دورِ حاضر کے انسان کی تباہی خود انسان کے ہاتھوں کی ہی رہینِ منت ہے

اِس دور میں تباہی کس طرح سے آتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ اب انسانوں کی تباہیاں انسانوں کے ہاتھوں سے آیا کریں گی۔ حوادثِ ارضی و سماوی کا مقابلہ یا اس سے حفاظت تو اس دور میں آسان ہوگی۔ اب انسانوں کی تباہیاں انسانوں کے ہاتھوں

آ ئیں گی ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے ایک نیا دور شروع ہوجاتا ہے ۔ نبی اکرم ﷺ کا خود اپنا دور آ گیا ۔ حضور ﷺ کے زمانے میں تیرہ سال تو مکے کی زندگی ہے' جس میں ان مخالفین نے اس قدر اذیتیں دیں' تکالیف پہنچائیں' مخالفتیں کیں ۔ اس کے بعد مدنی زندگی شروع ہوجاتی ہے' وہاں بھی انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا ۔ تو اگر پہلی قوموں میں سے کبھی کوئی ایسی صورت واقع ہوتی تو اسی طرح سے زلزلہ آ جاتا' یہ قریش تباہ ہوجاتے' کہیں آتش فشاں پہاڑ ہی ٹوٹ پڑتا' آندھی آ جاتی' جو کچھ پہلے ہوا تھا وہ کچھ ہونا چاہیے تھا ۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ اب اس طرح سے نہیں ہوگا' اب انسانوں کا مقابلہ انسانوں سے ہوگا کہ ان کی مخالفت سے جو تباہی آئے گی اس کے لیے وہی لفظ عذاب آیا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی مخالفت کو توڑنے کا' انہیں شکست دینے کا' انہیں تباہ کرنے کا' برباد کرنے کا' اس عذاب سے بچنے کا' کیا طریقہ ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **قَاتِلُوْهُمْ** (9:14) یہ تمہارے خلاف جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں ۔ اٹھو' میدانِ جنگ میں جاؤ اور ان کے ساتھ جنگ کرو ۔ اب آتش فشاں پہاڑ کا لاوا باہر نہیں آ رہا' اب کوئی زلزلہ نہیں آ رہا' کوئی سیلاب نہیں آ رہا' اب تو یہ ہے کہ **قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ** ❶ (9:14) ۔ اب خدا تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب لائے گا ۔ اب وہ خارجی حوادث کے ذریعے سے عذاب نہیں آتے ۔ یہ ہے دور نبی اکرم ﷺ کا ۔ اِس دور میں دنیا کا نقشہ بدل گیا ۔

آج کے دور میں قوموں کی تباہی اور بربادی کی نوعیت اور کیفیت

یہاں کہا ہے کہ **يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ** (9:14) یہاں وہی الفاظ ہیں کہ خدا ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا ۔ عذاب کا بھی وہی لفظ آیا ہے ۔ کس سے یہ عذاب ہوگا؟ بایدیکم ہوگا' یعنی تمہارے ہاتھوں ہوگا ۔ یہ عذاب کیا ہوگا؟ سنیئے عزیزانِ من! جنگوں میں ساری کی ساری قوم تو مر نہیں جائے گی' میدانِ جنگ کے سپاہی کچھ ہوتے ہیں اور وہ بھی جس مقام کے اوپر ہتھیار رکھ دیں' صلح کے لیے ہاتھ بڑھائیں' بچ جاتے ہیں ۔ ہوتا کیا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ **يُخْزِهِمْ** (9:14) وہ ذلت اور خواری کی زندگی بسر کریں گے ۔ یہ ہے اب خدا کا عذاب ۔ وہ تو اچھا تھا کہ ایک ہی دفعہ زلزلے کا جھٹکا آیا اور سب ختم ہوگئے' عذاب بھی ایک ثانیے میں ختم ہوگیا مگر یہاں تو صورتِ حال یکسر مختلف ہے ۔ یہاں تو

یہ سسک سسک کے مرنا' غمِ ہجر میں بلا ہے ❷

---

❶ تم ان کے خلاف جنگ کے لیے نکلو اور پھر دیکھو کہ خدا کس طرح انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلواتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ۔ 418) ۔

❷ مرزا اسداللہ خاں غالب اسے یوں کہتا ہے:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

اسوۂ حسنہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی لکھی گئی تاریخ میں مافوق الفطرت چیزیں

قرآن کریم بتاتا ہے کہ **یُخْزِهِمْ** (9:14) قوم زندہ رہے لیکن ذلت اور خواری کی زندگی بسر کرے۔ یہ ہے خدا کا عذاب۔ خدا آسمان سے عذاب نہیں بھیجے گا بلکہ تمہارے ہاتھوں سے یہ عذاب آئے گا۔ یاد رکھیے! ان مخالفین کی یہ جتنی بھی جنگیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہوئی ہیں' اور ادھر سے انہوں نے بھی کی ہیں' ان میں کسی جنگ میں بھی کوئی مافوق الفطرت (Super Natural) عنصر قطعاً نہیں ہوا۔ اب ہمارے ہاں یہ زیبِ داستان والے آئے اور مافوق الفطرت چیزیں لے آئے۔ انہیں تو یہ تھا کہ وہ اتنا بڑا رسول ﷺ ہے' وہ اتنے بڑے ان کے صحابی رضی اللہ عنہم ہیں' مقابلے میں یہ ابوجہل' ابولہب' یہ لعنتی کفاریوں آئے اور پھر وہ خدا کیا ان کی کوئی مدد ہی نہ کرے؟ وہ مدد کا تصور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کھڑے رہیں اور فرشتے آ کر ان کو تباہ کر جائیں اور یہ فتح کا جھنڈا لہراتے ہوئے اور اللہ اکبر کہتے ہوئے آ جائیں۔ ان کے ذہن میں تو یہ کچھ ہے۔ اور کہیں ان کو گنجائش نہیں نظر آئی۔ بدر کے میدان[1] کے بارے میں کہہ دیا کہ جب انہیں شکست ہونے لگی تو اور تو کوئی چارہ نہیں تھا تو اب مدد کے لیے خدا آتا ہے' رسول اللہ ﷺ نے ریت کی یا کنکریوں کی مٹھی بھر کے یوں کر کے مار دیا تو ہزار کے قریب سپاہی' جتنے بھی سامنے تھے سب اندھے ہو گئے' سب بھاگ گئے۔ اب اگر ان سے کوئی پوچھے کہ صاحب! اس کے بعد ایک جنگِ احد[2] بھی ہوئی تھی۔ اس جنگِ احد میں وہی رسولؐ ' وہی صحابہ رضی اللہ عنہم' وہی مقابل میں سارے مکے والے ہیں۔ اس جنگ کے اندر وہاں جو اتنی بڑی شکست ہوئی ہے' وہاں اور تو اور رہے' خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی تاریخ میں ہے کہ صحابہؓ نے ان کو محفوظ کرنے کے لیے ان کے گرد اس طرح سے گھیرا ڈالا جیسے شہد کی مکھیاں چھتے میں گھیرا ڈالتی ہے' اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کو زخم آئے' حضور ﷺ کا دانت شہید ہوا اور بھی کئی زخم آئے' مرہم پٹی کی گئی۔

جنگِ احد میں شکست سے دوچار ہونے کے اسباب

قرآن میں یہ ذکر آیا ہے کہ شکست ہوئی۔ تو اگر میدانِ جنگ کی یہ شکست خدا کا عذاب ہے' تو یہاں تو یہ ہزار (معاذ اللہ) غالب ہوئے اور اگر خدا کی وہ مدد بدر کے میدان میں ہوئی تھی تو یہاں بھی رسول اللہ ﷺ موجود تھے تو کیا انہوں نے پھر مٹھی بھر ریت نہیں پھینکی۔ قرآن میں اس کا ذکر ہے کہ یہ جو تمہارے سامنے کھڑے ہیں ان سے کہہ دو کہ انہیں معلوم ہے کہ یہ شکست

---

[1] جنگ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء)

[2] جنگ احد (14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء)

کیوں ہوئی ؟ اس لیے کہ ان کے کمانڈر نے ان سے کہا تھا کہ پہاڑ کا یہ جو درہ ہے' یہ بڑا نازک مقام ہے' اس کی حفاظت آخر تک کرتے رہنا' اور اگر تم دیکھو کہ میدانِ جنگ میں کامیابی بھی ہوگئی ہے تو اس درے میں جو ہم نے سپاہی کھڑے کیے ہیں' وہ کسی شکل میں درے کو نہ چھوڑیں ورنہ تمہاری فتح شکست میں بدل جائے گی ۔ یہ کچھ قرآن بتا رہا ہے ۔لیکن یہ عرب ابھی نئے نئے تھے' ان کے زمانے میں تو میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت آتا تھا وہ سپاہی لوٹتے تھے اور جو جس کے ہاتھ آجاتا تھا وہ اس کا ہوجاتا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ تم میں سے بعض اس Temptation (حرص) کے اندر آگئے کہ میدانِ جنگ میں تمہاری جو Infentory (فوجی دستہ) اس درے میں تعینات تھی اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور تم وہاں کھڑے دیکھ رہے تھے اور پیچھے سے انہوں نے آکے حملہ کیا اور تمہاری فتح شکست میں بدل گئی ۔ اس کے بعد کہا کہ اے رسول! ان سے کہدو کہ ہم نے اس لیے واضح کردیا کہ یہ نہ سمجھیں کہ شکست کیوں ہوگئی' آئندہ احتیاط رکھیں کہ جہاں جہاں کمانڈر کھڑا کرنے کو کہے' جب تک وہ حکم نہ دے' وہ جگہ نہیں چھوڑنی ۔ اور مکے والوں کو جو شکست ہوئی ہے تو سورۃ انفال میں ہے کہ بدر کے میدان ❶ میں تین سو کے مقابلے میں' اس زمانے کی ہزار کی فوج تھی' ہتھیار پورے نہ ہونے کے باوجود' وہ شکست کھا کر بھاگ گئے ۔ وہ جا کر گھر میں بیٹھ کے سوچ رہے تھے کہ کیوں شکست ہوئی' کوئی کچھ کہتا تھا' کوئی کچھ کہتا تھا۔قرآن بتا رہا ہے' کہتا ہے کہ ان کی نگاہ اس طرف نہیں گئی کہ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (5:58) انہوں نے میدانِ جنگ میں غور وفکر سے کام نہیں لیا تھا۔ میدانِ جنگ میں تو عام طور پہ جذبات ہی لڑتے ہیں' لیکن جرنیل جذبات کے تابع نہیں چلتا' وہ تو جو پلاننگ کرتا ہے پورے غور وفکر کے ساتھ کرتا ہے۔

قرآن بتا رہا ہے کہ ان سے کہو کہ ہم بتاتے ہیں کہ تمہیں کیوں شکست ہوئی ؟ یہ نہیں کہا کہ تم کفار تھے اس لیے شکست ہوئی' بدکردار تھے شکست ہوگئی بلکہ کہا یہ ہے کہ تم نے وہاں تفکر سے کام نہیں لیا' تمہارے ہاں کی جو Strategy (حکمتِ عملی) تھی' اس کو تم نے غور وفکر سے پلاننگ نہیں کیا' اس لیے شکست کھا گئے ۔قرآن کفار کو بتا رہا ہے۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ ادھر ہمارا رسول تھا' اتنے اتنے اولوالعزم صحابی تھے' ان کے ہاتھوں شکست نہ کھاتے تو اور کیا ہوتا ۔ کہا کہ تم نے تفکر سے کام نہیں لیا' اس لیے تمہیں شکست ہوگئی۔ ادھر احد ❷ کے میدان میں انہوں نے تفکر سے کام نہیں لیا' جذبات میں مالِ غنیمت پر آگئے' اس لیے شکست کھا گئے ۔ اور اسی لیے اس کے بعد فوراً ہی لڑائی کا یہ نظام ہی بدل دیا' میدانِ جنگ میں آنے والا جو مال تھا' اس کے بعد اس کو مالِ غنیمت کہا ہی

---

❶ جنگ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء)

❷ جنگ احد (14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء)

نہیں۔ انہیں کہا کہ کوئی سپاہی اس کو Touch (مَس) نہیں کرے گا' یہ تمام کا تمام مرکز میں جمع ہوگا اور مرکز ہر ایک کی ضروریات کے مطابق اسے تقسیم کرے گا۔ یہ جو اس زمانے کی شکست کی بنیادی وجہ تھی' اسی میں قرآن نے اصلاح کر دی۔

1965ء میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین ہونے والی جنگ کے حوالے سے کرامتوں کے کچھ افسانوں کا ذکر

پتہ نہیں آپ کو یاد ہے یا نہیں' 1965ء کی جنگ❶ میں ہمارے ہاں کے اس دور کے قابلِ رشک مجاہدین نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ تو تاریخ کے مورخ بتائیں گے' وہ زریں حروف میں لکھنے والی بات ہے لیکن ہمارے ہاں کی قوم افسانوں' معجزات اور کرامات کے اوپر چلنے والی ہے' اس نے کہا کہ جی' وہ راوی کے میدان کے اوپر جو انہوں نے کیا وہ ہم نے دیکھا ہے جی' وہ سفید گھوڑیوں والے' وہ سبز عماموں والے آئے' اُدھر وہ بم مارتے تھے اِدھر یہ آسمان سے آتے تھے' وہ بم مار کے بھاگ جاتے تھے' یہ انہیں ختم کر دیتے تھے' جی انہوں نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔ ملّا تو مجاہد کو کبھی بھی کریڈٹ دینے کو تیار نہیں ہوتا اس لیے کہ

مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور ❷

یہ مجاہد کی اذان کو کبھی بھی اپنے پہ فوقیت نہیں دینا چاہتا۔ یہ سازش تھی جو اس زمانے میں انہوں نے پھیلائی تھی کہ ان مجاہدین نے جانیں دے کر ہماری حفاظت نہیں کی بلکہ وہ تو اوپر سے فرشتے آئے تھے' سفید گھوڑیوں والے آئے تھے' سبز عماموں والے آئے تھے۔ طلوعِ اسلام اٹھا کے دیکھیے کہ میں نے سختی سے اس کی تردید کی اور پھر اس کے بعد 1971ء کی جنگ میں مَیں نے تردید کی۔ میں نے کہا تھا کہ حضرات! وہی پاکستان تھا' وہی لاہور تھا' وہی یہ مجاہد تھے' اس زمانے میں بھی گھوڑیاں موجود تھیں' عمامے بھی موجود تھے' قدم قدم کے اوپر شکست کیوں ہوگئی؟ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ان سے کہا جاتا تھا کہ داتا کی نگری ہے' یہاں کسی کا نقصان نہیں ہوتا' میں نے کہا کہ جاؤ' مصری شاہ کے پُل سے جا کر پوچھو۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن بتاتا ہے کہ ان مکے والوں سے کہو کہ تم بیٹھے ہوئے سوچ رہے ہو کہ شکست کیوں ہوئی؟ تمہیں کس طرح شکست ہوئی تھی اور یہاں تو ایک دفعہ کہا ہے کہ میدانِ جنگ میں شکست کھائی جب کہ یہی وہ خدا کا عذاب ہے جو تمہارے ہاتھوں سے آیا۔

---

❶ 1965ء کی پاک و ہند جنگ

❷ اقبالؒ: بالِ جبریل (حال و مقام):

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

جس قوم میں جوہرِ انسانیت نہ رہے تو پھر مال و دولت کی فراوانی کے باوجود وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے

قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے کہ اگر جنگ نہ بھی ہو تو کیا تمہیں پتہ ہے کہ پھر عذاب کس چیز سے آتا ہے؟ کہا کہ **وَ لَا تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُهُمۡ وَ اَوۡلَادُهُمۡ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ اَنۡ یُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِی الدُّنۡیَا** ❶ (9:85) یہ مال و دولت کی فراوانیاں' اور افرادِ خاندان کی کثرت تمہارے لیے وجہ تعجب نہ بنیں۔ اُس زمانے میں اولاد کہتے تھے' اب اسے جتھہ' گروہ' یا پارٹی کہیے۔ان کے ہاں مال و دولت کی کثرت تھی ۔کہا کہ یہ لوگ انہی چیزوں کو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان سے کامیابیاں ہو جاتی ہیں ۔ٹھیک ہے یہ چیزیں ضروری ہیں لیکن وہ جو جوہرِ انسانیت ہے' وہ جو حسنِ کردار ہے' اگر وہ نہ رہے تو یہ مال و دولت اور یہ پارٹیوں کی کثرت' عذاب کا موجب بن جاتی ہے۔قرآن نے اسے بھی عذاب کہا ہے۔خدا نے یہ کہا ہے کہ ان کے ذریعے ہم انہیں عذاب دیتے ہیں ۔ یہاں عذاب کا لفظ بھی آ گیا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ وہ کہاں عذاب دے؟ ہمارے ہاں تو عذاب اور ثواب قیامت میں جا کر ہوتا ہے ۔ یہاں سے نہ کوئی پلٹ کے آئے اور نہ کوئی بتائے کہ اوتھے کی ہویا سی ساڈے نال❷ ۔قرآن کہتا ہے کہ **یُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِی الدُّنۡیَا** (9:85) اسی دنیا کے اندر یہی چیز تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

سہاروں کے بل بوتے پر تباہ حال معاشرے میں نہ زندگی ہوتی ہے اور نہ ہی موت

کس قسم کی یہ تباہی آتی ہے؟ میں نے کہا ہے کہ ایک تباہیاں تو وہ تھیں کہ زلزلہ آیا اور ساری قوم ختم ہوگئی لیکن قرآن کہتا ہے کہ بدترین تباہی تو اس جہنم کی ہے کہ **لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَ لَا یَحۡیٰی** (20:74) اس میں انسان یا قوم نہ زندہ رہتی ہے نہ مرتی ہے۔ **یَاۡتِیۡهِ الۡمَوۡتُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ** (14:17) ہر طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن مرتے بھی تو نہیں۔ **ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا** (3:111) عذاب کی شکل یہ بھی ہے کہ **اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا** وہ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں' ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں' انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی وہ جہاں بھی زندگی بسر کر رہے ہیں' وہ زندگی ذلت وخواری کی ہے۔کیا بات ہے قرآن کی! یہ کہا تو بنی اسرائیل کے سلسلے میں ہے لیکن ہم تو وہیں آ پہنچے ہوئے ہیں' بلکہ ان سے بھی بدتر ہماری حالت ہے ۔کہیں چلے جائیں' دنیا کے کسی خطے میں چلے جائیں وہ قومیں جو کل تک ذلیل وخوار کہلاتی تھیں' اوناں دا ڈر سانوں ماری جان ڈیا ہیگا❸: **اَیۡـــــنَ**

---

❶ ان لوگوں کے مال و دولت کی فراوانی اور افرادِ خاندان کی کثرت تمہارے لیے وجہ تعجب نہیں ہونی چاہیے۔(یہی چیزیں تو ہیں جو انہیں حق وصداقت کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتیں)۔تم دیکھنا کہ یہی چیزیں کس طرح دنیاوی زندگی میں ان کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہیں۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 441)۔

❷ کہ وہاں ہمارے ساتھ کیا بیتی تھی۔

❸ ان کا خوف ہمارے لیے جان لیوا بنا ہوا ہے۔

مَا ثُقِفُوْٓا (3:111) اگر کہیں تھوڑی بہت پناہ ملتی ہے تو وہ **اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ** (3:111) بجز اس کے کہیں نہیں کہ انہوں نے لوگوں سے کچھ معاہدہ کیا' کسی کا سہارا ڈھونڈا لیا اور اس کی وجہ سے انہوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔

مسکنت کا ذلت آمیز عذاب انسانی ذات کے وقار کو پامال و پژمردہ کر دیتا ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ اصل سہارا تو خدا کا سہارا ہے اس لیئے قانونِ خداوندی کا سہارا ڈھونڈ و مگر انہوں نے سہارا بھی ڈھونڈا تو انسانوں کا ہی سہارا ڈھونڈا۔ وہ ان کی اپنی مصلحت کوشی ہے کہ وہ کب تک یہ سہارے باقی رکھتے ہیں ورنہ ان کی عام حالت یہی ہے کہ **وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ** (3:111) خدا کا عذاب ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ **وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الْمَسْكَنَةُ** (3:111) اور یہ سخت محتاجی اور بدحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ ہے خدا کا عذاب جو آتا ہے کہ چلتے ہوئے کاروبار رک جائیں' فیکٹریاں بند ہو جائیں۔ پوچھا کہ کیا ہوا؟ جی سیمنٹ نہیں مل رہا۔ موٹریں بند ہوگئیں' چل نہیں رہیں' سڑکوں پہ کھڑے ہیں۔ پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہا کہ جی پٹرول نہیں مل رہا۔ یہ مسکنت' آپ دیکھتے ہیں' حرکت کا ساکن ہو جانا ہے۔ اندازہ لگایئے' کتنی دفعہ ہر متحرک شے آتی ہیں اور ساکن ہو جاتی ہیں۔ ذلت اور مسکنت' یہ عذاب ہوگا۔ **اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا** (3:111) کہیں بھی جائیں' ذلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں' اپنے ہاں رہیں تو ان کی ہر حرکت جمود میں بدل جائے' صامت و ساکت کھڑی ہو جائے۔ یہ ہے اس قوم کے اوپر خدا کا عذاب۔

دوسری جگہ قرآنِ کریم نے ایک اور قوم کا قصہ بیان کیا ہے جو شریعتِ خداوندی کے نافذ کرنے میں' قوانینِ خداوندی کے نفاذ میں' نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ میں' بہت کوشاں ہوئی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں بعض قومیں کیا کرتی ہیں؟ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) وہ نظامِ خداوندی' ضابطۂ خداوندی میں سے کچھ ایسی چیزیں لے لیتی ہیں جن پر بڑی آسانی سے عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے اتنے ٹکڑے کے اوپر تو ان کا ایمان ہے مگر جو اہم مقامات اس کے اندر ہیں' جن میں واقعی کسی قربانی کی ضرورت پڑتی ہے' محنت و مشقت کی ضرورت پڑتی ہے' وہ ویسے کے ویسے ہی ہیں یا کہیں اور سے مانگ لیتے ہیں۔

پوری انسانیت کے لیے نظامِ خداوندی کی مثال انسانی جسم کی طرح ایک وحدت ہے

قرآن کہتا ہے کہ دنیا کے اندر یہ قومیں بھی ہیں۔ جب پوچھیے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نظامِ خداوندی کو لانے کے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں یعنی **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85) ان سے کہو کہ بھئی! اہم معاملات تو یہ ہیں' مثلاً یہ کہ ارے بابا! نظامِ خداوندی' جسے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کہا جاتا ہے' تو اس میں رسول اللہ کا پہلا اعلان یہ ہے کہ جس بستی میں رات کو کوئی ایک شخص بھی بھوکا سو گیا' اس

بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے۔ یہ نظامِ مصطفیٰؐ کا اعلانِ اول ہے' یہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے' ابوداؤد کی حدیث ہے۔ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ** (2:85) کہا جائے گا کہ جی' کوئی بات نہیں ہے' حساب کا پرچہ تھا' وہ کہا ہے کہ ایک حصے کے اوپر ایمان ہے اور دوسرے سے انکار کیا تو انہوں نے کہا کہ چالیس فیصد پاس مارکس ہوتے ہیں' تو چالیس فیصد وہ ہم نے ٹھیک کیے ہیں' باقی ان میں غلط ہوگیا' تو اس میں تو نمبر ملیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں الگ الگ سوالوں کے نمبر نہیں ہوا کرتے۔ نظام تو انسانی جسم کی طرح ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ آنکھ دکھنے آئی ہو تو اس آنکھ ہی میں تکلیف ہو' باقی جسم کا حصہ مزے سے سو رہا ہو۔ سوکے تو دکھاؤ ذرا۔ ذرا سی پھانس ایک حصے میں لگ جائے تو وہ تو ایک انچ سے بھی دسواں حصہ کم ہوتی ہے' اور دیکھتے ہیں دن رات دل پہ کیا گزرتی ہے۔ یہ چیزیں ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہوتا کہ اتنے حصے پر عمل کرلیا تو اس کے تو نمبر دیدیئے۔

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ حیات تمام حوادثِ ارضی وسماوی کی نوعیت کو بدل کر رکھ دیتا ہے

سنیئے' عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ ایک حصے پہ ایمان رکھتے ہیں' دوسرے سے انکار کرتے ہیں۔ **فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) اس روش کو اختیار کرنے والوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ان کے لیے اس دنیا کی زندگی میں ذلت اور خواری ہوگی۔ **وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) اور وہاں آخرت میں جا کر پھر دیکھو گے کہ کتنا شدید عذاب آتا ہے۔ اس دنیا میں ذلت اور خواری کی زندگی اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہیوں سے لبریز۔ عذاب خداوندی کو آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے اس کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ وہ آتش فشاں پہاڑ' وہ زلزلے' وہ آندھیاں' وہ سیلاب نہ رہے کہ ان سے حفاظت کا سامان انسان اب اپنی تدبیروں سے کرسکتا ہے۔ یہ انہی کو تباہ کرتے ہیں جن کے ہاں اخلاقی خرابیاں اتنی ہوں کہ ان کی حفاظت کی طرف بھی توجہ نہ کرسکیں۔ اب انسانوں کی تباہی انسانوں کے ہاتھوں سے آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کی شکل کیا ہوتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ **خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** (2:85) اس دنیا کی زندگی کے اندر ذلت اور رسوائی کی زندگی ہے۔ عزیزانِ من! پھر اس عذاب کی اور شکلیں دیکھتے جایئے' پھر یہ نہ سوچے کہ ہم ڈھونڈیں کہ کونسی قوم میں عذاب میں مبتلا ہے' کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے' اے تماشے تے ساڈے گھر آ گئے نیں [1] کہا کہ **وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ** (16:112)۔

اے رسول! مثال سے بات بیان کرو۔ اس طرح بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ ایک تھی بستی' اسے امن بھی نصیب تھا'

---

[1] یہ تماشے تو ہمارے گھروں میں آ بسے ہیں۔

اطمینان بھی نصیب تھا۔ امن خارجی خوف کی طرف سے اور سکون اطمینان قلب سے۔ یہ کیفیت تھی کہ چاروں طرف سے بافراط رزق ان کی طرف چلا آ رہا تھا۔ **فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ** (16:112) یہ جو نعمائے خداوندی یوں ملی تھیں، ان کے لیے یہاں دو الفاظ آئے ہیں۔ ہمارے ہاں کفر کا لفظ تو یہ ہے کہ کفر برتا اور پھر یہ کچھ نہیں کہ صاحب! ہوا کیا؟ عزیزانِ من! کفر کے معنی ہیں ''چھپا کے رکھنا، ڈھانپ کے رکھنا، عام نہ کرنا''۔ انعامات خداوندی اس لیے تھیں کہ وہ تمام مخلوق کے لیے یکساں طور پہ کھلی ہوں۔ نظام ایسا بنایا کہ جس کے قابو میں جو چیز آئی، اس نے چھپا کر رکھ لی۔ اسے کفرانِ نعمت کہتے ہیں۔ **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ** (16:112) خدا نے ان پہ عذاب نازل کیا۔ **لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ** (16:112) اس قوم کے اوپر خوف بھی طاری ہوا، وہ قوم بھوک بھی طاری ہوئی۔ بھوک کے عذاب میں اور خوف کے عذاب میں آ ئی۔ اسے کہیں دور جا کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آج بھوک اور خوف کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ خدا کی طرف سے بھوک اور خوف کا عذاب نازل ہوا۔ بھئی! پھر کیا کیا جائے؟ کہ جی اللہ ولوں ہیگا، جی قسمت اچ لکھیا ای ایہو جیا ہیگا سی [1]۔

معاشرتی طور پر تمام مصائب و آلام انسانوں کے خودساختہ نظام کا ہی نتیجہ ہیں

وہ خدا ہے، اس طرح نہیں ہے کہ جی! قسمت میں لکھا ہی یہی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ **بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ** (16:112) یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ تم نے جو اپنے ہاتھوں سے اپنا غلط نظام بنایا ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہاں **يَصْنَعُوْنَ** ہے یعنی یہ مصنوعی نظام ہے۔ ایک تو حقیقی نظام تھا جو ہم نے دیا تھا۔ یہ سامانِ ربوبیت، سامانِ رزق تو تمام مخلوق کے لیے یکساں طور پہ ہے، تم نے ان کو چھپا چھپا کے رکھا۔ ایسا نظام بنایا جس کے اندر یہ ساری چیزیں قانوناً جائز قرار پا گئیں۔ **بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ** (16:112) تمہارے مصنوعی نظام کا نتیجہ خوف اور بھوک کا عذاب ہے۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ لفظ ''ذکر'' کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک مثال

ایک اور جگہ، ایک اور مثال ہے۔ وہاں جامع طور پہ اصول دیدیا ہے کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ** (20:124)۔ اب ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ ہوگیا کہ ''جس نے خدا کا ذکر نہ کیا'' اور ذکر وہ ہے جو یہ راتوں کو پھر پورے کے پورے محلے کو سونے نہیں دیتا: بہت زور زور سے، لاؤڈ اسپیکر سے ہوتا ہے، یعنی وہ خدا تو بہت دور ہے، وہاں تک پہنچانا ہوتا ہے تو وہاں تک تو اتنے زور سے پہنچایا جاتا ہے، وہ لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے سے پہنچایا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ذکر کے معنی ہیں ''قوانین خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنا''۔ ذکر اس شے کو کہتے ہیں جو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اس میں قانون پر نگاہ رکھنے کی اتنی استقامت اور تسلسل ہے

---

[1] اللہ کی طرف سے ہے۔ جی! قسمت میں لکھا ہی یہی تھا۔

ہر وقت نگاہ کے سامنے رہے۔ چھوٹے سے پیمانے کے اوپر دیکھیے کہ جب آپ موٹر میں یا سائیکل کے اوپر جاتے ہیں تو Keep to the left (بائیں ہاتھ چلو) والی بات ہوتی ہے' وہ جس طرح سے ہر وقت ذہن میں رہتی ہے' اسے ذکر کہتے ہیں۔ جونہی اس ذکر سے آپ غافل ہوئے' یوں ٹکر ہوئی یا سیٹی بجی۔ کہا کہ **وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ** (20:124) جس نے ہمارے قوانین کی طرف سے اس طرح اعراض برتا۔ اعراض ہوتا ہے کہ نگاہ اِدھر کر لینا یا اُدھر کر لینا۔ جس نے ذرا سا بھی اس کو جس پر ہر وقت نگاہ رکھنی تھی' اس سے نگاہ اِدھر اُدھر کی' تو نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ سنیے' عزیزانِ من! اس کا نتیجہ ہوا عذاب: **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا** (20:124) اس کی روٹی' روزی تنگ ہوگئی۔ خدا کے ذکر یعنی خدا کے قانون سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اب یہ ہوا کہ انہوں نے یہ جتنے بھوکے' مفلس اور محتاج تھے' ان کو تھپکیاں دینی شروع کیں۔ کہنے لگے: کوئی بات نہیں' یہ جو دنیا ہے یہ ہے ہی ان دولت مندوں اور امیروں کے لیے' یہ تو مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں' یہ تو مومن کے لیے قید خانہ ہوتی ہے' تمہارے لیے آخرت کی زندگی کی خوشگواریاں ہیں، کوئی بات نہیں چار دن یہاں بھوک سے بھی گزارا کر لیا' مر بھی گئے تو کیا ہوا' آخرت تو سنورے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا** (20:124) اس دنیا میں تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ **وَّ نَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى** (20:124) اور جس کی یہاں زندگی اس طرح سے گزرے گی' قیامت میں بھی ایسی ہی گزرے گی۔ یہاں کا ذلیل وہاں کا معزز نہیں بن سکتا۔ زندگی حصوں میں نہیں بانٹی جا سکتی' اس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے' یہ تو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جو یہاں سے وہاں تک چلی جا رہی ہے۔

غلط نظام کے بدنتائج کے سلسلہ میں مصائب و آلام کی مختلف شکلیں

میں کہہ یہ رہا تھا کہ اب جو عذاب آ رہا ہے' اس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اس سے مختلف ہے جو پہلی قوموں کے متعلق اس کے قصے بیان کیے ہیں۔ وہ سیلاب تھے وہ آتش فشاں اور زلزلے اور جھکڑ تھے' اب تو انسانوں کے ہاتھوں سے انسانوں کے اوپر عذاب اور تباہیاں آ رہی ہیں۔ اور قرآن نے بتایا ہے کہ یہ غلط نظام کا نتیجہ ہے۔ یہ تو ہوا اعراض برتنا۔ آگے کہا کہ آؤ تمہیں عذاب کی ایک اور شکل بتائیں' ہوتا یہ ہے کہ معاشرے میں آہستہ آہستہ یہ چیزیں ہوتی رہتی ہیں اور پھر یہ آخر میں یہ اشکال کیا اختیار کر لیتی ہیں؟ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اس کی شکلیں یہ ہوتی ہیں کہ **قُلۡ هُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّ يُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ** (6:65) غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ

تباہ ہو جاتا ہے یعنی کبھی اوپر اس قسم کے لوگ مسلط ہو جاتے ہیں کہ نیچے والے یہ جتنے لوگ ہوتے ہیں' وہ اوپر والے ان کو کچل کے رکھ دیتے ہیں۔ اس سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نیچے والوں کے بھی صبر کی انتہا ہو جاتی ہے' جب وہ ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں' جب ان میں لاقانونیت (Lawlessness) کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے (16:45-47)۔ یہ بھی تباہی کی ایک شکل ہے۔ کبھی ان دونوں سے ایک اور مختلف شکل آتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ جو اوپر والے ہیں وہ نیچے والوں کو اپنے ساتھ ملا کر پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور یہ مخلوط پارٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی عذابِ خداوندی کی ایک شکل ہے۔ اس میں **يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ** (6:65) جتنی سختی کسی کے پاس ہوتی ہے' وہ وہاں آ کے دوسرے کے مقابلے میں استعمال کر لیتا ہے۔ یہ بھی شکل ہوتی ہے۔ پھر کہا کہ **اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ** (6:65) دیکھو ہم اس طرح سے لوٹا لوٹا کے' بار بار' پھیر پھیر کر' یہ بات بیان کرتے ہیں کہ کسی طرح سے بھی یہ تفکر سے کام لیں' غور و فکر سے کام لیں کہ ہم کس مقام کے اوپر کھڑے ہیں۔

معاشرتی عذاب کی آخری کڑی انتہائی مشکل ہوتی ہے

عزیزانِ من! آپ نے خدا کے عذاب کی شکلیں دیکھیں۔ اس کے بعد یہ کہا کہ آخر میں قوم کی زندگی کے اندر ایک فیصلہ کن مرحلہ آ جاتا ہے۔ وہ مرحلہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** (9:39) یاد رکھو' جب ضرورت آ پڑے اور مخالفتیں انتہا پہ آ پہنچیں تو پھر اس قوم کو میدانِ جنگ میں آ جانا چاہیے۔ اگر تم نے وہاں اس سے جی چرایا اور یہ چیز تم نے نہ کی' تو عذاب آئے گا اور الم انگیز آئے گا' بڑا ہی تکلیف دینے والا' درد انگیز' عذاب آئے گا۔ وہ عذاب کیا ہے؟ **وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** (9:39) تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم آ جائے گی۔ یہ عذاب کی انتہائی شکل ہے۔ اس میں یہ قوم اور اس کے یہ افراد ختم نہیں کر دیئے جاتے بلکہ دوسری قوم ان کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ایک اور جگہ ہے۔ یہاں تو میدانِ جنگ میں جانے کی بات تھی' وہاں دوسرے لوگ وہ ہیں جن سے کہا کہ ایسے وقت میں جتنا کچھ کسی سے ہو سکتا ہے، کسی کے پاس ہے' وہ اس کی مدافعت کے لیے دیدے' اگر ایسا نہ کیا تو یاد رکھو **وَاِنْ تَتَوَلَّوْا** (47:38) اگر تم نے اس سے اعراض برتا' ایسا نہ کیا **يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** (47:38) تمہاری جگہ پھر کوئی دوسری قوم آ جائے گی تو اب یہ ہے کہ پھر دوسری قوم کیا تمہارے جیسی قوم ہوگی؟ اس نے کہا ہے کہ تمہارے جیسی ہو تو تمہاری جگہ کیسے لے سکتی ہے۔ **ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ** (47:38) پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی' تم سے بہتر ہوگی۔ قرآن میں یہ ہے جسے آپ استخلاف و استبدالِ قومی کہتے ہیں Law of

Succession and Substitution of Nation ۔ اس کے لیے بڑے ہی واضح قوانین دیئے ہیں کہ قوموں کی جگہ دوسری قومیں کیسے لے لیتی ہیں۔ میں نے تو دو ہی ریفرنس دیئے ہیں۔

اقتدار سے محروم اور عزت وتکریم سے ناآشنا قوم آخر کار انسانی معاشرے میں ریت کے ذروں کی طرح بکھر کر رہ جاتی ہے

اب سوال یہ ہے کہ یہ جو پہلی قوم ہے، پھر تاریخ میں اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ کہا کہ **فَجَعَلۡنٰھُمۡ اَحَادِیۡثَ** (34:19) پھر اس قوم کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اس قوم کے ساتھ ہوتا کیا ہے؟ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ جو چٹان ہے، وہ کتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ ایک بحرِ ذخار کی موجیں اٹھتی ہیں' آ کے ٹکراتی ہیں اور اس کے بعد سر پھوڑ کے واپس چلی جاتی ہیں' وہ اپنے مقام کے اوپر محکم کھڑی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہی چٹان کسی حادثے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے' پھر آہستہ آہستہ اس کا ذرہ ذرہ ہو جاتا ہے' وہ ذروں میں بدل جاتی ہے۔ چٹان بھی تو ریت کے ذروں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے' اس کی یہ شکل Prescribed (متعین) ہوتی ہے' ارتکاز ہوتا ہے' مستحکم ہوتی ہے۔ جسے قرآن بنیان مرصوص کہتا ہے' تمہاری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہونی چاہیے۔ چٹان انہی ذرات کے اس طرح سے آپس میں جڑ جانے کا نام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ پھر اس ذرہ ذرہ ہونے کے بعد آپ کے اندر جو جاذبیت باہمی کی قوت ہوتی ہے' وہ ختم ہو جاتی ہے' چٹان ریت کے ذرے بن جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **وَ مَزَّقۡنٰھُمۡ کُلَّ مُمَزَّقٍ** (34:19) اور پھر ان ذروں کو ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی جدھر چاہے اڑائے اڑائے پھرتا ہے۔ چٹان ذرے بن جاتی ہے۔ دوسری قوم آ کر مسلط ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کہا ہے کہ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

مسلط ہونے والی قوم کا محکوم قوم کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی نوعیت

سنیے اگر سننے کی ہمت ہے تو۔ یہ بنی اسرائیل کی داستان بتاتے ہیں کہ **فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰھُمَا بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ** (17:5) ایسے لوگ پھر تمہارے اوپر مسلط ہو گئے جن کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ ہڈیاں توڑ دینے والی گرفت ہوتی ہے۔ ایسے لوگ پھر مسلط ہو جاتے ہیں۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ یہی ہے کہ جی' کوئی بات نہیں' قانون شکنی نہ سہی' باہر نہ نکلو' آرام سے رہو' جو سامنے آئے گا اسی کے ساتھ یہ کچھ ہوگا۔ کہا کہ نہیں' یہ قومیں جو اس طرح سے مسلط ہوتی ہیں **فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ** (17:5) پھر وہ گھروں کے اندر گھس گھس کے تلاش کرتی ہیں' چن چن کے پھر تمہیں سزا دیتی ہیں۔ اور پھر وہ جو

چیز ''جاسوا''[1] ہے یعنی تلاش کر کر کے تو اس کے معنی ہیں کہ کس کس قسم کا عذاب اس قوم کے افراد کو دیا گیا۔ اس کے بعد کہا کہ **وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا** (17:5) یہ بات نہیں ہے کہ یونہی کوئی مصیبت آتی ہے۔نہیں' ایسے ہی نہیں آتی' اس کا اس طرح آنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ قانونِ مکافاتِ عمل کا فطری نتیجہ ہے' لازمی نتیجہ ہے۔تو پھر اس قوم پہ ایسے لوگ مسلط ہوجاتے ہیں' جو چٹانوں کو ریزوں میں تبدیل کر دیتے ہیں' ان کی ہڈیاں توڑ دیتے ہیں۔وہ گھروں میں گھس گھس کر ان کو نکال نکال کے عذاب دیتے ہیں۔اس قوم کی بعد میں صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔

خارجی حوادث اور قوموں کے داخلی کردار میں باہمی ربط کی بنا پر پیدا ہونے والے اثرات کی شکل وصورت

عزیزانِ من! آپ نے غور کیا کہ بات یہاں سے چلی تھی کہ اقوامِ سابقہ کے قصوں میں جو کہا گیا کہ فلاں قوم میں اس قسم کی بدکرداری پیدا ہوئی' تو اس کے اوپر کوئی سیلاب آ گیا' زلزلہ آیا' آندھی آئی' آتش فشاں پھٹ پڑا' اس نے اس قوم کو تباہ کیا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان خارجی حوادث اور قوم کے داخلی کردار میں باہمی ربط کیا ہے؟ کہ یہ ان چیزوں کے لانے کی یعنی بدکرداری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں نے قرآن کے حوالوں سے یہ بتایا ہے کہ یہ بدکرداری ان چیزوں کو (خارجی حوادث کو) لانے کا ذریعہ نہیں بنتی' وہ تو فطرت کے قانون کے مطابق آتے ہیں' وہ حوادث جب آتے ہیں تو اس میں جو قوم کشتی بنا لیتی ہے' وہ سیلاب سے محفوظ رہ جاتی ہے' جو ایسے وقت میں مذاق اڑا دیتی ہے کہ نہیں صاحب! کیا ہوگا' دیکھا جائے گا' جب وقت آئے گا' وہ برباد ہوجاتی ہے' اس نے شروع سے اصول ہی یہ بتایا۔کہا کہ ہوتا یہ ہے کہ جس قوم میں بدکرداریاں عام ہوجاتی ہیں وہ پھر اس قسم کی قومی حفاظتی تدابیر کی طرف سے اعراض برت لیتی ہے' غافل ہوجاتی ہیں۔دولت کا' پارٹیوں کی کثرت کا نشہ' اتنا مست کر دیتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو Neglect (نظر انداز) کر دیتی ہے۔ بند بناتی ہے تو ان بندوں کی حفاظت کا سامان نہیں کرتی' بستیاں بساتی ہے تو یہ دیکھتی نہیں ہے کہ کہاں کہاں سے یہ اس قسم کے حوادث آ کے تباہ کر جائیں گے۔ بیماریاں آتی ہیں تو قبل از وقت ان سے حفاظت کے ٹیکے نہیں لگاتی' لگتا ہے تو ٹیکوں کی جگہ پانی ہوتا ہے۔

فطری حوادث سے بچنے کے لیے فطری قانون کو ہی اپنانا پڑے گا

قوموں کی یہ چیزیں ہیں جن سے یہ حوادث تباہی کا موجب بنتے ہیں۔اگر قوم میں' اس قسم کی بدکرداریاں نہ ہوں تو وہ فطرت

---

[1] اس کا مادہ ''ج وس'' ہے۔اس سے الجُوس ہے۔تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن میں اس کے معنی ''کسی چیز کی آخری حد تک اسے تلاش کرنا' چھان مارنا' گھومنا پھرنا' لکھتے ہیں۔ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ''کسی چیز کے اندر گھس جانے'' کے بتائے ہیں اور محیط المحیط میں اس کے معنوں میں حملہ کرنے یا لوٹ مار کرنے میں اِدھر اُدھر آمد ورفت کرنا بھی بتائے ہیں (ماخوذ از پرویزؒ): لغات القرآن جلد اول ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1960ء' ص۔ 458)۔

کے قانون کی طرف سے آئے ہوئے' حوادث کا فطرت کے طریقے سے ہی حفاظت کا سامان کر لیتی ہیں۔ یہاں مومن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اور اگر فرق کرنا چاہتے ہیں تو کیجیے' مومن وہ جو فطرت کے قوانین کے صحیح ہونے پہ ایمان لائے اور اس کے مطابق سامانِ حفاظت تیار کرے' کافر وہ جو ہماری طرح ان سے انکار کرے اور اس کے بعد تباہ ہو جائے۔ آج دہائی دے رہے ہیں کہ بابا' شہر کے اندر بچوں کو گل پھیڑے ❶ (Mumphs) نکل رہے ہیں' ان چیزوں سے بچو' یہ چیزیں نہیں ہونی چاہئیں۔ کیا یہ کچھ کرتے ہیں؟ کہنے والا صرف بیان بازی تک رہتا ہے' عملاً ان کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ یہ ہیں چیزیں جن سے قوم پہ تباہیاں آتی ہیں لیکن قرآنِ کریم کے نزول کے بعد' ختمِ نبوت کے بعد' اس کا نقشہ بدل گیا۔ اب اس نے ان چیزوں کو نہیں منع کیا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ فطرت کے قوانین ہیں' یہ سنت اللہ ہیں' جو قوم ان کے مطابق عمل کرے گی' وہ حوادث سے محفوظ رہے گی' یہ جو دوسرا معیار آگے آتا ہے اخلاق اور اقتدار کا وہ آگے آئے گا' اس سے پہلے جو قوم بھی ان کے مطابق عمل کرے گی' ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی' اپنے ہاں تدابیر کرے گی' ان کے نتائج خوشگوار ہونگے۔ جو ان کو Neglect (نظر انداز) کرے گی' **اعرض ذکری** ' یہ قوانین جو ہر وقت سامنے رکھنے تھے' انہیں نظر انداز کرے گی' اس کا نتیجہ ذلت اور خواری ہوگی' بھوک ہوگی' خوف ہوگا۔ یہ عذاب کی شکلیں ہونگی۔ عذاب اس طرح آئے گا۔ اور جو باہر کی بات کہتے ہو تو کہا کہ اس کی شکل یہ ہوگی کہ پھر کوئی دوسری قوم آ کے مسلط ہو جائے گی اور پھر وہ قوم ہڈیاں توڑ دے گی' ذلت وخواری بھی ہوگی' خون ریزیاں بھی ہونگی' فسادانگیزیاں بھی ہونگی' تباہیاں مچیں گی' چٹانیں ذروں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اور بعد میں تاریخ میں پھر تمہاری صرف کہانیاں باقی رہ جائیں گی۔

خدا اپنی مخلوق پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ یہ عمل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے

کہا کہ باقی یہ جو تمہارے ذہن میں تصور ہے کہ صاحب! خدا کا عذاب ہے' خدا عذاب دیتا ہے اور اس کے بعد تو یہ ہے کہ جی' جب خدا کی طرف سے عذاب آ جائے تو بندہ بشر میں کیا جرأت ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہیے وہ تو پھر خدا کے خلاف چیلنج ہوا۔ کہا کہ وہ جسے تم خدا کا عذاب کہتے ہو یہ بات نہیں ہے۔ قرآنِ مجید بتاتا ہے کہ **مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ** (4:147) اگر تم خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھو' جس جس طریق سے اس نے کہا ہے کہ ان قوتوں کو استعمال کرو' تو خدا نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی Sadistic Tendency رجحانِ ایذا پسندی نہیں ہے کہ ہم دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ کیا لفظ ہے **مَا يَفْعَلُ** ! او بابا! ہم نے کیا کرنا ہے تمہیں عذاب

---

❶ یاد رہے یہ بات جون 1978ء کی 23 تاریخ کو کہی گئی تھی جب لاہور میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔

دے کر!! اگر تم ہمارے ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے جاؤ تو وہ عذاب آتا ہی نہیں ہے۔ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔دوسری جگہ ہے **فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ** (3:96) ہم تو مستغنی ہیں، پوری کائنات کے تمام اقوام عالم سے اگر ساری دنیا، سارا دن، سورج کے آگے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے تو اس سے سورج کا کیا بگڑتا ہے۔کیا سورج تمہیں اندھا کرتا ہے ؟ پھر کیوں آنکھیں بند کرتے ہو۔تم دن کی حرارت اور روشنی سے فائدہ اٹھانے کا علم حاصل کرلو، آنکھیں صحیح رکھو۔**مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَ کَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا** (4:147) خدا تو ہر بات کا علم رکھتا ہے، شاکر ہوتا ہے، جو کسی کی محنت کا کسی کو نتیجہ دے۔ہم تو وہ ہیں۔ ہم نے تمہیں عذاب دے کے کیا کرنا ہے۔ان چیزوں کی وجہ سے جو تم کرتے ہو، سارا معاشرہ فساد سے بھر جاتا ہے۔وہ تو یہ دو چیزیں آتی ہیں، ہماری ہی طرف سے نہیں ہیں، یہ تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے اور نتیجہ خدا کے قانون میں فطرت کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔خدا کسی کو عذاب نہیں دیتا، خدا کسی کو تباہ کر کے خوش نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! بات کرنے کا طریقہ ہے کہ اپنے ہی جرائم کے اندر، جہنم کی تباہی کے اندر جانے والی جو قوم ہے، وہ جہنم میں جا رہی ہے اور ادھر سے خدا کی طرف سے آواز آتی ہے، او میرے بندو! تم نے کیا کرلیا اپنے آپ کو۔وہ تو ایسا خدا ہے۔مجرم کو سزا مل رہی ہے۔وہ جیسے اپنے الفاظ میں کہا کہ وہاں اس کے سینے میں درد اٹھ رہا ہے۔وہ ان کو ایسا کرنے سے روکتا نہیں ہے کیونکہ **وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ تَبْدِیْلًا** (33:62) ہم یہ نہیں کرتے کہ ہمدردی کا یہ جذبہ ہمارے دل میں اٹھا اور کہہ دیا کہ نہیں جی مجرم کو سزا نہیں ملنی۔سزا کا یہ عمل تو قانون کے مطابق ہوگا۔بچے کو سوئی چبھ جاتی ہے، ماں کی مامتا اور ہزار آنسو اس کے درد کے اندر کمی نہیں کر سکتے، وہ تو فطرت کے قانون کے مطابق مرہم لگے گا تو درد میں کمی ہوگی، لیکن ماں کی مامتا کہتی ہے کہ او میرے بچے! کیا ہوگیا۔یہ جو چیز ہے آپ دیکھیے کہ یہ اس انداز کی بات ہے اور وہ رسول سے بار بار کہتا ہے کہ او بابا! ان کے پیچھے تم اپنی جان گھلا رہے ہو، تم نے اپنا فریضہ ادا کردیا، سب کچھ سمجھا دیا، بتا دیا، اگر یہ نہیں مانتے اور سنکھیا کھا رہے ہیں، خودکشی کر رہے ہیں، تو اپنی جان پہ عذاب لا رہے ہیں۔ہم نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے۔

عزیزانِ من! یہ بڑا اہم سوال تھا، خدا کرے کہ میں آپ کو صحیح طور پہ سمجھا سکا ہوں۔یہ بڑی اہم چیز ہے جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔آج تو ہم نے اگلی آیت نہیں لی۔آئندہ سے ہم قرآنِ کریم کے درس میں سورۃ الشعرآء کی 123 ویں آیت لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

گیارھواں باب: **سورة الشعرآء**(آیت 123 تا 140)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1978ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعراء کی آیت 123 سے ہو رہا ہے:
(26:123)۔

نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نئی اصطلاح کا مفہوم اور اس کے نفاذ کا معیار

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات سے انبیائے سابقہؑ کی داستانیں شروع ہو رہی ہیں۔ حضرتِ نوح علیہ السلام کا قصہ پہلے آیا ہے اور اب قومِ نوح علیہ السلام کے بعد جو دوسری قوم سامنے آتی ہے، وہ قومِ عاد ہے۔ حضرتِ ہودؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ اس آیت سے آگے ان کی داستان چلتی ہے لیکن اس داستان کے آغاز سے پہلے اصولی طور پر ایک بڑا اہم نکتہ میرے ذہن میں آیا ہے کہ میں اس کی وضاحت کر دوں اور وہ بڑی اہم چیز ہے۔ آپ نے اسلامی نظام، اقامتِ دین، نظامِ خداوندی اور پھر پچھلے سال سے نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم [1] وغیرہ کی اصطلاحات عام طور پر سنی ہوں گی۔ جیسا میں نے کہا پچھلے سال سے نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صدا ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ کسی نے بھی آج تک یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے، یہ ہوتا کیا ہے، یہ ہے کیا چیز؟ اگر جدوجہد یہ ہے کہ نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم قائم کر کے رہیں گے تو کیسے معلوم ہوگا کہ اب یہ نظام قائم ہو گیا ہے یا نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم تو پورا ایک من گندم لیں گے تو وہ معلوم ہوتا ہے کہ چالیس کلو ہے اس چالیس کلو سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ابھی ایک من گندم پوری ہوئی یا نہیں ہوئی۔ اگر کسی شے کو Define (متعین) نہ کیا جائے تو وہ مبہم رہتی ہے۔ ان حضرات کی کوشش یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہمیشہ Undefined (غیر متعین) اور مبہم رکھا جائے تاکہ یہ گرفت ہی نہ ہو یا یہ کہیں کہ ہو گیا ہے تو مان لیں کہ ہاں ہو گیا ہے۔ یہ اسٹینڈرڈ کیا ہے؟ یہ معیار کیا ہے؟ جس سے پتہ چلے کہ یہ نظام قائم ہو گیا ہے یا نہیں ہو گیا؟

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں نظام کے بجائے الدین کا لفظ استعمال کیا ہے

عزیزانِ من! کیا کسی کے ذہن میں یہ چیز بھی ہے کہ یہ ہوتا کیا ہے؟ بظاہر ذہن میں یہ آئے گا کہ بات تو ہو رہی ہے انبیائے سابقہؑ کے قصوں کی، داستانوں کی، تذکارِ جلیلہ کی، تو اس میں یہ نظام والی بات کہاں سے آ گئی؟ نظام والی بات تو آتی ہی یہیں سے ہے۔ نظام کا لفظ تو قرآنِ کریم میں نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے لیے لفظِ الدین ہے۔ اور اب دین کے متعلق قرآن میں یہ ہے کہ دین خدا کا دیا ہوا ہے، کسی نبی کا خود وضع کردہ نہیں ہے۔ کسی نبی کا دین نہیں، کسی رسول کا دین نہیں بلکہ خدا کا دین ہے جو انبیائے کرامؑ نے پہنچایا اور عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ قرآن نے اسے ہمیشہ دین اللہ کہا ہے یعنی خدا کا دین۔ اگر ہمارے ہاں اس کا ترجمہ نظام ہے جو یہ کہتے ہیں تو پھر تو یہ صرف نظامِ خداوندی ہو سکتا ہے، اسے کسی نبی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کسی نبی کا دین نہیں ہو سکتا جیسے قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب نہیں بلکہ وہ کتاب اللہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کو دوسرے انسانوں تک پہنچایا،

---

[1] حزبِ مخالف نے 1977 کو پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح استعمال کی اور عوام کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

اسی طرح سے جسے آپ الدین کہتے ہیں اور اگر اس کا ترجمہ آپ نظام کرتے ہیں تو وہ صرف خدا کا ہے' کسی رسول کا نہیں ہے۔ رسولوں نے صرف اسے پہنچایا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی نسبت کسی رسول کی طرف کرنا ہی غلط ہے' یہ نہیں کرنا چاہیے۔ تو الدین ہے جو قرآن نے کہا ہے۔

الدین کے متعلق بھی یہ نہیں ہے کہ وہ نبی اکرمؐ ہی کو دیا گیا تھا اور حضور ہی نے آگے پہنچایا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب سے یہ سلسلۂ رشد و ہدایتِ آسمانی شروع ہوا' ہر نبی کو یہی دین دیا گیا' اس نے یہی دین آگے پہنچایا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ قرآنِ کریم کی سند موجود ہے۔ **شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ** (42:13) اے نوعِ انسانی! اے جماعتِ مومنین! یہ جو الدین ہے جس کا راستہ تمہیں دکھایا جا رہا ہے' یہ وہی ہے جو ہم نے نوحؑ کی طرف وحی کیا اور اے رسول! جسے اب تمہاری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے جو سب سے پہلا نبی ہے اس کا نام لیا' سب سے آخری نبی کا نام لیا اور درمیان میں کہا کہ **وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى** (42:13) یہ وہی دین ہے جو اس نے ابراہیم علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کیا۔ یہ اس نے درمیان کے چند انبیاء کا نام بھی لیا۔ ان سب کے پاس ایک ہی دین آیا تھا۔ ان سے کہا یہ گیا تھا کہ **اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ** (42:13) اس دین کو قائم کرو' اس کو Establish (متشکل) کرو' جو خدا کی طرف سے الدین دیا گیا تھا۔ **وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ** (42:13) اور اس میں تفرقہ نہ پیدا کرنا' افتراق نہ پیدا کرنا۔ الدین خدا کی طرف سے دیا گیا ہے تاکہ انبیائے کرامؑ اس کو پہنچائیں' عملاً قائم کریں اس میں تفرقہ نہ کریں اور ایک عالمگیر برادری بن جائے۔

احکامِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ شرک ہے

یہ اتنی اہم چیز ہے کہ شرک اور توحید کے درمیان مابہ الامتیاز چیز ہی الدین ہے۔ کہا کہ **كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ** (42:13) اے جماعتِ مومنین! جس الدین کی طرف تم دعوت دیتے ہو' مشرکین پر یہ بڑا ہی گراں گزرے گا۔ ہمارے ہاں تو مشرکین پھر ہندوؤں اور بت پرستوں کو کہتے ہیں' بظاہر تو ہم انہیں ہی مشرک سمجھتے ہیں۔ احکامِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرنا شرک ہے۔ الدین صرف خدا کا دیا ہوا نظام اور خدا ہی کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے اس کو Establish (قائم) کیا جاتا ہے۔ اگر اس میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو بھی شامل کیا جائے تو یہ شرک ہے۔ کہا کہ ان لوگوں پر یہ چیز بڑی گراں گزرے گی کہ خالص خداوندی احکام اور اقدار کی اطاعت ہو۔ یہ الدین کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے **اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ** (42:13) دین دینے کے لیے جسے خدا اپنی مشیت کے

مطابق سمجھتا تھا اسے منتخب کر لیتا تھا لیکن اس دین کی طرف جو آنا چاہے وہ اپنے اختیار و ارادے سے آ سکتا ہے۔ الدین تمام انبیائے کرامؑ کو دیا گیا۔

دین نظامِ زندگی کے نظریاتی اصول ہیں۔ انہیں عملی شکل دینے کا نام اسلام بھی ہے اور توحید بھی

یہ الدین نظری حیثیت سے آئے گا۔ یہ نظریات ہوں گے۔ یہ کچھ اصول ہوں گے جو انبیائے کرام کو دیئے گئے۔ جب ان اصولوں کو عملی شکل دیدی جائے گی تو اسے الاسلام کہا جائے گا۔ گویا الدین خدا کی طرف سے دیا ہوا نظام، نظریات کی شکل میں ہے اور ان نظریات کو جب عملاً متشکل کر دیا جائے تو اس کا نام اسلام ہے۔ یہ قرآنِ کریم میں ہے کہ **اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ** (3:19) اللہ کے نزدیک الدین کی جو محسوس اور مشہود شکل ہے، وہ ہے الاسلام۔ تو گویا اللہ کے نزدیک نظامِ خداوندی کا نام الاسلام ہے۔ وہ تمام انبیائے کرامؑ کو ایک ہی تھا جو اصولاً دیا گیا تھا۔ **وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ** (3:19) انبیائے کرام کے بعد ان کے نام لیوا، ان کی امتیں، محض ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے، ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے لیے، اس میں تفرقہ پیدا کرنے لگ گئے۔

دین کے معاملہ میں نبیوں کے مابین کوئی اختلاف نہ تھا

ایک ہی نبی کے نام لیواؤں کے درمیان یہ جو اختلاف دیکھتے ہو، یہ ان کا اپنا پیدا کردہ ہے ورنہ الدین اصولی طور پر حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی تھا اور سب کو یہی دیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ تم اس میں تفرقہ پیدا نہ کرنا۔ کہا یہ نبیوں میں تفرقہ نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہوا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام نے کوئی اور دین پیش کیا اور حضرتِ ھود علیہ السلام نے کوئی اور پیش کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اور دین پیش کیا۔ یہ تو ایک ہی چیز تھی جو انبیائے کرام خدا کی طرف سے دیا ہوا الدین پیش کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کے نام لیوا اپنے مفاد کی خاطر اس میں تفرقہ پیدا کر لیتے تھے۔ گویا اگر کسی نظام میں، کسی امت میں، الدین کے نام لیواؤں کے درمیان تفرقہ ہے تو وہ سمجھ لیجیے کہ الاسلام نہیں ہے، الدین نہیں ہے۔ یہ ہے الدین، یہ ہے وہ نظام۔ اور اگر نظام ترجمہ کرنا ہے تو نظامِ خداوندی کہہ سکتے ہیں۔ دینِ خداوندی ہے، قرآن نے اس کو دین اللہ کہا ہے۔ اور دوسری جگہ کہا کہ یہی ہے وہ دین جو انسانوں کو شروع سے ملتا چلا آ رہا ہے اور اب قرآن کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے یعنی اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہے اور بس! **اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ** (3:83) تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین (نظامِ زندگی) کے سوا کسی اور دین یا نظام کو اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ **وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (3:83) حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی بھی ہے،

قانونِ خداوندی کے سامنے جھکا ہوا ہے' اس کے سوا کوئی اور نظام قابلِ قبول نہیں ہے۔ الدین کے اصولوں کو عملاً متشکل کرنے کا نام الاسلام ہے۔ کہا کہ **وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ** (3:85) جو کوئی اس کے سوا کوئی اور نظام چاہے گا' قائم کرے گا' تو خدا کے ہاں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

انبیائے سابقہ کے ہاں دین کے اصول پیش کرنے کا طریق

یہاں جو میں بنیادی اصولی بات کہہ رہا تھا اور یہ بڑی اہم ہے' اسے یاد رکھیے کہ الدین تمام انبیائے کرام کو ایک ہی دیا گیا تھا۔ یعنی اس کے اصول' اس کے احکام' اس کی اقدار' وہ تمام یکساں تھے' شروع سے لے کر آخر تک وہی دیئے جا رہے تھے۔ وہ غیر متبدل تھے۔ ان میں کبھی نبی کے بعد انسانی آمیزشیں ہو جاتی تھیں' کبھی وہ حوادثِ ارضی وسماوی کے تحت مٹ جاتا تھا۔ دوسرا نبی آتا تھا تو وہی جو اصولِ دین تھے' وہ پھر پیش کر دیتا تھا۔ دین پر عمل اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہوتا تھا۔ تو گویا الدین کی عملی شکل جو بھی تھی وہ تو مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی تھی۔ الدین کے جو اصول' بنیادی نظریات ہیں وہ مختلف نہیں ہو سکتے' اور نہ ہی تھے۔ اب یہ الدین کہاں سے معلوم کیا جائے؟

اب یہیں سے بات آ گئی جہاں سے میں نے کہا تھا کہ بڑی اہم چیز ہے جو آج میں سامنے پیش کر رہا ہوں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی جو داستانیں پیش کی گئی ہیں' وہ تاریخی واقعات کی حیثیت سے تو پیش نہیں کی گئیں۔ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں' یہ تو الدین ہی کی کتاب ہے' الدین ہی کے مختلف گوشے' مختلف زاویئے اور مختلف شکلیں ہیں جو قرآن وضاحتوں سے اور تصریحات سے پیش کیے جاتا ہے۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام میں آپ دیکھیں گے کہ وہ سارے دین کے گوشے ایک ہی نبی کی داستان کے سلسلے میں سامنے نہیں لائے گا۔ ان کے زمانے میں' جو اس قوم میں ان کے خلاف نظام قائم تھا' جس میں وہ مبعوث ہوئے تھے' اس نظام کے جو اہم گوشے تھے' ان کے متعلق انہوں نے ذکر کیا کہ یہ چیز خلافِ دین ہے' خدا کے نظام کے خلاف ہے' شرفِ انسانیت کے خلاف ہے' باطل ہے اور اس کے بعد انہوں نے اس کی جگہ خدا کے الدین کے جو کچھ گوشے تھے' وہ دیئے کہ یہ غلط ہے یہ صحیح ہے۔ آپ قرآن میں دیکھیں گے کہ ایک یا دو زیادہ سے زیادہ گوشے ہیں جو وہ پیش کر رہا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ساری تعلیم وہی تھی جو انہوں نے اس طرح پیش کی۔ وہ تو الدین کے سارے مختلف اصول پیش کرتے تھے۔ اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق جس چیز نے اہمیت اختیار کر رکھی تھی' اسے زیادہ نمایاں کر کے قرآن نے پیش کیا ہے۔ جیسا ہمارا یہ دور معاشیات کا دور کہلاتا ہے' اس دور کے اندر دین کے باقی گوشے بھی اہمیت رکھتے ہیں لیکن الدین کا جو معاشی گوشہ ہے' اس نے

خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے‘ جس طرح دور حضرت شعیبؑ کے زمانے میں ہوا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری تگ و دو امورِ معاشیات کے متعلق ہے۔ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے صرف اتنا ہی دین کا حصہ پیش کیا تھا بلکہ الدین کے سارے گوشے پیش کیے تھے۔ قرآن نے ان انبیائے کرام کی جو داستانیں یا تذکرے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں‘ ان میں دین کے وہ اہم گوشے جنہیں انہوں نے اپنے زمانے میں پیش کیا یا متشکل کیا‘ انہی کو قرآن نے بیان کیا ہے۔

آج نوعِ انسانی کو زندگی کے وہ بنیادی غیر متبدل اور مکمل دینی اصول کہاں سے حاصل ہوں گے؟

اب آیئے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی داستانوں کے یہ جو اہم گوشے ہیں‘ یہ الدین کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہ جو کچھ انہوں نے آ کر اپنی اپنی قوم سے کہا تھا کہ یہ غلط ہے اور یہ صحیح ہے‘ اسے آپ اگر یکجا کر لیں تو الدین کا گلدستہ آپ کے سامنے آ جائے گا۔ گویا یہ داستانی کہانیاں نہیں ہیں‘ یہ داستانیں الدین کے مختلف گوشوں کو پیش کر رہی ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ الدین کیا ہے تو قرآنِ کریم سے نہایت آسانی سے اس کو مدوّن کیا جا سکتا ہے۔ اور ان انبیائے کرام علیہم السلام نے جس جس چیز کے خلاف آواز اٹھائی وہ باطل کا نظام تھا۔ اس کی جگہ جو انہوں نے پیش کیا وہ خدا کا دین تھا۔ ان اجزاء کو آپ اکٹھا کرتے چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے ایک کُل مرتب ہو جاتا ہے اور وہ کُل ایسا ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں کُل کی حیثیت سے دنیا کو دیا کیونکہ حضورؐ خاتم النبیین تھے۔ گویا دین کے جتنے بکھرے ہوئے منتشر گوشے‘ مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی داستانوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں‘ ان کی جو مجموعی اور کلی حیثیت ہے‘ وہ قرآنِ کریم کے اندر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک دین کے ان گوشوں میں کہیں اختلاف نہیں ہے۔ انہیں اکٹھا کر دیکھیے یا ان کی کلی حیثیت جو قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان مبارک سے پیش کی ہے‘ انہیں سامنے لے آیئے تو ایک چیز آئے گی اور وہ ہے الدین‘ یہ ہے نظامِ خداوندی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا مدوّن کرنا تو کچھ مشکل ہے ہی نہیں۔ قرآن ہمارے سامنے ہے‘ انبیائے کرام کے تذکار ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے جو اپنی دعوت پیش کی تھی اس کو لے کر یکجا کر لیجیے‘ اکٹھا کرتے چلے جایئے۔ اور پھر قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ سارے کے سارے ہمیں یکجا کیے ہوئے ملیں گے۔ یہ تو مشکل ہی کچھ نہیں ہے اگر یہ الدین پیش کر دیا جائے تو پھر میں‘ آپ‘ ہر ایک‘ ہر وقت‘ دیکھ سکتا ہے کہ یہ جو تحریکیں‘ دعوتیں چلائی جا رہی ہیں‘ یہ اس الدین کی طرف جاتی ہیں یا اس کے خلاف جا رہی ہیں۔

اپنے اپنے معاشی حالات کو نظامِ خداوندی کے ترازو میں تولنا ہوگا

اب جب کہا جائے کہ دین نافذ ہو گیا ہے، نظام نافذ ہو گیا ہے تو اسے ماپا جائے گا، تولا جائے گا، پرکھا جائے گا کہ آیا یہ نافذ ہو گیا ہے یا نہیں۔ کسی کے کہنے کی تو بات ہی نہیں ہوگی کہ یہ کہیں کہ نہیں ہوا تو نہیں ہوا، اور وہ کہیں کہ ہو گیا تو ہو گیا ہے۔ یہ ہے وہ چیز۔

دین میں ابہام نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تو غلط اور صحیح کو نمایاں طور پر، واضح طور پر، بیان کر دیا ہے تو جسے خدا کہتا ہے کہ واضح طور پر بیان کر دیا ہے، اس کے متعلق اس ابہام کے اندر رہنا کہ ایک کا بیان دوسرے سے ملتا ہی نہیں ہے، تو کیا یہ اچھی وضاحت ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ایک دوسرے سے نہیں مل رہا؟ اس لیے کہ یہ خدا کا دیا ہوا جو دین ہے اسے نہیں پیش کر رہے۔ یہ جو ان کے اپنے اپنے فرقے ہیں، اپنے اپنے فرقوں کے جو بانی ہیں یا ان کے آئمہ ہیں، یا پھر اپنے یہ فرقے ہیں، یہ ان کا بنایا ہوا دین پیش کر رہے ہیں۔ قرآن نے تو خود کہا ہے کہ انبیائے کرام کے بعد یہ جتنے بھی مختلف فرقوں کے بانی پیش کرتے ہیں یہ وہ ہے جس میں اختلاف ہے۔ الدین میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔

فرقوں کی موجودگی میں دین کا نفاذ تو ممکن ہی نہیں

اب اس سے اگلی بات صاف ہو گئی کہ جب تک یہ الگ الگ فرقے باقی ہیں، الدین اپنی اصلی شکل میں سامنے آ ہی نہیں سکتا کیونکہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ اور یہ تمام، یا ان فرقوں کے بانی یا ان کے آئمہ کسی ایک معاملے میں بھی متحد نہیں۔ متحد تو اس نعرے میں ہیں یا اس دعوے میں ہیں کہ دینِ مصطفیٰ، اسلامی نظام، نظامِ شریعت، نظامِ مصطفیٰ ﷺ لائیں گے اور کبھی نہیں بتائیں گے کہ یہ ہے کیا؟ کیونکہ اس سے تو پھر ان کی اپنی قلعی کھل جاتی ہے۔ ایک کا بتایا ہوا دوسرے کے ساتھ ملتا ہی نہیں ہے، مل سکتا ہی نہیں۔ تو یہ قائم کس طرح سے ہو جائے گا۔ یہ الدین تو ایک کُلی زندگی کو محیط ہے۔

افطار پارٹی کے بعد نماز کے سلسلہ میں یک جہتی کا منظر

یہاں آپ کو معلوم ہے کہ دوسرے سال رمضان شریف میں، جب نظامِ مصطفیٰ کے نافذ کرنے کی تحریک بڑے زوروں پر تھی، ان کے داعیوں میں سے جو مذہبی دنیا کے اندر دو بڑے بڑے اہم ستون مفتی محمود صاحب [1] اور مولانا نورانی صاحب [1]، یہیں گلبرگ لاہور میں چودھری ظہور [2] الٰہی کی کوٹھی پر افطار پارٹی تھی اور یہ اس زمانے میں عام خبر شائع ہوئی تھی۔ افطار کی میز کے

---

[1] اب مرحوم ہو چکے ہیں: مولانا مفتی محمود (1980-1919)، مولانا شاہ احمد نورانی (2003-1926)۔

[2] راہنما قومی اتحاد و تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ (1977): ظہور الٰہی، چودھری (1981-1920ء)

اوپر یہ ساری پارٹیاں بیٹھی تھیں' یہ بھی بیٹھے تھے' افطاری تو اکٹھی تھی' اس میں تو کوئی تفرقہ نہیں تھا۔ جب مغرب کی نماز کی اذان ہوگئی' جلدی جلدی انہوں نے گلی کی' گلی میں بھی تفرقہ نہیں تھا' مفتی [1] صاحب نماز کے لیے اپنے ٹولے کو لے کر اسی لان میں ایک طرف کھڑے ہوگئے' نورانی [2] صاحب اپنے ٹولے کو لے کر اسی لان میں دوسری طرف کھڑے ہوگئے۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قائم کرنے کے داعیوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دونوں جو اس کے اہم ستون ہیں' وہ نماز میں اکٹھے نہیں ہیں' وہ الگ اپنی نماز پڑھ رہے ہیں' وہ اپنی پڑھ رہے ہیں اور جب پڑھ چکنے کے بعد کھانا رکھا گیا تو دونوں اکٹھے میز پہ تھے۔ اب دیکھ لیا کہ اکٹھے کس بات پہ ہوتے ہیں اور اختلاف کہاں ہے۔ اور یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

مولانا نورانی کا جنرل ضیاء الحق سے ایک ملاقات میں وضاحتی بیان

مولانا نورانی [2] صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ ان کے اپنے فرقے اہلِ سنت کا پرچہ کراچی سے نکلتا ہے۔ یہ جسے بریلوی یا رضائیہ فرقہ کہتے ہیں' یہ پرچہ ان کا ہے۔ اور مفتی محمود [1] صاحب جو ہیں یہ دیو بندی ہیں۔ اور دونوں حنفی ہیں۔ یعنی دونوں کا ایک اسلام تو ایک طرف رہا' دونوں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [3] کے متبع ہیں' دونوں حنفی ہیں۔ اور ان حنفیوں کی یہ کیفیت ہے' یعنی شیعہ سنی کا سوال نہیں ہے' اہلِ حدیث اور حنفیوں کا سوال نہیں ہے۔ حنفیوں میں ہی ایک فرقہ دیو بند ہے' ایک بریلوی ہے' ان دونوں میں کیفیت یہ ہے کہ افطاری کے کھانے میں تو اکٹھے ہیں' مگر نماز دونوں الگ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بیان شائع کیا ہے۔ یہ بڑا دلچسپ ہے۔ کہنے لگے کہ "ہم جنرل ضیاء الحق [4] صاحب سے ملنے کے لیے گئے۔ میرے ساتھ مولانا عبدالستار [5] نیازی بھی تھے اور ایک اور صاحب بھی تھے"۔ دو گواہ بھی موجود۔ کہا کہ "جنرل صاحب [4] نے مجھ سے کہا کہ نورانی [1] صاحب! مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ مذہب کے معاملے میں بڑے کشادہ ظرف واقع ہوئے ہیں' وسعتِ قلبی ہے آپ کی' آپ لوگ نماز کے معاملے میں تفرقہ نہیں کرتے' جو بھی امام ہو' اس کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے"۔ نورانی [1] صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ "میں نے اسی وقت کہا کہ جنرل [4] صاحب! آپ کو کسی نے غلط خبر دی ہے اور آپ اس مغالطے میں نہ رہیے' ہم اور ان

---

1. مولانا مفتی محمود (1919-1980)
2. مولانا شاہ احمد نورانی (1926-2003)
3. امام ابوحنیفہؒ (80-150ھ/c.699-767)
4. جنرل ضیاء الحق (1924-1988)
5. مولانا عبدالستار خاں نیازی (1915-2001)

کے پیچھے نماز پڑھ لیں!!'' کہا کہ ''یہ تو کچھ شے نہیں ہے، جب کعبے کے امام آئے تھے تو چونکہ وہ ہمارے فرقے سے متعلق نہیں تھے، ہم نے ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھی، ہم تو مکے میں جا کے بھی ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور جن لوگوں نے ان کے پیچھے نماز پڑھ لی تھی، ہم نے بعد میں فتویٰ دیا تھا کہ وہ اپنی نمازیں دہرائیں گے۔ معاف رکھیے گا، آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی ہے''۔ اور یہ سارے متحد ہیں نظامِ مصطفیٰ قائم کرنے کے لیے۔ یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ اسے مبہم رکھا گیا تھا، اسے واضح ہی نہیں کیا گیا کہ یہ ہے کیا؟ اس وضاحت میں کم از کم اتنی تو بات آئی کہ ایک امام کے پیچھے یہ سب نماز نہیں پڑھیں گے یہ تو مکے کے امام کے پیچھے بھی سارے اکٹھے ہو کر نہیں پڑھیں گے۔

ملتِ اسلامیہ میں دین اس وقت تک نافذ نہیں ہوسکتا جس وقت تک ہماری مساجد میں اذان اور نماز کی یکجہتی نہیں ہوتی

میں نے جو کہا ہے کہ جسے الدین کہا گیا ہے، جسے نظامِ خداوندی کہیں گے، اس کا متعین کر لینا کچھ مشکل ہی نہیں ہے۔ قرآن میں اس کے سارے اجزاء، اس کے سارے حصے، اس کے سارے گوشے دیئے ہوئے ہیں۔ ان کو یکجا کر لیجیے، الدین متعین شکل میں آپ کے سامنے آ جائے گا لیکن سب سے بڑی بنیادی بات تو یہ ہے کہ یہاں جو قرآن کا نام لے، وہ مرتد ہے، ملحد ہے، بے دین ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ واقعی مرتد ہے بلکہ اس لیے کہ انہیں پتہ ہے کہ اگر لوگ اس پر آ گئے کہ صاحب! قرآن کو الدین کا معیار بنا لیجیے تو یہ جتنا کچھ بھی ہے وہ سب ختم ہو جائے گا۔ زندگی کے ہر شعبے میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ ہی سہی، جو یہ کہہ رہے ہیں، نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے ماننے والے جو ہیں وہ نمازیں الگ الگ پڑھیں گے۔ یہ کیسی یک جہتی ہے!!

مجموعی شکل میں نظامِ دین کو عملی طور پر سمجھنے کا طریق

جو بات مجھے بیان کرنی تھی وہ یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح پلے باندھ لیجیے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی جو داستانیں آئیں تو ان میں انہوں نے جس پہلو کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی، وہ غیرِ خداوندی دین پر تھا، وہ باطل تھا، اور اس کی جگہ انہوں نے خود جو پیغام دیا وہ نظامِ خداوندی یا الدین ہے، وہ اس کے اجزاء تھے۔ اور اس طرح سے ان تذکار پہ آتے چلے جائیے اور جو جو انہوں نے کہا ہے اس کو یکجا کرتے چلے جائیے۔ جب آپ آخر میں نبی اکرم ﷺ تک پہنچیں گے تو الدین یا نظامِ خداوندی اپنی مجموعی متعین شکل میں آپ کے سامنے ہوگا۔ تو یہ جتنی آپ کے سامنے داستانیں آئیں گی وہ اس مقصد کے لیے ہیں، ان سے یہ حاصل ہوگا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں قومیت کا مدار خون کا رشتہ تصور کیا جاتا تھا

ہمارے سامنے حضرت نوحؑ آ گئے۔ یہ پہلی داستان تھی۔ کیا کہا انہوں نے؟ کیا پیغام تھا؟ کیا نظام لائے تھے؟ اس زمانے میں اس قوم میں بلکہ آج بھی ساری دنیا میں قومیت کا مدار خون کا رشتہ ہوتا ہے' یہ نسلی ہوتا ہے' قوم نسلی ہوتی ہے' ایک نسل کے' ایک خون کے' ایک قبیلے کے' ایک خاندان کے افراد' جو نسلاً مشترک ہوں وہ ایک قوم بنتی تھی' خواہ ان کے عقیدے کچھ بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کا تصور یہ تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے ایک قوم کے فرد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اس کے خلاف یہ کہا کہ اے نوحؑ ! یہ ان کا تصور ہے' باپ اور بیٹا بھی اگر ایک نظریئے کے حامل نہیں ہیں تو یہ ایک قوم کے فرد نہیں ہیں۔ قوم نسل کے اشتراک سے نہیں بنتی بلکہ دین کے اشتراک سے بنتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے کہہ دیا کہ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اسی طرح ان کی بیوی کے متعلق بھی کہا کہ وہ بھی اس اشتراک میں نہیں۔ انہیں کہا گیا کہ نہیں' وہ اپنوں میں سے نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابراہیمؑ آ گے آئیں گے۔ ان سے کہہ دیا کہ اپنے باپ سے کہہ دو کہ تو اور میں ایک قوم کے فرد نہیں ہیں۔ یہاں حضرت نوحؑ کے سلسلے میں بیٹا اور باپ اپنوں میں سے نہیں ہیں' وہاں حضرت ابراہیمؑ کے سلسلے میں باپ اور بیٹا ایک قوم کے فرد نہیں ہیں۔ حضرتِ نوحؑ کی بیوی کے متعلق بھی یہی ہے کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک قومیت کا مدار رنگ' نسل' علاقہ' ذات' زبان' دولت یا پیشہ نہیں ہوتا

عزیزانِ من! اس کے بعد چلتے آیئے۔ مجموعی شکل میں نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ بات آئے گی۔ حضور ﷺ کے والد پہلے فوت ہو چکے تھے۔ حقیقی چچا حضرتِ عباس تھے اور ابولہب جو اتنا بڑا دشمنِ اسلام نظر آتا ہے وہ چچا تھا' آپ ﷺ کا داماد ابو العاص (حضرت زینبؓ کے شوہر) جنہوں نے اس وقت تک یعنی جنگ بدر[1] تک ایمان نہیں لایا تھا' ان کو دین میں اشتراک نہیں ہے۔ دوسری طرف دیکھیے ان میں نہ صرف یہ کہ اس قوم کے افراد نہیں ہیں بلکہ یہ ہے حبش کا بلالؓ ہے' روم کا صہیبؓ ہے' فارس کا سلمانؓ ہے' نہ نسل کا اشتراک' نہ وطن کا اشتراک اور نہ رنگ کا اشتراک' یہ اکٹھے ہو کے ایک قوم اور اپنے حقیقی چچا اور داماد یہ دوسری قوم۔ تو الدین یا جسے آپ نظامِ زندگی کہیے' اسلامی نظام کہیے' اس کا پہلا گوشہ ہمارے سامنے یہ آیا ہے کہ قومیت کا مدار رنگ' نسل' زبان وطن کا اشتراک نہیں بلکہ Ideology' نظریہ ایمان کا اشتراک ہے۔ بات صاف ہوگئی کہ جہاں قومیت' اس معیار کے خلاف'

---

[1] جنگ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء)

کسی اور اشتراک سے بنے گی وہ الدین کے خلاف بات ہوگی۔ وہاں نظامِ خداوندی نہیں آ سکتا۔ دوسری بات حضرت نوحؑ نے پیش کی تھی۔ مخالفین کہتے تھے کہ ایک طرف یہ چھوٹے درجے کے لوگ' یہ کنجڑے' یہ موچی' یہ حجام' یہ محنتی' یہ مزدور اور دوسری طرف جاگیردار اور ریاستوں والے اور چوہدری' کیا ان میں مساوات ہوسکتی ہے؟ یہ تھا جو اس زمانے میں نظام مروج تھا۔ اس کے خلاف حضرت نوح علیہ السلام نے آواز بلند کی۔ انہوں نے کہا کہ یہ قطعاً غلط ہے۔ کسب و ہنر کا تعلق تو صرف معاش سے ہے' مساوات کی بنیاد انسانیت ہے۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی بنا پہ یکساں واجب التکریم ہے۔ اس لیے دولت کے معیار کے مطابق' یہ طبقاتی کشمکش یکسر دینِ خداوندی کے خلاف ہے۔ مخالفین نے بہتیرا ہی کہا کہ اس میں کوئی مفاہمت کی شکل نکل آئے لیکن انہوں نے کہا کہ دین میں مفاہمت ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مخالفین بڑے بڑے جاگیردار تھے' بڑے بڑے امیر تھے' جیسے قرآن کہتا ہے کہ ان کی کوٹھیاں دانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ اس زمانے کی چوہدراہٹ یا جاگیرداری تھی' آج تو اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

دین میں مدارج کا معیار کردار اور اخلاق ہے

آج بھی گاؤں کے اندر جو گاؤں کا چوہدری ہوتا ہے' پوچھو نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ اس زمانے کے یہ لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ انہیں ذرا ہم سے الگ رکھیے گا یا کم از کم یہی ہو کہ ہم چار پائی پہ بیٹھیں اور یہ زمین پہ بیٹھیں' تو ہم تمہارے ساتھ آ جاتے ہیں۔ آپؑ نے کہا کہ دین سودا بازی کا نام نہیں ہے' میری نگاہوں میں ان میں سے ایک مومن تم سب سے زیادہ قیمتی اور بھاری ہے۔ میں تمہاری خاطر انہیں نہیں دھتکار سکتا۔ نہیں آنا چاہتے تو مت آؤ' مجھے ان کھوٹے سکوں کی ضرورت نہیں ہے۔ دین کا دوسرا جزو ہے کہ یہ طبقاتی کشمکش اور یہ امتیاز باطل کا نظام ہے اور دینِ خداوندی یا نظامِ خداوندی میں مساواتِ انسانیہ ہے۔ اس میں مدارج کا معیار کردار اور اخلاق ہے۔ یہ **وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا** (6:132) ہے۔ یعنی سزا اور جزا ہمارے قانون کی رو سے عمل کے مطابق ملتی ہے اور عمل کے مطابق ہر ایک کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ اور **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (49:13) ہے یعنی میزانِ خداوندی کی رو سے' عزت اور تکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ تم میں سے کس کی زندگی قوانینِ خداوندی سے زیادہ مطابق ہے۔ کون ان کی زیادہ اطاعت کرتا ہے؟ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ یعنی جو سب سے زیادہ ان شرائط کا پابند ہے' اخلاق میں بلند ہے' وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ محنتی ہے اور یہ تمہارے ہاں کا بڑا آدمی ہے۔ یہ معیار نہیں ہے۔ یہ دین کے گوشے تھے جو حضرتِ نوحؑ کے قصے میں ہمارے سامنے آ گئے۔ کیا یہ آج سے چھ ہزار سال پہلے کی کچھ داستان ہے یا آج کے متعلق یہ بات ہے؟

دین ابدی ہے۔ اس کو نافذ کرنے کے جو طریق ہیں' وہ حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو پہلے نبی کی داستان میں جو بات آئی تھی وہ آپ کے سامنے آ گئی۔ یوں چلیے گا اب آگے۔ اور یہ ہم ان پھولوں کو یکجا کرتے چلے جائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ آخر میں جا کر یہ کتنا حسین اور مزین گلدستہ بنتا ہے۔

اب اگلے نبی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور یہ قوم ہے قومِ عاد۔ ان کی طرف حضرت ھودؑ مبعوث ہوئے۔ جس طرح الدین ایک ہی چلا آ رہا ہے' آپ دیکھیں گے کہ ان انبیاء کی جو دعوت ہے' اصولی طور پر وہ بھی مشترک چلی آ رہی ہے' وہی الفاظ آئیں گے جو پہلے نبی کے ضمن میں آئے۔ کہا کہ **كَذَّبَتْ عَادُنِ الْمُرْسَلِيْنَ** [1] (26:123)۔ یہی الفاظ حضرتِ نوحؑ کے متعلق تھے۔ قومِ عاد نے بھی خدا کے بھیجے ہوئے پیغام رسانوں کی تکذیب کی۔ **اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلاَ تَتَّقُوْنَ** (26:124) جب ان کے بھائی بندوں میں سے ھود علیہ السلام رسول آیا۔ اس نے ان سے کہا کہ کیا تم اپنی غلط روش کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟

ہر رسول کی زندگی دوسروں کے لیے شہادت ہوتی تھی

عزیزانِ من! رسول باہر سے نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے ہوتا تھا اور مؤثر بھی اس کی دعوت ہو سکتی ہے جو انہی کے لوگوں کے اندر سے ہو۔ اس لیے کہ ایک بڑی چیز اس میں یہ بھی ہوتی ہے کہ رسول اپنی زندگی کو بھی اپنے دعوے کی صداقت کی شہادت میں پیش کرتا ہے۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس نے ان کے اندر زندگی بسر کی ہو۔ باہر سے آیا ہوا کیا کہہ سکتا ہے کہ دیکھا میں نے اپنی زندگی کیسے گزاری ہے۔ وہ کہیں گے ہم تو جانتے ہی نہیں ہیں' تم تو یہاں باہر سے آئے ہو۔ تو رسول انہی میں سے ہوتا ہے۔ حضرت ھودؑ نے یہ کہا کہ کیا تم زندگی کے راستے پر خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنا چاہتے ہو یا نہیں؟ تو کون کہے گا کہ نہیں۔ اب آگے بات آئی کہ یہ گھاٹیاں ہیں کیا؟ وہ ان گھاٹیوں کو خطرناک سمجھتے نہیں۔ رسول کو نذیر اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ نہیں' بابا! ادھر نہ چلو آگے کنواں ہے۔ کہا کہ **اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ** (26:125) میں خدا کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں اور تمہارے لیے امن کا پیغام لایا ہوں۔ اگر تم نے میری بات سنی تو خطرات سے بچ جاؤ گے۔ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ** (26:126)۔ یہ وہی بات ہے جو حضرتِ نوح علیہ السلام کے ضمن میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان آیات میں وہی الفاظ ہیں جو ابھی ابھی پہلے گزری ہیں۔ ''قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو لیکن انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک نظام کی حیثیت سے کرو اور اس نظام کا سب

---

[1] اسی طرح قومِ عاد نے بھی ہمارے پیغامبروں کی تکذیب کی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 847)۔

سے پہلا مرکز میں ہوں کیونکہ میں ہی دعوت دے رہا ہوں اور میں ہی اسے متشکل کر رہا ہوں۔ اس لیے احکامِ خداوندی کی جو اطاعت ہے یہ میرے Through (ذریعہ) ہے' اس نظام کے مرکز کی حیثیت سے میں تمہیں یہ باتیں کہہ رہا ہوں'۔

دین کے نفاذ کے لیے مرکزِ ملت کی اہمیت اور اس کا کردار

یہ ہے نظام کی عملی شکل: ایک امت' ایک سربراہ' ایک مرکزی اتھارٹی' جسے میں مرکزِ ملت کہتا ہوں اور جس کے خلاف اتنی دہائی مچائی جاتی ہے۔ ایک مرکز' ایک سنٹرل اتھارٹی' وہ ایک جماعت ہو اور ایک Cabinet (کابینہ) یا ایک مجلسِ مشاورت ہو' جیسے آپ کا جی چاہے مقرر کر لیجیے اسے سنٹرل اتھارٹی کہا جائے گا۔ یہ سنٹرل اتھارٹی خدا کے احکام کی اطاعت کرائے گی۔ یہ ہے نظامِ خداوندی' اسے کہتے ہیں الدین۔

دین میں اس خدمت گزاری کا صلہ یا اس کے اجر کی نوعیت

اگلی بات یہی ہے جو ہر نبی کہتا ہے کہ **وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ** (26:127) اس کے صلے میں مَیں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگ رہا۔ یہ بھی دین کے نظام میں مضمر ہے کہ اس کے صلے میں اپنی ذات کے لیے قوم سے کوئی معاوضہ نہ مانگے۔ لیکن جیسا میں نے کہا تھا کہ دلِ بے مدعا تو شاعری ہے' اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ اس کا خیال پیدا نہ ہو۔ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (26:127) یہ جس نظام کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہاں ہوں اس کا صلہ' اس کا اجر' وہاں سے ملے گا' تم سے میں کچھ نہیں مانگتا۔ میں چونکہ ان آیات کی تشریح پہلے حضرتِ نوح علیہ السلام کی داستان کے ضمن میں کر چکا ہوں' اس لیے اب زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان کا مفہوم پیش کرتے ہوئے آگے چلا جاؤں گا۔

دین متشکل کرنے کے برعکس چٹانوں پر اپنی اپنی تحریروں کی نمود کا لا حاصل نتیجہ

اب قرآن آگے بتایا ہے کہ قوم کی کیفیت کیا ہے؟ ذہن میں یہ آتا ہے کہ اس زمانے میں یعنی یہ اگر یہیں سے آج کل کی تاریخ یہاں تک پہنچی ہے' اسے دیکھیں تو کم از کم کوئی پانچ چھ ہزار سال پہلے کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن دور وہ نہیں ہے جس میں ابھی لوگ غاروں میں رہتے تھے یا درختوں پہ زندگی بسر کرتے تھے' اس دور سے آگے نکل آئے تھے۔ انسان تمدنی دور میں پہنچ چکا تھا۔ اب اس قوم کے متعلق پہلی چیز یہ کہی اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم تمدنی سطح پر کتنی اونچی ہو چکی تھی۔ یہ جو Memorial یا یادگاریں قائم کی جاتی ہیں یہ ساری تاریخ میں ہمیں قدرِ مشترک نظر آتی ہیں۔ مختلف سلطنتیں' مختلف حکومتیں' اپنی اپنی یادگاریں زندۂ جاوید رہنے کے لیے' نظام قائم کرنے کے لیے' قائم کرتی ہیں۔ Memorial (یادگار) تو اسی لیے Memory (یاد) سے ہے کہ

ان کی Memory (یاد) قائم رہے۔ مرنے کے بعد پھر انسان مرنا نہیں چاہتا حالانکہ زندۂ جاوید یا حیاتِ جاوید حاصل کرنے کے لیے ذرائع اور بھی ہیں لیکن بہر حال ان قوموں کے سامنے ہر چیز مادی تھی اس لیے آپ جتنے بھی Memorial (یادگاریں) دیکھیں گے، وہ مادی بنے ہوئے ہوتے ہیں: بڑے بڑے ستون، بڑی بڑی یادگاریں، چٹانوں پر کندہ کیے ہوئے احکام۔ یہ اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ چھ ہزار یا پانچ ہزار سال پیشتر دینِ خداوندی کیا دعوت دیتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ **اَتَبۡنُوۡنَ بِکُلِّ رِیۡعٍ اٰیَۃً تَعۡبَثُوۡنَ** (26:128) بلند چٹانوں کے اوپر یادگاریں قائم کرتے ہو، یہ یادگاریں ایسی ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ یعنی اگر ایک پہاڑی کے اوپر لاش کھڑی کر دی جائے تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ تم نے اس جذبے کی تسکین تو کر لی کہ ہماری جان کی یادگار یہ لوہے کی لاش ہمیشہ رہے گی۔ انسانیت کو اس سے کیا حاصل ہوا؟ یہ پانچ چھ ہزار سال پہلے بات کہی جا رہی ہے کہ بابا! میں یادگار قائم کرنے کے خلاف نہیں ہوں، یادگار وہ قائم کرو جو نوعِ انسانی کے لیے مفید ہو۔ قرآن نے اصول دیا ہے کہ **مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ** (13:17) یاد رکھو! بقا اسی عمل کو، اسی نظریہ کو، اسی بات کو ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہے۔

حیاتِ جاوید کے حصول کا راز نوعِ انسانی کی خاطر زندہ رہنے میں ہے

بقا چاہتے ہو، چاہتے ہو کہ دنیا میں، رہتی دنیا تک تمہارا نام روشن رہے۔ یعنی تم **فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ** (13:17) ہونا چاہتے ہو تو آؤ میں بتاؤں تمہیں کہ یہ لاشیں کھڑی کرنے، یہ ستون بنا دینے سے بقا نصیب نہیں ہو جاتی۔ یہ **وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ** (13:17) سے ہوتی ہے یعنی اس سے، تمہارے اس کام سے انسانیت کو فائدہ کتنا پہنچا۔ ہسپتال بنا کے، تعلیم گاہیں قائم کر کے، بے کسوں اور لاوارثوں کے لیے پناہ گاہیں بنا کے، نوعِ انسانی کی منفعت کی چیزیں بنا کے، یادگاریں قائم کرنی ہیں تو یوں یادگاریں قائم کرو۔ یوں یادگاریں کہ اپنے جذبات کی تسکین ہو جائے، اتنا روپیہ اس قوم کا اس کے اوپر صرف کر دیتے ہو اور اس سے فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس سے فائدہ کیا ہوگا اس سے تو قوم کو اس کی مرمت اور نگہداشت میں مستقل طور پر زنگ لگ جاتا ہے۔

سنگ و خشت کے ان مضبوط قلعوں کے اندر تو انسانی ذات دفن ہو کر رہ جاتی ہے

اگلی چیز یہ آئی کہ یہ جو یادگاریں ہیں، الدین ان کے خلاف نہیں ہے بلکہ یادگار وہ ہو جو **مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ** ہو یعنی جو نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخش ہو۔ اگر کوئی عمارت یا یادگار بنانی ہے تو ایسی بناؤ جو کسی کے کام آئے **وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ** (26:129) اور تم طرح طرح کے ساز و سامان اور اسلحہ وغیرہ بناتے ہو، اس لیے نہیں کہ اسی سے ظلم کی روک تھام کرو۔

تم بڑے بڑے قلعے بناتے ہو' بڑے بڑے مضبوط محلات بناتے ہو۔ کاہے کے لیے؟ تاکہ تمہیں حیاتِ دوام حاصل ہو جائے۔ کہا کہ بڑے بڑے مضبوط قلعوں اور محلوں سے حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قلعے اور محل تو باقی رہ جائیں لیکن تمہیں تو حیاتِ دوام حاصل نہیں ہوسکتی۔ فرد کو حیاتِ دوام حسنِ عمل سے حاصل ہوگی۔ قوم کو حیاتِ دوام اس سے حاصل ہوگی کہ وہ انسانوں کی منفعت کے لیے کیا کام کرتی ہے۔ کہا کہ اس طرح سے حیاتِ دوام حاصل ہوتی ہے۔ بڑے بڑے محلات اور قلعے بنانے سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہے کہ اپنے خطۂ زمین کی حفاظت تو نہایت ضروری ہے لیکن حیاتِ دوام حسنِ عمل سے ہوگی۔ یہ ہے **فَاتَّقُوا اللّٰـهَ وَاَطِيْعُوْنِ** [1] (26:131)۔ میں نے دانستہ درمیان کی آیت [2] کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس سے یہ ہے کہ یہ ان کے خلاف الزام یا جرم عائد ہو رہا ہے۔ میں فردِ جرم بعد میں عرض کروں گا۔ یہاں (26:131) میں کہا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس نظام کے تابع آ جاؤ جس کا سربراہ میں ہوں۔ بتایا یہ کہ **وَاتَّقُوا الَّذِيْۤ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ** (26:132-134) اس زمانے کی معیشت زرعی تھی' جسے Agriculture Economy کہتے ہیں۔ کہا کہ وسیع و عریض زمین' بڑی زرخیز' سونا اگلنے والی' آبپاشی کے یہ چشمے' باغات' پھل' اجناس' چشمے' اتنا کچھ' پھر تمہارے قبیلے کے افراد کی تعداد' یہ افرادی قوت بھی بڑی چیز ہے' یہ تمام چیزیں تمہیں میسر ہیں۔ یہ انعاماتِ خداوندی ہیں۔ ایک زرعی معیشت کے فروغ کے لیے یہی چیزیں ہیں یہاں ان تمام کا تذکرہ کیا۔

ظہورِ اسلام سے قبل قومیں بصیرت اور تمدن کے لحاظ سے بھی بڑی ثمر بار رہی تھیں

اس کے علاوہ میں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تقریباً پانچ چھ ہزار سال پہلے کی بات ہو رہی ہے۔ ہمارے ذہن میں تو ایسا آتا ہے کہ اس زمانے میں وہ لوگ بہت وحشی سے ہوتے تھے' جنگلوں میں رہا کرتے تھے' پتوں سے اپنے بدن ڈھانپ لیتے تھے۔ اب آپ کو تاریخ کو Re-write (ازسرنوتحریر) کرنا پڑے گا اور اب Re-write (ازسرنوتحریر) ہو رہی ہے۔ تاریخ پر جو ریسرچز (تحقیقات) ہو رہی ہیں' ان میں بتایا جا رہا ہے کہ یہ غلط ہے بلکہ وہ تو ان سے پہلے بڑے متمدن زمانے تھے۔ اب قرآن کی

---

[1] (یہ روش بڑی غلط ہے' اسے چھوڑ دو' اور) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے کے لیے اس نظام کی اطاعت کرو جو میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔848)۔

[2] وہ آیت ہے: وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (26:130) (تم یہ اس لیے کرتے ہو کہ) کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ واقتدار اور جور واستبداد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔848)۔

شہادت ملاحظہ فرمائیے۔ایک جگہ تو قرآن نے صرف ایک اشارہ کیا ہے۔ یہاں اس نے کہا ہے کہ **وَ کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ** (29:38) یہ کوئی جاہل قسم کی قوم نہیں تھی' بلکہ مستبصرین تھی یعنی آنکھیں رکھتی تھی' دیدہ ور تھی' سب چیز دیکھتے بھالتے تھے' ان کو بصیرت حاصل تھی۔ایک لفظ میں یہ بات کہہ دی اور اس کی تفصیل دوسری جگہ دی اور وہاں یہ نظر آتا ہے کہ جسے آپ آج کل تمدنی' معاشرتی' Scientific Knowledge (سائنسی علم) کہتے ہیں' ان میں بھی یہ قومیں اتنی آگے بڑھی ہوئی تھیں۔ کہا یہ کہ ان قوموں کی کیفیت یہ تھی۔قرآن کے جو مخاطبینِ اول تھے ان کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ **وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّکَّنّٰکُمْ فِیْهِ** (46:26) جتنا تمکن انہیں حاصل تھا وہ تمکن تو تمہیں بھی حاصل نہیں ہے۔یعنی دونوں کے موازنے میں ظہورِ اسلام کے دور میں جو وہ قوم تھی' اس کا مقابلہ کر کے کہا ہے کہ جتنا تمکن انہیں حاصل تھا' وہ تمہیں بھی حاصل نہیں ہے۔

فطرت کے علوم کے حصول میں بصارت' سماعت اور افئدہ کی اہمیت

وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے انہیں تمکن حاصل تھا؟ **لَھُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً** (46:26)۔قرآن کریم نے' فطرت کے علوم اور قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے جس علم کی تاکید کی ہے' اس علم کے متعلق یہ جو انسان کے حواس (Senses) ہیں' یہ جسے آپ Perceptual Knowledge (علم بالادراک) کہتے ہیں' یہ جو Sense Perception (حواسی ادراک) ہیں' قرآن نے اس کے لیے تین الفاظ استعمال کیے ہیں اور ان میں بڑی جامعیت ہے۔ان میں دو سماعت اور بصارت ہیں اور تیسرا افئدہ ہے۔ اگرچہ ہم تو پانچ حواس کہتے ہیں لیکن اگر جامع طور پر یا مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بصارت اور سماعت اور افدہ ہیں۔ کہا کہ یہ تمہاری آنکھیں' کان یا تمہارے یہ جو Senses (حواس) ہیں یہ تو کچھ Data (معطیات) فراہم کرتے ہیں۔مثلاً وہاں سے مجھے بندوق کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ وہ تو آواز آتی ہے۔کان تو نہیں بتا سکتا کہ یہ آواز کیا چیز ہے؟ بلکہ اندر ایک قوت' ایک صلاحیت ہوتی ہے' جو کہتی ہے کہ یہ بندوق کی آواز تھی۔ اس کے بعد ایک چیخ ابھرتی ہے۔ چیخنے میں بھی ایک آواز ہوتی ہے۔ آپ کے اندر سے آواز آتی ہے کہ یہ تو میرے دوست کی آواز ہے۔یعنی ایک چیز اندر ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہ جو قوت ہے اس کے لیے ابھی تک کوئی Comprehensive (جامع) لفظ کسی زبان میں نہیں ہے۔ اسے Mind کہا جاتا ہے' دماغ کہا جاتا ہے' ذہن کہا جاتا ہے' دل کہا جاتا ہے۔ یہ اندر کوئی چیز ہے جو Sense (حواس) کو کچھ Data (مواد) فراہم کرتی ہے' اس پہ وہ ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یہ جو نتیجے پر پہنچنے والی اندر صلاحیت ہے' قرآن میں اس کو افئدہ کہا ہے۔ یہاں میں بس اتنا ہی کہوں گا اور جب میں اس نظام پہ آؤں گا تو وہاں تشریح کروں گا کہ فواد اور قلب میں فرق کیا ہے؟ کہا کہ وہ قوم ایسی تھی۔انہیں تم سے زیادہ تمکن حاصل تھا' ان کو Perceptual Knowledge (ادراکی علم) بہت حاصل تھا۔ اور اسی بنا پہ کہا کہ بڑے بڑے قلعے

بناتے تھے، بڑے بڑے مضبوط محل بناتے تھے، بڑی عجیب وغریب یادگاریں قائم کرتے تھے۔ تو وہ لوگ امورِ فطرت کے اندر اتنے بڑھے ہوئے تھے۔ یہ تو وہ قوم ہے۔

ترقی یافتہ قوموں کی سیاسی اور معاشرتی جان لیوا زندگی کے خدوخال

اب اس کے بعد اس قوم کی طرف یہ رسول [1] آتا ہے۔ انہیں کہتا ہے کہ تمہارا نظام باطل کا نظام ہے۔ اس آیت کے اگلے الفاظ میں ذرا ٹھہر کر بیان کروں گا، آپ اسے نوٹ کر لیجیے گا اور کوئی نشانی رکھ لیجیے گا کہ پھر اسے سامنے لے آؤں۔ اس قوم کا نقشہ کھینچا ہے کہ ان کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی حالت کیا تھی؟ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی اچھی سے اچھی جو ترقی یافتہ قوم (Developed Nation) ہے تو اس کے متعلق بھی آپ یہی کچھ کہیں گے۔ اب قرآن ان کے سیاسی اور معاشرتی نظام کی طرف، انسانیت کی طرف آتا ہے۔ کہا کہ ان کی کیفیت یہ تھی۔ اب آئی ہے وہ آیت (26:130) جو میں نے درمیان میں چھوڑی تھی۔ کہا کہ تمہارا سیاسی نظام، حکومت کا نظام یہ ہے کہ وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ (26:130) جو کمزور تمہارے ہاتھ آجاتا ہے، اس کی ہڈیاں توڑ کے رکھ دیتے ہو۔ چار لفظوں میں جرم عائد کیا۔ یہ دولت، یہ ثروت، یہ خوشحالی، یہ فارغ البالی، یہ نعمائے خداوندی اس لیے دی تھیں کہ نوعِ انسان کی منفعت کے کام آئیں جبکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ ان کی بنا پہ جو قوت تمہیں حاصل ہوتی ہے، وہ قوت تم اس لیے استعمال کرتے ہو کہ جو کمزور تمہارے ہتھے چڑھ جاتا ہے اس کی ہڈیاں توڑ دیتے ہو۔ یہ قرآن مجید کی اس آیت کا ترجمہ ہے کہ ہڈیاں توڑ دیتے ہو۔ ہڈی ٹوٹنے پر جبائر (Splints) لگائی جاتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ تم اس میں پھریوں جکڑ کے انہیں باندھ دیتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس کو جبر کہتے ہیں۔

---

[1] آپ حضرت ہود علیہ السلام ہیں۔ یوں سمجھیے کہ قوم نوح علیہ السلام کی بربادی کے بعد جب یہ علاقے دوبارہ آباد ہوئے تو بنی سام کی پہلی ترقی اسی قوم عاد سے ہوئی ہے۔ یہی قوم عاد ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ ان کا مقام بعثت وتبلیغ احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف صحرا کو کہتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ طول وعریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کا علاقہ تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوہِ تمثال ریت کے ٹیلے، خوف ودہشت کے بھیانک عفاریت کی طرح سر اٹھائے کھڑے رہتے ہیں لیکن جب وہاں آندھی کا طوفان آتا ہے تو یہ ٹیلے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جا مسلط ہوتے ہیں اور جو کچھ وہاں موجود ہو اسے اس طرح نیچے دبا لیتے ہیں کہ پھر محکمۂ آثارِ قدیمہ والے ہی ان کا سراغ لگائیں تو کچھ پتہ چلے۔ کیا معلوم ان ٹیلوں کے نیچے کتنی آبادیاں قبرستانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ کم از کم ایک کا ذکر تو سن لیجیے یہ شوریدہ بخت قوم وہ ہے جس نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کی اور پھر جس کے فقط افسانے دنیا میں باقی رہ گئے۔ الا ان کے جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچا لیے گئے اور جو پھر عادِ ثانیہ کہلائے کیونکہ عادِ اولیٰ وہ تھے جنہیں ان کی اپنی غلط روشِ زندگی کی وجہ سے تباہ وبرباد کر دیا گیا (پرویزؒ: (1994)۔ جوئے نور، لاہور: طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ص ص۔ 44 تا 45)۔

قرآنی مفہوم کے اعتبار سے لفظ جبر کے دو پہلو ہیں

کیوں نہ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر وہ جبائر (Splints) ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنے کے لیے لگائی جائیں تو وہی جو جبر ہے، وہ اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اسی لیے خدا کو ''الجبار'' کہا ہے یعنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا جوڑنے والا۔ اور اسی سے اگر کسی کی اچھی بھلی ہڈیاں توڑ دی جائیں تو اسے بھی ''جبار'' ہی کہا جاتا ہے۔ ایک بڑی قوت ہے کہ جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں استعمال ہوتی ہے اور وہی قوت ہے جو اچھی بھلی ہڈی کو توڑنے میں استعمال ہوتی ہے۔ قوت مذموم نہیں ہے بلکہ قوت کا استعمال مذموم ہے۔ وہ افندہ فیصلہ کرتا ہے کہ حمد و ستائش ہے یا مذمت کے قابل ہے۔ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ یہ کچھ ملا اور اس سے تمہیں کچھ قوت حاصل ہوئی۔ اس قوت کو تم استعمال کرتے ہو کہ جو کمزور تمہارے ہتھے چڑھ جاتا ہے تم ان کو کسکر رکھ دیتے ہو، ان کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے ہو۔ اب یہ چیز آئی کہ باطل کے نظام میں جو قوت حاصل ہو تو وہ پھر غریبوں، کمزوروں، ناتوانوں، بے کسوں، بے بسوں کی ہڈیاں توڑنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ تو ہو گیا حکمران طبقہ۔

جبر و استبداد کے اس نظام میں قوم کا فریضہ اور اس کی کوتاہی

یہ قرآن ہے، عزیزانِ من! وہ باقی قوم کو بھی نہیں بخشتا۔ بڑے نفیس پیرائے میں بات آئی ہے اور پھر اس تصریف آیات کو یاد رکھیے کہ ایک ہی مقام پہ، ایک چیز کو نہیں لینا بلکہ اس کے بارے میں مختلف مقامات میں جو کچھ کہا گیا ہے ان سب کو یکجا کیجیے۔ یہاں تو ان کے حکمران طبقے سے کہا کہ تمہارا سیاسی نظام یا حکومت کا نظام یہ ہے۔ باقی رہی قوم تو اب دیکھیے کہ کتنی اہم بات قرآن کہہ گیا ہے۔ قوم اگر صحیح آنکھیں رکھتی ہے اور صحیح راستے پہ ہے تو وہ اس قسم کا غلط نظام قائم کرنے والے کو الگ کر کے رکھ دے گی۔ قرآن کی، اس ذمہ داری سے وہ چشم پوشی نہیں کرتی۔ دیکھیے وہ قوم کو کیا مجرم قرار دیتا ہے۔ (26:130,11:59) ان دو آیتوں کو ملایئے، حکمران طبقہ **وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ** (26:130) ہے۔ ان کی قوم کی کیفیت یہ ہے **وَ اتَّبَعُوٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ** (11:59) وہ جو ہڈیاں توڑنے والا حکمران طبقہ تھا، یہ ساری قوم اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی، کوشش ہی نہیں کرتی تھی کہ آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ روک لے کہ کیا کر رہے ہو تم۔ تو قوم اس جرم میں برابر کی شریک ہوتی ہے:

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو ❶

---

❶ مرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوانِ غالب، جہانگیر بک ڈپو لاہور، 2002، ص۔ 124۔

اور یہاں سیاست کا ایک اہم نکتہ آ گیا کہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اس قسم کا طبقہ اپنے ہاتھ میں حکومت کی باگ لے لے جو اس طرح کا ظلم کرے' قوم کا یہ حق ہے کہ ان کو روک دے۔ قوم کا جرم قرآن یہ قرار دے رہا ہے کیونکہ تباہ پوری قوم ہو رہی ہے۔ کہا کہ برسرِ اقتدار کا یہ جرم تھا اور تمہاری کیفیت یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ تم ان کو روکتے' تم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ ساری ہی قوم اس جرم کے اندر شریک ہوگئی۔ اس کے بعد حضرتِ ہود علیہ السلام نے کہا کہ **اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ** (26:135) یاد رکھو! میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ کس قسم کی تباہی تم پر آنے والی ہے تو گویا جہاں یہ سیاسی نظام ہوں کہ دولت کی فراوانیاں ہوں' علم وحکمت کی ترقیاں ہوں' یہ سب کچھ حاصل ہو لیکن نظام وہ ہو جو کہیں کمزور ہتھے چڑ جائے تو اس کی ہڈیاں توڑ دیں اور قوم ساری کی ساری ان کے ساتھ چلی جا رہی ہوتی ہے تو اس نظام کے لیے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ کس قسم کی تباہی تم پر آنے والی ہے۔ **قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَکُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِیۡنَ** ❷ (26:136)۔ تباہی کے متعلق اسی ضمن میں یہ بات ذہن میں آ گئی کہ یہ جو تباہی تھی' وہ کس قسم کی کہی گئی تھی۔

قوموں کی سب سے بڑی تباہی ان کا محکوم ہو جانا ہے

پچھلی دفعہ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم جسے عذاب کہتا ہے' اس عذاب کی انتہائی شکل یہ ہوتی ہے کہ **وَ یَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ** (11:57) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آ جائے گی' حکومت اس کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ یہ سب سے بڑا عذاب ہے' سب سے بڑی تباہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قوم زمین میں غرق ہو جاتی ہے' تباہ ہو جاتی ہے بلکہ یہ محکوم ہو جاتی ہے اور حکمران کوئی دوسری قوم آ جاتی ہے۔ جو کچھ یہ غریبوں سے' کمزوروں سے کرتے تھے تو وہ ان کے ساتھ یہ کچھ کرتی ہے۔ انہوں نے ان سے یہ کہا کہ تمہارے اس غلط نظام سے آنے والے عذاب کو میں دیکھ رہا ہوں کہ کیسی تباہیاں تم پر آنے والی ہیں۔ **قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَکُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِیۡنَ ۙ اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِیۡنَ** (26:136,137) انہوں نے کہا جانے بھی دو' روز آ کے وعظ کرتا رہتا ہے' روز آ کے نصیحتیں کرتا رہتا ہے' تمہاری ان باتوں سے جان تنگ آ گئی ہے کہ مر جاؤ گے' تباہ ہو جاؤ گے۔ باطل کے نظام والا ہر واعظ سے تنگ آتا ہے' ہر نصیحت کرنے والے سے تنگ آتا ہے' وہ زبانیں کاٹ لیتا ہے۔ یہ جو

---

❷ (انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور نہایت طنز وحقارت سے) کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے تمہارا وعظ ونصیحت کرنا یا نہ کرنا' برابر ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔848)۔

کچھ تم کہہ رہے ہو کیا یہ کوئی نئی بات ہے' ہم پرانے زمانے کی کہانیاں سب کچھ سنا کرتے تھے اور تم بھی یہی کچھ کہہ رہے ہو۔ آج بھی یہی کچھ کہا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے یہ تباہ ہو گئے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر ہی نہیں کی ہوگی۔ **وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ** (26:138) ایسے لوگوں کی کچھ باتیں سنا رہے ہو' ٹھیک ہے ان کی تباہی آئی ہوگی' ہماری نہیں آ سکتی' ہم نے بڑے انتظامات کر رکھے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ تباہی ان مقامات سے آیا کرتی ہے جو **مِنۡ حَيۡثُ لَا يَشۡعُرُوۡنَ** (16:26) تمہارے ذہن میں نہیں ہوتے۔ **فَكَذَّبُوۡهُ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ** (26:139,140) انہوں نے ایک نہ مانی۔ اپنی غلط روش پہ چلتے گئے۔ بالآخر تباہی آ گئی۔ اس قوم کی جگہ دوسری قوم نے لے لی۔ اس دنیا کے اندر ذلت اور رسوائیاں ان کے نصیب میں آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ خدا کا قانونِ مکافات کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ لیکن وہ قوت نہیں جو ہڈیاں کچلنے والی ہے' بلکہ حکیم ہے' حکمت والی ہے' Reason پہ' Rationality پہ وہ ان چیزوں کو کرتا ہے۔ اب (46:26) کا باقی حصہ [1] سامنے لایئے۔

اہلِ یورپ کی حالتِ زار

عجیب بات ہے' عزیزانِ من! آج کی ان یورپ کی قوموں کو آپ دیکھیے۔ ہم تو شاید اعداد شمار میں ہی نہیں ہیں وہ قومیں جو اس قدر علم و فضل میں' علوم طبعی میں' حکمت کے علوم میں' اتنی اونچی بڑھ گئی ہیں کہ وہ چاند اور مریخ تک جا رہی ہیں لیکن آنے والی تباہی کے ہاتھوں آج اس بری طرح سے چیخ رہے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ سنیے! قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ **وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَةً** (46:26) انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع' سماعت' بصارت اور قلب' حاصل تھے۔ اس قوم کو قوتیں حاصل تھیں' صلاحیتیں حاصل تھیں' یہ بہت آگے تھیں۔ لیکن **فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (46:26) جب انہوں نے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی مخالفت کی تو ان کی سمع' بصر' فواد (Intellect)' ان کی کوئی بھی قوت' ان کے کسی کام نہ آ سکی۔ وہ تمام قوتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ساری کی ساری چیزیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ خالص عقل اور

---

[1] اس آیت کا باقی حصہ یہ ہے: وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَةً فَمَاۤ اَغۡنٰى عَنۡهُمۡ سَمۡعُهُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُهُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ اِذۡ كَانُوۡا يَجۡحَدُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (46:26)

Intellect انسان کو اتنا نہیں بچا سکتی۔ یہ انسان کا صحیح نظام ہے جو تباہیوں سے بچا سکتا ہے اسی طرح **وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ** (46:26) وہ جس انجام کا مذاق اڑایا کرتے تھے یوں ان کے چاروں طرف مسلط ہو گیا کہ وہاں سے نکلنے کا پھر راستہ نہیں تھا۔

تنہا فطرت کی قوتوں پر کنٹرول کا ماحصل قوموں کی ہلاکت کا مداوا نہیں کر سکتا

یہ قومِ عاد کی داستان تھی۔ آیت 140 تک ہم آ گئے۔ اس کے بعد اگلی قوم قومِ ثمود آتی ہے جن کی طرف حضرتِ صالح علیہ السلام آئے تھے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ آج دو انبیاءؑ کے قصے ہمارے سامنے آئے اور دو قومیں سامنے آئیں۔ حضرتِ نوح علیہ السلام نے یہ پیغام دیا تھا کہ قومیت کا معیار خون کا نظام نہیں ہے' یہ مساواتِ انسانیہ کے خلاف ہے۔ اس نظام میں معیارِ تکریم' حسنِ عمل ہے۔ یہ دو چیزیں حضرت نوحؑ کے متعلق آئیں۔ حضرتِ ہودؑ قومِ عاد کی طرف آئے۔ کہا کہ Intellectually (ذہانت و فطانت سے) کتنے ہی آگے چلے جاؤ' فطرت کی قوتیں کتنی ہی تمہارے قابو میں کیوں نہ آ جائیں لیکن اگر تمہارا نظام نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے نہیں ہے بلکہ کمزوروں کی ہڈیوں کو توڑنے اور کچلنے کے لیے ہے' تو یاد رکھیے' یہ تمہارے ہاں کی Intellcual (ذہنی و عقلی) ترقیاں' یہ Scientific Progresses (سائنسی ترقیاں)' یہ فطرت کی قوتوں کے اوپر تمہارا اقتدار' تمہیں ہلاکت سے نہیں بچا سکے گا۔ نظام وہی باقی رہ سکتا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہو۔ الدین یا نظامِ خداوندی کا دوسرا گوشہ ہمارے سامنے یہ آیا۔ الدین آہستہ آہستہ ایک چیز کے ساتھ ساتھ بنتا جا رہا ہے۔

عزیزانِ من! اب آگے چلیں گے تو ہم حضرتِ صالح علیہ السلام یا قومِ ثمود کی طرف آئیں گے۔ انہوں نے دین کا جو گوشہ پیش کیا تھا وہ کیا ہے' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

بارھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 141 تا 159)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزان من! آج جولائی 1978ء کی 7 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 141 سے ہو رہا ہے: (26:141)۔

سابقہ درس میں دین سے متعلق ایک اہم عمودی بلکہ بنیادی نکتہ احباب کے سامنے آیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان احباب کے لیے جو شاید اُس درس میں نہ ہوں، اسے دہرا دیا کروں۔ یہ بڑی اہم بنیادی چیز ہے کہ قرآنِ کریم نے انبیائے سابقہؑ اور اقوام گزشتہ کی سرگزشتیں بیان کی ہیں۔ یہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی جامع اور بنیادی چیز ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ الدین حضرتِ نوح علیہ السلام سے لے کر آخر تک ایک ہی تھا جو ہر نبی نے آ کر پیش کیا۔ آج ہمیں الدین کی تلاش ہے کہ وہ ہے کیا؟ کہا گیا ہے کہ الدین ہر نبی نے ایک ہی پیش کیا۔ اب اس کی صورت کچھ ایسے نظر آتی ہے کہ ایک نبی کے زمانہ میں انسانوں کے خودساختہ نظامِ زندگی کے جو ایسے تخریبی گوشے ہوتے تھے، جو بڑے نمایاں طور پر اس زمانے میں انسانیت کے لیے انتہائی غلامی اور مایوسی کا باعث بن جاتے تھے، وہ ان گوشوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تھے اور ان کی جگہ دین کے وہ اصل اور صحیح گوشے سامنے لاتے تھے۔ وہ گوشے (Aspects) پورے کا پورا دین نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ ساری تعلیم میں وہ انبیائے کرام وہ بھی لاتے ہوں۔ قرآنِ کریم ان گوشوں کو سامنے لاتا ہے جو اس دور میں نمایاں طور پر وجہ تکریمِ انسانیت بنتے تھے۔

حضرتِ نوح علیہ السلام کی پیش کردہ تعلیم کے دو اہم گوشے

حضرتِ نوح علیہ السلام آئے تو نظر یہ آتا ہے کہ اس دور میں قومیت کا مدار خون یا رنگ یا وطن کا اشتراک تھا۔ قرآنِ کریم اس کا جو نازک پہلو تھا وہ سامنے لایا اور حضرتِ نوحؑ سے کہا کہ تم تو یہ کہہ رہے ہو کہ یہ عام لوگ رنگ اور خون اور نسل میں جن کا اشتراک ہے وہ مل کر ایک قوم بنتے ہیں حالانکہ باپ اور بیٹا بھی مل کر قوم نہیں بنتے تاوقتیکہ وہ آئیڈیالوجی میں مشترک نہ ہوں۔ آپؑ کا بیٹا اور آپؑ ایک قوم کے فرد نہیں ہیں۔ قرآن نے کہہ دیا کہ یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہیں۔ یہ کتنی بنیادی چیز ہے کہ دین تو قیامت تک کے لیے غیر متبدل اصولوں کا نام ہے۔ وہ ایسے ہی رہتے ہیں، ایک قوم کے افراد نہیں ہیں۔ آج بھی آپ دیکھیے جب آپ کے ہاں وطنیت اور قومیت کا سوال اوپر آ گیا تو دین کا وہ گوشہ ہمیں خدائی رہنمائی دے دیتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ حضرتِ نوحؑ کے زمانے میں نظر آتا ہے کہ وہاں طبقاتی کشمکش تھی۔ یہ جو بڑے بڑے دولت مند سردار

تھے، جن کے گھر بھرے ہوئے ہوتے تھے، انہوں نے اعتراض یہ کیا تھا کہ جو کچھ تم کہتے ہو بڑی سچی بات ہے لیکن کیا ایسا ہوگا کہ یہ کمی، یہ کمین، یہ محنت کش، یہ ترکھان، یہ بڑھئی، یہ کنجڑے اور ہم دونوں اکٹھے ایک مساوات کی حیثیت سے ایک جگہ بیٹھ جائیں گے، ہم میں کوئی تمیز نہیں رہے گی، کوئی اونچ نیچ نہیں رہے گی؟ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم سب آ جاتے ہیں، انہیں نکال دو۔ ان کے ہاں دولت وجہ تکریم تھی۔ اور اس کے جواب میں آپؑ نے کہا کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کیا کام کرتے ہیں، خدا کے نزدیک تو اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) ہم دیکھتے یہ ہیں کہ جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہے، وہ سب سے زیادہ معزز ہے۔ اس لیے اگر تم آنے کی یہ شرط عائد کرتے ہو، شکریہ آپ کا، ہزار بار نہ آیئے، میں تمہاری خاطر انہیں نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہ ان کی تعلیم کا دوسرا گوشہ ہے۔ آج اس دور کے اندر بھی آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کس طرح سے طبقاتی کشمکش کا حل حضرتِ نوح علیہ السلام کی داستان سے پیش کر رہا ہے۔

قومِ عاد میں طبقاتی کشمکش

ان کے بعد قومِ عاد آتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان کے ہاں رزق کی فراوانیاں ہیں، دولت کی افراط ہے، صنعت وحرفت اور علم وفضل میں بہت آگے ہیں، ترقی کا عروج ہے، المختصر ان تمام میں بہت بلند ہیں لیکن سیاسی نظام ایسا ہے کہ جب کسی کمزور پہ ہاتھ ڈالتے تو اس کی ہڈیاں توڑ دیتے ہیں۔ یہ کہا کہ یہ سارا ساز وبراق اللہ نے اس لیے دیا تھا کہ جنہیں یہ میسر نہیں ہے تم ان کی تمام ضروریات پوری کرو۔ اس لیے نہیں کہ چونکہ وہ کمزور رہ گئے ہیں اس لیے ان کی ہڈیاں توڑ دو۔ اب ہوتا یہ ہے کہ پہلے تم انہیں کمزور کر دیتے ہو اور جب وہ محتاج ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی ہڈیاں توڑ دیتے ہو۔ باقی رہی قوم تو اس سے کہا کہ تم کہو گے کہ جی، یہ تو یہ کچھ ہیں اور یہ جو کرتے ہیں ہم تو نہیں کرتے۔ کہا کہ تم ان کو روکتے نہیں ہو، ان کو Follow (پیروی) کرتے ہو، اس لیے اس جرم میں دونوں برابر کے شریک ہو۔ تباہی آئے گی تو سب کی آئے گی۔ سیاست میں تو یہ چیز بتائی کہ جس قدر بھی ملک کی ترقی ہو، اس میں اگر آپ کمزوروں کو برابر کے طاقتور نہیں بناتے تو وہ نظام باطل کا ہے، وہ مٹ کر رہے گا، تباہ ہو کر رہے گا۔ نظامِ خداوندی میں جنت کا نقشہ ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کے اندر جنت میں نعماء گنائے گئے ہیں۔ آج تو شاید کسی مملکت میں اس کا تصور نہ رہا ہو لیکن اس قومِ عاد میں دیکھیے کہ رزق کی افراط ہے، نہریں بہہ رہی ہیں اور ان کی صورت یہ ہے کہ یہ خود بخود جھولیوں میں آ کر گر رہے ہیں، حریر واطلس کے پردے ہیں، چاندی سونے کے برتن ہیں، صوفے قالین باغات انہار اتنا کچھ ہے۔ لیکن یہ

نہیں ہے کہ یہ کسی ایک طبقے کے لیے ہو' یہ سب اہلِ جنت کے لیے یکساں ہے۔ کہا کہ اے قومِ عاد! یہ ہونا چاہیے تمہارا نصب العین حیاب۔

ہر نبی کو قوموں کی طرف سے تکذیب کا سامنا کرنا پڑا

اب اس کے بعد ہمارے سامنے قومِ ثمود آتی ہے۔ یہ دین کا ایک اہم گوشہ سامنے لاتی ہے۔ پہلے تو وہی چار آیات ہیں جو ہر نبی کے قصے کے سلسلے میں قرآنِ کریم نے شروع میں بیان کی ہیں۔قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ نبی ﷺ جن کا تذکرہ خاص طور پہ سامنے آتا ہے' اس سے پہلے بھی انبیائے کرام ان میں سے ہوئے اور **كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ** [1] (26:141) انہوں نے ہر ایک کی تکذیب کی' انہیں جھٹلایا اور آخرالامر **اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:142) ان کے بھائی بندوں میں سے' صالح علیہ السلام نبی ان کی طرف آیا۔قرآن ہمیشہ یہ کہتا ہے کہ وہ نبی انہی میں سے ہوتا تھا۔ اجنبی نہیں ہوتا تھا' اس کی ساری زندگی ان کے سامنے ہوتی تھی۔ اور جیسا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت کے ثبوت میں' جب انہوں نے کہا کہ کوئی معجزہ دکھایئے' کوئی دلیل لایئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ معجزہ تو یہ ہے کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16) میں نے تمہارے اندر اس دعوے سے پہلے ایک عمر بسر کی ہے۔ میری اس عمر پر نگاہ رکھ کر تم ایمانداری سے بتاؤ کہ ایسی عمر ایک سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ہوتی ہے۔ نبی تو دعویٰ نبوت سے پہلی زندگی بھی پیش کرتا ہے۔ اگر وہ باہر سے آیا ہوا ہو تو اس کے Past (ماضی) کے متعلق کسی کو پتہ نہیں لگ سکتا' انسان دھوکا کھا سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن ہمیشہ کہتا ہے کہ انہی کے بھائی بندوں میں سے ایک نبی پیدا ہوا۔ اس نے کہا کہ **اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:142)۔ عربی زبان میں یہ الفاظ خبردار کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ ہوش میں آؤ' مجھے بتاؤ تم نظامِ خداوندی کی تابع چلنا چاہتے ہو یا اپنے ہی خود ساختہ نظام کے تابع؟ اگر بچنا چاہتے ہو تو سن لو کہ **اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ** (26:143) میں اپنی طرف سے یہ نہیں کہتا' میں امن و سلامتی کا خدا کا پیغام دے رہا ہوں اور میری خصوصیت یہ ہے کہ میں تمہیں آنے والے خطرات سے امن میں رکھوں گا۔ کون ہے جو یہ نہیں کہے گا کہ فساد (Anarchy) کے مقابلے میں امن ہو؟ میں امن وسلامتی کی گارنٹی دیتا ہوں' ضمانت دیتا ہوں مگر اس کا ایک طریقہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ طریقہ کیا ہے؟

---

[1] اسی طرح قومِ ثمود نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 849)۔

دین تو ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جبکہ انفرادی نجات کا تصور مذہب کا پیدا کردہ ہے

وہ طریقہ یہ ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ (26:144) تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ انفرادی طور پہ نہیں ہے۔ مذہب انفرادی طور پر خدا کی بھگتی' پوجا' Worship' عبادت' پرستش سکھاتا ہے اور وہ انفرادی نجات ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی نجات کے لیے کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اجتماعی نظام ایک مرکزیت چاہتا ہے' ایک سنٹرل اتھارٹی چاہتا ہے۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس سنٹرل اتھارٹی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ انفرادی طور پہ معاشرہ قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ معاشرہ تو عشر سے ہے جس کے معنی 10 ہیں۔ ایک اکیلا بھی معاشرہ نہیں ہے۔ زیرو (Zero) تو ہوتا ہی کچھ نہیں وہ تو دوسرے اعداد یا عدد سے مل کر ان میں کمی بیشی کرتا ہے۔ ان دونوں کو اکٹھے کر دیجیے تو معاشرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے فَـاتَّـقُـوا اللّٰـهَ (26:144) کہہ کر بات ختم نہیں کی۔ کہا کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو یعنی وَاَطِیْـعُـوْنِ (26:144) میری اطاعت کے ذریعے سے خدا کے قوانین کی اطاعت کرو۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ ہماری سیاست اور سارا نظامِ حکومت اس میں آ جاتا ہے۔

نظامِ حکومت کے قیام کے لیے سربراہِ مملکت کا ہونا لازم ہے

یہ جس قدر آپ کے ہاں جھگڑے اٹھ رہے ہیں کہ اسلامی سیاست یا نظام ہوگا کیا؟ قرآن میں دو لفظوں میں بات آ گئی فَـاتَّـقُـوا الـلّٰـهَ وَاَطِیْـعُـوْنِ (26:144) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت میرے Through (ذریعہ) کرو۔ یہ اگر میرے Through (ذریعہ) والا درمیان میں نہیں ہے تو دین مذہب بن جاتا ہے اور اگر میرے Through (ذریعہ) والا خدا کے قوانین کی اطاعت نہیں کراتا تو فاتقوا اللہ نہیں رہتا۔ یہاں فَـاتَّـقُوا اللّٰهَ اور وَاَطِیْعُوْنِ اکٹھا ہوتا ہے۔ اب سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی واضح ہوگئی' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا طریقہ بھی سامنے آ گیا۔ ان دونوں کا نام ہے الدین۔ اسے آپ نظامِ خداوندی کہہ سکتے ہیں۔

دین صرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے کسی نبی کا نہیں ہوتا

یاد رکھیے! الدین صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ خدا نے اسے ہمیشہ دین اللہ کہا ہے۔ دین کی نسبت کسی پیغمبر کی طرف نہیں کی جا سکتی۔ یہ پیغمبر کا دین نہیں ہوتا' یہ خدا کا دین' پیغمبر کے ذریعے انسانوں کی طرف پہنچایا ہوا اور متشکل کیا ہوا ہوتا ہے۔ وَمَآ اَسْـئَلُکُمْ عَـلَیْـهِ مِنْ اَجْـرٍ (26:145)۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے کہ ہر نبی پہلی سانس میں جب وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی دعوت دیتا

ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں اس کے لیے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ قرآن ہے عزیزانِ من! یہ نہیں ہے کہ میں کسی اجر کا خواہاں ہی نہیں ہوں۔ اجر کا خواہاں نہ ہونا تو نفسیاتی ناممکنات میں سے ہے یہ Psychological Impossibility (نفسیاتی ناممکن) ہے۔ دلِ مدعا تو کسی مُردے کا ہی ہوسکتا ہے انسان کا نہیں ہوسکتا۔

تصوف کی دنیا دل کی شگفتگی سے محروم ہوتی ہے

ہمارے ہاں تصوف میں انتہا یہ کہی جاتی ہے کہ ''وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے'' تو گویا خدا کا دل بے مدعا ہے۔ اندازہ لگایئے کہ جس کے مدعا کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہماری عقل سے بھی تیز تر وہ تمام چیزیں بروئے کار لا کر اپنے پروگرام کے مطابق چلا جا رہا ہے ان کے نزدیک دلِ بے مدعا ہو جانا خدا ہو جانا ہے۔ ''ایہناں دا خدا ہے ہی ایہو جیا''[1]۔ یہاں کہا ہے کہ دیکھو **وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ** (26:145) میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ کے ہاں جو اس دین اللہ کی تشکیل کا مطالبہ کرے گا وہ اگلی ہی سانس میں یہ کہے گا کہ میں تم سے اس کے لیے کوئی معاوضہ یا صلہ نہیں مانگتا اور یہ بھی نہیں ہے کہ دلِ بے مدعا ہے۔ بے مقصد تو انسانی زندگی ہے ہی نہیں اس کا صلہ اور معاوضہ ہے۔ **اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ** (26:145) اس کا صلہ اور اجر اسی سے یعنی رب العلمین سے مانگتا ہوں۔ میں کیا کہوں! ایک ایک نکتہ سامنے آتا ہے آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ جو صلہ اور معاوضہ ہے آدمی ربوبیت کے لیے مانگتا ہے نشوونما کے لیے پرورش کے لیے ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مانگتا ہے مگر اس کا صلہ تم سے نہیں مانگتا اس سے مانگتا ہوں جو اکیلا میرا ہی رب نہیں ہے وہ رب العلمین ہے وہ ساری دنیا جتنی مخلوق ہے وہ اس کو بھی دیتا ہے مجھے بھی دے گا اس سے مانگتا ہوں اور باقی مخلوق کی طرح مانگتا ہوں۔

صدرِ اول میں انبیائے کرام یا سربراہِ مملکت کا ذریعہ معاش کیا تھا؟

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انبیائے کرام ہوں یا صدرِ اول ہو یا نظامِ خداوندی ہو تو اس میں یہ جتنے بھی سربراہِ مملکت فرائض سرانجام دیتے ہیں وہ روٹی کہاں سے کھاتے ہیں؟ وہ تو قوم سے کہتے ہیں کہ ہم تم سے صلہ یا جزا نہیں مانگتے تو پھر وہ کھاتے کہاں سے ہیں۔ یہ بڑا ہی اہم سوال تھا۔ میں یہ کسی دوسرے وقت بتاؤں گا۔ تاریخ میں یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ آئے تو وہاں یہ Question (سوال) پیدا ہوا۔ آپؓ حضرت ابوبکر صدیق (573-632AD) کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ کپڑا بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔ یہ 632 AD میں خلیفہ منتخب

---

[1] ان کا خدا ہے ہی ایسا۔

ہوئے۔ حضرت عمرؓ (581-644/45AD) نے دیکھا کہ اسی طرح سے آپؓ کپڑے کا تھان مونڈھے پہ اور گز ہاتھ میں لے کر پھیری کرنے کے لیے چلے۔ حضرتِ عمرؓ نے پوچھا کہ جی' کہاں جا رہے ہو؟ کہنے لگے: حسبِ معمول اپنے کام' ذریعہ معاش کے لیے' کپڑا بیچنے کے لیے' جا رہا ہوں۔ کہا: تمہیں پتہ نہیں ہے کہ کل جب تم نے بیعت کی ہے تو اس میں یہ عہد کیا تھا کہ **اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ** (6:162) میری صلوٰۃ' میری زندگی کے طور طریق' میری زندگی حتیٰ کہ میرا جینا مرنا' میں نے خدا کے مشن کے لیے وقف کر دیا ہے' تو تیری زندگی' تیرا وقت' تو اپنا رہا ہی نہیں ہے۔ خدا کے اس وقت کو اپنے اس کام میں لگا رہا ہے۔ کیا کر رہا ہے؟ یہ وقت تیرا رہا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ جی' پھر روٹی کا انتظام کیسے ہو؟

افرادِ مملکت کے ہر فرد کے فرائض اور حقوق کو پورا کرنے کا ایک غیر متبدل اصول

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ روٹی کا انتظام' مملکت' ریاست' اسٹیٹ کی طرف سے ہی آئے گا۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے۔ یہ کہا کہ مملکت نے تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ تم مملکت کے ایک فرد کی حیثیت سے As of Right (بطورحق) یہ ڈیمانڈ (طلب) کر سکتے ہو' تم مملکت کے ایک فرد کی حیثیت سے ضروریاتِ زندگی ڈیمانڈ (طلب) کر کے بھی لے سکتے ہو' مگر پھیری کرنے کا یہ جو کام کر رہے ہو' اس کا معاوضہ تم نہیں لے سکتے۔ یہ کام تم سے نہ بھی لیا جائے' کسی دوسرے سے لیا جائے۔ تمہارا روٹی کپڑا تو مملکت کے ذمے ہے۔ اسی لیے جب حضرت عمرؓ (581-644/45) سے پوچھا گیا❶ تھا کہ بھئی! تم خزانے سے کتنا لو گے؟ وہ اسے بیت المال کہتے تھے۔ اب تو اس کا نقشہ ہی مذہب میں آ کر کچھ اور ہے۔ اسلامی حکومت بناتے ہیں تو اس کا جو خزانہ ہوتا ہے' اسے بیت المال کہتے ہیں۔ اب تو کہتے ہیں کہ بیت المال الگ کھولنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ یہ بات تو بڑی سیدھی سی ہے۔ ایک جوڑا سردی میں پہننے کے لیے' ایک جوڑا گرمی کا اور اس کے بعد یہ چیز ہوئی کہ جو باقی افرادِ مملکت کا حال وہی عمرؓ کا حال❷۔ اس لیے یہ جو فریضہ تھا' یہ جو نظامِ خداوندی کے سلسلے میں ان خدمات کا سرانجام دینا تھا' یہ اس کا معاوضہ مملکت سے نہیں لیتے تھے۔ وہ تو تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ مملکت کے سر تھا' وہ بھی بطورِ حق ڈیمانڈ کر سکتے تھے۔ یہ ہے **وَمَآ اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ**❸ (26:145)۔

---

❶ خلافتِ حضرت عمرؓ کا آغاز 23 جمادی الآخر 13ھ بمطابق 22 اگست 632ء

❷ کپڑوں کے دو جوڑے' ایک سردی کا' ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لیے ایک ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لیے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے' نہ اس سے زیادہ' نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا۔ (حوالہ پرویزؒ (1987ء)۔ شاہکارِ رسالت۔ لاہور: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)' ص۔ 371۔

❸ اور دیکھو! میں اس بات کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے ذمہ ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 849)۔

صلہ یا معاوضہ کی متمنی سوچ انسانی زندگی کے وقار کا گلا گھونٹ دیتی ہے

حق کی آواز، عزیزانِ من! وہی کہہ سکتا ہے جو دوسروں سے کوئی صلہ یا معاوضہ نہ طلب کر رہا ہو، دوسروں سے صلہ یا معاوضہ کا متمنی ہی نہ ہو۔ دوسروں سے صلہ یا معاوضہ کی تمنا کی یہ چیز انسان کا گلا گھونٹ دیتی ہے، انسان کو بیباک نہیں رہنے دیتی۔ یہ ہے اگلی چیز جو ہر نبی اکرم ﷺ کے سلسلے میں کہی کہ ان سے صلہ اور معاوضہ نہیں لینا۔ اب یہ کچھ کہنے کے بعد جب کہا کہ میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں مانگتا تو اب آئی یہ بات کہ تم سوچو کہ اگر تم نے یہی روش جاری رکھی جس پر تم اس وقت چلے جا رہے ہو تم کس دھڑلے سے یہ کہتے ہو کہ **اَتُتۡرَكُوۡنَ فِىۡ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِيۡنَ** (26:146) کیا تم زندگی کی ان آسائشوں اور فراوانیوں میں، جو تمہیں اس وقت میسر ہیں، امن و چین سے علیٰ حالہ رہنے دیئے جاؤ گے؟ کیا تمہارا خیال ہے!! یہ جو کچھ اس وقت تمہارے پاس ہے کیا وہ تمہارے پاس رہنے دیا جائے گا؟ اگلی آیات میں ہے کہ وہ کیا کچھ ہے: **جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ** (26:147) باغات ہیں۔ اس زمانے کی جو معیشت (Economy) تھی، وہ زرعی ہوتی تھی یا مویشی پالنے کی ہوتی تھی، چراہ گاہیں ہوتی تھیں۔ قومِ ثمود کے زمانے میں چراہ گاہوں کی بڑی اہمیت ہوگئی تھی اور پھر جو آبادیاں تھیں ان کو کہیں کہا ہے کہ **جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍ ۝ وَّزُرُوۡعٍ وَّنَخۡلٍ** (26:147-148) کھیتیاں ہیں، چشمے ہیں، ان زرخیز زمینوں میں کھجور ہیں۔ یہ سب سے بہتر پھل ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں ادھر کہیں نبوت آتی تو آم کا ذکر آتا۔ ہمارے ہاں تو کہتے کہ بڑے بڑے آموں کے درخت ہیں۔ اور یہاں کہا ہے کہ **وَّنَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ** (26:148) ان نخلستانوں میں ہوتا ہے جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار، تہ بہ تہ، خوشے لگے ہوئے ہیں۔

محلات کی تعمیر ضرورت پوری کرنے کے خیال سے نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو اونچا دکھانے کے لیے کرتے ہیں

کہا کہ **وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ** (26:149) اور عام میدانوں میں ہی تم مکانات نہیں بناتے، تم پہاڑوں کو تراش تراش کر قلعے بھی بناتے ہو، محلات بھی بناتے ہو۔ بھئی! بنانا ہے تو یوں کہیے کہ حفاظت سے رہنے کے لیے ہے۔ قرآن تو ایک لفظ میں فرق کر جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ تم یہ کچھ فٰرِهِين یعنی بڑی صنعت کاری سے اترانے اور فخر کرنے کے لیے بتاتے ہو کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ فٰرِهِين کے لفظ میں ضرورت کے ساتھ جذباتی چیز ہے جو Psychological (نفسیاتی) چیز ہے کہ ہونا چاہیے کہ تم ضرورت کے لیے بناؤ مگر نہیں تم تو اکڑتے اتراتے پھرتے ہو۔ یہ کہنے کے بعد کہا **فَاتَّقُوا اللّٰهَ** (26:150) خدا کے قوانین کی اطاعت یعنی نگہداشت کرو۔ اپنے غلط نظام کے انجام سے ڈرو۔ ان قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا

ثبوت یہ ہے کہ وَاَطِیۡعُوۡنِ (26:150)۔تم ان قوانین خداوندی کی نگہداشت کے لیے میری اطاعت کرو۔اور محلات کی تعمیر ضرورت پوری کرنے کے لیے ہو' اپنی شخصیت کو اونچا دکھانے کے لیے نہیں' اترانے کے لیے نہیں۔

غلط نظام کا ساتھ دینے والے بھی مجرم ہیں

اب آ گئی وہ بات جو میں نے پہلے کہی ہے کہ وہ تو اوپر چند آدمی ہوتے تھے جن کے ہاتھ میں مملکت کا' سارا سربراہی کا' کاروبار ہوتا تھا۔ یہ وہ قوم تھی۔اس کا کیا جرم تھا؟ اس کے لیے کہا کہ وَلَا تُطِیۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِیۡنَ (26:151) یہ جو مسرف ہیں ان کی اطاعت نہ کرو' ان کے احکام کی اطاعت نہ کرو۔تمہارا جرم یہ ہے کہ وہ جو غلط باطل انسانیت سوز نظام ہے وہ اس کے احکام نافذ کرتے ہیں اور تم بلا چوں و چرا ان کی اطاعت کیے چلے جاتے ہو۔

اسراف کا مفہوم اور سربراہانِ مملکت کا فریضہ

یہاں اسراف کا لفظ آیا ہے۔اس کا ترجمہ تو فضول خرچی کیا جاتا ہے لیکن یہ بڑی گہری چیز ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ عام زمینداروں کے ہاں بھی پانی کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور پھر جب بوائی کا موسم ہو تو اس زمانے میں پانی کی باری پہ قتل ہو جاتے ہیں اور عربوں کے ہاں تو اس کا پوچھو ہی نہیں ۔ پانی کی تو قلت ہوتی تھی تو یہ کتنی قیمتی چیز ہوتی تھی۔کنواں چلتا ہے تو وہاں سے پانی آتا ہے''آڈاں کیندے نیں ساڈے''❶ ۔ وہاں سے پانی چلتا ہے۔کھیت وہاں سے دور ہوتا ہے' اس نے وہاں پہنچنا ہوتا ہے۔ پانی لگانے کی اکثر باری رات کو آتی تھی۔ان میں ایک آدمی ساری رات کدال کندھے پہ رکھے' اس نالی کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ جہاں سے کہیں ذرا سی نالی پھٹی اور پانی ذرا اِدھر اُدھر بہنے لگا' جھٹ سے اس کو پورا کر دیتا ہے تاکہ یہ پانی جس مصرف میں آنا چاہیے' سارے کا سارا وہاں پہنچ جائے' راستے میں یہ پانی اِدھر اُدھر بہہ کر ضائع نہ ہو جائے۔اگر ایسا ہو جائے تو عرب اسے پانی کا اسراف کہتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے اس پانی کو آپ نے رواں کیا ہے وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ پائے' راستے میں اِدھر اُدھر ضائع ہو جائے۔ان کے ہاں ایسا کرنے والے اسراف کرنے والے ہوتے ہیں۔

یہاں بات سربراہانِ مملکت کی ہو رہی ہے۔مملکت کے مال و دولت کی منزل مقصود کون سی ہے؟ یہ افراد ہیں جن کو رعایا کہا جاتا ہے' یہ افرادِ مملکت ہیں' یہ انسان ہیں۔ یہ ان تک پہنچنا چاہیے' یہ راستے میں اسے اِدھر اُدھر بہا دیتے ہیں۔ایسا کرنے والے مسرفین ہیں۔کہا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ الَّذِیۡنَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا یُصۡلِحُوۡنَ (26:152) یہ وہ لوگ ہیں جو ملک

---

❶ ہمارے ہاں انہیں ''آڈاں'' (نالیاں) کہتے ہیں۔

میں نا ہمواریاں پھیلاتے ہیں اور کبھی اس کی اصلاح کی فکر نہیں ہے۔ اس کا نام دولت کا فساد ہے۔ یعنی دولت کا اس طرح سے استعمال کہ جن کا وہ حق ہے، وہ ان تک نہ پہنچے اور حق یہ ہے کہ **حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ o لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ** (70:24-25) ان کا ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہو۔ وہ As of Right (بطور حق) لے سکتے ہیں۔ اور یہ ہے عربی زبان۔ حق باطل کے مقابلے میں حق کو بھی کہتے ہیں اور حق Right کو بھی کہتے ہیں۔ Right کا لفظ ہمارے ہاں انگریزی میں بھی آ گیا۔ اگرچہ اس کے مقابلے میں انہوں نے Wrong کہہ کر حقیقت میں اس کو مسل دیا ہے۔ عربوں نے اپنے ہاں ان دونوں لفظوں کو ایک جگہ رکھا ہے، حق وہ ہے جسے آپ بطور حق ڈیمانڈ (طلب) کر سکتے ہیں اور جب آپ کو آپ کا حق ملے گا تو یہ جو دینے والا نظام ہے، حق پر مبنی کہلائے گا۔ یہاں **یُفْسِدُوْنَ** (26:152) کہا ہے یعنی فساد کرنے والے۔ تو فساد یہ بات ہوگئی کہ جو چیز جس تک پہنچنی چاہیے، وہ وہاں تک نہ پہنچ پائے، راستے میں ہی تم اپنی مرضی کے مطابق اسے اِدھر اُدھر بہا دو۔ یہ فساد ہے۔

عملِ صالح اور لفظِ ''ملآ'' کا مفہوم

قرآن میں ہے کہ **وَلَا یُصْلِحُوْنَ** (26:152)۔ جسے آپ اب یہ عملِ صالح کہتے ہیں، وہ کبھی کسی نے Define (تعین) نہیں کیا کہ عملِ صالح کیا ہے۔ عملِ صالح وہ ہے جو فساد کو مٹا دے۔ فساد ناہمواریوں کو کہتے ہیں۔ صالح یہ ہے جس سے کسی کی صلاحیتیں بیدار ہوں، اس قسم کی نشوونما ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ صلاحیتوں کو بیدار نہیں کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسرفین کیسے تھے؟ یہ فساد کیا تھا؟ یہاں سے ساری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ انہوں نے یہ سب کچھ سنا اور اس کے بعد نہایت حقارت سے کہا کہ ہمیں اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ **قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ** (26:153) انہوں نے کہا کہ تُو بھی ان لوگوں میں سے ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے اور ہمیں دنیا کی اصلاح کے لیے مامور کیا گیا ہے حالانکہ **مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ** (26:154) تم تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو اس لیے تم خدا کے رسول کس طرح ہو سکتے ہو؟ بہر حال اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ ہم پر تباہی آنے والی ہے تو اس کے لیے کوئی نشانی پیش کرو۔ اب یہ وہی بات ہے جو میں نے کہا ہے کہ جس دور میں کوئی مسئلہ اہمیت اختیار کرتا ہے، اسی کے متعلق قرآن اس نبی کے احکام کے سلسلے میں ذکر کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ قومِ ثمود کی معیشت چراہ گاہیں تھیں، وہ مویشی پالتے تھے۔ یہ جتنے ان کے بڑے بڑے سردار تھے، میں پھر کہوں کہ قرآنِ کریم نے ان کے لیے ''الملأ'' کا لفظ استعمال کیا ہے مثلاً **قَالَ الْمَلَاُ** (7:60) حتیٰ کہ سردار اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، یعنی سر ہے ہی ان کا، باقیوں کا تو سر ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں یہ ترجمہ کیا جاتا ہے ورنہ ملآ کے معنی یہ ہیں کہ

''جن کے گھروں کے برتن دولت سے یا اناج سے بھرے ہوئے ہوں''۔

قومِ ثمود کے دور کا معاشی نظام اور اللہ کی اونٹنی کا تذکرہ

یہ جو لوگ تھے قوت ان کے پاس تھی' اقتدار ان کے پاس تھا' جتھے ان کے پاس تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کرتے کیا تھے؟ اپنے مویشیوں کے لیے چراگاہیں مختص کر لیتے تھے کہ یہاں یہی چریں گے۔ پانی کی بڑی اہمیت تھی تو ان کے ہاں یہ تھا کہ ہمارے ہی مویشی پانی پئیں گے۔ ان میں سے بعد میں جو کچھ بچ جائے تو گاؤں کے کسی غریب کے جانور بھی وہاں آ جائیں۔ لیکن ترجیحات یہ تھیں کہ سب سے پہلے ان کے جانور پانی پئیں گے۔ یعنی یہ تھی وہ چیز' جو قرآن ان کے ہاں کے نظام کے اس گوشے کو ابھار کر سامنے لا رہا ہے۔ دیکھیے گا کتنا اہم مسئلہ ہے جو قرآن دو الفاظ میں حل کر دیتا ہے۔

پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ اس دور میں ان کا جو خود ساختہ نظام تھا' یہ ہے اس کا تکنیکی گوشہ' جسے قرآن ابھار کر سامنے لایا ہے' میں یہ بات بعد میں عرض کروں گا کہ قرآن نے اسے **نَاقَةُ اللّٰهِ** (11:64) کہا ہے تو یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ وہ کیا ہے؟ کہا یہ ہے کہ **تَاْكُلْ فِىْٓ اَرْضِ** (11:64) اسے بھی باقی اونٹنیوں کی طرح ان چراہ گاہوں میں چرنے اور پانی پینے کی اجازت ہونی چاہیے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ مسئلہ کیا تھا جو یہ کہا گیا ہے کہ ہر اونٹنی کو اجازت ہونی چاہیے۔ تو گویا یہ ہوا کہ انہوں نے زمین پہ لکیریں کھینچ رکھی تھیں کہ یہ میری زمین ہے' یہ میری چراہ گاہ ہے' اس میں میرے ہی جانور جا سکتے ہیں دوسرے کے نہیں جا سکتے تو گویا قرآن نے یہ کہا کہ ہر مویشی کو اجازت ہونی چاہیے کہ اس میں چرے اور پانی پیے۔ یہ تھا مسئلہ۔ یہاں تاکل کہا یعنی صرف چرنا' دوسرے مقام پہ کہا ہے کہ **قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ** ❶ (26:155)۔ یہاں پانی پینے کا سوال ہے۔ گویا یہ بہت اہم چیز تھی۔ اس میں چشمہ ایک تھا' یہ ان کے جانور تھے' غریب کا جانور ہے اس کو وہاں کا پانی نہیں دیتے تھے۔ کہا کہ باریاں باندھ لو تمام مویشی اپنی اپنی باری پہ پانی پئیں گے۔ جب تمہاری باری آئے گی تو تمہارے مویشی پانی پئیں گے' دوسرے کی باری تم نہیں لے سکتے۔

---

❶ یہ ایک اونٹنی ہے (تمہیں اس سے سروکار نہیں کہ یہ کس کی اونٹنی ہے؟ کسی غریب آدمی کی ہے یا بڑے لوگوں میں سے کسی کی۔ بس یہ ایک جانور ہے جسے اور جانوروں کی طرح بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی۔ اس لیے اسے پانی بھی چاہیے اور چارہ بھی)۔ ہم باریاں مقرر کر لیتے ہیں اور اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ اونٹنی اپنی باری پر پانی پیا کرے گی اور تمہاری اونٹنیاں اپنی باری پر۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 850 تا 851)۔

عزیزانِ من! ایک رسول خدا کا نبی ﷺ ہے۔ یہ ان تک خدا کی دعوت پہنچا رہا ہے اور یہ دعوت کیا ہے؟ یہ کہیں نہیں کہہ رہا کہ بہت زیادہ نمازیں پڑھا کرو، روزے رکھا کرو، فطرانے دیا کرو۔ خدا کا یہ نبی پیغام لے کر آ رہا ہے، یہ پیغام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ وحی کے ذریعے دہرایا جا رہا ہے۔ یہ پیغام قرآن کی دفتین میں قیامت تک کے لیے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ یہ خالص ایک معاشی مسئلہ ہے کہ بابا! سب کے جانور ہیں، یہ اس میں سے کھائیں پئیں۔ تم نقشے کے اوپر لکیریں لگا رہے ہو کہ یہ میرا ہے، یہ اس کا ہے۔ تم یہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟ اسے فساد فی الارض کہا ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ وہ مفسدون تھے، تو فساد یہ تھا کہ خدا کی زمین پہ لکیریں مار کر یہ کیا جائے کہ یہ میری ہے اور اس میں کسی اور کا حق نہیں ہے، غریب کا جانور یعنی مویشی بھوکا مرتا ہے تو مرتا رہے، پیاسا ہے تو پیاسا رہے، میرا چشمہ ہے میری زمین ہے۔ یہ بات ہو رہی ہے۔

فساد فی الارض کے سلسلہ میں زمین پر ذاتی ملکیت کے متعلق قرآن حکیم کا پیش کردہ دائمی حل

اب اس کا حل کیا ہے؟ یہ ہے عزیزانِ من! وہ حل جو اس مسئلے کا ابدی حل ہے، یہ جو تخصیص ہے، تحدید ہے، حد بندی ہے، یہ آج بھی موجود ہے: زمینوں کی ملکیتیں موجود ہیں اور اس کی وجہ سے دنیا جہنم بن رہی ہے اور اس کا حل تلاش کر رہی ہے مگر ملتا نہیں ہے: ''ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں''۔ ملتا تو ہے ''تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں''۔ اور پھر جن کے سامنے قرآن ہو، ان کے سامنے یہ کہنا کہ سرا ملتا نہیں ہے، غلط ہے۔ سرا ہاتھ میں آتا ہے تو اس کو اور الجھا دیتے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ نہ پائے کہ اس کا سرا یہ ہے۔ سنیئے، عزیزانِ من! اتنے بڑے اہم مسئلے کا حل دو الفاظ میں۔ کہا کہ تمہاری کیفیت یہ ہے۔ اب سنو! یہ زمین تمہاری نہیں، تمہارے باپ کی نہیں، تم نے بنائی نہیں، یہ کہتے ہو کہ ہمارے ہاں وراثت میں آ رہی ہے تو کیا یہ تمہارے باپ نے بنائی؟ جی وہ شروع سے چلی آتی ہے، تو وہ جو شروع والا تھا اس نے کس سے خریدی تھی، کیا کہیں خود بنائی تھی؟ کہ جی نہیں، خود تو نہیں بنائی تھی۔ تو پھر یہ تمہاری کیسے ہوگی؟ ماننا پڑے گا کہ یہ انسان کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ ایک بات یہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ جتنے مویشی پھر رہے ہیں، کیا ان کے ماتھے پر لکھا ہوا ہے کہ ''ایہہ تے ملنگے جولاہے دا، اے تے سردار سرفراز خان دا اے''[1] کہا کہ کیا یہ کسی کے ماتھے پہ لکھا ہوا ہے؟ خدا کے قانون کے مطابق ان کی پیدائش ہوتی ہے۔ بچے ہوتے ہیں تو ان کے اوپر نشان تم خود لگا دیتے ہو کہ یہ سردار صاحب کا ہے اور یہ ملنگے تیلی کا ہے۔ اور یہ خود نشان لگانے کے بعد اب فیصلہ یہ ہے کہ پہلے وہ زمین تمہاری نہیں تھی۔ اس پر تم نے لکیر ماری، اپنی بنائی، پھر یہ جو مویشی ہیں ان میں سے اپنے مویشیوں کے متعلق کہا کہ یہ سردار صاحب کے ہیں، یہ ان کے ہیں۔ ان کا مویشی آپ کی زمیں میں نہیں آ سکتا۔ کہنے لگے کہ یہ ہے ساری تخصیص۔

---

[1] یہ ملنگے جولاہے کا ہے اور یہ سردار سرفراز خاں کا۔

عزیزانِ من! سنیے قرآن دو الفاظ میں اتنے بڑے مسئلے کا حل کیا کہتا ہے۔ کہا کہ پہلی چیز تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اِس کی اونٹنی ہے، وہ اس کی اونٹنی ہے۔ کہو کہ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ** (7:73)۔ بات ختم کر دی کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ جب کوئی شے انسانی ملکیت سے نکل جائے تو اس کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ جس کو آپ بیت اللہ کہتے ہیں، خدا نے خود کہا ہے کہ میرا گھر ہے "کدی ویکھیا اے تسی کہ اللہ نے منجی ڈھائی ہوئی ہووے"❶؟ اللہ کا گھر کیا ہے؟ وہ تو کہتا ہے کہ **وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ** (57:4) جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے، وہ تو ہر جگہ ہے، تمہاری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ کیا وہ کسی مکان میں رہتا ہے؟ اس کا مکان کیا ہے؟ وہ کہ جو کسی انسانی ملکیت میں نہیں جا سکتا۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ جس شے کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، ویسے تو ہر شے اسی کی ہے، خاص طور پر جس شے کو اللہ کی کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔ کہا: **نَاقَةُ اللّٰهِ** (7:73) یہ ہیں سارے مویشی، خدا کے پیدا کردہ ہیں، یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ **فَذَرُوْهَا** (7:73) ان کے پاؤں میں کیوں رسیاں باندھ رہے ہو کہ یہ غریب کی اونٹنی ہے، یہاں نہ آنے پائے۔ اپنی اونٹنی کو باندھ کے رکھو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ **فَذَرُوْهَا** اسے کھلا چھوڑ دو، اپنی اونٹنیوں کو تو تم کھولتے ہو۔ یہ تمہاری اونٹنیاں نہیں ہیں یہ تو خدا کی پیدا کردہ ایک مخلوق ہے۔ خدا کی اس مخلوق کو کیوں رسیاں باندھتے ہو؟ **تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ** (7:73) یہ خدا کی اونٹنی ہے، خدا کی زمین میں چرے۔ "تسی چاچے لگدے او"❷ عزیزانِ من! یہ مسئلے کا حل ہے۔ پھر کہا ہے کہ **نَاقَةُ اللّٰهِ** ...... **تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ** (7:73) خدا کی زمین ہے اور خدا کی اونٹنی ہے میں اسے کھلا چھوڑتا ہوں کہ یہ چراگاہ میں چرے۔ جب تک انسان اس مقام تک نہیں پہنچے گا معاشی مسئلے کا حل نہیں مل سکے گا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ عیہ وسلم نے اس کو دہرا دیا "یاد رکھو! انسان اللہ کے بندے ہیں اور زمین اللہ کی زمین ہے تو یہ عباد اللہ ہیں اور یہ ارض اللہ ہے۔ اللہ کے بندے، اللہ کی زمین ہے، تم بیچ میں کہاں سے آ گئے"؟ مسئلے کا حل ہو گیا: خدا کے بندے خدا کی زمین۔ قرآن کہتا ہے کہ **سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ** (41:10) تمام ضرورت مندوں کے لیے اس کے دروازے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ یہ **لِّلسَّآئِلِيْنَ** ہے۔ ہمارے ہاں تو اس سائل کا ترجمہ بھکاری فقیر کیا اور کہہ دیا کہ جب تمہاری فصل پکے تو اس میں سے باقیوں کا بھی حصہ نکالتے رہو۔ تو یہ جو گداگر بھکاری آ جاتے ہیں، ان کا بھی حصہ نکال لیا کرو۔

عزیزانِ من! سائل کے معنی فقیر گداگر نہیں ہیں بلکہ ضرورت مند ہیں۔ اس لیے قرآن نے کہا ہے کہ **سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ** (4:10) اللہ کے بندے، اللہ کی زمین، ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیے۔ یہ حل ہو گیا۔ پوچھتے ہیں صاحب!

---

❶ کیا کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی چارپائی ڈالی ہوئی ہو؟

❷ کیا تم اس کے چچا لگتے ہو؟ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

قرآن کا معاشی نظام کیا ہے؟ نظام یہ ہے کہ **نَاقَةُ اللّٰهِ ...... تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ**(7:73)**عباد الله** اور **ارض الله**. یہ میں نے ایک ریفرنس دیا ہے ورنہ جتنا جی چاہے آپ ریفرنس لے لیجیے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے' **فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا** (91:13) یہ جو اونٹنیاں ہیں ان کی نسبت انسانوں کی طرف نہ کرو' ان کو اللہ کی مخلوق کہو' اللہ کی زمین کہو اور اس میں اللہ کے چشمے تک' ان میں سے یہ پانی پئیں گے۔ یہ ہے مسئلے کا حل۔ یہ حضرت صالحؑ نبی ہیں۔ ان سے کہا تھا کہ انسانوں کے رائج کردہ اس غلط نظام کے خلاف جہاد کرو۔ انہوں نے کہا کہ یا اللہ! یہ تو اتنی بڑی قوم ہے' ساری کی ساری اس باطل نظام میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اتنا بڑا معاشرہ ہے' اتنی بڑی قوم ہے' اتنا بڑا ملک ہے اور یہ خرابی وبا کی طرح اتنی عام ہے میں کس کس کو ٹھیک کروں گا۔ یہ تو بڑا مشکل معاملہ نظر آتا ہے۔

ہر باطل نظام کی فساد انگیزیوں کا علاج برسر اقتدار لوگوں کی اصطلاح پر ہی منحصر ہے

سنیے' عزیزانِ من! یہ کہا ہے کہ تم گھبرا گئے۔ یہ ساری قوم کی بات نہیں ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ **وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ** (27:48) یہ جو کیپٹل سٹی (City) ہے' ان کا بڑا شہر ہے' اس میں نو بدمعاش ہیں۔ وہ سارے فساد کی جڑ ہیں' وہ قوم کو صحیح راستے کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ساری قوم کی بات چھوڑ دو' ان کا علاج کر دو' سارا معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ عزیزانِ من! میں حضرت صالح علیہ السلام کی بات کر رہا ہوں ۔ یہ قرآن ہے کسی بات کو چھوڑتا نہیں۔ مدینہ تو ہر شہر کو کہا جائے گا۔ کہا کہ یہ خرابی وہاں کیپٹل شہر میں ہوتی ہے۔ ایک ایک آبلے کے اوپر مرہم لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس وہاں آپ بیکٹیریا کو مارنے والا انجیکشن دے دیجیے' سارے ٹھیک ہو جائیں گے۔

بات' عزیزانِ من! گو کہ شاید پانچ چھ ہزار سال [1] پہلے کی ہو رہی ہے' مگر بات آج کی بھی ہو رہی ہے۔ یہ ہے جسے وحی کی ہدایت کہتے ہیں۔ ہر دور میں یہی مسائل پیش ہیں' ہر دور میں یہی علاج بتایا گیا' اسی لیے تو کہا کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔ کہنے لگے کہ یہ بات ہے!!!

---

[1] امِ سامیہ سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں' ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادِ اولیٰ کے بعد کا ہے۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ ان کا دارالحکومت حجر تھا جو اس قدیم راستے پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا ہے۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا میدان بڑا سرسبز و شاداب ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز۔ قرآن نے اس قوم کو عاد کا جانشین بتایا ہے (7:74)۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے پیشتر ان کی تباہی ہو چکی تھی کیونکہ دربارِ فرعون کا مردِ مومن اپنی قوم سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بدکرداریوں سے باز نہ آئے تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو قوم نوح و عاد و ثمود کا ہوا تھا (40:30-33)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم کا زمانہ قریب اڑھائی ہزار سال ق م سے لے کر 1600 ق م تک کا ہے (ماخوذ از پرویزؒ: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994، ص ص۔ 68 تا 69)۔

اب صالح علیہ السلام نے اس نظام کے خلاف کام شروع کیا اور پھر آپ سوچ سکتے ہیں کہ وہ جونو (۹) تھے' ان کی مخالفت کی صورت کیا ہوگی۔ پہلی چیز انہوں نے یہ کہی کہ صالح علیہ السلام! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے میں یہ بتا دوں کہ ''کیا ہو گیا'' والی بات کیا ہے؟

معاشرتی طور پر رسول باوقار حیثیت کا حامل ہوتا تھا

عزیزانِ من! رسول کے متعلق قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ وہ رسول اس دور میں بھی' جسے اس دور کا نچلے کا طبقہ کہا جائے گا' قرآن کی رو سے تو نیچے کا اور اوپر کا طبقہ ہوتا ہی نہیں ہے' رسول اس نچلے طبقے سے نہیں آتا تھا۔ اگر رسول نچلے طبقے سے ہوتا اور اگر وہ اٹھ کر یہ چیز کہتا ہے کہ یہ سب اوپر والے جتنے امیر ہیں غلط ہیں' تو نظر آتا کہ چونکہ اس کے اپنے پاس نہیں ہے' اس واسطے یہ کہہ رہا ہے کہ میں کبڑا ہوں' سارے ہی کبڑے ہو جائیں۔ رسول کے متعلق کہا کہ یہ قوم کے بلند ترین درجے کا آدمی ہوتا تھا اور اسی کی یہ بات جچتی ہے۔ سر اونچا کر کے چلنے والا اگر کسی کو سلام کرتا ہے تو یہ خوبی ہے۔ یہ مانگنے والا فقیر اور غریب سلام کرتا ہے تو یہ اس کی خوبی نہیں ہے۔ کہا کہ یہ جو رسول تھا' یہ بلند طبقے کا انسان ہوتا تھا' قریش کے بھی ہاشمی قبیلے سے تھا اور ہر رسول کی یہی کیفیت قرآن نے بتائی ہے۔ قرآن تو چلتے چلتے دو الفاظ میں ساری کہانی کہہ جاتا ہے۔ کہا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ **قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ** (11:62) صالح علیہ السلام! تم سے تو ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ تو گویا یہ نظر آ گیا کہ نبی کی نبوت سے پہلے کی جو زندگی ہے' اس زندگی کی اپنی قوم میں کیفیت یہ تھی کہ قوم اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہوتی تھی۔ اور امیدیں یہ وابستہ تھیں کہ تم اٹھو گے' بڑے سمجھدار Intellectual (دانشور) آدمی تھے' ہم سمجھتے تھے کہ تم اٹھو گے اور یہ کہو گے کہ یہ جو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ان کے پاس ہیں' یہ نہیں رہنے چاہئیں' یہ زمین کو خراب کر دیتے ہیں' اس سے پیداوار ہی کچھ نہیں ہوتی' اس کو بڑے بڑے حصوں کے ساتھ ملا دینا چاہیے۔ ہم سمجھتے تھے کہ تم یہ کہو گے۔ تیری مت ماری گئی ہے۔ تم آ کے ہم سے یہ کہہ رہے ہو کہ زمین کی ملکیت ہی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ او صالحؑ! تمہارے ساتھ تو ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن دو الفاظ میں دونوں باتیں کہہ گیا ہے۔ نبی کا مقام قبلِ دعویٰ نبوت ایسا مقام ہے کہ قوم کو اس سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور اس دعویٰ نبوت کے بعد اس کا پیغام ان کی ان توقعات کے اوپر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ ہوتا ہے انقلابی کا مقام۔ اور اب کیفیت کیا ہو رہی ہے؟ بڑے عجیب مرحلے ہیں۔ ہماری تو بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور تمہاری یہ حالت ہے کہ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' ہر وقت' یہ کہتے ہو کہ تم تباہ ہو جاؤ گے' تم برباد ہو جاؤ گے' تمہارا بیڑہ غرق ہو جائے گا' ڈرو اس خطرے سے کہ جو آنے والا ہے' تم نہیں رہو گے' تمہاری داستانیں رہ جائیں گی' تم باقی نہیں رہو گے۔ کہا کہ تم بھی اور تمہارے ساتھی بھی بڑے ہی منحوس ہو ''ہر وقت طعنے دیندے رہندے او ساہنوں''[1]۔ جو کسی کے غلط کام کے انجام سے آگاہ کرے' اسے یہ کہا جاتا ہے

---

[1] ہر وقت ہمیں طعن و تشنیع کرتے رہتے ہو۔

کہ تم بڑے ہی منحوس ہو' کبھی کوئی خوشخبری کی بات نہیں کہتے کہ ہاں اپنے اس ظلم وفساد میں اور بڑھتے جاؤ اور اس کے بعد اور پھلتے پھولتے جاؤ گے' میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں' اللہ کا فضل بھی تمہارے ساتھ ہے۔ جواب عنداللہ ملتا ہے کہ بات یہ ہے کہ یہ جو نحوست ہے' یہ نہ میری وجہ سے ہے' نہ تمہاری وجہ سے ہے۔ یہ تو قانونِ خداوندی کی جو تم خلاف ورزیاں کرتے ہو' یہ تم پہ نحوست اس کی وجہ سے پھیل رہی ہے۔ میں منحوس نہیں۔ تمہارے اعمال ہیں وہ نحوست پھیلانے والے ہیں۔ کیا بات ہے! سعد ونحس کا مسئلہ بھی کس طرح حل کر دیا۔ یہ کہتے ہیں کہ فلاں دن منحوس ہے' فلاں مہینہ منحوس ہے' دن کی فلاں گھڑی منحوس ہے' یہ نام منحوس ہے۔ یاد رکھیں! عنداللہ نحوست کہیں نہیں ہوتی۔ وہ تو خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرو گے تو نحوست آ جائے گی۔ اپنے اعمال سے قوم کی تباہی ہوئی ہے۔ انہیں قرآن نے نحس کہا ہے۔

انہوں نے یہ بات کہی کہ اسے صالح علیہ السلام! تم اچھے بھلے ہوتے تھے' سمجھدار ہوتے تھے' اب تم بیٹھے بیٹھے یہ کہنے لگ گئے ہو کہ خدا نے یہ کہا ہے' اس کا قانون یہ ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ تم پر کسی نے جادوٹونہ کر دیا ہے اور تم اپنے متعلق کچھ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ اس فریب میں مبتلا ہو کہ مجھے خدا کی طرف سے پیغام ملنا شروع ہو گئے ہیں: **اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ** (26:153)۔ یہ جو سحر ہے' جسے اپنے ہاں جادو کہتے ہیں' عرب عجیب قوم تھی' جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی' تعویذ تاگے گنڈے چڑیلیں بھوت پریت سب چیزوں کو جاننے والے' ماننے والے تھے' وہ یہ جو لفظ سحر ہے' اس فریب خوردہ کو بھی کہتے تھے جو خود فریبی میں مبتلا ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ دو ہی باتیں ہیں کہ یا تو تم پہ کسی نے کوئی جادوٹونہ کر دیا ہے' تمہارے ہوش نہیں رہے یا پھر تم خود فریبی میں مبتلا ہو گئے ہو۔ نظر کچھ ایسا آتا ہے ورنہ پہلے تو بہت اچھے بھلے تھے۔ جو بھی کسی کو غلط راستے سے آگاہ کرتا ہے کیونکہ اس سے اس کے مفاد پہ زد پڑتی ہے' وہ یہی کچھ کہتا ہے۔

قرآن حکیم کی ہر بات ہر اصول منطق کی بجائے دلیل پر مبنی ہوتا ہے

شروع سے آخر تک (Through out) آپ دیکھیں گے کہ رسول ان سے کہتا ہے کہ **هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ** (27:64) اس کی تردید میں دلیل لاؤ' یعنی جو بھی اس سے آگاہ کرے وہ اس کی تردید میں دلیل نہیں دے سکتے' قرآن ساتھ کہتا ہے کہ **لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ** (23:117) دلیل تم لا ہی نہیں سکو گے' دلیل تمہارے پاس ہو ہی نہیں سکے گی۔ دلیل تو ایک ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی ایک بات کے حق میں بھی دلیل ہو' اس کے خلاف بھی ہو۔ یہ منطق (Logic) تو ہوسکتی ہے' برہان نہیں ہوسکتی۔ میں پھر بتاؤں گا کہ ان دونوں میں فرق کیا ہوتا ہے۔ ایک چیز ہوتی ہے جو بظاہر دلیل نظر آتی ہے لیکن وہ لفاظیّت ہوتی ہے۔ کسی چیز کے متعلق دو متضاد Reasons ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ تنگ آ گئے۔ دلیل پاس نہیں' یہ پیغام بڑھتا چلا جا رہا ہے' خطرہ قریب آتا نظر آ رہا ہے اور بالآخر وہ ان ہتھیاروں پہ اتر آئے جن پر ہر صاحبِ استبداد آمر اتر آتا ہے۔ وہ ایک فرد ہو یا ان کا جتھہ ہو' آخر میں جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی تو ہمیشہ دھاندلی پہ اتر آتے ہیں۔ آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کریں؟ **قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ**

لَـنُبَیِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ (27:49) کہا کہ آؤ' سب کھڑے ہو کر قسم اٹھاؤ کہ سب مل کر صالح علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں پر رات کو حملہ کر کے قتل کر دیں گے۔ انہیں آپس میں بھی ایک دوسرے پہ اعتبار نہیں ہے' ایک دوسرے سے قسمیں اٹھواتے ہیں۔ کہنے لگے کہ قسمیں اٹھاؤ۔ اور پھر اگلی بات جو قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جو کافر تھے' خدا کو مانتے نہیں تھے' وہ ان سے اس بات کے اوپر قسمیں اٹھواتے ہیں کہ راتوں رات اندھیرے میں چپکے سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لَـنَقُوْلَنَّ لِوَلِیِّهٖ مَـا شَهِـدْنَا مَهْلِکَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (27:49) اور صبح اٹھ کر کہو کہ توبہ توبہ صاحب! ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے' ہم جانتے ہی کچھ نہیں ہیں۔ ان سے قسم کھا کر کہہ دو کہ ہم بالکل سچی بات کہہ رہے ہیں؟ ہمیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ وہ جو ہم کہتے ہیں کہ اس کے بعد معجزہ ہوتا ہے اور ان کی تباہیاں آتی ہیں۔ کہتا ہے کہ وہ یہ تدبیریں کرتے تھے: وَمَـکَـرُوْا مَـکْرًا (27:50)۔ مکر کا یہ لفظ ہی ہمارے ہاں مکاری کے معنوں میں شمار ہوتا ہے۔ عربوں کے ہاں یہ بات نہیں تھی بلکہ ہر خفیہ تدبیر کو وہ مکر کہتے تھے' وہ تدبیر جس کو خفیہ رکھا جائے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ قسمیں اٹھاتے ہیں' بات خفیہ رکھ رہے ہیں تا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اس کو مکر کہتے ہیں۔ وہ اپنے ہاں ایک خفیہ تدبیر کر رہے تھے وَّمَـکَـرْنَـا مَکْرًا (27:50) اور ہمارا قانونِ مکافات بھی ایک تدبیر کر رہا تھا۔ ادھر سے بھی تدبیر ہو رہی ہے۔

خدا کا قانون انسان کے ہر عمل کے پیچھے ایک کھوجی کی طرح پیچھا کر رہا ہوتا ہے

قرآن کی یہ چیزیں غور طلب ہیں۔ اور تدبیر کے متعلق کیا بات ہے! یہ سارے بڑے بڑے صاحبِ عقل و شعور تھے' حکمران طبقہ سیاست کی گتھیاں سلجھا رہا تھا لیکن اپنے غلط نظام کا جو انجام ہونے والا ہے اس کے متعلق کہا ہے کہ وَّهُـمْ لَا یَشْـعُـرُوْنَ (27:50) وہ آنے والا عذاب ایسی جگہ سے آ جاتا ہے جو ان کے شعور میں بھی نہیں ہوتا۔ یہ بڑے بڑے رخنے بند کرتے رہتے ہیں لیکن بعض رخنے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے شعور میں بھی نہیں آتے۔ غلط اعمال کے تباہ کن نتائج ان راستوں سے آتے ہیں۔ اور ویسے بعد میں یہ صورت ہوتی ہے کہ لوگ جو دور سے دیکھتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! اتنا بڑا Intellectual (دانشور) اتنا بڑا ذہین شخص' اتنا بڑا سیاستدان' وہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکا۔ واقعی نہیں سمجھ سکتا۔ نشے میں کوئی بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا اور نشہ صرف شراب ہی کا نہیں رہتا۔ یہ تو بڑا معمولی سا نشہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تھوڑی سی کھٹائی دے دیجئے' اس کا نشہ اتر جاتا ہے۔ نشہ تو یہ ہوتا کہ ان کے کمبخت شعور میں بات نہیں آتی کہ عذاب کدھر سے آئے گا۔

لفظ عذاب کا قرآنی مفہوم جس کے تحت قومیں رسوا ہو جاتی ہیں

اب عذاب کی ذرا سی جھلک دیکھیے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ بات ہے کہ وہ ایک چیخ اٹھی' وہ ایک زلزلہ آیا اور وہ ساری کی ساری قوم زمین میں دھنس گئی اور ختم ہو گئی۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی یہ عرض کیا تھا کہ عذاب یوں نہیں شروع ہوتا' اس پہ غور کیجئے عزیزانِ من! قرآن لفظ تو عذاب ہی استعمال کرتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ عذاب ہوتا کیا ہے؟ غلط نظام کے اندر جو تباہیاں اور

خرابیاں مضمر ہوتی ہیں وہ ہے جس کو عذاب کہا جاتا ہے۔ کہا کہ پہلے یہ چیز ہوتی ہے کہ **فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ** (51:45) اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہتی۔ یہ ضعف کچھ عرصے سے چلا آ رہا تھا' دوسری قومیں ان کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ کہا کہ پھر اس کے بعد جب یہ کیفیت ہوگئی کہ اس سے بھی یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہتے تو **وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ** (51:45) پھر کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرتا' پھر وہ ایسی قوم کو ڈھونڈتے ہیں جس میں اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی استطاعت ہو'' تاکہ او ساڈے کم وی آوے''[1] ان میں تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی استطاعت ہی نہی رہی ان کی تو یہ کیفیت ہوگئی۔ عذاب کی شکلیں' میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کی تھیں۔ عزیزانِ من! قرآن نے عذاب کی بدترین شکل یہ کہی ہے کہ **خزیٌ فی الحیوۃ الدنیا** (2:85) وہ قوم ذلیل اور رسوا ہو جاتی ہے۔ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے' تو ٹھیک ہے' وہ مر جاتا ہے لیکن یہ ذلیل ورسوا قوم مرتی نہیں ہے۔ ظالم کے متعلق تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ **لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى** (20:74) اس میں نہ زندہ رہتا ہے نہ مرتا ہی ہے۔ کہا کہ **مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ** (11:66) اس دور کی ذلت اور رسائی سے ہم نے اس قوم کو بچا لیا جنہوں نے بات مانی تھی اور وہ دوسری قوم ذلت اور رسوائی کے عذاب میں محصور ہوگئی۔ ان میں کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی' جو امداد دیا کرتے تھے انہوں نے امداد بند کر دی۔ اس کے بعد پھر ساری دنیا میں یہ قوم ذلیل اور خوار ہوگئی۔ گناہ یہ تھا کہ خدا کی زمین پر لکیریں مار کر اسے ذاتی ملکیت میں رکھ لیا تھا' غریبوں کے مویشی کو اس میں چرنے نہیں دیتے تھے' پانی پینے نہیں دیتے تھے۔ یہ ایک ہی گناہ گنایا ہے' ایک ہی جرم گنایا ہے۔ اس کا انجام یہ بتا دیا۔ اور دوسری جگہ' عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز ہے۔ میں تو جب اس لفظ کو دیکھتا ہوں' کانپ جاتا ہوں۔

خدا کے قانون میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا

عزیزانِ من! قانون جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ قانون میں اگر جذبات شامل ہو جائیں تو عدل نہیں رہتا۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے۔ قانون کی رو سے اگر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے' خواہ یہ فیصلہ کسی کے متعلق پھانسی دینے کا ہی کیوں نہ ہو' تو وہ جو فیصلہ دینے والا ہے اس سے اس کے جذبات متاثر نہیں ہوتے۔ مجرم کو پکڑتے وقت اگر جذبات متاثر ہو جائیں تو مجرم تو پکڑا ہی نہیں جا سکتا' پکڑا ہوا بھی چھوٹ جاتا ہے۔ وہ ایک بڑا تنگڑا تھا' بڑی بڑی ڈینگیں مارتا تھا' صبح اٹھ کر انہوں نے دیکھا کہ بیٹھا رو رہا ہے۔ پوچھا کہ کیا ہوا؟ کہنے لگا: رات ایک چور آ گیا۔ کہنے لگے کہ تم سوئے رہے؟ کہنے لگا: میں تو کب کا جاگ اٹھا تھا۔ کہنے لگے: پھر کیا ہو؟ کہنے لگا: میں نے اس کو للکارا' اس نے دیوار پھاندی' دوسری طرف چلا گیا۔ کہنے لگے: کیا تم گھر ہی رہے؟ کہنے لگا: میں اس کے پیچھے بھاگا۔ کہنے لگے: کیا پھر پکڑا نہیں؟ کہنے لگا: پکڑ لیا۔ کہنے لگے: پکڑ لیا تو اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا تم کمزور

---

[1] تاکہ وہ ہمارے بھی کام آئے۔

تھے؟ نہیں، بڑی سختی سے میں نے پکڑا۔ کہنے لگے: پھر کیا ہوا؟ کہنے لگا؟ میرے بازو میں سخت درد ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے ازراہِ رحم اسے چھوڑ دیا۔ کہا کہ **فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا** (91:14) ان لوگوں نے صالحؑ سے معاہدہ کر لیا کہ ٹھیک ہے ہم انہیں چرنے چگنے دیں گے لیکن اس کے بعد جب دیکھا کہ مفاد پہ ہاتھ پڑے تو برداشت نہیں ہوا۔ **فَكَذَّبُوهُ** (91:14) معاہدے کو جھٹلا دیا۔ **فَعَقَرُوهَا** (91:14) اسے ہلاک کر دیا، مار دیا۔ کہا کہ **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا** (91:15) یہ ان کے غلط نظام کے نتائج بھی اس کے پیچھے چپکے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جانور کی، مویشی کی، جو دم ہوتی ہے، اسے ذنب کہتے ہیں، جہاں چلا جائے وہ پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کہا کہ غلط عمل کا جو نتیجہ ہے اس سے تم چھوٹ ہی نہیں سکتے، وہ تو دم کی طرح تمہارے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ وہ جوان کے پیچھے لگا ہوا تھا اس کی وجہ سے کیا ہوا؟ کہا کہ **فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم** (91:15) خدا نے ان کے اوپر روڈ رولر پھیر دیا اور اس طرح ہموار کر کے رکھ دیا۔ **وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا** (91:16) اس کے بعد ہمارے ذہن میں کبھی نہیں آتا کہ آئے ہائے! یہ کیا ہو گیا!! اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہم ڈرتے نہیں ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔

ظالم کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

عزیزانِ من! خدا کی طرف سے جب عذاب ہوتا ہے تو اس کے بعد خدا کا دل نہیں پسیجتا کیونکہ یہ تو جذبات کی چیز ہے اور خدا تو ہو ہی وہی سکتا ہے جو جذبات سے بلند ہو۔ اگر عدل کے راستے میں جذبات اس کو متاثر کر دیں تو عدل نہیں ہوسکتا، وہ قانون نہیں ہوسکتا، وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے بعد قرآن نے کہا کہ **وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ** ❶ (26:159)۔ یہ جتنے بھی انبیائے کرام کے قصے ہیں ان میں آخر میں یہ کہا جاتا ہے۔ جب بھی اس قوم کی تباہی آتی ہے اس تباہی کے بعد خدا کی یہی صفت آتی ہے۔ عزیز کے معنی ہوتا ہے: بڑے غلبے والا، اس کی بڑی گرفت ہوتی ہے۔ اس لفظِ عزیز کے ساتھ دوسرا لفظ رحیم ہے۔ اب یہ دو چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں کہ یہ تو ایک دوسرے سے متضاد ہیں: وہ غلبے والا ہے، اس کے ساتھ رحیم کو اگر ہم رحم دل کہیں تو وہ تو وہی ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دو متضاد صفات اس طرح سے کیوں آتی ہیں؟ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ کہتا ہے کہ خدا کا غلبہ، اس کی گرفت، اس کی سختی، اس کی طرف سے بھیجا ہوا عذاب یا تباہی، یہ غلبہ کس کے لیے ہے؟ ہمارا غلبہ ظالم کے لیے ہے اور خدا مظلوم کے لیے رحیم ہوتا ہے۔

''مرگ او اہلِ جہاں را زندگی''

ظالم کی موت میں مظلوموں کی زندگی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ خدا کا یہ جو بطش شدید ہے یہ ظالم کی گرفت کے لیے ہے اور جونہی ظالم

---

❶ اس کا قانون بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ ان سب پر غالب آ کر رہے گا اور ایسا نظام قائم ہوگا جس میں خدا کا عطا کردہ سامانِ رزق تمام مخلوق کی نشوونما کے لیے عام ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 851)۔

کی گرفت ہوتی ہے وہ مظلوم کے لیے رحمت بن جاتی ہے اس لیے بیک وقت خدا عزیز بھی ہوتا ہے اور رحیم بھی ہوتا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں اس نے کہا کہ **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا** (6:45) جس قوم نے ظلم پہ کمر باندھ رکھی تھی، ہم نے ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی اور اس کے بعد ہے کہ **وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (6:45) اس نے بڑا کام کیا ہے۔ الحمد للہ کہ جڑ کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ کہتا ہے کہ اس لیے یہ حمد کا مقام ہے کیوں کہ **وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (6:45) ہمارے ذمے تو پوری مخلوق کی ربوبیت ہے، جو اس کے راستے میں روک بن کر کھڑا ہوتا ہے اسے راستے سے ہٹا دینا ہے، یہ گرفت ربوبیت عالمینی کے لیے ہے۔ یہ جو مکافاتِ عمل کا خدا ہے، وہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جانے والوں کی گرفت کرتا ہے، ربوبیت عالمینی کا خدا اس کی جڑ کاٹ کر کہتا ہے: الحمد للہ۔ یہ ہے عزیزانِ من! خدا کا نظام۔ اس میں مجرمین اور ظالمین پہ جو گرفت ہوتی ہے، وہ بڑی سخت ہوتی ہے، وہ Regret (متاسف) نہیں ہوتا اس لیے کہ ایک ظالم کی موت میں ہزاروں مظلوموں کی زندگی پنہاں ہوتی ہے۔ یہ ہے **لَا یَخَافُ عُقْبٰھَا**[1] (91:16) عزیزانِ من! یہ ہے قوم ثمود کا قصہ۔

قصص الانبیاء سے دین کے مختلف گوشوں کا اُبھر کر سامنے آنا اور قانون مکافات کا دَمدمہ

سورۃ الشعراء کی آیت 159 تک ہم آ گئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انبیائے کرام کی داستانوں سے دین کے گوشے کس طرح ابھر کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ مثلاً حضرت صالحؑ کے قصے میں یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ اگر زمین خدا کی ملکیت سے نکل کر افراد کی ذاتی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور خدا کا دیا ہوا رزق اور اس کی تقسیم یوں ہوتی ہے کہ بڑے بڑے اس کو سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں تو محتاجوں اور غریبوں کے جانور اور وہ خود بھوکے مر جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ سنگین ترین جرم جس کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق آخر میں انجام یہ ہوتا تھا کہ **فَدَمْدَمَ** (91:14) اس کے اوپر روڈ رولر پھر جاتا ہے اور یہ کہ اس قسم کی ظالم قوم کی موت میں دنیا کے محتاجوں، محکوموں، مظلوموں کی زندگی کا راز پنہاں ہوتا ہے اس لیے کہا کہ **وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** (6:45) حمد و ستائش، تبریک و تہنیت کا مقام اللہ کے لیے ہے، وہ عالمین کا نشوونما دینے والا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] ایسا کرتے وقت وہ اس بات کے احساس سے قطعاً نہیں گھبراتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس لیے کہ یہ بات ظلم اور ناانصافی کی نہیں تھی بلکہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ تھا جو ان کے سامنے آ گیا (لہٰذا قانونِ خداوندی کے لیے اس میں تذبذب، اضطراب یا تاسف کی کوئی بات نہیں تھی۔ قانونِ عدل اس قسم کے جذبات سے بلند ہوتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1455)۔

تیرھواں باب: **سورة الشعرآء**(آیات 160 تا 176)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزان من! آج جولائی 1978ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورة الشعرآء کی آیت 160 سے ہو رہا ہے: (26:160)۔

حضرت نوح علیہ السلام کے دور سے ہی انسانیت کو قومیت اور تکریمِ آدمیت کے اصولوں سے آگاہ کر دیا گیا تھا

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے تذکارِ جلیلہ جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں' دینِ خداوندی کے کسی نہ کسی گوشے کو ہی نمایاں کرتے ہیں۔ ہر نبی کے قصے میں اس دین کا کوئی نہ کوئی گوشہ آ جاتا ہے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام سے بات شروع ہوئی۔ اس میں انسانوں کا جو خود ساختہ نظام تھا' اس میں قومیت کا معیار خون یا نسل کے رشتے سے ہوتا ہے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام نے اس کی تردید کی اور کہا کہ نہیں! قومیت کا مدار آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوتا ہے' باپ اور بیٹا بھی اگر آئیڈیالوجی میں مشترک نہیں ہیں' تو بیٹا بھی اس باپ کا اہل نہیں ہوسکتا' باپ بھی بیٹے کا اہل نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ طبقاتی کشمکش وجہ فسادِ عالمیت ہے' انسان کی تکریم انسان ہونے کی جہت سے ہے اور اس طرح سے ایک عالمگیر نوع انسانیہ کا یہ ایک گوشہ پہلے ہی رسول کے تذکرے کے ضمن میں ہمارے سامنے آیا۔

اس کے بعد قومِ عاد آئی جن کی طرف حضرتِ ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ یہ جتنی بھی رزق کی افراط ہے' آسائشیں ہیں' نعمتیں ہیں' دولت ہے' ثروت ہے' قوت ہے' یہ سب اس لیے ہے کہ تم کمزوروں اور ناتوانوں کی کمی کو پورا کرو' نہ کہ یہ جو تم کر رہے ہو جہاں کہیں کمزور آیا تم اس کی ہڈیاں توڑ دیتے ہو۔ تو گویا دین کا گوشہ یہ ہوا کہ حکمرانی یا سیاست کا مقصد یہی ہے کہ جو پانی آتا ہے جہاں جہاں نشیب ہوتا ہے وہ اس کو بھر دیتا ہے اور بھر کر آگے چلا جاتا ہے۔ نشیب وفراز میں ہمواریاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جہاں کمزور آیا اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔ یہ دین کا ایک اور گوشہ سامنے آیا۔ اس کے بعد قومِ ثمود آتی ہے جن کی طرف حضرتِ صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ یہ انسانوں کے لیے' مویشیوں کے لیے' ہر جاندار کے لیے' ذریعۂ رزق ہے اور اس میں سے ہر ایک کی ضرورت یکساں طور پر پوری ہونی چاہیے۔

چار ہزار سال قبل قوموں کے تمدن پر جنسی بدنہادی کے اثرات سے آگاہی کی تعلیم

اب اس کے بعد ہمارے سامنے حضرتِ لوط علیہ السلام آتے ہیں' قومِ لوط آتی ہے۔ یہاں سوال جنسی تعلق کا آ گیا ہے۔ جنسیات کے متعلق اب تک عام طور پہ نگاہ اسی طرف جاتی ہے کہ اگر یہ تعلق شادی کی عقد یا معاہدہ کے بغیر قائم کیا جائے تو اس سے سوسائٹی کے کچھ قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح سے ہونے والی اولاد' اس باپ کی اولاد نہیں کہلاتی' وہ جو عورت ہے وہ بیوی کے حقوق نہیں لے سکتی۔ آج تک مختلف مہذب قوموں نے جو بھی قوانین اپنے ہاں بنائے ہیں ان میں تو یہ وہاں تک چلے گئے ہیں کہ یہ جنسی تعلق بھی اگر ایک بالغ مرد اور لڑکی میں باہمی رضا مندی سے ہو تو سوسائٹی اس کو بھی جرم قرار نہیں دیتی۔ شادی شدہ مرد یا

عورت کے ساتھ ہوتو جرم صرف اتنا ہی ہے کہ اگر وہ عورت ہے تو اس کا مرد اس پر یہ دعوٰی کر سکتا ہے کہ مجھے اس سے یہ نقصان پہنچا ہے اور اگر وہ یہ دعوٰی نہ کرے تو قانونِ ریاست یا معاشرہ اس کو جرم قرار نہیں دیتا۔ زنا بالجبر کو جرم قرار دیا گیا ہے اور بالجبر تو کسی سے پیسے بھی چھین لیجیے تو وہ جرم ہے۔ طبی نقطہ نگاہ سے یہاں تک ہی کہا گیا ہے کہ یہ توانائی بڑی قیمتی ہے' اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے' صحت پہ اثر پڑتا ہے۔ لیکن آپ حیران ہوں گے کہ قرآنِ کریم کم از کم چار ہزار سال پہلے کی بات کرتا ہے بلکہ اس سے بھی پہلے کی اور کہتا یہ ہے کہ یہ جنسی بے راہ روی قوموں کو لے کر ڈوب جاتی ہے۔ یہ نکتہ کسی کے سامنے ہی نہیں آیا تھا۔ اب بھی اگر ذہن میں سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل ایک عورت اور مرد کا انفرادی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ سوسائٹی جو قانون بنائے' جو پابندیاں عائد کرے' وہاں تک تو بات ٹھیک ہے کہ مثلاً سوسائٹی نے کہا Keep to the left ' بائیں طرف چلو تو اس میں کوئی اخلاقیات کی بات نہیں۔ اس کے باوجود کیونکہ سوسائٹی نے ایک پابندی عائد کی ہے' اس پابندی کا توڑنا جرم قرار پائے گا۔ تو سوسائٹی نے جو جنسی تعلقات کے متعلق پابندیاں عائد کی ہیں بس ان کا صرف احترام ہونا چاہیے' ان کو توڑ یئے گا تو جرم ہو جائے گا۔ لیکن یہ چیز کہ یہ جو انفرادی فعل ہے' جسے آپ جنسی تعلقات کی بے راہ روی کہتے ہیں' جسے Sex Pervertion کہا جاتا ہے' بدنہادی کہا جاتا ہے' اس سے قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اکثر یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ غور کیجیے۔ یہ ہیں وہ گوشے جہاں بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ فکر قرآنی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہے۔

میں عرض کروں گا کہ اس دور میں کچھ ایسے محقق پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے عمر ہی اس میں صرف کی ہے اور تحقیق کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے جو بات کہی تھی واقعی صحیح بات کہی تھی: ''جنسی تعلقات میں بے راہ روی سے قوم تباہ ہو جاتی ہے''۔ یہ جو ہم قرآن کے مدعی ہیں ہمارے ہاں تو کبھی تحقیق کی نگاہ ہی نہیں گئی۔ ان لوگوں نے یہ کچھ کہا ہے جن کا اس قرآن سے کچھ تعلق نہیں' کچھ واسطہ نہیں۔ آزادانہ طور پر وہ تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ آواز ہمارے اس دور میں پہلی دفعہ بلند ہوئی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ اس بے راہ روی کا اثر صرف افراد پر نہیں ہوتا' قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں جب بھی اس مسئلے کو لیتا ہوں اگرچہ بہت سا لٹریچر اس کے بعد بھی موجود ہے اور قرآن کی رو سے اور لٹریچر بھی سامنے آتا ہے لیکن اس موضوع پر انون ❶ کی وہ جامع کتاب ❷ ہی ہے جس کے میں عام طور پر ریفرنسز یعنی حوالے دیا کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ اس نے آسٹریلیا میں بسنے والے' افریقہ میں بسنے والے' 80 قبائل کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ ان کے اندر رہ کر اسی ایک نکتے

---

❶ Dr. J.D. Unwin

❷ اس کتاب کا نام ہے: Sex and Culture (جنس اور تمدن)

پہ تحقیق کی کہ جنسی پابندیوں سے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور جنسی بے راہ روی سے کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ شخص سولہ مہذب قوموں کے اندر گیا اور اتنا Data (معطیات) اکٹھا کرنے کے بعد اس نے نتائج مرتب کر کے دنیا کو دیئے ہیں۔ تو یہ جو جنسی توانائی کا زیاں ہے یعنی اس کو اس سے سوال نہیں ہے کہ اس میں قانونی طور پر کون سی چیز ناجائز ہے اور کون سی جائز ہے اس کا تو اس کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ تو خالص Biological یعنی حیاتیاتی اور Sociolgical یعنی تمدنی نقطہ نگاہ سے تحقیق کرتا ہے۔ وہ Sexual Opportunities کو جنسی مواقع کہتا ہے۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ مواقع (Opportunities) کہنے سے ہمارے ہاں کی وہ چیزیں آتی ہیں جو ہم اپنے آپ کو فریب میں رکھ کر کہتے ہیں کہ وہ سب جائز ہیں۔

جنسی بدنہادی میں گرفتار قوم تین نسلوں کے بعد بالکل تباہ ہو جاتی ہے

اس ❶ کے ہاں جائز اور ناجائز نہیں ہے۔ اس کے ہاں سوال یہ ہے کہ کس قسم کی پابندیاں ہیں جن سے قومیں عروج کی طرف جاتی ہیں اور ان پابندیوں کو توڑنے سے قومیں کس طرح سے زوال کی طرف جاتی ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جس قوم کے اندر Sexual Opportunities (جنسی مواقع) زیادہ ہوں وہ قوم زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک بچ سکتی ہے قریباً سو سال کے بعد تو دنیا کی کوئی قوت اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ یعنی اس قوم کی سیاست نہایت اعلیٰ ہو' معیشت نہایت بلند ہو' ان کی معاشرتی زندگی نہایت اچھی ہو' باقی اخلاق بھی نہایت عمدہ ہوں لیکن یہ جو صرف جنسی بے راہ روی ہے وہ اس قوم کو زیادہ سے زیادہ سو سال کی مہلت دیتی ہے' اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دیتی ہے۔ اس ❶ نے اعداد و شمار سے' تاریخی حوالوں سے' یہ چیز ثابت کی ہے۔ قرآن اس باب میں اس قوم کو پیش کرتا ہے جس نے جنسی تعلقات کی صورت کے لیے زنا کا سوال اٹھایا ہے۔ میں اپنی بہنوں سے' بیٹیوں سے' ذرا معذرت چاہوں گا۔ موضوع ہی ایسا آ گیا ہے' مجھے بیان کرنا پڑتا ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ جہاں جنسی بے راہ روی ہے' اس کے ہاں زنا یا جائز تعلق کا سوال نہیں ہے۔ میں نے یہ کہا کہ جنسی مواقع سے جنسی توانائی کو ضائع کرنا ہے۔ اس کی انتہائی شکل وہ ہے جسے Homo Sexuality کہتے ہیں۔ قومِ لوط کا یہ لفظ بھی وہاں سے آیا ہوا ہے' جیسا ہماری زبان میں یہ لفظ لواطت آ گیا ہوا ہے اگرچہ میں اس کو استعمال نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس میں حضرتِ لوطؑ کا بھی لفظ درمیان میں شامل ہو جاتا ہے۔ بہر حال قرآن نے اس چیز کو بطور مثال پیش کیا ہے۔

---

❶ ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ انون

اصل مسئلہ جنسی توانائی کی اہمیت کا ہے

جنسی زیاں کی جتنی صورتیں بھی ہیں' آیا کہ یہ مرد اور عورت کا جائز جنسی تعلق ہے' یا مرد اور عورت کا ناجائز جنسی تعلق ہے' وہ تو مرد اور عورت کے اس تعلق پہ بحث ہی نہیں کرتا۔ جسے آپ جنسی توانائی کا زیاں کہتے ہیں' وہ اسے لیتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے یا قانون کی رو سے' کسی مذہب کی' شریعت کی رو سے' جو نہایت صحیح جائز جنسی تعلقات ہیں' ان میں بھی اگر جنسی توانائی کا زیاں ہوتا ہے تو وہ اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تمہاری اپنی Satisfaction (تشفی) ہو جاتی ہے یا جو تمہارے ہاں کی معاشرتی زندگی کی بات ہے کہ تم نے جائز اور ناجائز میں تمیز کر دی اور اس کی حدود کھینچ دیں ہیں' میں تو اس سے بحث نہیں کرتا' میرے نزدیک تو جس طرح سے' جن مواقع سے بھی' یہ توانائی ضائع ہو جاتی ہے' اس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن انتہائی شکل پیش کرتا ہے۔ قرآن نے اس جنس کی توانائی کے زیاں کی جو انتہائی شکل ہے اسے پیش کیا ہے اور یہ قوم لوط ہے۔

میں پہلے اسے پیش کروں گا کہ قرآن کہتا کیا ہے اور آج کی تحقیق کس طرح اس کی تائید کر رہی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ** (26:160)۔ پہلے انبیائے کرام کے سلسلے میں بھی یہ آیات اسی طرح سے آئی ہیں کہ قومِ لوطؑ نے بھی خدا کے فرستادگان کی تکذیب کی یعنی انہوں نے کہا کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا تو انہوں نے کہا کہ جھوٹ بولتے ہو' تباہی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے تکذیب۔ پھر کہا کہ **اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:161) ان کے بھائی بندوں میں سے لوطؑ ایک پیغمبر تھا اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ پیغمبر اسی قوم کے اندر سے آتا ہے تاکہ اس کی پہلی زندگی اس قوم کے سامنے ہو اور وہ اپنی پہلی زندگی کو اپنے دعویٔ نبوت کی صداقت میں پیش کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ **اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:161) کیا تم تباہی سے بچنا چاہتے ہو؟ **اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ** (26:162) میں اپنی طرف سے نہیں کہتا' خدا کا پیغام دیتا ہوں اور اس کا نتیجہ تمہیں اس تباہی سے بچانا ہے' میں تمہارے لیے امن کا پیغامبر ہوں اس لیے **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ** (26:163) قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو اور اجتماعی طور پر میری اطاعت کرو' میری ذاتی اطاعت نہیں قوانین خداوندی کی اطاعت ایک اجتماعی نظام کی شکل میں کرو جس کا میں پہلا سربراہ ہوں۔ یہ ہوتا ہے اسلامی نظام۔

قوم کی فلاح و بہبود کی خاطر کسی سے معاوضہ کا طالب ہونا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (26:164)۔ یہ وہی بات ہے جو پہلے درس

میں آ چکی ہے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اور اتنی کوشش کرتا ہوں' اس کے لیے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ اس کے ذمے ہے جس نے یہ فریضہ میرے ذمے عائد کیا ہے' میں اس کا کام کرتا ہوں اس سے پیسے لے لوں گا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ بڑی عظیم چیز ہے۔ ہر لیڈر کے لیے' ہر اس شخص کے لیے جو قوم کی فلاح چاہتا ہے' قوم سے معاوضہ لینا اس کے لیے قرآن کی رو سے قطعاً جائز نہیں ہوتا۔ یہ اپنے ذمے خدا کی طرف سے عائد کردہ ایک فریضہ سمجھتا ہے۔ کام تو یہ اُس کا کرتا ہے تو یہ اِن سے پیسے کیوں مانگتا۔

قومِ لوط کی روشِ زندگی

آگے کہا ہے کہ تمہارا جرم یہ ہے کہ **اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ** [1] (26:165-166) تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جنسی جذبے کی تسکین کے لیے تم یہ روش اختیار کرتے ہو۔ تم نے دنیا جہان سے الگ روش اختیار کر رکھی ہے۔ یہی الفاظ مجھے استعمال کرنے چاہئیں تاکہ وہ جو ذرا سطح ہے وہ تھوڑی سی فٹ آ جاتی ہے۔ تمہاری کیفیت یہ ہے **قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ** (26:167) انہوں نے کہا کہ اے لوطؑ! اگر تم ان نصیحتوں سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں بستی سے نکال دیں گے۔ دوسری جگہ طنزاً ایک بات کہی ہے کہ تم فاسق ہو' فاجر ہو' اس قسم کے بیہودہ کام کرتے ہو۔ **وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ** (7:82) قوم نے آپس میں یہی کہا کہ اگر یہ باز نہیں آتا ہے تو اس کو نکال باہر کرو اور یہ ہیں وہ لفظ **اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ** (7:82) یہ اپنے آپ کو بڑا پاکباز بنا کر پھرتے ہیں جناب! باقی سارے ان کی نگاہوں میں گنہگار ہیں۔ یہ کہیں کے بڑے پاکباز آ گئے۔ اس میں بڑی طنز کی بات ہے کہ جو برائی سے روکتا ہے اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ دنیا کے اندر سب سے نیک آدمی تو یہی رہ گیا' باقی تو سب اس کی نگاہوں کے اندر فسق و فجور میں اٹے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا پاکباز ہے تو ہمارے جیسے خراب آدمیوں کے اندر رہتا کیوں ہے' جائے کہیں جا کے نیک لوگوں میں رہے' ہمارے اندر کیوں رہتے ہیں؟ بڑے پاکباز کہیں کے آ گئے۔!! بالکل Natural (فطری) سی چیز ہے' آج بھی کسی سے بات کیجیے تو یہی بات کہتا ہے کہ ''جا جا میاں! اپنا کم کر۔ جے تینوں بہت برا لگدا ہیگا تے توں چنگے بندیاں اچ جا کے وس لے۔ اسی تو ایہو جئے ای ہیگے آں''[2]۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کے

---

[1] تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے جنسی تسکین کے لیے' دنیا جہان سے الگ روش اختیار کر رکھی ہے۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر' جنہیں تمہارے نشوونما دینے والے نے اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے (کہ ان سے افزائشِ نسل ہو) مردوں کے پاس جاتے ہو۔ تم تو بالکل حد سے گزر گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔852)۔

[2] جاؤ میاں! اپنا کام کرو۔ اگر تمہیں برا لگتا ہے تو تم جاؤ' نیک و پاک لوگوں میں جا بسو' ہم تو ایسے ہی لوگ ہیں۔

پاس دلیل نہیں ہوتی ۔ یہ سب چیزیں اس کی غماز ہیں۔ جس کے پاس دلیل ہے وہ یہ روش اختیار نہیں کرے گا۔ وہ کہے گا کہ تم یوں کہتے ہو' اس طرح سے غلط ہے' یہ اس کی دلیل ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیم ضد کی بجائے دلائل و براہین کا درس دیتی ہے

قرآن پہلے یہ کہہ دیتا ہے کہ جن چیزوں کے خلاف ہم چیلنج کرتے ہیں ان لوگوں کے پاس کوئی برھان نہیں ہے یعنی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر کسی کا کوئی بھی عمل' کسی کی کوئی بھی روش' کوئی بھی مسلک دلیل پر مبنی ہے تو یہ بات ہے کہ وہ غلط نہیں ہوسکتی۔ غلط روش کے لیے کسی کے پاس دلیل نہیں ہوگی۔ اسے کہو کہ دلیل لاؤ اور آپ دیکھیں گے شروع سے آخر تک جتنی قوموں کے خلاف یہ کچھ کہا گیا ہے' انہوں نے اپنے مسلک کی تائید میں کبھی دلیل نہیں دی۔ جذبات سے کام لیا۔ انہوں نے کہا کہ بڑے پاکباز بنتے ہو۔ نظر آتا ہے کہ یہ بڑی جاہل قوم تھی' ان کے اندر جہالت تھی۔

صاحبِ بصیرت ہونے کے باوجود سرکشی اور جہالت کے عمل کو اپنائے چلے جانا' ایک خطرناک مرض ہے

قرآن دو لفظوں میں بات کہہ جاتا ہے۔ ایک جہالت اور ہوتی ہے۔ وہ ہے کہ جو صحیح روشِ زندگی ہے' اس کی ایسے ہی تکذیب کرنا۔ کہا کہ **وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ**[1] (27:54)۔ اس قسم کی برائی کی روش تھی اس پہ تم اترے ہوئے ہو' صاحبِ بصیرت ہو' سب کچھ جانتے بوجھتے یہ کچھ کرتے ہو **اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ**[2] (27:55) اس قدر صاحبِ بصیرت ہونے کے باوجود' عقل و ہوش رکھنے کے باوجود' تم جہالت کے اندر ڈوبے ہوئے ہو۔ تو یہ جسے ہم عقل و ہوش کہتے ہیں' علم و سمجھ کہتے ہیں' ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ انسانیت کی جو اقدار ہیں' وہ ان پہ بھی کاربند ہوں۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور آج کا دور تو اسی کا مظہر ہے۔ اس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں کہ قوم لوط علیہ السلام کے بعد اس دور میں یہ چیز پیش آئی ہے۔ یہ کبھی ذہن میں بھی نہیں آیا کرتا تھا۔ میں خود حیران ہوتا تھا۔ وہاں ایک مقام پہ حضرت لوط علیہ السلام ان سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ کرتے ہو' تم ہوش میں آؤ کہ تم کرتے کیا ہو؟ **اَلَيْسَ مِنْكُمْ**

---

[1] اسی طرح لوطؑ کی سرگزشت ہے جس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سب کچھ دیکھتے بھالتے' سمجھتے سوچتے' اس قدر کھلی ہوئی بے حیائی کا کام کرتے ہو! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 872)۔

[2] تمہاری حالت یہ ہے کہ تم جنسی خواہش کی تسکین کے لیے' عورتوں کو چھوڑ کر' مردوں کی طرف آتے ہو۔ یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 872)۔

رَجُلٌ رَّشِيْدٌ (11:78) کیا تمہاری ساری قوم میں ایک بھی رجلِ رشید نہیں ہے کوئی ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں ہے کوئی ایک شخص بھی نہیں ہے جو عقل و ہوش سے کام لے؟ تو عقل و ہوش کی بات اسی لیے کہی کہ خود قرآن نے یہ بات کہی ہے اور دیکھیے کہ یہ جو کم بخت Sex (جنس) ہوتا ہے اس کا نشہ یا بدمستی کتنی شدید ہوتی ہے۔ کہا کہ حضرت لوطؑ ان سے کہتے تھے کہ تمہاری بیویاں موجود ہیں۔ اور یہاں میں یہ بات عرض کردوں کہ حضرتِ لوط علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ تم جنسی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف آتے ہو یہ کتنی بڑی جہالت کی بات ہے اور اس کو پھر پوچھیے نہیں کہ زیب داستان کے لیے ہمارے ہاں کے مفسرین نے اس میں جو حاشیہ آرائی کی ہے اور وہ کس قدر گھناؤنی ہے۔

ہمارے ہاں کے گزرے ہوئے دور کی ایک باوقار ریت

کہنے کی بات یہ تھی کہ صاحب! انہوں نے اپنی بیٹیاں پیش کر دیں (معاذ اللہ معاذ اللہ) حالانکہ یہ عام روزمرہ کے محاورے کی بات ہے۔ میں نے ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ میری بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے میں اس قسم کی برہنہ گفتگو نہیں کرسکتا۔ ہر بڑا آدمی بزرگ نہ بھی ہو عمر میں بھی بڑا آدمی ہوتا ہے وہ قوم کی عورتوں کو بیٹیاں کہہ کر پکارتا ہے عام اخلاق کا بھی تقاضا ہے کہ اگر ہم عمر ہیں تو ان کو بہنیں کہا جاتا ہے۔ اردو میں تو یہ بات نہیں۔ ہمارے ہاں پنجابی میں ابھی کل تک یہ چیز محسوس ہو رہی تھی۔ جب کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو لڑکی ماں سے جا کر کہتی تھی: ''اماں باہر ایک بھائی آیا ہے''۔ ہمارے ہاں کہا ہی یہ جاتا تھا۔ بازار میں راستہ لینے کے لیے کہا جاتا تھا: ''او بھائی ذرا ایدھر تے ہو'، او بھائی ہٹیو ذرا''[1] یعنی بھائی جو لفظ تھا وہ ہمارے ہاں ہر عورت ہر لڑکی استعمال کرتی تھی۔ اسی طرح سے ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ جو عمر میں ذرا بڑے ہوتے تھے وہ بیٹیاں کہتے تھے برادر کی حیثیت سے بہنیں کہتے تھے۔ یعنی یہ انداز ہے جس کے لیے یہ کہا ہے۔ انہوں نے بجائے ازواجکم (26:166) کہنے کے کہا کہ تمہاری بیویاں میرے لیے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں[2] تو اس میں کون سی ایسی بات کہہ دی جناب!

---

[1] اے بھائی! تھوڑا سا ادھر ہو جائیے۔ اے بھائی! تھوڑا سا ہٹ جائیے۔

[2] قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ (11:78) لوطؑ نے انہیں کہا (کہ) یہ تمہاری بیویاں جو میرے لیے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں تمہارے لیے جائز اور مناسب ہیں قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ (11:79) انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے جنہیں تُو اپنی بیٹیاں کہتا ہے کچھ دلچسپی نہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 509)۔

قرآنِ حکیم نے جنسی بدنہادی کے مرض کو اجتماعی جرم کیوں قرار دیا گیا؟

اب سوال یہ ہے کہ یہ جو روش تھی' قرآن نے اسے اتنا بڑا اجتماعی جرم کیوں قرار دیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم جنسی توانائی کو افزائشِ نسل کا ایک ذریعہ بتاتا ہے' اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ جہاں اس توانائی کا مقصد یا منتہا یہ نہ ہو' اسے ضائع نہ کیا جائے۔ اس کے لیے آج اپنے معاشرتی قوانین یا مذہب کے قوانین' جو بھی آپ کے ہاں کے ہیں' ان کی رو سے آپ اس کا کوئی بھی نام رکھ لیجیے' اسے کچھ بھی کہہ لیجیے' خواہ اسے جائز قرار دے لیجیے' اگر وہ مقصد یہ (افزائشِ نسل) نہیں ہے تو پھر اس میں زیاں آ جاتا ہے۔ اور اسی لیے قرآن نے یہ جو اس کی انتہائی شکل یہاں بیان کی ہے اس کے لیے اور لفظ استعمال کیا ہے اور یہ ہے اصل میں جسے میں اب اجتماعی جرم کہوں گا یا جسے اجتماعی بدنہادی کہا جائے گا۔ اس کی وجہ قرآن نے دو لفظوں میں خود بیان کر دی کہ **اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ** (29:29) تم اس جنسی جذبۂ ہوس کی تسکین کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو (7:80-81) اور اس طرح اس راستے کو منقطع کرتے ہو جسے فطرت نے افزائشِ نسل کے لیے تجویز کیا ہے [1] اس طرح جنسی توانائی کا یوں زیاں کرتے ہو۔ کہا کہ فطرت نے ازواج سے نسل کا راستہ بنایا تھا' تم اس کو منقطع کرتے ہو۔ غور سے دیکھیے کہ یہ چیز کیا ہے جسے زنا کہتے ہیں۔ آج بھی جو جنسی تعلق ہوتا ہے' اس میں آپ دیکھیں گے کہ پہلی چیز یہی ہوتی ہے۔ یہاں یہ شادی والی بات نہیں ہوتی۔ یہاں انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح سے یہ اولاد والی صورت پیدا نہ ہو۔ یہ **تقطعون السبیل** ہے یعنی جس مقصد کے لیے فطرت نے یہ مصرف تجویز کیا تھا' یہ اس کی خلاف ورزی ہے۔ فطرت کا یہ مقصد نہیں تھا کہ تم اس کو قطع کرتے رہو۔ یہ ہے وہ جرم جو گنایا گیا ہے: **قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ** (26:168) لوطؑ نے کہا کہ جو کچھ تم کرتے ہو' میرے نزدیک یہ بڑا ہی قابلِ نفرت ہے' میں اس سے بہت تنگ آ چکا ہوں۔ اور پھر اس کے بعد جب وہ کہتے ہیں کہ تم باز نہ آؤ تو ہم یہ کریں گے' وہ کہتے ہیں کہ ایک رجل رشد بھی تمہارے ہاں نہیں [2] ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنے نشوونما دینے والے سے عرض کیا کہ **رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ** [3] (26:169)۔

---

[1] یاد رہے قطع السبیل کے معنی رہزنی کے بھی ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 917)' فٹ نوٹ 1۔

[2] (11:78)

[3] اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے رفقاء کو اس تباہی سے بچالے جو ان لوگوں پر' ان کے اعمال کے نتیجے میں آنے والی ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 852)۔

جنسی معاملے میں آج کے ترقی یافتہ ممالک کی ذلت آمیز حالت

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ کبھی میرے ذہن میں آتا تھا کہ کیا پوری قوم کی قوم کبھی اس قسم کی فحاشی میں بہہ جاتی ہے۔ جس دن میرے سامنے انگلستان کا یہ فیصلہ آیا کہ پوری قوم نے اس کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے' ہم انہیں کھڑے ہو کے کہہ سکتے ہیں کہ او ساری قوم! تمہارے ہاں ایک بھی رجل رشید نہیں ہے۔ چار ہزار سال پہلے کا بھی قصہ ہے کہ پوری کی پوری قوم کو قرآن سامنے لے آیا ہے۔ آج اس دور تہذیب وتمدن میں وہ قومیں جو بلندی کی معراج پر پہنچی ہوئی ہیں' ان کے ہاں یہ چیز افراد تک ہی نہیں رہی' قوم اپنے ہاں قانون بنا کر اس کو جائز قرار دیتی ہے صاحب! پوری قوم اس کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔ وہ یہی چیز تھی جو قومِ لوط علیہ السلام کے متعلق تھی۔ وہ کیا تھا؟ قوم ہی اس کو جائز سمجھتی تھی اس لیے قانوناً جائز ہو گیا اور قانون کیا ہوتا ہے؟ یہ قوم کا Interest (مفاد) ہی تو ہوتا ہے۔ اس باب میں وہ اسے مذموم نہیں سمجھتے' انہوں نے اسے Declare (ظاہر) کر دیا۔ آئینی طور پہ اسے قانون کہتے ہیں۔ اگر ایسی چیز قانون میں نہ ہو' اور مصلحتاً آپ اسے اپنے ہاں برا سمجھیں ہی نہیں تو یہ وہی بات ہو گئی۔ جب حضرت لوطؑ نے دیکھا کہ قوم باز ہی نہیں آتی تو اس کے بعد کچھ عام ری ایکشن (ردعمل) تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ صاحب! میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا' سمجھایا بجھایا' نہیں باز آتے تو نہ باز آئیں' میرا اس میں کیا بگڑتا ہے لیکن یہ جو چیز ہے کہ رسول کو تو یہ پتہ ہے کہ یہ وہ خطرناک مرض ہے' جس سے قوم تباہ ہو جاتی ہے ورنہ ہماری نگاہ افراد تک ہی جاتی ہے کہ ٹھیک ہے صاحب! یہ افراد ہیں' تباہ ہو جائیں گے' قوم تباہ نہ ہو گی۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل وعیال کی تعریف

اس تباہی سے بچنے کے لیے حضرت لوطؑ نے اپنے نشوونما دینے والے سے عرض کیا کہ **رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ** (26:169) یااللہ! مجھے اس تباہی سے بچالے اور جو میرے یہ ساتھی ہیں انہیں بھی۔ یہاں پھر وہ اہل کا لفظ آیا ہے۔ یہ وہی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن آیا تھا۔ اب ہمارے ہاں یہاں تو اہل بچوں کو سمجھا جاتا ہے۔ اہل وعیال میں تو آج بھی ہمارے ہاں یہ بیوی بچے آتے ہیں۔ تو اہل کا لفظ تو یہاں بھی آیا ہے اور پھر یہ ہے کہ **فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ** (26:170) ہم نے اسے اور اس کے جو اہل تھے' ان کو بچالیا اور اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ **اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ** (26:171) اس کی جو بیوی تھی وہ نہیں بچی کیونکہ وہ ان میں سے نہ تھی۔ وہاں بیٹا بھی اہل نہیں ہے' وہ اس آئیڈیالوجی میں باپ کا شریک نہیں ہے۔ یہاں بیوی بھی اہل نہیں ہے' وہ خاوند کے ساتھ اس آئیدیالوجی میں شریک نہیں ہے۔ اہل کا لفظ کہاں آئے گا؟ ہمارا وہ ہے جو ہمارے

ساتھ چلتا ہے' بات ختم ہوگئی۔ اہل کا لفظ یہاں آیا ہے۔ دوسری جگہ آل کا لفظ آیا ہے۔ تو قرآن تو قدم قدم پہ بتاتا ہے کہ جو اپنے اور بیگانے ہیں' ان کی وجہِ امتیاز کیا چیز ہے؟ یہ صرف آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ تو یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی بھی ان کے اہل میں سے نہ تھی۔ **ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ۝ وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ۝ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ** [1] (26:172-174) جو پھر باقی تباہ ہوئے اور وہ اسی لیے تباہ ہوئے کہ وہ لوطؑ کی ان باتوں کو صحیح نہیں مانتے تھے۔ یہ وہی ہے جسے ہم اس پر ایمان لانا کہتے ہیں لیکن اگر یہ ایمان نہیں لائیں گے' تو نہ لائیں۔ اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ **وَاِنَّ رَبَّکَ لَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ** [2] (26:175)۔ یہ وہی آخری الفاظ آئے ہیں جو ہر قصے کے بعد ہم پہلے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ خدا عزیز بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ مستبد' غلط کار' غلط کوش' کے حق میں اس کا قانون تباہی لے آنے والا ہے' یہ غالب ہوتا ہے۔ یہ اس کا عزیز ہونا ہے۔ ان کی تباہی دوسروں کے لیے باعثِ رحمت بن جاتی ہے یہ اس کا رحیم ہونا ہے۔ حضرتِ نوحؑ نے جب یہ کہا تھا کہ یا اللہ! ان کو تباہ کر دے اور کہا تھا کہ ان میں سے ایک بھی نہ چھوڑ تو وہاں یہ بات کہی تھی کہ میں جو یہ کہتا ہوں کہ ایک بھی نہ چھوڑ' وہ اس لیے کہتا ہوں کہ ایک بھی چھوڑا تو وہ آگے اسی قسم کے اور پیدا کرے گا۔ یعنی سانپ کو مار کر اگر اس کا ساتھی چھوڑ دیتے ہیں' تو چند دنوں کے بعد اس میں سے سپولیے اور نکل آئیں گے۔ یہاں عزیز و رحیم قرآن نے کہا ہے۔ قومِ لوطؑ کے واقعات میں' مختلف آیات میں' مختلف مقام پر' یہ چیزیں جستہ جستہ مفہوم پہ آتی ہیں' ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قوموں کے تباہ و برباد ہونے کی انتہائی شکل یونان اور اٹلی کی مثال ہمارے سامنے ہے

عزیزانِ من! اصل بات وہ ہے جو میں نے شروع میں کہی ہے اور جسے اب ذرا وضاحت سے پیش کرنا چاہوں گا کہ جنسی بے راہ روی سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق مومن یا اس جیسے محققین کے نزدیک وہ لفظ ہے جو وہ [3] اس کے لیے استعمال کرتا

---

[1] چنانچہ ہم نے ان سب کو جو اس طرح پیچھے رہ گئے تھے' تباہ کر دیا (26:172) اور یہ تباہی ان پتھروں سے ہوئی جو کوہِ آتش فشاں نے ان پر برسائے تھے۔ کیسی تباہ کن تھی یہ بارش جو ان پر ہوئی جنہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے لوطؑ کی بات نہ مانی تو ہلاک ہو جاؤ گے (26:173)۔ اس واقعہ میں اربابِ بصیرت کے لیے سامانِ صد موعظت ہے لیکن اس کے باوجود ان لوگوں میں سے اکثر خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں لائیں گے (26:174)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 852 تا 853)۔

[2] اس کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ آخرالامر غالب آئے گا اور یہ لوگ نوعِ انسان کی نشوونما کے راستے میں جو روڑے اٹکا رہے ہیں' وہ انہیں دور کر دے گا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 853)۔

[3] یہ اشارہ ڈاکٹر جے ڈی انون کی طرف ہے۔

ہے۔ وہ اسے واضح ترین تباہی کہتا ہے' وہ اسے علمی گوشوں کی تباہی کہتا ہے۔ اس سے بھی مراد یہ ہے کہ یہ نہیں ہے کہ زلزلہ آتا ہے تو ساری کی ساری قوم اس گڑے میں جا گرتی ہے اور اس طرح تباہ ہو جاتی ہے۔ جس قوم کی تہذیب' تمدن اور جس کو یہ لوگ کلچر کہہ کر پکارتے ہیں' اعلیٰ ہے' وہ دنیا میں باقی اقوام کے مقابلے میں عروج پر پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر ایسی قوم کی صورت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اس قوم کا تہذیب تمدن' کلچر اور اس کا علم اور سائنس' یہ سب ختم ہو جاتا ہے تو اس سے زیادہ کسی قسم کی تباہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ تمدن کے عروج پہ پہنچ کر پھر زوال کی طرف' پستی کی طرف آنا تو ایک طرف' جن قوموں میں ابھی تک تمدن اور تہذیب آئی نہیں ہے انہیں ہم صف آدمیت میں شمار نہیں کرتے' ان کو وحشی قبائل کہتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ یہ جو قومیں ہیں کسی زمانے میں یہ بھی عروج پر ہوں۔ بڑی بڑی قومیں مثلاً اہل یونان دیکھیے۔ آج کسی بڑی قوموں میں ان بیچاری کا شمار ہی نہیں ہو رہا حالانکہ جب تاریخ اپنا پہلا صفحہ الٹتی ہے تو اس یونان کا یہ خطہ علم و بصیرت اور فلسفہ اور حکمت کے معراج کمال پر نظر آتا ہے۔ یہ اٹلی والے آپ دیکھیے کہ آج ان کا شمار دنیا کی کسی زندہ قوم میں نہیں ہو رہا۔ کچھ عرصہ پہلے تک جب کپڑے کی ملز نہیں بنی تھیں' اٹالین ایک کپڑا آیا کرتا تھا۔ وہ صرف استر کے کام آتا تھا یا اٹلی کے ہاں کے بٹن آیا کرتے تھے' آج ان کا نام تک نہیں ہے مگر آج بھی اٹلی کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہوٹلوں کے اندر وہ جو ہیڈ خانسامے ہیں' وہ ان کے ہاں کے ہوتے ہیں۔ رومن ایمپائر کا لفظ سنتے ہوئے' آپ دیکھیے کہ ذہن میں کیا نقشہ آتا ہے' پوری دنیا میں اس قوم نے تہلکہ مچا رکھا تھا' آج تعداد کے اعتبار سے قوم زندہ ہے' بڑھی ہوئی ہے مگر زندہ قوموں کی صف میں اس کا شمار نہیں ہو رہا۔ کہا گیا ہے کہ تہذیب' تمدن' علم سے وہ محروم ہو گئی۔ اسی کو قوم کی موت کہا جاتا ہے۔

جنسیات کے شعبہ پر J.D.Unwin کی تحقیق اپنی مثال آپ ہے

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اس باب میں J.D.Unwin کا نام سرفہرست ہے۔ وہ بہت بڑا محقق ہے'[1] پروفیسر ہے' اس کی کتاب کا نام ہے: ''Sex & Culture'' میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب اپنے کمرے میں بیٹھ کر نہیں لکھی' اس نے اپنی ساری عمر اس تحقیق میں صرف کر دی۔ اور وہاں کے محققین کی تو کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک کیڑے کے اوپر تحقیق کرتے ہیں تو اس میں پوری عمر صرف کر دیتے ہیں۔ یہ تو موضوع ہی ایسا تھا جو اس سے پیشتر کسی نے نہیں لیا تھا۔ اس نے ساری عمر اس پہ صرف کی ہے۔ اور ان لوگوں کا انسانیت کے اوپر کتنا بڑا احسان ہے کہ اپنی ساری عمر صرف کر دیتے ہیں اور اس کے

---

[1] یاد رہے یہ بات جولائی 1978ء کی 14 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

بعد اس کا ماحصل یہ ضخیم ❶ کتاب ہے۔ ابتدا ہی میں وہ یہ کہتا ہے کہ کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو' اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اور صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔ اب دیکھ لی مسئلے کی اہمیت۔ میں نے عرض کیا ہے اس کی اہمیت ذرا آگے چل کر سمجھ میں آئے گی۔ جس قوم نے Sex (جنس) کے زیادہ سے زیادہ مواقع (Opportunities) اپنے ہاں پیدا کیے ہیں وہ قوم زوال میں آتی ہے اور جس قوم نے ایسے قوانین یا حدود مرتب کیے ہیں جس میں یہ مواقع کم از کم رہ جاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ وہ قوم اوپر چڑھتی ہے۔

قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر نہایت ہی غور وخوض کا متقاضی ہے

ابھی میں عرض کروں گا کہ ہماری حالت یہ کیوں ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کہنے سے پہلے آپ کی سمجھ میں بات آ گئی ہوگی۔ اس نے جنسی مواقع (Sexual Opportunities) کا لفظ دیا ہے' جائز اور ناجائز کا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مواقع کتنے زیادہ ہیں۔ آگے لکھتا ہے کہ اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہوگئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی' جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی تمدنی سطح بلندی پر پہنچی تھی۔ آپ مسئلے کی اہمیت دیکھتے چلے جایئے اور آگے چل کر یہ کہتا ہے کہ جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد یعنی قریباً سو سال میں نمودار ہوتے ہیں۔ اتنا سا مہلت کا وقفہ فطرت دے دیتی ہے۔ کہ پھر بھی یہ سمجھ جائیں' اپنے آپ کو سنبھال لیں اور اگر ایسی صورت نہیں ہے تو اسے تین پشتوں کا یا سو سال کا عرصہ ملتا ہے اور پھر اس نے اس زوال کی مثالیں دی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بڑی ضخیم کتاب ❷ ہے اور بڑی تفصیل سے اس نے یہ سب کچھ لکھا ہے۔ اس نے قوموں کی مثالیں دی ہوئی ہیں کہ کتنے عروج پہ وہ قوم تھی' اس نے اپنے ضوابط کے اندر یہ تبدیلیاں کیں' مواقع زیادہ سے زیادہ بہم پہنچائے اور اس کے بعد آپ دیکھ لیجیے کہ پھر کم و بیش اتنا ہی عرصہ تھا جس میں وہ قوم زوال کا شکار ہوگئی کیونکہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ وہ حیوانوں کی طرح بلاتمیز جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے' نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پاس اور کام کے لیے توانائی باقی نہ رہی۔ اب اگر کسی قوم کے ہاں جنسی تعلقات یا مواقع کے اوپر پابندیاں نہ رکھیں اور پھر وہ قوم تہذیب اور تمدن کے اندر آگے بھی بڑھتی چلی جائے تو اس سلسلے میں وہ کہتا یہ ہے کہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ جنسی پابندیوں کو بھی ہٹا دیا جائے اور قوم کی زندگی ان کے خیال میں پھر بھی متمدن

---

❶ یہ کتاب بڑی تقطیع کے 676 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

❷ ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ انون کی کتاب Sex and Culture

ہوتی رہے جو ایک تمدن کا ثمرہ ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی ہیئت کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ یہ دونوں آرزوئیں کبھی یکجا نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک دوسرے کی نفی ہیں۔ جو ریفارمر (مصلح) ان میں مفاہمت یا Compromise کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کی مثال اس احمق بچے کی سی ہے جو چاہتا ہے کہ وہ اپنے کھانے کو کھا بھی لے اور پھر وہ سالم کا سالم باقی بھی بچ جائے۔

جنسی بدنہادی کے باعث تخلیقی توانائیاں پامال ہو جاتی ہیں

کوئی انسانی معاشرہ ہو' اسے ان دو راہوں میں سے' کوئی ایک راہ اختیار کرنا ہوگی یا تو ان صلاحیتوں کو پائندہ رکھنے کی جو اس کے تمدن کو بلند کرتی ہیں اور یا جنسی آزادی کی راہ۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ جو قوم ان دو متضاد کو اکٹھا کرتی ہے وہ اپنی تہذیب کو ایک نسل سے بھی زیادہ آگے نہیں لے جا سکتی۔ کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر لے۔ اگر جو قوم اس قسم کے نظام کو جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔ اس کے بعد وہ مختلف قوموں کی مثالیں دیتا چلا جاتا ہے۔

وحدتِ زوج کا اصول تمدن کی شان وشوکت کا ضامن ہے

وہ کہتا یہ ہے کہ انسانیت کی علمی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش اور تربیت وحدت زوج (Monogamy) کی روایات میں نہ ہو' نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنے تمدنی بلندی پہ پاؤں رکھ سکی ہو۔ ایک ایسا شخص جو میں نے کہا ہے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہیں' کسی خاص شریعت کا پیروکار نہیں' زندگی کے حقائق اس کے سامنے نہیں ہیں' خالص حیوانی اور Biological یعنی حیاتیاتی نقطہ نگاہ سے وہ بات کر رہا ہے' کہتا ہے کہ جب عقد نکاح پوری قوم کا مساوی حیثیت سے نہ ہو' یعنی جب آپ عورت کو مساوی حیثیت نہیں دیتے ہیں تو وہاں بھی یہ بات باقی نہیں رہتی۔ پوری قوم کا عقد نکاح مساوی حیثیت سے ہو' عمر بھر کی رفاقت ہو اور اس کے بعد یہ نہ ہو کہ وہ اپنی بیوی کے سوا کسی عورت سے آشنا ہو اور نہ وہ بیوی اپنے میاں کے سوا کسی مرد کی شناسا ہو تو اس صورت میں جنسی مواقع کم سے کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ قوم آگے بڑھ جاتی ہے۔

نتائج اور عمل کے لحاظ سے مجرد کی زندگی اور ازدواجی زندگی میں فرق

اب ذہن میں آیا کہ قرآن نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں ان کی پابندی کرنے سے وہ اقوام کہاں پہنچتی ہیں۔ اس شخص کے سامنے تو قرآن کی آیات نہیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس کا شاہد ہے کہ جن اقوام نے معاشرتی رسوم اختیار کر لی تھیں جو زندگی بھر کی جبری رفاقت کے قریب ترین پہنچ گئیں ہوں، وہ کہتا ہے کہ وہ بھی صحیح نہیں ہوتیں، ان حدود و قیود کی پابندی بطیّب خاطر ہونا چاہیئے اختیارات رکھنے کے باوجود ایسا ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جو Nuns ہوتی ہیں جو ایک عقیدے کی رو سے جبراً عمر بھر کے لیے تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں، ان کے ہاں عروج کی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی ہے، یہ اسی وقت ہوتی ہے جب یہ چیز ہر قسم کے اختیارات رکھنے کے باوجود ہو۔ یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

اختیار و ارادہ کے سلسلہ میں حیوان اور انسان میں فرق

اصل میں انسان اور حیوان میں تو فرق ہی یہ ہے کہ وہاں اختیار نہیں ہوتا۔ جتنی پابندیاں حیوانات پہ ہوتی ہیں، آپ سوچیے تو سہی، انسانی دنیا میں تو اس کی کبھی مثال ہی نہیں مل سکتی۔ حیوان کی مثال دیکھیے کہ پوری توانائیاں رکھتا ہوا ایک بیل، سال بھر گائیوں کے گلے کے اندر پھرتا رہتا ہے وہ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن جونہی فطرت کا اشارہ ہوتا ہے جسے آپ Mating Season (جفتی رُت) کہتے ہیں پھر وہ اس کے اوپر اختیار ہی نہیں رکھتا کہ اس کو اس طرح قابو رکھے۔ اور جب یہ فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے یعنی جنسی تعلق سے استقرار حمل ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہی بیل ہوتا ہے، وہی گائیں ہوتی ہیں، پھر ایک ہی تعلق ہوتا ہے۔ جو اس قسم کی چیز کو، ان مواقع کو، اس حد تک کم از کم لے آتی ہے تو اس کی مثال ہی نہیں ملتی لیکن یہ گائے بھینسیں نہ تو متمدن ہوتی ہیں، نہ مہذب ہو سکتی ہیں۔ وہ تو بیل کے بیل اور گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں اس لیے یہ چیز اپنے اختیار اور ارادے سے نہیں تھی۔ انسانوں کی زندگی میں وہ کہتا ہے کہ یہ تجرد کی زندگی (Celibacy) بسر کرنے سے یہ بات پیدا نہیں ہوتی حالانکہ وہ Nuns عیسائی ہیں۔ اپنے اختیار و ارادے سے یہ چیز کی جائے گی تو پھر یہ بات پیدا ہوگی۔ اب جن اقوام نے جنسی اختلاط کی حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک قائم رکھا تھا وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں تک انسانیت اس وقت پہنچ سکی ہے۔ قبل اس کے کہ میں یہ عرض کروں کہ جو قوم جنسی اختلاط کے زیادہ سے زیادہ مواقع اپنے ہاں فراہم کرتی ہے خواہ اس

نے انہیں اپنی دانست میں اپنے کسی عقیدے کے مطابق جائز ہی کیوں نہ قرار دے لیا ہو' اس کی کیفیت' اس کی حالت کیا ہوتی ہے؟ یہ میں اس کے اپنے ہی الفاظ میں بتاؤں گا' اب ذرا ہم اپنی طرف آ جاتے ہیں۔

جنسی اختلاط کے لیے نکاح کی شرط کیوں؟

قرآنِ کریم نے جو پہلی چیز عائد کی ہے' وہ یہ ہے کہ جنسی اختلاط کے لیے برابری کی سطح پر نکاح کی شرط عائد ہو' مرد اور عورت کے درمیان زندگی بھر کی رفاقت کا معاہدہ ہو۔ یہ انون کے الفاظ ہیں' یہی قرآن کے الفاظ ہیں کہ اپنے اختیار و ارادے سے یہ معاہدہ ہو۔ مرد کے لیے یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے انتخاب کرو جو بہترین انتخاب تمہیں نظر آئے' اس عورت یا لڑکی کے ساتھ تم اپنا معاہدہ کرو گے۔ اس کے بغیر یہ حلال ہی نہیں ہے کہ تم کسی عورت کی مرضی کے خلاف اس سے نکاح کر لو۔ عمر بھر کی رفاقت کا معاہدہ جو عورت سے مساوی حیثیت سے نہ ہو' حلال ہی نہیں ہے اور اس کے بعد قرآنِ کریم وحدت زوج کو تحسین کہتا ہے۔ وہ جو ہمارے ہاں آگے بات چلی ہے کہ یہ معاہدہ اور معاہدے کے ساتھ جب میاں صاحب کا یہ جی چاہے کہ ایک دو تین کہا اور یہ گئی وہ بیچاری روتی دھوتی ہوئی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں اس میں کس قدر مواقع بہم پہنچ رہے ہیں کہ ایک وقت میں چار تک بیویاں جائز ہیں۔

چار چار بیویوں کی اجازت کے سلسلہ میں ہماری مصلحت کوشی اور اس کا نتیجہ

قرآن کریم صرف یہ کہتا تھا کہ اگر جنگ وغیرہ کی صورت میں کہیں ایسی ایمرجنسی آ جائے کہ کچھ بیوہ عورتوں اور یتیم بچیوں کا مسئلہ ہو اور منصفانہ طور پر اس کا حل نہ مل سکتا ہو تو پھر معاشرے کو اجازت دی جاتی ہے کہ جو جو اس کے اہل ہیں' جو عدل کر سکیں' گھر میں جہنم نہ بن جائے' تو وہ ان کو چار تک بصورت نکاح Protection (حفاظت) دیدیں اور آپ ہیں کہ چار چار تک کہہ رہے ہیں۔ یہاں سے یہ آیت [1] شروع ہوتی ہے کہ اگر تمہیں اس قسم کا خطرہ ہو کہ تم اس طرح مختلف افرادِ خاندان میں عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر اسی ایک بیوی والے قانون پر کار بند رہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ نکاح کے خطبے کے اندر یہ آیت جو وہ پڑھتے ہیں تو اس کا **وَاِنْ خِفْتُمْ الا تقسطوا** (4:3) کا جو ٹکڑا ہے یہ پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ نکاح نامہ جو چھپا ہوا ہے' اس میں یہ الفاظ نہیں چھپے ہوئے۔ آپ کے ہاں چار چار کی اجازت ہے' اور ان کے ساتھ وہ تبدیلی ہے جیسے کیلنڈر کو سال

---

[1] وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْيَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3)۔

کے بعد بدلتے ہیں' اس طرح سے ہوتا ہے کہ جب جی چاہے طلاق دی تین رہ گئیں' پھر چوتھی کر لی۔ اس کی ایک مثال سنیے۔ ایک بڑا محقق ❶ تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی :The Mothers۔ یہ بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ آؤ' میں تمہیں بتاؤں کہ یہ مواقع کیسے بنتے ہیں؟ اس نے ایک کرد کا واقعہ لکھا ہے۔ اس نے بھی خود جا کر تحقیق کی ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ ایک کرد نے کہا کہ میں ایک بیوی کا قائل ہوں۔ ایک بیوی کا قائل ہونا سیدھی سی بات ہے۔ کہنے لگا: پھر کیا؟ کہنے لگا کہ یہ جو میری بیوی ہے' یہ چالیسویں بیوی ہے' 39 کو میں نے طلاق دی ہے اور ایک وقت میں ایک ہی ہے۔ یہ ہیں مواقع (Opportunities) چار تو ہونی چاہئیں اور پھر ان کی تبدیلی اس طرح سے کر دی۔ یہ پرانے دور کے جو ہمارے ہاں کے مفسر' محدث ہیں' یہ ان کی باتیں نہیں ہیں۔ اس دور میں آپ کے ہاں یہ جو Latest (جدید ترین) مفسر ❷ ہیں' یہ انہوں نے کہا ہے کہ جنگ میں گرفتار عورتیں سپاہیوں میں بلا تعداد' بلا نکاح بانٹی جائیں' اور سپاہی ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ جب جی چاہے انہیں بیچ کر ان کی قیمت لے سکتے ہیں' انہیں بیچ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ جو اس سے پہلے Establishment (نظام کا اختیاراتی ڈھانچہ) تھی۔ اس میں مولوی نعمت اللہ صاحب نے اس وقت ❸ یہ کہا تھا' جب وہاں یہ چیز آئی تھی کہ آپ کے ہاں Constitution (آئین) میں یہ جو Slavery (غلامی) ہے' یہ ممنوع قرار دی تھی' تو انہوں نے یہ چیز کہی تھی کہ یہ چیز دین میں مداخلت ہے' یہ قانون جو بنا رہے ہو' اسلام کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک لونڈی کی اجازت تو دے دو۔ کل آپ کے ہاں یہ چیز ہوتی تھی کہ لونڈیاں بلا تعداد بغیر نکاح کے ہوں۔

جنسی آلودگی اقوام سے علم وشعور اور فہم وفراست کی دولت چھین لیتی ہے

اب آپ سوچیے کہ دنیا کی کوئی اور قوم بھی ایسی نظر آتی ہے جس میں جنسی اختلاط کے مواقع اتنے زیادہ ہوں۔ یہ ہے وہ بات جو اس نے جنسی مواقع کی کہی ہے۔ اب قرآن یہاں کیا کہتا ہے' اس پر غور کیجیے کہ یہ جو ہم آج یہ کمیٹیاں اور کمیشن بٹھاتے ہیں کہ ہماری حالت ایسی کیوں ہوگئی ہے' دیکھیے ❹ یہ شخص کیا کہتا ہے؟ یہ کہ جو قوم اس قسم کی جنس آلودہ مصنوعی فضا میں صدیوں تک زندگی

---

❶ Robert Briffault

❷ یہ اشارہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1979-1903ء) کی طرف ہے۔

❸ مولوی نعمت اللہ' جمعیت علمائے اسلام کے رکن قومی اسمبلی مجلس دستور ساز کے 1973 کے اسپرنگ سیزن میں اپنی تقریر میں کہا تھا کہ غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے۔ (حوالہ پاکستان ٹائمز (Pakistan Times) کی یکم مارچ 1973 کی اشاعت۔ اس اشاعت میں اس اسپرنگ سیزن کی Proceeding شائع ہوئی تھی' اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ المؤمنون' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2007' ص۔61

❹ یہ اشارہ Sex and Culture کے مصنف Dr.J.D.Unwin کی طرف ہے۔

بسر کرے، اس قوم کی علم وبصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا** (7:179) سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو وہ رکھتے ہیں، اس سے کبھی راہنمائی حاصل نہیں کرتے، وہ واقعات کے اسباب وعلل (Causes) کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتے کہ یہ کیوں ہو گیا۔ جو کچھ ہوتا ہے، اسے اسی طرح سے تسلیم کیے چلے جاتے ہیں۔ جس قوم میں جنسی مواقع زیادہ ہوں، اس کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے۔ اور معاشرتی خرابیاں، سیاسی مسائل، معیشت کی وجہ سے پیدا ہونے والی وہ باتیں، نہیں آ رہیں، صرف اس ایک چیز کے اوپر ہی کہہ رہا ہے۔

تقلید جیسی مہلک بیماری انسان کو مردہ پرست بنا دیتی ہے

ڈاکٹر انون کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے جس کے مطابق وہ چلے جاتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں۔ یہ پوری تقلید ہے۔ وہ ہر غیر معمولی واقعہ جو ان کی سمجھ میں نہ آئے، کسی عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں مثلاً یہ کہ حضرت صاحب کی بددعا کا اثر ہے جو یہ کچھ ہو رہا ہے حالانکہ وہ پانچ سو سال پہلے مر چکے ہیں۔ کہا کہ گو وہ مر چکے ہیں لیکن ان کی قوت زندہ ہے۔ ان کے ہاں یہ بات نہیں ہے کہ میں نے یہ کہا تو اس کی وجہ سے یہ چیز ہوئی۔ ہر غیر معمولی واقعہ جو ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ اسے کسی عجیب وغریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کبھی تو اس قوت کا مظہر پتھروں کو سمجھا جاتا ہے۔ اب ہم نے سمجھ لیا کہ یہ بتوں کو کہتے ہیں، یہ بت تو وہ پتھر ہیں جو کھڑے کیے جاتے ہیں۔ جب ان بتوں کو لٹا دیا جاتا ہے تو آپ کے ہاں مقدس بنا دیئے جاتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ کبھی اس قوت کا مظہر پتھروں کو سمجھ لیا جاتا ہے، کبھی درختوں کو، کہیں درخت پہ جھنڈی بندھی ہوئی ہے، کہیں پیلے رنگ کا تاگا بندھا ہوا ہے، کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی ایسی اشیاء کہ جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ ایک ایک شق لیتے جایئے عزیزانِ من! اور اپنی حالت پہ نگاہ ڈالتے چلے جایئے اور پھر یہ سوچیے کہ جو ڈاکٹر انون (Unwin) نے کہا ہے کہ جو قوم اپنے ہاں جنسی مواقع (Sexual Opportunities) کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دیتی ہے صرف اس چیز کے اوپر وہ لکھتا ہے کہ اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے لیے کسی کمیشن بٹھانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جنسی مواقع (Sexual Opportunities) جتنے زیادہ سے زیادہ جائز طریقے سے، میں کہہ رہا ہوں، شرعاً جائز طریقے سے ہیں اور اس کے بعد وہ حالت ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ آپ یہ دیکھ رہے ہیں۔

ابلیس کی دوکان داری کا سارا راز چانس کی بنیاد پر ہے

اب بات سمجھ میں آئے گی کہ ان قبروں پر جو ہجوم لگا ہوتا ہے' جو لیٹے ہوتے ہیں' پھر صبح سے شام تک چلچلاتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے ہوتے ہیں کہ کبھی تو کچھ اشارہ کریں گے ہی۔ وہ یونہی کسی سے جان چھڑانے کے لیے بھی کچھ کہہ دیا تو اس کے اوپر جا کر نمبر لگا دیئے۔ ابلیس کی جو ساری کاریگری ہے وہ چانس کی ہے' کبھی اتفاقیہ طور پر کوئی نمبر ٹھیک آ جائے تو پوچھو نہیں ان کے قطب بننے میں' جھنڈا لگ جاتا ہے' مرنے کے بعد اتنی بڑی قبر بن جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ محض اتفاقات ہوتے ہیں۔ جن کا کچھ نہیں ہوتا وہ گھر پر بیٹھ جاتے ہیں کہ ''ساڈی قسمت ای ایہو جئی سی''[1] جس کا اتفاق سے لگ جاتا ہے' وہ حضرت صاحب کی ڈگڈگی بجاتا ہے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ تعویذ تاگے گنڈے ورد وظیفے اس قوم میں عام ہوتے ہیں۔ نذر و نیاز ان کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے۔ اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلاً متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانے کے اثرات ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس معاشرے میں انسان پیدا ہوتے ہیں' اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور جب ان کی لاشوں کو تہ خاک دبا دیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ انسان نہیں ہوتے' حیوان ہوتے ہیں **اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ** (7:179) بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر' حیوان تو کبھی یہ کچھ نہیں کرتا جو یہ کرتے ہیں۔

وحدتِ زوج کی زندگی بسر کرنے والی قوم کے نزدیک جنسی اختلاط کا مقصد اور اس کا نتیجہ

اس کے برعکس وہ قوم آئی جو پابندیاں رکھتی ہے' وحدت زوج کی زندگی عمر بھر کی رفاقت کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔ جو جنسی اختلاط ہے اس کا مقصد افزائش نسل ہے جو فطرت نے مقرر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح سے یہ جو توانائی Preserve (محفوظ) کی جاتی ہے اس کا کیا اثر ہوتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ پھر یہی نہیں کہ اس کا صحت پہ اثر پڑتا ہے' میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ لوگ بتاتے ہیں کہ قوم کی تہذیب وتمدن کا دارومدار اس کے اوپر ہے۔ اب اس کی جو وجہ ہے وہ سائنس نے بتائی۔ فرائڈ[2] کا نام

---

[1] ہماری قسمت ہی ایسی تھی۔

[2] Freud, Sigmund (1856-1939) یہ آسٹریلوی طبیب نفسی (Prychiatrist) ہے۔ اس کی خاص طور پر دو کتب The Interpretation of Dreams(1899) (خوابوں کی تعبیر) اور The Ego and Id (1923) نے بیسوی صدی کی فکر کو متاثر کیا ہے۔ اس نے تحلیلِ نفسی کا نظریہ پیش کیا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا۔ ہمارے دور میں سائیکولوجی اور خاص طور پہ جسے Psycho-Analysis (تحلیل نفسی) کہتے ہیں اور جنسیات کے اوپر تو پوچھو ہی نہیں وہ سند مانا جاتا ہے' اگرچہ اس کے بعد بھی بہت سے ماہرین تحلیلِ نفسی آئے ہیں۔ وہ بعد میں آنے والے اس کے مکاتب فکر کے افراد ہیں اور اس قسم کے دوسرے سائیکولوجسٹ وغیرہ بھی آئے ہیں جنہوں نے مزید تجربات کیے ہیں۔ وہاں تو تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ فرائڈ نے اس باب میں یہ کہا ہے کہ یہ ہوتا کس طرح سے ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب کی عمارت استوار ہی اس طرح ہوئی ہے کہ جنہوں نے اپنے جذبات کی تسکین میں ایثار و قربانی سے کام لیا ہے تو وہ عمارت دن بدن اوپر کو اٹھتی جا رہی ہے' ان کا ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کے مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں تو وہ توانائی' اپنا رخ دوسری طرف منتقل کر لیتی ہے۔ اسے Sublimation[1] (تصعید) کہتے ہیں۔ یہ سائیکولوجی کی ایک خاص اصطلاح (Term) ہے۔

انسان کی یہ Preserve (محفوظ) کردہ توانائی کی قوت قوموں کو بامِ عروج پہ لے جاتی ہے

وہ کہتے یہ ہیں کہ جس توانائی کو بھی آپ اپنے ہاں Preserve (محفوظ) کر لیں وہ توانائی دوسری طرف اپنا رخ کر لیتی ہے اور وہاں بلند ہو کر کسی دوسری شکل میں کام کرتی ہے۔ اس طرح افراد کی فالتو توانائی جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر ان گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ اب Scientifically (سائنسی لحاظ سے) ہمارے سامنے یہ بات آ گئی کہ پھر اس سے ہوتا کیا ہے؟ جس قوم کی یہ کیفیت ہو جائے یعنی جو اپنے اندر اس قسم کے ضوابط بنا لے' وہ آگے بڑھتی ہے' بلند ہوتی ہے اور عروج حاصل کرتی ہے۔ اور یہ میں نے عرض کر دیا ہے کہ یہ ضوابط جب ان کا عقیدہ بن جاتے ہیں یعنی ایک چیز جب ذہن کے اندر پختگی سے راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہے جسے عقیدہ کہا جاتا ہے تو اس کا عملی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

قرآن حکیم کی روشنی میں جنسی بدنہادی کا مکمل علاج عقیدے کی بنا پر ہی ممکن ہے

جنسی اختلاط کے معاملے میں جو عقیدے کی بات ہے' وہ ایک مثال سے سمجھ میں آئے گی۔ ایک لڑکا ہے: نہایت عیاش اور بدمعاش۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں۔ اس کے ہاتھوں کسی لڑکی کی عزت محفوظ نہیں' دن بھر لڑکیوں کے اطراف پھرتا رہتا ہے' اس سے کہا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اپنے پہ کنٹرول کر ہی نہیں سکتا۔ رات کو گھر آ جاتا ہے۔ گھر میں صرف وہ ہے اور اس کی

---

[1] To Transform (an impulse, especially a sexual urge, which cannot be immediately fulfilled) into more socially acceptable forms of expression, behavior, or activity.

ایک جوان بہن ہے۔ ایک ہی کمرے کے اندر سوتے ہیں۔ کوئی اور دیکھنے والا نہیں ہوتا' کسی قسم کا ڈر نہیں ہوتا۔ یہ وہی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں ہے۔ ایک جوان لڑکی کمرے کے اندر موجود ہے' محسوس کرنا تو ایک طرف رہا' تصور تک اس کو نہیں آ سکتا کہ میں اس طرف نگاہ بد بھی کروں۔ یہ وہی ہے جو کہتا ہے کہ میں کنٹرول نہیں کر سکتا۔ ایک لڑکی ہے جوان' ایک عورت ہے جوان' جو اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے تو کیا بات ہے کہ کیوں اس کا خیال ادھر نہیں جا رہا؟ کیونکہ ایک عقیدہ راسخ ہے کہ بہن کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو' کچھ سال ہوئے' ایک واقعہ ہوا تھا۔ دوسری جنگ عظیم (1945-1939) میں کسی کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ انہوں نے حفاظت کے لیے انہیں کینیڈا بھیج دیا۔ وہ جنگ کے بعد بھی وہاں رہے۔ اس جنگ کے بعد وہ بڑے پھولے پھلے۔ ایک لڑکا جوان تھا' ایک لڑکی جوان تھی۔ ان بچوں کو پتہ ہی نہیں تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں۔ ان کی آپس میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کوشش کی کہ جو بچے وہاں ہیں' ان کے ماں باپ کا پتہ چل جائے اور ماں باپ کو بھی خواہش تھی کہ پتہ چل جائے۔ انہوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ جوڑا بہن بھائی تھے۔ یعنی اس سے بیشتر انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ یہ دونوں لڑکا اور لڑکی بہن بھائی ہیں۔ جب یہ معلوم ہوا کہ وہ پیدائش کے اعتبار سے بہن بھائی ہیں تو انہوں نے جو' اس کے بعد' خاص طور پر لڑکی نے اخباروں میں کہرام مچایا ہے' وہ چیخ اٹھی: او خدا کے لیے ہمیں بتاؤ کہ اتنا عرصہ یہ جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں' اس کے لیے ہم کیا کہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہا کہ اس کی تحقیق کو بند کرو اور بند کر کے اگر ایسا نتیجہ بھی نکلتا ہے تو اس طرح جلدی سے Announce (اعلان) نہ کرو۔ پہلے دیکھ لو کہ اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی دن سے میاں بیوی کی حیثیت سے سلسلہ ختم کر دیا۔ یہ جوان کے ذہن کے اوپر اثرات تھے کہ اتنا عرصہ یہ کچھ کرتے رہے وہ روح فرسا تھے حالانکہ پادری بھی ان کو بتاتا رہا کہ کوئی بات نہیں' عیسائیت کی تعلیم کی رو سے تم نے کوئی جرم نہیں کیا لیکن وہ جوان کے عقیدے کا یہ پہلو تھا کہ بہن بھائیوں میں یہ چیز نہیں ہوتی اس کا ان کے اوپر بہت ہی گہرا اثر ہوا تھا تو اب بات صاف ہوگئی کہ اگر یہ چیز عقیدے کے اندر داخل کر دی جائے تو یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آپ اس جنسی توانائی کو' سیکس (Sex) کے تعلقات کو' کنٹرول نہ کر سکیں۔

مومنہ عورتوں اور مومن مردوں کا باہمی رشتہ بھائی بہن کا ہی ہے

قرآن یہ عقیدہ پیدا کرتا ہے کہ بجز اس ایک لڑکی یا عورت کے جس کے ساتھ اس طرح سے عقد ہوتا ہے' ساری لڑکیاں جتنی بھی ہیں' تمہاری بہنیں ہیں۔ اس نے جب **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** (49:10) کہا ہے تو یہ نہیں کہا ہے کہ مومن مرد بھائی بھائی ہیں' مومنہ عورتیں اور مومن مرد بھی آپس میں بھائی بہن ہیں۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! ایمان کیا کرتا ہے؟ اسے ایمان کہتے

ہیں کہ بہن کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ یہاں تو نہیں معلوم کہ یہ کیوں ہے لیکن یہ تو معلوم ہے کہ یہ عقیدہ ہے' یہ ذہن کے اندر راسخ کی ہوئی ایک چیز ہے۔ تو اسی طرح یہ عقیدہ کہ ہر لڑکی بہن ہے' ہر لڑکا بھائی ہے' اور اگر یہ ایمان کی بات ہو کہ اسی طرح سے جس طرح یہ حقیقی بہن بھائی ہیں' سیکس (Sex) کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس نے کہا تھا کہ جب تک اس کا نکاح نہ ہو تو وہ اپنے آپ پہ کنٹرول کرے۔ کھانے پینے کے معاملے میں تو اس نے کہا ہے کہ اگر حالت ایسی پہنچ جائے کہ کوئی چیز نہیں ملتی اور جان کا خطرہ ہو تو اضطراری طور پر حرام کی اجازت ہے۔

سیکس کے معاملے میں قرآنِ حکیم کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ

سیکس (جنس: Sex) کے معاملے میں قرآن نے اضطراری حالت بیان ہی نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ پیاس اور بھوک پہ تو کنٹرول نہیں ہو سکتا لیکن سیکس ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو وہ کہتا ہے کہ اس میں آپ اپنے پہ کنٹرول کرو اور کنٹرول اس طرح سے ہوتا ہے۔ جنسیات کے معاملے میں یہ چیز ہے۔ جسے ایمان کہتے ہیں' وہ یہ چیز ہے کہ ایک چیز عقیدے کے طور پر راسخ ہو۔ قرآن یہ چیزیں ایمان کی شرط بتاتا ہے اور جب یہ عقیدہ ہو تو پھر ڈاکٹر انون (Dr.Unwin) کے الفاظ میں اس قوم میں کیا ہوتا ہے؟ سنیے! اس نے اپنی کتاب❶ کا آغاز ہی اِن الفاظ میں کیا ہے: اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں (Creative Energy) مدت دراز تک نہیں' بلکہ ابدالآباد تک قائم رہیں اور آگے بڑھتی رہیں' تو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یہ چیز ایمان کی حیثیت سے اپنے اندر رکھے' پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں عورت کو کیا حیثیت دے رکھی ہے؟ وہ یہ ہے کہ ''ایہہ مسواک دا پھوگ اے۔ جیہڑا آئے منہ اچ پالے''❷ یہ حیثیت دے رکھی ہے آپ نے۔ پہلے قانوناً مساوی حیثیت دو' پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرو جن سے معاشرے میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدت تک نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے' کم از کم حد تک' محدود رہیں' اس طرح اس معاشرے کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی طرف بڑھ جائے گا' اس کے ماضی کی روایات شاندار اور درخشاں مستقبل کی حامل ہوں گی' وہ تمدنی تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس تک آج تک کوئی

---

❶ Sex and Culture (جنس اور تمدن)

❷ یہ مسواک کا ''پھوگ'' (چھان) ہے' جو آئے منہ میں رکھ لے۔

نہیں پہنچ سکا۔ اور انسان کی توانائیاں اس کی ان روایات سے ایک ایسے انداز سے Cycle (کامل سلسلہ میں عمل) کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ قرآنِ کریم نے حضرت لوطؑ اور قومِ لوطؑ کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ دین کے کس گوشے کو ہمارے سامنے لاتا ہے: وہ گوشہ ہے کہ جس سے قوم کی تہذیب وتمدن' قوت وتوانائی' عقل و شعور اور فہم وفراست' ان سب کا' دارومدار صرف اس اصول کو اپنانے کے اوپر ہے کہ معاشرے میں جنسی اختلاط کے مواقع (Sexual Opportunities) ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کم از کم حد تک رکھے جائیں اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ پہلے وہ اپنی تخلیقِ نو کرے۔ لیکن اگر یہ جنسی بدنہادی کا مکمل علاج عقیدے کی بنیاد پر نہیں کریں گے تو نہ کریں' اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ وہ آخرالامر غالب آئے گا اور یہ لوگ نوعِ انسان کی نشوونما کے راستے میں جو روڑے اٹکا رہے ہیں' وہ انہیں دور کر دے گا۔

عزیزانِ من! اگلی آیت میں قرآنِ کریم نے کہا کہ **كَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡئَيۡكَةِ** [1] **الۡمُرۡسَلِيۡنَ** (26:176) اہلِ مدین نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ اب درس کا وقت ختم ہوا اور یوں کہیے کہ ہم سورۃ الشعراء کی آیت 176 تک آ گئے۔ 177 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اصحاب الایکہ وہ قوم ہے جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے (15:78)۔ حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی' قطورا سے) جو اولاد پیدا ہوئی' ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ یہ حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہوا اور اس کی نسل' تاریخ کے اوراق میں قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ ان کا زمانہ قریب 2000 ق م سمجھنا چاہیے۔ یہ قوم یہیں پھولی پھلی۔ قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی...... تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا ددان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہو گیا۔ یہ علاقہ بہت سرسبز وشاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کی طرف (29:36) اور اصحاب الایکہ کی طرف (26:176-77) مبعوث ہوئے تھے۔ اربابِ تحقیق کا خیال ہے کہ قومِ مدین اور اصحاب الایکہ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے گویا یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے (پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960' ص۔ 959)۔

چودھواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 177 تا 191)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1978ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 177 سے ہو رہا ہے: (26:177)۔

شروع سے آخر تک پیش کردہ دینِ خداوندی کی وضاحت

تجدید یادداشت کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ انبیائے سابقہؑ کی داستانوں کا سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے شروع میں یہ بتایا تھا کہ یہ داستانیں تاریخی کہانیاں نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ دین شروع سے آخر تک ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریق کار بدلتے جائیں گے' اس کی جزئیات زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدل سکتی ہیں' دین کے اصول غیر متبدل ہیں' شروع سے آخر تک ویسے ہی رہیں گے۔ قرآن میں ہر رسول کا جو تذکرہ آیا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس کے دور میں انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں جو سب سے زیادہ نمایاں خرابی تھی' اسے ابھار کر سامنے لایا گیا اور اس کی بجائے دین خداوندی کا' وہی جو متعلقہ عنوان تھا' اس کی وضاحت کی گئی۔

میں نے کہا تھا کہ اگر آپ حضرت نوحؑ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان انبیاء نے جو جو پیغام اور دعوت دی' انہیں اگر آپ ایک ایک کر کے اکٹھا کر لیں تو پورا دین کا نظام آپ کے سامنے اصولی طور پر آ جائے گا۔ اس وقت تک ہمارے سامنے حضرتِ نوح علیہ السلام کا ذکر آیا تو اس میں بتایا یہ گیا کہ قومیت کا مدار رنگ خون وطن کا اشتراک نہیں' آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک ہے' پھر یہ بتایا گیا کہ انسانوں کی طبقاتی تقسیم پیشوں اور حرفتوں کے لحاظ سے' دولت' امارت اور غربت کے لحاظ سے' خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔ ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے اور مدارجِ تکریم ہر ایک کے کردار کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے قومِ عاد آئی۔ ان کے متعلق کہا گیا کہ حکومت و سیاست کا مقصد یہ ہے کہ کمزوروں کی کمزوریاں' ناتوانوں کی ناتوانیاں' محتاجوں کی احتیاجات رفع کی جائیں' نہ کہ کمزوروں کی ہڈیاں چور کر دی جائیں اور دولت اس لیے نہیں کہ کمزور کو کمزور تر کر دیا جائے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ ان کی ان کمزوریوں اور کمیوں کو رفع کر کے ایک مساواتِ انسانیہ قائم کی جائے۔

قرآنی نظام کے تحت زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

عزیزانِ من! ہمارے سامنے قومِ ثمود آئی جس میں کہا گیا کہ زمین پر ذاتی ملکیت قائم کر کے اپنی لکیریں کھینچ لینا صحیح نہیں ہے' زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ انسانوں' مویشیوں اور باقی جانداروں کے لیے پرورش اور نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اس کا انتظام اس طرح سے کیا جانا چاہیے کہ ہر ضرورت مند کی ضرورت یکساں طور پر پوری ہوتی رہے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے قومِ

لوطؑ آئی اور اس ضمن میں قرآن نے کہا کہ یہ جنسی پابندیاں صرف وہی نہیں ہیں کہ یہ سوسائٹی یا تمدن کا ایک اصول ہے بلکہ قوموں کے عروج و زوال پر ان کا بڑا گہرا اور بنیادی اثر پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد اب ہمارے سامنے قومِ شعیبؑ آتی ہے۔ کہا کہ **كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ** [1] (26:176) قومِ شعیبؑ [2] کو اصحاب الایکہ بھی کہتے ہیں۔ ایکہ کے معنی ہیں جنگل۔ وہاں جنگل زیادہ تھے اس لیے انہیں جنگل والے بَن والے بھی کہا جاتا ہے اور انہی کو شعیبؑ کی قوم بھی کہا گیا [3] ہے۔ ان کا مرکز مدین میں تھا۔

ہر رسول کی پہلی دعوت قوموں کے خودساختہ نظام کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا

قرآن کریم نے کہا کہ **اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ** [4] (26:177)۔ یہ وہی پہلی چاروں بنیادی آیات میں سے ہے جو ہر رسول کے تذکرے کے ضمن میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ پہلے ان کو دہرایا جاتا ہے۔ کہا کہ **اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:177) کیا تم اپنے اس خود وضع کردہ غلط نظام کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہو؟ پہلی چیز یہ ہوتی ہے کیونکہ جو رسول ہے، وہ منذر ہوتا ہے، وہ آگاہ کرنے والا ہوتا ہے۔ پہلی چیز آگاہی کی ہے کہ کیا تم ان خطرات سے بچنا چاہتے ہو؟ جو بچنا نہیں چاہتا اس کے لیے یہ بتانا کہ راستے میں خطرہ آئے گا، بے فائدہ ہے۔ جو خودکشی کرنے کے لیے جانا چاہے، اسے یہ کہنا کہ یہاں (دریائے) راوی میں چھلانگ نہ لگانا، یہاں تو پانی ڈوبو ہے، وہ تو گیا ہی ڈوبنے کے لیے ہے۔ وہ جو ہے کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ** (2:2)۔ یہ پہلے ہی آتا ہے جس پہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ ہدایت متقین کے لیے ہے تو وہ کہتے ہیں کہ جو پہلے ہی متقی ہیں ان کے لیے ہدایت کی کیا ضرورت ہے، جو غیر متقی ہے ان کا تو نام نہیں۔ متقی کے معنی ہیں کہ جو راستے کے خطرات سے بچنا چاہے، جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہے، اس کے لیے ہدایت ہے۔ جو خودکشی کرنا چاہتا ہے اس کے لیے صحیح راستہ بتانا بے معنی ہے۔ یہاں کہا کہ **اَلَا تَتَّقُوْنَ** (26:177) بچنا چاہتے ہو یا نہیں؟ **اِنِّىْ لَـكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ** (26:178) میں تمہارے سامنے خود خدا کا پیغام لایا ہوں، ضابطہ قوانین لے کر آیا ہوں جو امن و سلامتی کا ضامن ہے۔

---

1. اسی طرح اہلِ مدین نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 853)۔
2. قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کے علاوہ، اصحاب الایکہ کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔ اربابِ تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ بنو مدین ہی تھے۔ ان کی بستی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ وہ اسی شاہراہ (امام مبین) پر واقع تھی جو حجاز سے شام کی طرف جاتی ہے (پرویزؒ: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، 1994، ص۔ 280)۔
3. اس کی تفصیل کے لیے تیرھواں باب کے اختتامی فٹ نوٹ 1 کو ملاحظہ فرمائیے۔
4. اُخرالامر ان کی طرف شعیبؑ آیا اور ان سے کہا کہ کیا تم اپنی روش کے تباہ کن نتائج سے بچنا نہیں چاہتے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 853)۔

دینِ خداوندی کے نظام کا نفاذ مرکزِ ملت کے تحت ہی ہوسکتا ہے

اس ضابطہ قوانین کا ملخص یہ ہے کہ وہ تمہیں امن دے گا' وہ تمہیں ان خطرات سے حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا اس لیے **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ** (26:179)۔ یہ وہی ہے جو میں کہتا چلا آ رہا ہوں کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو' انفرادی طور پر نہیں۔ یہ مذہب نہیں' یہ دین ہے' یہ نظام ہے' یہ اجتماعی انسانیت کا ایک نظم ہے۔ اس لیے اس کا ایک مرکز ہوگا' اس مرکز کی اطاعت کی جائے گی۔ قوانین خداوندی کی اطاعت اس اجتماعی مرکز کی وساطت سے ہوگی۔ یہ ہوا دین کا نظام۔

معاوضے کا طلب گار تو نبیؑ بھی ہوتا ہے لیکن وہ کسی انسان سے نہیں مانگتا

اور اگلی چیز وہی ہے کہ **وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (26:180) اور جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں تم سے اس کا کوئی معاوضہ اور صلہ نہیں مانگتا' اس لیے کہ یہ نہیں کہ میں تمہارا کوئی کام کر رہا ہوں بلکہ مجھے تو خدا نے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے' یہ فریضہ میرے ذمے لگایا ہے' میں وہ فریضہ ادا کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ نہیں ہے کہ میں بلا معاوضہ' بلا اجر' کروں گا۔ کوئی کام بھی اس کے بغیر تو کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک منتہائے مقصد ہے' ایک آرزو ہے' جس نے مجھے کہا ہے کہ جاؤ یہ ہمارا کام کر آؤ۔ میں اس سے اپنا معاوضہ لے لوں گا' تم سے تو میں کچھ نہیں چاہتا۔ یہ بنیاد ہے دین کی۔

اب آگے بات آئی کہ اس دور میں کیا چیز تھی اور قرآن نے دین کا کون سا گوشہ نمایاں کیا ہے؟ اور میں نے جیسا عرض کیا تھا کہ باتیں تو یہ کچھ تین چار ہزار سال پہلے کی ہیں۔ آپ کو ایک ایک گوشہ ہمارے اس دور سے' اس نظام سے متعلق نظر آئے گا' قومیت کا مدار' طبقاتی تقسیم' زمینوں پر ذاتی ملکیت' اس قسم کی سیاست کہ جو غریب ہتھے چڑھ جائے اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دی جائیں' آج کے دور میں ساری دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ تو اس لیے یہ بات نہیں کہ وہ قومِ نوحؑ کے لیے یہ کچھ کہا تھا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالے سے دنیا کی موجودہ حالتِ زار

ہمارے لیے بھی یہ کہا تھا اور میں کہوں گا کہ ہمارے اس دور کا تو مدار ہی اس بدنظمی اور بدانتظامی پہ ہے جس کی اصلاح قرآن یہاں کرتا ہے۔ یعنی اقتصادیات کا زمانہ جس میں صنعت اور کامرس دونوں آ جاتے ہیں یعنی چیزوں کا تبادلہ بھی اور خرید و فروخت بھی۔ اور دیکھیے گا کہ وہ رونا ہم روز روتے ہیں۔ پہلی بات وہیں آ جاتی ہے اور پھر اگلی بات یہ ہے کہ یہ مزدور اور کارخانہ دار کا تعلق ہے' آجر اور جسے مستاجر کہتے ہیں (Employer & Employees) محنت کش کا اور محنت لینے والے کا تعلق ہے۔ یہ بنیادی مسئلہ ہے جو آج سامنے آ رہا ہے۔

معاشرتی طور پر سب سے پہلی چیز ناپ اور تول کا صحیح ہونا ہوتا ہے

قومِ شعیبؑ کے قصے کے ضمن میں دیکھیے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ پہلی چیز تو اس نے یہ کہی کہ **اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ ۞ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ**[1] (26: 181-182) کوئی چیز ناپتے وقت یا تول کے وقت اگر کوئی چیز دینا ہے، تو جتنا کسی کو دو، اس کے مطابق پورا پورا اس سے لو۔ روزمرہ کے کام میں تو یہ ناپ اور تول کے ہی لفظ آئیں گے لیکن یہ جو اصول ہے کہ "جتنا کسی سے لو اس کے مطابق اس کو دو"۔ سارے گوشے، جتنے بھی ہیں، اس میں آ جاتے ہیں۔ یعنی عام بازار میں ہمارے آج یہ مصیبت ہے کہ صاحب! کہیں سے کوئی چیز لیجیے، صحیح ملتی نہیں ہے۔ پہلے تو اس میں یہ ہے کہ **وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ** (26:183) اور جو چیزیں دوسروں کو دو، یہ نہ ہو کہ وہ ان سے مثلاً اگر وہ جوس لیتا ہے، تو وہ جوس نہ ہو بلکہ اس کے اندر اتنا حصہ پانی کا ہو، پھر جو ناپ کے دیتے ہو، وہ یہ نہ ہو کہ سیر بھر تم دو اور گھر میں جا کے وہ دیکھے تو وہ چودہ چھٹانک نکلے۔ میں پرانا پیمانہ بتا رہا ہوں۔ روز یہ ہوتا ہے کہ جو چیز ملتی ہے اس میں ملاوٹ ہوتی ہے، جو وزن کیا جاتا ہے یا ماپ کے لیا جاتا ہے آ کے دیکھیے تو اس میں کمی نظر آتی ہے۔ تو میں نے کہا کہ یہ ابتدائی تینوں چیزیں اس کے اندر آ گئیں کہ جو روزمرہ کی ہمارے ہاں یہ شکایت ہے: خالص چیز نہیں ملتی، پورے وزن سے نہیں ملتی، پورے ناپ تول سے نہیں ملتی۔

فساد کا اور مطففین کا قرآنی مفہوم اور اس کے نتائج

قومِ شعیبؑ کا قصہ ہو رہا ہے: "ارے دل یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے"۔ بات آج کی ہو رہی ہے اور اس کا نام رکھا ہے **وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ**[2] (26:183) یہ ہے فساد۔ ہمارے ہاں تو دنگا فساد ہی صرف فساد ہوتا ہے۔ یہ تو بڑی خاموشی سے ہوتا ہے۔ اسے فساد تو کوئی کہے گا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے فساد تو یہ ہے۔ اب یہ جو چیزیں یہاں قران نے کہی ہیں ایک دوسرا مقام ہے جہاں اس کو بڑی ہی جامعیت سے اس نے پیش کیا ہے۔ وہ ہے سورۃ المطففین[3]۔ اس میں بڑی جامعیت ہے۔

---

1. ماپ تول کے پیمانے صحیح رکو۔ کسی کو کم نہ دو۔ ٹھیک ترازو سے تولو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 853)۔
2. تم اپنے معاشی نظام کو عدل کے خطوط پر متشکل کرو اور اس طرح ان ناہمواریوں کو دور کرو جو تم نے اپنے غلط نظام کی رو سے پیدا کر رکھی ہیں (انسانی معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں پیدا کرنے کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 853)۔
3. اس کی مکمل تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 مکمل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006، ص ص۔ 292 تا 342۔

اس میں کہا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (83:1) تباہ ہو کر رہے گا' وہ نظام' وہ معاشرہ' جو تطفیف پر مبنی ہو گا۔ یہ جو لفظ مطفف ہے اس کے معنی ہیں تطفیف کرنے والا اور تطفیف جو ہے اس کا مادہ (Root) ط ف ف ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ وہ عرب کہاں کہاں اس کو استعمال کرتے تھے اور قرآن ایک لفظ کہہ کر کتنے جامع معنی اس کے اندر لے آتا ہے۔ ان کے ہاں پہلی چیز تو یہ تھی کہ کسی چیز میں کمی کرنے والا جو ہے وہ مطفف ہے' کسی چیز کو ناقص دینے والا مطفف ہے' حتیٰ کہ اگر اونٹنی کو بعض اوقات قبل از وقت ایسا بچہ پیدا ہو جاتا ہے مثلاً جسے یہ ششماہیا وغیرہ کہتے ہیں' وہ پورا نہیں ہوتا کمزور ہوتا ہے' بعض اوقات ناقص ہوتا ہے' وہ اس کو بھی تطفیف کہتے تھے کہ کوئی شے مکمل شکل میں دینی چاہیے ناقص شکل میں کسی کو دی جائے۔ ایک لفظ کی جامعیت پہ غور کرتے چلے جایئے: کوئی شے ہو' وہ ہو تو وہی لیکن اس میں کمی کی جائے' وہ اسے اس معنی میں استعمال کرتے تھے۔ پھر دوسری چیز یہ وہی تھی کہ ناقص چیز دی جائے اور اگلی چیز ان کے ہاں یہ ہوتی تھی کہ اونٹنی کے پاؤں کو ایسا باندھا جائے کہ جتنا یہ اس کو چلانا چاہتے ہیں' جس رفتار سے اسے چلانا چاہیں وہ اس سے چل سکے' وہ اپنی رفتار سے نہ چل سکے۔

مطففین کا معاشرہ تباہ ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا

آپ دیکھ رہے ہیں کہ تطفیف کہاں تک جا رہی ہے؟ اس کی صلاحیتوں کو بھرپور ہونے نہ دیا جائے اور اس میں جتنی ہیں' وہ اپنے اختیار سے ان کو استعمال نہ کر سکے' تمہارے اختیار سے ان کو استعمال کرے' جتنا تم چاہو اتنا ہی وہ اس سے کر سکے' آگے وہ ایک قدم نہ اٹھا سکے۔ اب قرآن دیکھیے۔ پہلا تو یہ لفظ استعمال کیا کہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (83:1) وہ نظام جس میں یہ کچھ ہو گا' جسے تطفیف کہا ہے' وہ تباہ ہو کر رہے گا۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجیے' وہ تباہ ہو کر رہے گا۔ اور خود ہی پھر قرآن تو اپنی تفسیر آپ کر دیتا ہے' کہا کہ مطففین کون ہیں؟ جواب میں کہا کہ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (83:2) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ اگلے الفاظ ہیں وہاں سے اصل بات آ رہی ہے۔ یہاں ہے کہ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ (83:2) علی الناس ہوتا ہے کہ دوسرے سے لیتے تو پورا ہیں' دیتے کم ہیں۔ اس میں یہ دونوں چیزیں آ جاتی ہیں لیکن یہاں تک باتیں چیزوں کی ہو رہی ہیں' جنس کی ہو رہی ہے یعنی جو کچھ کسی سے لیا جائے یا دیا جائے اس کی ہو رہی ہیں۔

انسانوں کی صلاحیتوں کے سلسلہ میں ماپ تول کے فرق کا ذکر

اگلے الفاظ ہیں کہ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (83:3) جب انسانوں کو تولتے ہیں یا انہیں ماپتے ہیں تو

ان کا نہ پورا وزن کرتے ہیں' نہ ان کی پوری پیمائش کرتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ انسانوں کو دیکھیے' جب وہ تولتے ہیں۔ اب بات اشیاء سے آگے چلی گئی اور یہ آیا صحیح معنوں میں ہمارا دور۔ پہلا دور تو ہمارا یہ آیا کہ جس میں کوئی شے آپ کو خالص نہیں ملتی' کسی شے کا وزن صحیح نہیں ہوتا' کوئی شے مکمل نہیں ہوتی' ناقص ہوتی ہے۔ یہ ساری چیزیں قوم مدین یا قوم شعیبؑ میں قرآن نے گنائیں کہ یہ تھا تطفیف کا نظام' جس میں یہ ہوتا تھا۔ اور اگلی بات یہ بتائی کہ یہ چیزیں اشیاء تک ہی نہیں ہیں' انسانوں تک بات آ گئی ہے کہ جب وہ انسان کا بھی وزن کرتے تھے تو جتنی اس کی قیمت ہونی چاہیے تھی' وہ قیمت نہیں دیتے تھے۔ جب اس کو ماپتے تھے تو جو اس کا پورا ماپ ہوتا ہے' اس کا وہ ماپ نہیں دیتے۔ اب یہ سوال آ گیا۔

عزیزانِ من! آج کی دنیا میں ہمارے ہاں آجر اور مستاجر کے کام کا مسئلہ ہے' لینے والے اور دینے والے یعنی محنت کش' مزدور' ملازم اور ان کی محنت سے فائدہ اٹھانے والے کا مسئلہ ہے۔ یہاں بتایا یہ ہے کہ جتنی قیمت ان کی ہونی چاہیے' انہیں وہ نہیں دیتے اور اگر وہ تطفیفِ ناقہ ہے تو ان کی صلاحیتوں کو اتنا آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے کہ وہ بھرپور ہو جائیں' ان کے پاؤں میں رسی باندھ دیتے ہیں کہ وہ آگے بڑھنے ہی نہ پائیں۔ اب یہ بات کیا چیز ہے؟ چونکہ یہ بات آج کے دور کی آئے گی' اسے آج کے دور کی اصطلاحوں میں آپ کو سمجھنا چاہیے۔

انسانی تاریخ میں منحوس ترین دن

میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ انسانیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ منحوس دن وہ تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر لا دیا جو اس سے زیادہ تھا جو وہ آقا اس پر خرچ کرتا تھا' یہاں سے انسانوں کی سوداگری شروع ہو گئی۔ وہ بڑا ہی بدبخت دن تھا۔ اگر وہ اس سے کم کما کر لاتا' جتنا وہ اس کے ہاں سے کھاتا ہے تو وہ دوسرے دن اس کو نکال دیتا' یہ تو گھاٹے کا سودا ہے' برابر سرابر بھی لاتا پھر بھی وہ نہ رکھتا کہ اس نے اس میں سے کیا کمایا ہے۔ جب وہ اتنا کما کے لایا جو اس سے زیادہ تھا جتنا یہ اس پہ خرچ کرتا تھا تو یہ وہ سودا ہے جو اس کو Pay (ادا) کر رہا ہے۔ اب اگر وہ کما کے لاتا ہے مثلاً دس روپے تو یہ اسے دس روپے نہیں دیتا۔ اس پہ خرچ کرتا ہے پانچ روپے' آٹھ روپے تک بھی' اس میں سے خود بچاتا ہے اور اس کے بعد کوشش یہ ہے کہ یہ تو زیادہ سے زیادہ کام کرتا جائے اور میں اس پہ کم از کم خرچ کرتا جاؤں۔ خرچ وہ اس لیے اس پہ کرتا ہے کہ یہ کام کرنے کے قابل رہے اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی پرورش منظور ہوتی ہے۔ یہ تو وہ قربانی کی عید کے لیے بکرا پال رہا ہوتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کتنا موٹا ہوتا ہے اور کتنا تازہ اس کو رکھتے ہیں اور کتنا کھلاتے ہیں اور کتنی خاطر تواضع کرتے ہیں' کتنا نہلاتے دھلاتے ہیں' ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اس کی قربانی دینی

ہے' اس کا اس نے ثواب کمانا ہے۔ یہ سارا کچھ اس کے لیے کر رہا ہے۔

نظام سرمایہ داری کی بنیاد دوسروں کی محنت کے استحصال کے لیے مزدور کی مزدوری مقرر کرنے میں ہے

یہ جو چیز ہے کہ جتنا کوئی محنت کر کے لاتا ہے اگر زیادہ نہیں تو اتنا ہی اس کو دے دیا جائے تو نظام سرمایہ داری چل ہی نہیں سکتا۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ اس کو اتنا نہ دیا جائے اور اس کی لم یہ Wages (مزدوری) مقرر کرنا' تنخواہ مقرر کرنا ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ یہ جو مزدور ہے' جی' اس کا آٹھ آنے روز ہوتا تھا' بہر حال میں بات وہاں انگریز سے شروع کروں تو میرے بچے ہنسا کرتے ہیں' نوجوان بھی ہنسیں گے کہ اس میٹ کا آٹھ آنے روز ہوتا تھا تو بہر حال آج آپ وہ پندرہ روپے روز بھی کر لیں' راج (Mason) ہے اس کے چالیس روپے روز کے' جو انجینئر ہے اس کے ڈیڑھ سو روپے روز کے۔ یہ مزدور کے جو فیکٹریز میں' ملز میں' کام کرنے کے لیے جاتے ہیں پندرہ روپے کس نے مقرر کیے ہیں؟ مزدور خود تو مقرر نہیں کرتا' اسے یہ اختیار ہی نہیں ہے۔ یہ تو جو اس کو Employ (ملازم) کرنے والا ہے' وہ مقرر کرتا ہے۔ یہ مقرر کرنے کا پیمانہ کیا ہے؟ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہ مل کے مالک کا' کارخانے کے مالک کا' پیمانہ ہے۔ اگر ان کو وہ دیدے جتنا وہ وہاں کماتے ہیں' جتنی وہ محنت کرتے ہیں تو دوسرے دن کارخانہ بند کر کے چلا جائے۔ جتنا وہ کماتے ہیں وہ ان کو اس سے کم دے گا تو یہ کارخانہ چلے گا۔

سرمائے کے ماحصل کی بنیاد پر استوار ہونے والے نظام کی کیفیت

یہ کارخانے کا مالک جو اس مزدور سے زیادہ لیتا ہے' مثلاً وہ پندرہ روپے کا کام کرتے ہیں' دس روپے دیتا ہے' اس سے پوچھو کہ تم یہ پانچ روپے کس چیز کے لیتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ یہ میرا سرمایہ ہے جو میں نے اس کے اوپر Invest (لگایا) کیا ہوا ہے' یہ اسی کا لیتا ہے۔ جس نے سرمایا لگا کر مل نہیں لگائی' اس کو تو یہ مزدور جا کر پانچ روپے نہیں دے آتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے سرمایہ لگایا ہے تو اسی کو تو نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں۔ یہ تو لفظ بتا رہا ہے کہ سرمائے کے اوپر کچھ لینا ہے لیکن یہ چیزیں جب پہلے شریعت میں آتی ہیں تو پھر پوچھو نہیں کہ کس کس طرح یہ سب حلال ہو جاتی ہیں۔ یہ جو اس نے ادھر سرمایہ لگایا ہے اگر اس میں سے کسی کو یہ سو روپیہ قرض دیدے اور اس قرض کے اوپر سال کے بعد پانچ روپے مزید لے تو اسے آپ کے ہاں کی مذہبی پیشوائیت سود کہتی ہے' بیاج کہتی ہے' حرام کہتی ہے اور وہ جو اُدھر روز اس سو یا ہزار مزدور کی پانچ روپے روز کی کمائی یہ کہہ کر لے جاتا ہے کہ یہ میرے سرمایہ کا ماحصل ہے' یہ جائز ہے' شیر مادر کی طرح حلال وطیّب ہے' بتاؤ کہ یہ کیسے جائز ہے؟ غریب کاشتکار کسی چوہدری کے پاس جا کر یہ کہے کہ میاں صاحب! یہ ایک زمین مجھے ملتی ہے ہزار روپے میں مل جاتی ہے' میرے پاس رقم نہیں ہے' مجھے ہزار روپیہ آپ قرض دیدیجئے' تو میں

اس کے اوپر دس روپے آپ کو مہینہ دے دوں گا۔ لاحول ولا قوۃ کیا کہہ رہے ہو؟ حرام کھلوا رہے ہو مجھ کو وہ کہتے ہیں' سود دینے والا سود لینے والا' شریعت کی رو سے دونوں جہنمی ہوتے ہیں۔ میں تو نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ جی' میرے بچوں کی پرورش نہیں ہو رہی' میں محنت کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں نہیں! اس کا حل ہو جائے گا کوئی بات نہیں۔ اب وہ ہزار روپے میں زمین تو خود خرید لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کو مزارع کی حیثیت سے کاشت کرو' سال کے بعد آدھی بٹائی لے جاتا ہے۔ پانچ روپے اس کے اوپر لینا حرام مطلق' پچاس روپے لے لینا حلال وطیب ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! قرآن کا اعجاز ان چیزوں سے سمجھ میں آتا ہے۔ جب اس نے کہا ہے کہ وہ جب لوگوں کو تولتے ہیں تو ان کا وزن کم بتاتے ہیں' جب ان کو ماپتے ہیں تو جتنا ماپ ان کا ہوتا ہے اتنا بھی ان کو نہیں دیتے' کبھی نہیں کہتے کہ پانچ فٹ چھ انچ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پانچ فٹ چار انچ ہے کبھی نہیں کہیں گے کہ ڈیڑھ من ہے' وہ کہیں گے سوا ہی من ہے۔ یہ کیا ہے جو ڈیڑھ من اور سوا من کی بات قرآن نے کہی ہے؟ وہ یہی ہے کہ جب انسانوں کو تولتے اور ماپتے ہیں تو کم ہی بتاتے ہیں۔

دنیا بھر کی پسماندگی اور اذیت ناکی کی بنیاد ماپ تول کے غلط نظام پر ہے

عزیزانِ من! اشیاء کا تولنا اور ماپنا تو ہر جگہ آپ کو مل جائے گا مگر انسانوں کا تولنا اور ماپنا قرآن ہی کا اعجاز ہے اور یہ ساری جتنی خرابیاں اور ناخوشگواریاں آج معاشرے میں ہو رہی ہیں' ان سے یہ ساری دنیا جہنم بنی ہوئی ہے۔ اشیاء کے ماپ تول کی جو بات ہے وہ تھوڑے سے حسنِ انتظام سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یہ جو انسانوں کا ماپنا تولنا قانون کی رو سے جائز اور طیّب قرار دیا جاتا ہے' اسے آپ کیا کریں گے؟ اپنے اپنے دائرے میں' اپنے اپنے حالات' یہ سوچیے کہ کیا آپ کو اپنا پورا وزن ملتا ہے؟ جس کو آپ کی قامت کہتے ہیں کیا وہ کہیں پوری ملتی ہے؟ آپ کی جو محنت ہے اس کا پائی پائی کا حساب آپ سے کیا جاتا ہے۔ Wages (اجرت) کے لیے قانون یہ بتاتا ہے کہ جتنا تم نے اس مزدور سے طے کیا ہے' اتنا دیدیا۔ وہ دیدیا تو اس کا کوئی حق ہی نہیں بنتا کہ عدالت میں جا کر دعوٰی کرے' کوئی فریاد کرے۔ وہ دس روپے جو روز طے ہوئے تھے کیا وہ مل گئے ہیں؟ کہ جی ہاں' وہ تو مجھے مل گئے ہیں' اب یہ بات کہ میں نے کام بیس روپے کا کیا ہے' کوئی قانون اس پہ اس کی گرفت نہیں کرتا۔ یہ دس روپے کس طرح سے مقرر ہوئے تھے' کوئی نہیں پوچھتا۔ بس طے ہو گئے تھے۔ صنعت وحرفت ان کے ہاں کا لفظ ہے' جس کو آپ زمینداری کہتے ہیں' یہ چیزیں جن پہ وہ سارا سسٹم چلتا ہے' اس پر قائم ہیں کہ جتنا کسی ایک فرد یا انسان کا وزن ہے وہ اسے پورا نہ دیا جائے' اس کا ماپ اسے پورا نہ دیا جائے۔

Wages (اجرت) مقرر کرنے کے سلسلہ میں سپلائی اور ڈیمانڈ (رسد وطلب) کا حربہ

اگلی بات یہ ہے کہ یہ کیوں ہے صاحب! کہ اسی قسم کا وہ مزدور ہے' اس کے پندرہ روپے روز ہیں' انجینئر ہے اس کا سو روپیہ روز ہے۔ یہ کیوں ہے؟ یہ ہے سپلائی اینڈ ڈیمانڈ (رسد وطلب) کا سوال۔ انجینئر کی تعداد تھوڑی ہوتی ہے' مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈیمانڈ (طلب) سے کوئی چیز جب زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ سستی ہو جاتی ہے۔ اگر مزدوروں کی تعداد بھی اتنی ہو' جتنی انجینئروں کی ہے تو انہیں آپ کو سو روپیہ روز دینا پڑے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ وہ مزدور اتنی زیادہ تعداد میں ملیں' وہ اس بات پہ منحصر ہے کہ یہ مزدور انجینئر نہ بن جائیں۔ اس اونٹنی کے پاؤں میں ایسی رسی ڈالو کہ وہ اتنا چل سکے جتنا آپ چاہتے ہیں کہ وہ چلے۔ اب آپ کی سمجھ میں تطفیف کی بات آ گئی کہ یہ اتنا ہی چل سکیں جتنا ہم چلانا چاہتے ہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے تو ہر انسانی بچہ یکساں پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ یہ مزدور رہے گا اور یہ انجینئر بن جائے گا۔ یہ تو ہمارا نظام ہے جو یہ کچھ کرتا ہے۔ دو لفظوں میں تو یہ ہے کہ صاحب! ٹھیک ہے اس کے ماں باپ اسے Afford (مصارف برداشت) کر سکتے ہیں' انہوں نے اعلیٰ تعلیم دلا دی۔ یہ معاشرے کا ہی نظام ہے کہ جو Afford (مصارف برداشت) کر سکتا ہے اس کو اعلیٰ تعلیم ملے' جو نہیں کر سکتے اس کو کم ملے یا نہ ہی ملے۔ جن کو کم ملے یا نہ ملے وہ مزدور بنتے جائیں گے اور یہی رہ جائیں گے۔ بڑے آدمی کا بیٹا ہے' اس نے روپے کے زور پہ اسے انجینئر بنا لیا۔ وہ تو اتنا ہی بنا سکے کہ جن کے پاس اتنا ہے۔ جن کے پاس اتنا نہیں ہے یعنی جو نوے فیصد ہیں' ان اونٹنیوں کے پاؤں میں تو رسی بندھی ہوئی ہوگی' وہ اس سے آگے کچھ بن ہی نہیں سکتے۔ یہ آپ کا نظام ایسا ہے۔

پرائیویٹ اسکول میں بچوں پر اٹھنے والے اخراجات

اس نظام کے اندر جہاں یہ چھوٹے چھوٹے پرائیویٹ اسکول ایک ایک کوٹھی کے اندر قائم کیے ہوئے ہیں' یہ بچے ہیں جو یہاں پڑھتے ہیں۔ یہاں تو وہ پہلی کلاس بھی نہیں کہلاتی' Pre-Garden کہلاتی ہے: بچوں کا باغ' چمن۔ وہ چار چار پانچ پانچ سال کے بچے اس باغ میں کھیلنے کے لیے جاتے ہیں' وہ صرف وہاں کھلانے ہوتے ہیں' وہ کھیل کر آ جاتے ہیں۔ پتہ ہے اس کی فیس کتنی ہے؟ پہلے سو تھی' ایک سو چالیس ہوئی' اب تو ایک سو ساٹھ [1] ہوگی' تین مہینے کی چھٹیاں ہیں' پھر بھی فیس دیجیے یعنی کھیلنے بھی نہیں جا رہا بچہ۔ ایک سو ساٹھ روپیہ مہینہ ایک بچے کا' جو وہاں نرسری میں یا Pre-Garden کے اندر جاتا ہے' داخلے کے سو روپے الگ ہیں اور پھر یہ ان کے کپڑوں کا' یہ ان کی کاپیوں کا' یہ ان کی پنسلوں کا' یعنی وہ روز ان کے ہاں کا بل دیئے چلے جاتے ہیں' اسی اسٹینڈرڈ (معیار) کی ان کے ہاں کاپی چاہیے صاحب! اسی اسٹینڈرڈ (معیار) کی وہاں پنسل چاہیے۔ کتنے ہیں جو یہ Afford (مصارف برداشت) کر سکیں گے۔

---

[1] یاد رہے اسکول فیس کی یہ صورتِ حال صرف جولائی 1978ء تک کی ہے۔

معاشرے کی خاطر کھولے جانے والے اسکولوں کا معیار اور ان کی حالتِ زار

زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہیں گے کہ معاشرہ اور اسکول کھول دے گا۔ یہ جو اور اسکول کھولے ہوئے ہیں اس میں ذرا بچہ بھیج کے دیکھیے۔شام تک آدھی گالیوں کا تو حافظ بن جائے گا اور کم از کم دس پرسنٹ اس کے کپڑوں میں جوئیں ہوں گی۔ یہ کیا بنے گا؟ وہ مزدور بنیں گے، جن کی تعداد اتنا زیادہ بڑھے گی۔ انجینئر تو انہی میں کچھ بن سکیں گے اگر بنیں گے تو آگے چل کر، جو ایک بچے کے لیے کم از کم دوسو روپیہ اوسط پڑے گی وہ پہلی کلاس ابھی شروع نہیں ہوئی۔ یہ جو چیز ہے کہ صاحب! اس کی تو اتنی Wages (اجرت) ہونی چاہیۓ یہ سپلائی اینڈ ڈیمانڈ (رسد وطلب) ہے۔ نظام سرمایہ داری میں ہوتا یہ ہے کہ جس طرح سے اشیاء یا اجناس ہوتی ہیں کہ جن کی مانگ زیادہ ہوتی ہے ان کی پیدائش یا پروڈکشن وہ زیادہ کرتے ہیں اسی طرح سے انسانوں میں بھی Labour یا مزدور کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کے لیے Wages (اجرتوں) کی خاطر مزدوروں اور غلاموں کی پیداوار کا طریق

وہ معاشرے میں انسان اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ مزدوروں کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہے تا کہ ان کا وزن کم ہو۔ یہ قرآن کے الفاظ آ گئے اور جب یہ سپلائی زیادہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ Wages (اجرتیں) مقرر کرتے وقت تو ایسا ہی ہوگا۔ وہاں صبح جا کر دیکھیے، میں تو خیر کم جاتا ہوں، میں تو شاید وہ منظر دیکھ بھی نہ سکوں۔ آج کل تو بہر حال مزدوروں کی کمی ہے، بہت باہر چلے گئے ہیں، ورنہ صبح جا کر یہاں مارکیٹ میں فٹ پاتھ کے اوپر یہاں سے وہاں تک ایک لائن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ ہر آنے والے کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں۔ جب ہم پڑھتے تھے کہ غلامی کے زمانے میں مارکیٹ میں غلام بکتا تھا تو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ اس کی طرف نگاہ اٹھا اٹھا کے دیکھ رہے ہوتے تھے۔ اس کو اگر ایک کی ضرورت ہوتی تھی تو سات آٹھ بھاگ کر آتے تھے۔ ایک کو وہ لیتا تھا باقی جو پانچ سات تھے وہ جس افسردگی و یاس سے گھر میں واپس جاتے تھے اس کا انہی کو پتہ تھا کہ دوپہر کے لیے کھانا، بچوں کے لیے آٹا، نہیں تھا اور یہاں ان کو مزدوری نہیں ملی۔ اس جانے والے کو اگر آپ کہیں کہ دس روپے روز اس کی مزدوری ہے اور میرے ہاں میاں کام تھوڑا ہی ہے تو پانچ روپے دوں گا، وہ کہے گا اللہ کا شکر ہے اتنا ہی بہت ہے۔ یہ جوان کا وزن کیا جا رہا ہے، یہ جوان کو ماپا جا رہا ہے، نہ وزن پورا دیا جا رہا ہے، نہ ماپ پوری دی جا رہی ہے۔ یہ دو ہی چیزیں ہیں جو قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ جو نظام معاشرت ہے تباہ ہو کر رہے گا کہ جس میں انسانوں کو تولا جاتا ہے تو پورا وزن نہیں دیا جاتا، ماپا جاتا ہے تو پوری پیمائش نہیں ہوتی، کم رکھی جاتی ہے۔ اور پھر ان کے پاؤں میں، اونٹنی کے پاؤں میں، رسی باندھی جاتی ہے کہ ان پہ ایسا نظام ہوتا ہے کہ ان کی صلاحیتیں

زیادہ بڑھ ہی نہ جائیں۔ آپ دیکھیے کہ کیا یہ آج کے دور کی باتیں نہیں ہو رہیں؟

قرآنِ حکیم Wages (اجرتیں) مقرر کرنے والا معاشرہ تشکیل ہی نہیں کرتا

ہمارے دور میں ایک بڑا انقلابی ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ روس کا ایک دور آ رہا ہے' کارل مارکس (83-1818) نے کمیونزم کا دعویٰ کیا۔ وہ تو وہ چیز تھی جو چودہ سو سال پیشتر ایک اعلان ہوا تھا۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ جو کمیونزم کا اعلان ہے کہ ''ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق' جو کام کر سکتا ہے' وہ بطیّب خاطر کرے اور اس کی' اس کے بچوں کی ضروریات پوری کرنا معاشرے کے ذمے ہے''۔ سوال Wages (اجرتوں) کا ہے ہی نہیں۔ یہ تھا جو اس [1] نے کہا تھا۔ لوگوں کو تو چونکہ علم نہیں تھا لپک کر اسے لیا کہ صاحب! واقعی اتنی بڑی چیز ہے جو یہ کر رہا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ جو اصول تھا یہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ ہے۔ وہاں جو وظائف مقرر ہوئے تھے وہ اس اصول کے مطابق مقرر ہوئے تھے۔

کارل مارکس کی ناکامی کے بعد لینن کا اعتراف

کارل مارکس (1818-1883) نے یہ بات کہہ دی کہ اصول تو یہی ہے' انسانیت بچے گی تو اسی اصول کے مطابق بچے گی۔ انہوں نے کہا کہ اسے رائج کریں تو وہ کہنے لگا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ یہ جو Incentive ہے' (جذبۂ محرکہ) ہے کہ ایک شخص بطیّب خاطر' جان مار کر بیس روپے روز کا کام کرے' اس کی ضروریات زندگی پانچ روپے میں پوری ہوتی ہیں وہ پانچ روپے لیتا ہے' خوشی خوشی چلا جائے اور بیس روپے کا کام مسلسل کرتا چلا جائے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے؟ مارکس (1818-1883) کہتا ہے کہ مجھے ''اس کیوں'' کا جواب نہیں مل رہا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس کی پارٹی کے ساتھی اس پہ زور دے رہے ہیں کہ تم اتنا بڑا زریں اصول بتا رہے ہو' بات سمجھ میں آتی ہے' واقعی انسانیت اس جہنم سے نکل جائے گی لیکن اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے کہتے ہو کہ مجھے یہ جذبہ محرکہ نہیں ملتا' Incentive نہیں ملتا تو کیا ہوا یہ اصول تو یہی ہے۔ اس نے کہا کہ میں بڑی دیانتداری سے بات کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں وہ بڑا دیانتدار ہے۔ اس نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو فریب میں نہیں رکھنا چاہتا' مجھے وہ جذبۂ محرکہ نہیں مل رہا۔ انہوں نے کہا کہ پھر کب ملے گا؟ اس کے بعد لینن (1870-1924) تک نے ان سے کہہ دیا کہ میں بھی یہ نہیں بتا سکتا۔ پتہ نہیں کہ انسانیت کن کن ادوار سے' کن کن مراحل سے گزر کر آخر اسی چیز پر پہنچے گی' ہم نہیں کہہ سکتے کہ کب پہنچے گی؟

---

[1] یعنی کارل مارکس (1818-1883) نے

کمیونزم کی جگہ سوشلزم کی بنیاد

انہوں نے کارل مارکس (1818-1883) سے کہا کہ پھر کیا کریں؟ کہنے لگے کہ بر سبیل تنزل سوشل ازم کو اختیار کرلو۔ یہ جو اس سرمائے (Capital) کے ذرائع پیداوار کے الگ الگ مالک ہیں' ان کی جگہ اسٹیٹ (ریاست) مالک ہوجائے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ پھر وہ ہوا کیا؟ اب تو پھر بھی یہ ہے کہ اگر دس مختلف کارخانوں کے دس مالک ہیں' ایک کارخانے میں کسی مزدور کو یا مزدوروں کی پارٹی کو کوئی شکایتیں ہوتی ہیں' تو بہر حال وہ وہاں سے چھوڑ کر دوسری جگہ آ جاتے ہیں۔ اور اگر یہ سارے کارخانے کسی ایک کی ملکیت ہوں' تو وہ جائے کہاں؟ کیا سائبیریاں میں جائے؟ اس سوشل ازم کے اندر کیا ہوا؟ اس سے اب وہ ایک بہت بڑا سرمایہ دار آ گیا' جسے اسٹیٹ (ریاست) کہتے ہیں۔ تو وہ اسٹیٹ مسماۃ تو کہیں بیٹھی ہوئی نہیں ہے' وہ تو یہی برسرِ اقتدار طبقہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اسٹیٹ (ریاست) اپنا نام رکھ لیا ہوتا ہے۔ وہاں بھی Wages (اجرتیں) ہیں۔

کوئی سرمایہ دار Wages (اجرتوں) کے نظام کو غلط قرار نہیں دیتا

یہ Wages (اجرتوں) والی چیز پر میں نے ان لوگوں سے' دانشوروں سے' ان طے کرنے والوں سے بھی' اسی Issue (مسئلے) پر لمبی چوڑی Discussion (بحث) کی کہ جب آپ Wages (اجرتیں) مقرر کرتے ہیں' مزدوری مقرر کرتے ہیں' تو اس کا معیار یا پیمانہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ ان کی Consensus سے' ان کی مرضی سے مقرر ہوتی ہے' جیسے وہ کہتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ وہ تو چل ہی نہیں سکتا۔ تو میں نے کہا کہ پھر اس سوشل ازم میں اور کیپٹل ازم میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ یہاں سوشل ازم سے ان بیچاروں کے لیے بھاگنے کا راستہ ہی نہیں۔ اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کارخانہ ایک فرد کی ملکیت ہو یا ایک اسٹیٹ کی ہو' سوشل ازم کے اندر' وہ Wages (اجرتوں) مقرر کریں گے کہ جتنی وہ محنت کر کے کما کے دیتا ہے اس سے کم دیا جائے گا تو کارخانہ چلے گا۔ Wages (اجرتوں) کا جو سسٹم ہے اس میں یہ ہے کیپٹل ازم (نظام سرمایہ داری) کی لم۔ اس کا کوئی بدل اب تک دنیا کے اکنامسٹ (ماہرین معاشیات) نہیں دریافت کر سکے۔

Wages (اجرتوں) کے سسٹم کو ختم کرنے کے طریق کے بعد قرآن کے معاشی نظام کے لیے جذبہ محرکہ

Wages (اجرتوں) کا سسٹم تو اسی صورت میں ختم ہوسکتا ہے کہ جو کام وہ کر سکتا ہے وہ اسے بطیّب خاطر کرے' اس کو یہ فکر نہ ہو کہ آٹا کہاں سے آئے گا؟ آٹا اس کے ہاں پوری ضرورت کے مطابق پہنچتا رہے۔ اس اطمینان سے یہ کام کرے۔ اور اگلی چیز پھر وہ آ گئی جسے ہم ایمان کہتے ہیں کہ میں زیادہ کام کیوں کروں؟ اس نے بتایا یہ ہے کہ یہ سارے نظام چلتے ہیں تو ان میں انسان

اس کی جسمانی زندگی کا نام ہے یہ صرف Physical Life کا نام ہے۔قرآن کریم نے کہا کہ کھانا پینا افزائش نسل کرنا اور مرجانا حیوانوں کی زندگی ہے۔ انسان کی زندگی اس سے آگے ہے۔ انسان میں ایک اور چیز بھی ہے' جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ وہ مرنے کے ساتھ مرتی نہیں ہے' آگے چلتی ہے۔ قرآن نے اصول یہ دیا ہے کہ ''انسانی جسم کی پرورش اس شے سے ہوتی ہے' جسے انسان اپنے لیے لیتا ہے' انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ کسی کو دیتا ہے''۔ یہ جو جان مارکر' یہ جانتے ہوئے محنت کرتا ہے کہ میرے اور میرے بچوں کا سارا خرچ پانچ روپے میں پورا ہوتا ہے' یہ بیس روپے جو کماتا ہے تو یہ ایمان ہے کہ یہ پندرہ روپے زائد میں دے رہا ہوں تاکہ میری ذات کی بھی نشوونما ہو جائے۔ اس کے جسم کی نشوونما اور پرورش کی ذمہ داری تو معاشرے نے لے رکھی ہے۔ یہ بطیّب خاطر دوسروں کی ضرورتوں کے لیے اس میں Contribute کر رہا ہے۔ پندرہ روپے زائد جو وہ کماتا ہے تو وہ اس لیے ہیں تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ یہ ہے سارا راز۔ کارل مارکس (1883-1818) کی سمجھ میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی۔ وہ انسان میں صرف Physical Life (طبعی زندگی) کا قائل ہے' انسانی ذات کا' آخرت کا' قائل ہی نہیں ہے۔

انسانیت کے راستے کی یہ تمام رکاوٹیں یقیناً ختم ہو جائیں گی

یہ ہے وہ چیز' عزیزانِ من! جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ** (83:3) جب یہ انسانوں کو تولتے ہیں' ان کا وزن کرتے ہیں' تو ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ یہ ''یُخْسِرونَ'' عجیب چیز ہوتی ہے۔ یہ وہ ہے جسے ہمارے ہاں ڈنڈی مار جانا کہتے ہیں' وہ کبھی بھی پورا پورا نہیں دیتا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ پورا دینے سے نظامِ سرمایہ داری چل نہیں سکتا' اس میں پورا پورا نہیں دیتے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے کہا کہ **اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ o لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ** (83:4-5) یہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے اس نظام کو بڑا محکم اور مضبوط بنا لیا ہے کہ یہ بیچارے مزدور' یہ غریب' جن کو ہم نے رکھا ہی اس سطح تک ہے کہ اس سے یہ ابھرنے ہی نہ پائیں' یہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ کہا کہ نہیں' انہیں پتہ نہیں ہے۔ یہاں اس آیت میں یہ ''بعث'' کا لفظ قرآن میں بڑی عجیب چیز ہوتی ہے۔ یہ ہوتا ہے ''راستے کی رکاوٹ کو ہٹا دینا''۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو ہم نے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں' یہ ہٹ نہیں سکتیں' انہیں کوئی ہٹا ہی نہیں سکتا' ہم نے اپنے اس نظام کو اتنا محکم بنا لیا ہے کہ اسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ کہا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ ہٹ جائیں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کب ہٹ جائیں گی؟

قرآنِ حکیم کا عالمگیر نظامِ ربوبیت قائم ہو کر رہے گا

غور سے سنیئے' عزیزانِ من! اس وقت صرف یہ ہے کہ صرف یہ طبقہ ہے جسے یہ مزدور کہتے ہیں' غریب کہتے ہیں'محتاج کہتے ہیں۔صرف ان پہ نگاہ ہے کہ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' یہ اس طرح سے انہیں تنگ کرتے جائیں گے اور یہ محتاج ومزدور طبقہ بڑھے گا تو جوالناس یعنی انسانیت ہے وہ ربوبیت عالمینی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی' اس دن راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ یہ ہے **يَـوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) عالمگیر ربوبیت کے لیے الناس کھڑے ہو جائیں گے' انسانیت کھڑی ہو جائے گی [1]۔

عزیزانِ من! بات قومِ شعیبؑ کی ہو رہی ہے وہ ان سے کہہ رہے ہیں کہ تمہارے اس نظام کا انجام تباہی ہوگا۔ یاد رکھو' اس پورے گروہ انسانیت کو اس مقام تک نہ پہنچاؤ کہ یہ اٹھ کھڑے ہوں اور پھر یہ صرف اپنے لیے نہیں اٹھ کھڑے ہوں گے یہ **لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (83:6) ربوبیت عالمینی کا یہ ایک نعرہ لے کر اٹھیں گے۔ یہ وہ چیز ہوگی جس میں یہ ساری رکاوٹیں' جو تم نے راستے میں ڈال رکھی ہیں' اٹھ جائیں گی' ان لوگوں کو آزادی حاصل ہو جائے گی۔ یہ تھی وہ باطل نظام کی چیز جس کے خلاف حضرت شعیبؑ کے سلسلہ میں قرآن نے یہ ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی۔ یہ جو چیز ہم نے کہی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا' ہم نے ایسے انتظام کر رکھے ہیں کہ یہ اٹھ ہی نہیں سکتے' ان کو ہم نے احتیاج کے' ضرورت کے' غربت کے' جہالت کے شکنجوں میں' جکڑ رکھا ہے' وہ اٹھ ہی نہیں سکتے۔قرآن کہتا ہے کہ یہ بات آج کی نہیں ہے۔حضرت شعیبؑ نے جب یہ بات کہی تو وہاں بھی یہی دہرایا گیا ہے جو اس آیت میں ہے۔

ان رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانے کا طریق

بات یہ کہی ہے کہ ان کے خلاف براہِ راست کچھ نہ کہا جائے۔ اگر ان کے خلاف براہِ راست کہتے تو یہی لوگ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔ آپ دیکھیے کہ ان کی یہ سازش کتنی گہری ہوتی ہے اور ہر دور کی یہی ہوتی ہے کہ انہیں کچھ نہ کہا جائے۔ یہ جو عوام ان کے پیچھے لگ رہے ہیں' ان کی آواز سے متاثر ہو رہے ہیں' ان کو بہکایا جائے۔قرآن کہتا ہے کہ وہ ان کے راستے میں بیٹھ جاتے ہیں اور ان کا راستہ روک لیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر یہ ہٹ جائیں گے تو وہ اکیلا کیا کرے گا۔ وہ لوگ اس کے متعلق یہ کہتے تھے۔ سوال یہ بھی پیدا ہو جاتا تھا کہ فساد کی جڑ تو یہ ہے جو دعوتِ انقلاب دیتا ہے۔ اس کے ہی خلاف اٹھ کھڑے ہونے والی بات کرو۔

---

[1] ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 30 مکمل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006 (سورۃ التطفیف)

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کے لیے صرف زبان کا سمجھنا ہی ضروری نہیں

قرآن نے کہا کہ **قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ** (11:91) اے شعیبؑ! جو کچھ تم کہتے ہو وہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ یعنی انہی کی زبان بول رہا ہے۔ قران نے یہ کہا ہے کہ ہم رسول کو پیغام دینے کے لیے بھیجتے ہی اس قوم کی زبان میں ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ صاحب! جو کچھ تم کہتے ہو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ انہی کی زبان بول رہا تھا' کیا بات سمجھ میں نہیں آتی تھی؟ سمجھ میں تو آتی تھی مگر مصلحت کوشیاں اور مفاد پرستیاں سمجھنے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ نہیں صاحب! ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی جو تم کہہ رہے ہو۔ اب اس سے نظر آیا کہ یہ زبان کا اشتراک کوئی شے نہیں ہے۔ وہ سمجھنا چاہے تو سمجھ سکتا ہے۔ اور یہیں سے بات آ گئی۔ ہمارے ہاں اکثر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہ جو عرب ہیں' یہ پچاس ساٹھ کروڑ[1] کی آبادی ہے' سب کی زبان عربی ہے تو کیا یہ قرآن شریف نہیں سمجھتے' تم ہی لوگ زیادہ سمجھتے ہو' تم لوگوں کی تو زبان بھی عربی نہیں ہے۔ سوال زبان کے عربی اور عجمی ہونے کا نہیں ہے۔ جو سمجھنا ہی نہ چاہے' وہ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ شعیبؑ تمہاری یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں!! یاللعجب۔

رسول ہمیشہ معزز خاندان سے ہوا کرتے تھے

باقی رہا یہ کہ ہم تمہاری باتیں بیٹھ کر کیوں سن لیتے ہیں؟ اس لیے کہ **اِنَّا لَنَرٰكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا** (11:91) تم اگر اکیلے ہوتے تو تم بہت کمزور سے آدمی تھے۔ اصل یہ ہے کہ **وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ** (11:91) اگر تمہاری یہ برادری پیچھے نہ ہوتی تو دیکھو ہم تمہیں پتھر مار مار کر مار دیتے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو رسول آتے تھے' یہ معزز خاندانوں کے افراد ہوتے تھے' خود بھی صاحبِ عزت ہوتے تھے۔ وہ حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق جو قوم نے کہا تھا کہ تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں' ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ تم آئے ہو' بڑے پڑھے لکھے سمجھدار ہو' رابطہ بھی تمہارا اچھا ہے' تمہارے Contact (تعلقات) بھی بڑے ہیں' محاورۃً یہ بھی ہے کہ کمشنر کے ہاں' بورڈ آف ریونیو میں' سیکرٹریٹ میں بھی' اوپر کیبنٹ میں بھی تمہارے بڑے تعلقات ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ تم یہ قانون بناؤ گے کہ یہ جو ان غریبوں کے پاس چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی ہیں' یہ بھی اشتمال اراضی کے ذریعے یہ جو ہمارے بڑے بڑے قطعے ہیں' یہ سارے ان میں ملا لو۔ تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ دعوت سے پہلے بھی رسول کا مقام

---

[1] یاد رہے یہ بات جولائی 1978ء کی 21 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

معاشرے میں ایسا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر تُو اکیلا ہوتا تو ہم تمہیں ختم کر دیتے کیونکہ **وَ مَآ اَنۡتَ عَلَيۡنَا بِعَزِيۡزٍ** (11:91) تمہارا کچھ بس نہ چلتا' اورتم ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکتے۔

انسان کے لیے اس کی اصل طاقت اس کا جتھہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کا قانون ہوتا ہے

حضرت صالحؑ کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ **قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَهۡطِىۡۤ اَعَزُّ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ** (11:92) میری برادری سے تم ڈرتے ہو' خدا کے قانونِ مکافات سے نہیں ڈرتے۔ ڈرنے کی چیز تو وہ ہے۔ میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ میری برادری یا جتھہ ہو' قوت اس میں نہیں ہے۔ قوت تو اس کے اندر ہے جو تم غلط نظام قائم کرتے ہو' یہ خدا کا قانونِ مکافات عمل تمہیں تباہ کرے گا۔ کیا الفاظ ہیں! تم اللہ کے قانون سے نہیں ڈرتے' میری برادری سے ڈرتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ تُو جو روز خدا خدا کہتا رہتا ہے' ہم بھی تو خدا کو مانتے ہیں۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ قومیں خدا کو مانتی تھیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ خدا کو ماننے والی قوموں کو یہ دعوت دی جا رہی ہے کہ خدا کو مانو' خدا پر ایمان لاؤ' یہ کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ آیت کا ایسا ٹکڑا ہے جب میں نے پہلی دفعہ اس پہ غور کیا تو پوچھو نہیں کہ میں کتنے دن سرور میں رہا۔ یہ جو ہمارے ہاں کرکٹ کی ٹیم جاتی ہے' اس میں 11 کھلاڑی (Players) تو چن لیتے ہیں' وہ تین چار کھلاڑی اس کے اندر ایکسٹرا (Extra: زائد) رکھ لیتے ہیں کہ جب ان کو کچھ ہو جائے' ان سے کام نہ چلے تو اُن کی جگہ اِن میں سے لے آئیں۔ یہ Extras (ایکسٹرا) کہلاتے ہیں۔ آج کل تو نوجوان طبقہ یہ سمجھ لے گا کہ یہ جو فلمیں بنانے والے ہیں' ان کے ہاں بھی Extras (ایکسٹرا) رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ جو ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں وہ تو پہلے ہی چنے ہوئے ہوتے ہیں' کسی کو کچھ ہو جائے' کوئی اور بات ہو جائے تو اس وقت اِن میں سے کسی کو رکھنا چاہیے جو یہ کام دے یا جب ان سے یہ کام نہ چلے تو جیسے ضرورت پیش آ جائے تو پھر اس کو درمیان میں لے آئے۔

خدا کے نام کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سطحی طور پر تسلیم کرنا قبول نہیں کیا جائے گا

سنیئے عزیزانِ من! ہمارا' آپ کا' قوم شعیبؑ کا' خدا پر ایمان کا کیا کہا ہے؟ کہا کہ **وَ اتَّخَذۡتُمُوۡهُ وَرَآءَكُمۡ ظِهۡرِيًّا** (11:92) تم کہتے ہو ہمارا خدا پہ ایمان ہے۔ تم نے خدا کو ایک Extra (ایکسٹرا) کی حیثیت سے رکھ چھوڑا ہے کہ جہاں اور ذرائع کام نہ دیں تو وہاں خدا کو درمیان میں لے آؤ' یہ بارھواں کھلاڑی ہو۔ کیا بات ہے قرآن کی! جب نظر آ جائے کہ اگلا میری بات نہیں مانتا' جھوٹا سمجھتا ہے تو خدا کی قسم' ''قرآن کسے کم نہیں اوندا' سوائے چک کے عدالت اچ لے جاؤ کہ کھا قسم قرآن

دی''۔ ❶ اس دور میں وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہارا یہ کہنا کہ خدا پر ہمارا ایمان ہے' تم نے تو خدا کو ایک ایکسٹرا کی حیثیت سے رکھا ہوا ہے کہ جو چیزیں سمجھتے ہو کہ ان سے ہمارا کام چلے گا' جب ان میں سے سمجھو کہ کام نہیں چلتا تو پھر وہ خدا سامنے آ جاتا ہے' مذہب کا نعرہ لگایا جاتا ہے' وہ جو نظامِ خداوندی ہے اس کا جھنڈا بلند کر دیا جاتا ہے۔ جب سیاست کے اور حربے کام نہ دیں تو یہ جو عوام کے جذبات ہیں وہ تو مذہب کی بنا پر کام آتے ہیں' پھر وہ اس اکسٹرا (Extra) سے کام لیتے ہیں۔

ہم نے بھی قومِ شعیبؑ کی طرح قدر کے نام کو ایک اکسٹرا (Extra) خدا کے طور پر مان رکھا ہے

آپ کو معلوم ہے' عزیزانِ من! کہ یہ بات حضرت شعیبؑ نے ہی اپنی قوم سے نہیں کہی تھی' نہ ہم نے کبھی غور کیا ہے' نہ ہمیں یہ بتانے والے بتاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ** (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو! ایمان لاؤ خدا پر۔ وہ ہم سے یہ کہہ رہا ہے۔ تو کیا یہ ایمان نہیں ہے؟ ہم بھی قومِ شعیبؑ کی طرح کہیں گے کہ صاحب! خدا پہ تو ہمارا ایمان ہے تو یہی جواب ملے گا کہ ٹھیک ہے لیکن تم نے تو اسے ایک اکسٹرا (Extra) کی حیثیت دے رکھی ہے۔ خدا پر ایمان لاؤ۔ جب انہوں نے کہا کہ اب ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں' لاؤ وہ عذاب جو لانا چاہتے ہو' لاؤ اسے۔ انہوں نے کہا کہ وہ عذاب ایسی چیز نہیں ہے کہ خدا نکردہ میں مداری کی طرح کروں اور عذاب آ جائے۔ سوال یہ نہیں ہے۔ میں ایک نظام پیش کرتا ہوں' تم کہتے ہو کہ یہ غلط ہے۔ اس نظام کے نتائج اتنے انسانیت ساز نہیں ہوں گے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ اس کے برعکس تم ایک نظام پیش کر رہے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا انجام تباہی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ عزیزانِ من! آپ غور کیجیے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم معجزہ دکھا دیتے تھے اور وہ ثبوت ہو جاتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں۔ اس لیے کہا کہ **وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ** (11:93) بہت اچھے' یوں نہیں مانتے تو اس کے بعد Pragmatic Test (استنتاجی ٹسٹ) ہے' ایک تجرباتی طریقہ ہے' تم اپنے نظام پہ کاربند رہو' مجھے اپنے نظام پہ عمل کرنے کے لیے مہلت دو' فرصت دو' میں اِدھر نظام قائم کرتا ہوں۔ تم اُس میں دخل نہ دینا۔ میں اتنے وقت میں تمہارے نظام میں دخل نہیں دوں گا۔ **سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ** (11:93) یہ نہیں' کہ پھر دیکھو' قیامت والے دن کون جہنم میں جاتا ہے' ابھی بات سامنے آ جائے گی۔ دونوں نظاموں کا نتیجہ بتا دے گا کہ کس کا دعویٰ سچا ہے' کس کا دعویٰ جھوٹا ہے؟ **مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ** (11:93) نتائج بتا دیں گے کہ کون سا وہ نظام ہے جس کا نتیجہ ذلت اور رسوائیاں ہیں' ہم دونوں میں سے کون جھوٹا دعویٰ کرنے والا

---

❶ قرآن کسی کام نہیں آتا سوائے اس کے کہ اسے اٹھا کر عدالت میں لے جاؤ کہ قرآن کی قسم کھاؤ۔

ہے۔ دعوے کی صداقت کا اصل ثبوت یہ ہے کہ اس کو عمل میں لاؤ اور عمل میں لانے کے بعد نتائج بتائیں گے کہ کونسا نظام صحیح ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دوران مذہبی پیشوائیت کے ساتھ طلوع اسلام (مجلّہ) کا تنازعہ اس سسٹم کی بنیاد پر ہی تھا

عزیزانِ من! جب ہم نے تحریک پاکستان میں اس خطۂ ارض کا مطالبہ کیا تھا' وہاں دلیل یہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہی سیکولر نظام ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کہتی تھی کہ اس نظام میں ہمیں نماز' روزے' حج' زکوٰۃ کی اجازت ہے' باقی جو سارا سسٹم ہے وہ سیاست ہے۔ ہم ان سے یہ کہتے تھے کہ خدا کا عطا کردہ نظام اس کے برعکس ہے۔ وہاں صرف خدا کے قوانین کی حکومت ہوگی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چار دن نہیں چل سکے گا۔ اب ''میں'' بیچ میں لے آؤں۔ یہ جوان کا شعبہ تھا جو مذہب کی بنیادوں پر یہ مخالفت کرتے تھے' ان کی مدافعت میرے ذمے تھی۔ طلوعِ اسلام (مجلّہ) اس زمانے ❶ میں جاری کیا گیا تھا۔ اس زمانے کے فائل پڑھیے۔ ہم دلیل دیتے تھے کہ یہ خطۂ زمین ہمیں لے لینے دو' اس کے اندر ہم میں امکانی قوت ہو جائے گی کہ ہم خدا کے احکام کو نافذ کریں گے' نتائج بتا دیں گے کہ جو تم کہتے ہو وہ صحیح ہے یا جو ہم کہتے ہیں صحیح ہے؟ ہمیں تھوڑی سی مہلت دو۔ یہ آیات پیش کی جاتی تھیں۔ اب یہ تو بات ہی الگ رہ گئی کہ خطۂ زمین ملا تو ہم نے ان سے بھی زیادہ خدا کو اکسٹرا (Extra) بنا لیا۔ وہ تو بارھواں کھلاڑی رکھتے تھے' ہم نے تو پتہ نہیں 15 واں' 16 واں' 17 واں رکھا ہوا ہے۔

بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ بابا! یہ نظام کے قیام کی بات ہے۔ تم اپنا نظام قائم رکھو' میں دخل نہیں دیتا۔ کیا بات ہے اس کی!! کتنا اعتماد ہے اپنے آپ کے اوپر کہ مجھے اپنا نظام قائم کر لینے دو۔ وہ اس نظام کے قائم ہونے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ یہ اتنی سے بات چاہتا تھا کہ میں تمہارے نظام میں دخل نہیں دیتا' تم میرے نظام میں دخل نہ دو' نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تحریک پاکستان کے زمانے میں جو آپس میں تصادم تھا' علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے ایک شعر میں اس کی بات کر دی:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

---

❶ 1938ء میں:

Founded in 1938 at the behest of Allama Iqbal (R) and Quaid-e-Azam.

سجدے کی اجازت اور چیز ہوتی ہے' اسلام کا آزاد ہونا اور چیز ہوتی ہے۔ اس میں وہ جو اسلام کا نظام قائم کرنا چاہتے تھے' اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اسے قائم ہونے دیں' وہ سجدے کی اجازت تو دیتے تھے۔ وہ تو سب سے پہلے جو ملکہ وکٹوریا (1819-1901) نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد منشور جاری کیا تھا' جو چارٹر تھا' اس میں یہ چیز تھی کہ یہاں ہر قوم کو اپنے اپنے مذہب کی اجازت ہوگی۔ ہمارے ہاں پاکستان کی تحریک کے مخالف علما حضرات یہ دلیل دیتے تھے کہ یہ دیکھیے کہ ہمیں ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے تو پھر تم اس مذہبی آزادی کے لیے الگ خطۂ زمین کیوں مانگتے ہو؟

قرآن حکیم کے ہاں صلوٰۃ کا مفہوم قرآنی نظام کو عملاً قائم کرنا ہے

یہ بات کل کی نہیں ہے۔ یہ بات حضرت شعیب علیہ السلام کے سلسلے میں آئی ہے' بڑی اہم آیت ہے۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ ٹھیک ہے مجھے خدا نے یہ حکم دیا ہے' خدا کی عبادت کے لیے میں آیا ہوں اور اس کے اندر یہاں یہ بات آ گئی' صلوٰۃ کا بھی لفظ آتا ہے۔ یہاں بھی جب صلوٰۃ کہتے ہیں تو اب انہوں نے ایسا چکر چلایا ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ ہی اب غائب ہو چکا ہوا ہے' ہمارے ہاں نماز کا لفظ آ گیا ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ میں صلوٰۃ پڑھنے جا رہا ہوں' کہتے ہیں کہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے بھی یہ بات کہی' انہوں نے یعنی قوم نے یہ کہا کہ اس سے کیا بگڑتا ہے' نماز کی اجازت مانگتا ہے' ٹھیک ہے ہم اپنے طور پر کچھ بت پرستی کر لیتے ہیں' یا خدا کو پوج لیتے ہیں' اپنے طور پر یہ پوج لے گا' اس سے کیا بگڑتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' ہم اس کی اجازت دیتے ہیں' ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے۔

حضرت شعیبؑ کی صلوٰۃ معاشی نظام کا بھی احاطہ کیے ہوئے تھی

اب جو وہ صلوٰۃ آگے بڑھی تو یہ مجھ سے نہیں قرآن کے الفاظ میں سنیے کہ انہوں نے کیا کہا؟ انہوں نے کہا کہ **قَالُوْا يٰشُعَيْبُ** (11:87) بڑی حیرت ہے کہ اے شعیب علیہ السلام! تم نے تو ہم سے صلوٰۃ کی بات کی تھی اور ہم Agree (اتفاق) کر گئے تھے اور اس صلوٰۃ کی یعنی نماز کی اجازت بھی ہم نے دیدی تھی تو **اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا** (11:87) تمہاری یہ نماز' یہ صلوٰۃ' کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔ صلوٰۃ ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتی' یہ ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں' ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ پوجا پاٹ' بھگتی ایشور' بندگی' عبادت' خدا کی پرستش' کچھ اس قسم کا ہے کہ پڑھ لیا کرو نمازیں' یہ صلوٰۃ کہ جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔ دیکھ رہے ہیں صاحب! کہ صلوٰۃ کے معنی کیا ہیں؟ تو کیا اس صلوٰۃ کی اجازت

آپ کو کوئی دوسرا سیکولر نظام دے گا؟ وہ وہاں خوش تھے' ❶ یہی حضرات تھے جو یہاں ❷ آ گئے ہوئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ نماز کی تو اتنی اجازت ہے۔ یہ مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957ء) کا قول تھا۔ وہ کہتے تھے کہ وہاں ریزولیشن پاس ہوتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کی پوری آزادی ہوگی۔ قومِ شعیب علیہ السلام نے بھی یہی بات سمجھی ہوگی۔ کہا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ یہ طریقہ جو ہمارے ہاں عبادت کا' پرستش بندگی پوجا پاٹ کا چلا آ رہا ہے' وہ یہ مذہب نہیں ہے' اس کو چھوڑو اور یہ صلوٰۃ اختیار کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ تو کہا کہ اچھا! یہ صلوٰۃ ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔

نظامِ صلوٰۃ کی ساری کی ساری مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے

یہ ہے صلوٰۃ' عزیزانِ من! اس کی اجازت کون دے سکتا ہے؟ اس لیے انہوں نے یہ کہا کہ **قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ** (7:88)۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جو ''الملا'' کا لفظ آتا ہے یہ بار بار آتا ہے اور وہ جو نواں پارہ ہے اس کے اوپر آپ نے دیکھا ہوگا کہ قال الملا لکھا ہوتا ہے' یہ شروع وہاں سے ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ تو سردارانِ قوم ہی کر دیا جاتا ہے تو ٹھیک ہے' ہوتے تو وہی ہیں لیکن اس کے بنیادی معنی وہی ہیں جو میں نے آپ کو بتائے ہوئے ہیں کہ ''وہ جن کے گھروں میں برتن اناج سے بھرے ہوئے ہوں''۔ یہ ساری مخالفتیں ان کی طرف سے ہوتی ہیں' اور وہی پھر سردار بنتے ہیں' وہی بڑے بڑے لیڈر بنتے ہیں' وہی اس قسم کے نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔ استکبار تکبر سرکشی کو کہتے ہیں۔ کس بنا پر یہ سرکشی؟ اس لیے کہ ان کے برتن اناج سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

سرمایہ دار کے نزدیک کوئی غریب تو عقلمند ہوتا ہی نہیں

دوسری جگہ حضرتِ نوحؑ ہی کے قصے میں قرآن نے کہا ہے۔ یہ لوگ جو غریب طبقے کے ہیں' روز محنت کر کے اپنی روٹی کماتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ دیکھو' یہ میرے ساتھ ہو لیے ہیں' انہوں نے یہ بات سمجھی ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تھا کہ ان کی یہ عقل تو کوئی عقل ہی نہیں ہے' ان کی سمجھ تو کوئی سمجھ ہی نہیں ہے' ان کی رائے تو کوئی رائے ہی نہیں ہے' رائے تو ہماری ہے جو گنی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ پھر میں وہی پنجابی کے محاورے پہ آؤں گا ''کہ جنا دی کوٹھی اچ دانے' اوہناں دے کملے وی سیانے''❸ جن کے گھر کھانے کو ہوتا ہے ان کے ہاں کا ''کملا'' بھی ''سیانا'' ہوتا ہے' جس کے پاس کھانے کو نہیں ہوتا ہزار عقل و دانش کا مالک بھی ہو تو بھی کوئی اس

---

❶ یعنی ہندوستان میں

❷ یعنی سرزمین پاکستان میں

❸ جن کے گھر اناج سے بھرے ہوں ان کے فاتر العقل بھی عقلمند ہوتے ہیں۔

کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا: ''چپ او چپ' بیٹھ جا آرام نال۔ ایویں ای دخل نہیں دیندا ہیگا سمجھ والیاں دی گلاں دے وچ۔ اومیاں جی! میری سن تے لؤ اوسنی ہوئی ہیگی تیری''❶ ۔ یہ نہیں ہے کہ صرف پنچائیت میں ہی اس کی بات نہیں سنی جاتی' اوپر تک کون سا غریب آدمی ہے جس کے ہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے اور وہ Elect (منتخب) ہوکر اوپر چلا جائے۔ بیس بیس ہزار روپیہ تو قانوناً الیکشن کا منظور کر دیا جاتا ہے۔ ''جیہدی کوٹھی اچ دانے نہیں سن' اوہدوں ای اوہدی صورت سی کہ کوئی نہیں سی سندا'' ❷

روپے کے بل بوتے پر کسی غریب کو کوئی بلند مرتبہ نصیب ہی نہیں ہوتا

آج بھی اگر بات سننے کی کوئی مجلس قائم ہوتی ہے' تو وہاں اس کا داخلہ بند ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ چیز کہ ''وہ جن کے برتن بھرے ہوئے تھے'' وہ غریب جو بات کہتے تھے' پہلے تو وہ جو اس بھرے ہوئے برتن والے کے ساتھی تھے' ان کو ورغلاتے تھے' ان کے راستے میں بیٹھ جاتے تھے۔ جب اس پہ بھی باز نہ آئے تو پھر یہ کہا کہ باز آتے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں تو ہم تمہارے سامنے دوٹوک متبادل باتیں پیش کر دیتے ہیں کہ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا (7:88) اے شعیب علیہ السلام! یا تو ہمارا یہ نظام ہے' اس کی طرف آ جاؤ اور اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر ہم تمہیں اپنے ہاں سے نکال دیں گے۔ اس میں وہ کوئی Compromise (مصالحت) نہیں کر سکتا' وہ باطل کے ساتھ Compromise (مصالحت) کرنے کو تیار ہی نہیں ہوسکتا۔ کیا کسی سوال کا غلط جواب اور صحیح جواب کسی طرح بھی آپس میں مفاہمت کر سکتے ہیں؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ وہ جو روز چیز ہوتی ہے کہ صاحب! آپ کے دو چوکے آٹھ ہیں وہ دو چوکے چھ کہتا❸ ہے۔ آپس میں تم جھگڑ رہے ہو' کٹ رہے ہو' لڑ رہے ہو۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے' کچھ تم نیچے آؤ' کچھ یہ اوپر چلتے تو دو چوکے سات❹ کے اوپر فیصلہ کر لو۔ اب جو دو چوکے سات❹ کے اوپر فیصلہ ہو تو وہ جو کچھ کہتا تھا تو اس کو اس میں بھی جیت ہے' مارا تو وہ جاتا ہے جو دو چوکے آٹھ کے بجائے سات پہ آتا ہے۔ حق کو چھوڑنے والا باطل پہ آتا ہے' باطل ایک باطل کو چھوڑے گا دوسرے باطل پہ آ جائے گا' غلط نشانے تو سو ہوتے ہیں' ٹھیک تو ایک ہی ہوتا ہے۔ جو ٹھیک نشانے پہ لگا ہے وہ اگر ان سے کہہ دے کہ اچھا جی! میں تمہارے دوسرے نشانے پر آ جاتا ہوں تو اس غلط نشانہ والے نے تو کچھ نہیں کھویا' اس صحیح نشانے والے کا کچھ رہا ہی نہیں۔ اس کا نام ضد رکھا جاتا ہے۔ حق پہ جو قائم ہوتا ہے'

---

❶ خاموش! چپ رہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ خوامخواہ عقلمندوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ میاں جی! میری سن تو لیتے۔ اے سنی ہوئی ہے تیری بات بھی!

❷ جس کے گھر ہن نہیں برستا تھا' وہیں اس کی صورت یہ تھی کہ اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔

❸ یعنی 2x4=8 اور 2x4=6

❹ 2x4=7

وہ بقول ان غلط کاروں کے ضد ہوتی ہے۔

آج باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے 51 فی صد ووٹ کافی ہوتے ہیں

آج جمہوری طرزِ حکومت میں جو حق پہ قائم ہیں' اس دور میں جو بہت بلند دانشوری کا دور ہے' کس طرح سے اس کے دو اور دو چار کو توڑا جاتا ہے! بس ایک ووٹ زیادہ یعنی 51 ووٹس لے لیجیے' دو اور دو سات قانوناً جائز ہو جائیں گے' آئینی طور پر یعنی Constitutionally اس ''حق'' کے خلاف کہیں کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا جا سکتا' یہ 49 والے لاکھ کہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ یہ ہے وہ چیز کہ یا تو یہ مان لو یا ہم تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔ **قَالَ اَوَ لَوۡ کُنَّا کٰرِہِیۡنَ** (7:88) کہا کہ خواہ ہمارا دل اس چیز کو نہ بھی مانے پھر بھی اگر ہم یہ مان لیں تو پھر تم سمجھ لو گے کہ مفاہمت ہوگئی۔ تمہارے نزدیک تو بات ہوگئی مگر **قَدِ افۡتَرَیۡنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِیۡ مِلَّتِکُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰنَا اللّٰہُ مِنۡہَا** ❶ (7:89) وہ جس نے ہمیں کہا تھا کہ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں اس کے ہاں جا کے کیا جواب دیں گے۔

عزیزانِ من! اب ہم پھر سورۃ الشعرآء کی آیتوں پر آتے ہیں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواریاں پیدا کرنے کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہوتا ہے۔ اس تباہی سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ **وَاتَّقُوا الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالۡجِبِلَّۃَ الۡاَوَّلِیۡنَ** (26:184) تم اس خدا کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور تم سے پہلی قوموں کو بھی۔ جس خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا' اس نے ان کی پرورش کے لیے سامانِ زیست بھی عطا کر دیا ہے۔ اس سامان کی تقسیم اس طریق سے کرو کہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے اس پر **قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِیۡنَ** (26:185) وہ کہنے لگے کہ اے شعیبؑ! نظر یہ آتا ہے کہ یہ جو تم لیے پھرتے ہو کہ خدا کی طرف سے مجھے اس قسم کے پیغامات ملتے ہیں' تم خود فریبی میں مبتلا نظر آتے ہو۔ دوسرے کہنے لگے کہ نہیں نہیں! اس پہ کسی نے جادو کر دیا ہے' یہ پاگل ہو گیا ہے۔

قرآنی اقتدار کو نہ ماننے والوں پر عذاب کی نوعیت

مزید کہا کہ **وَمَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَاِنۡ نَّظُنُّکَ لَمِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ** (26:186) ہمارے ہی جیسے ایک عام انسان ہو' کوئی جتھہ برادری نہیں' اکثریت تمہارے ساتھ نہیں' ہم سمجھتے ہیں کہ بالکل جھوٹ بولتے ہو اور اگر یہ بات نہیں ہے تو روز ڈراتے رہتے ہو کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' تم ہو تو ہماری ہی طرح کے انسان۔ اس لیے تُو خدا کا رسول کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہم

---

❶ اگر ہم تمہارے مذہب کو اختیار کر لیں حالانکہ (خدا نے اپنی وحی کی روشنی عطا کر کے) ہمیں اس باطل مذہب سے نجات دلائی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔361)۔

تمہیں تمہارے دعوے میں سراسر جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ ہماری اس روش کے نتیجے میں ہم پر تباہی آنے والی ہے تو فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ (26:187) پھر آسمان کا ایک ٹکڑا ہمارے اوپر گراؤ' کرو تباہ۔ وہ اس قسم کی تباہی سمجھتے تھے کہ کوئی آسمان کا ٹکڑا گرائے گا۔ اس نے کہا تھا کہ خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) ذلیل اور خوار ہو جاؤ گے۔ یہ ہے خدا کا عذاب۔ آسمان سے ٹکڑے نہیں گرا کرتے۔ عذاب اس شکل میں آیا کرتا ہے: خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) اس پر قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ قَالَ رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (26:188)۔ اس نے کہا کہ میں عذاب لانے والا ہوتا تو پتہ نہیں کس کس شکل میں لے آتا۔ وہ تو اس کا مکافات کا قانون ہے جو تمہارے اعمال کا نتیجہ تمہارے سامنے لائے گا۔ فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمِ الظُّلَّۃِ [1] (26:189) انہوں نے اس کی تکذیب کی۔ وہ عذاب جو ان کو پہلے سے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا' بس وہ محسوس شکل میں سامنے آنے کی بات تھی۔ قرآن نے تو جہنم کے متعلق کہا کہ تم انتظار کر رہے ہو کہ قیامت کا دن آئے گا' جہنم تو تمہیں آج بھی دیکھ رہا ہے۔ عذاب وہ ہو گا جب تم اسے دیکھنے لگ جاؤ گے۔ قوت کے نشے میں بند آنکھیں جہنم کو نہیں دیکھتیں' جہنم تو تمہیں آج بھی دیکھ رہا ہے۔ عذاب اسے کہتے ہیں' جب تم اسے دیکھنے لگ جاؤ گے۔ اِنَّہٗ کَانَ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ o اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً وَمَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ [2] (26:189-190) جو ہم بیان کر رہے ہیں یہ صرف اس زمانے کی بابت نہیں ہے' آج بھی یہ کچھ لوگوں کے سامنے کرو' ان میں آج بھی اربابِ بصیرت کے لیے بچنے کی اور تباہ ہونے کی علامات اور نشانیاں اور قوانین موجود ہیں۔ وَاِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ (26:191) یہ اس خدا کی طرف سے ہے جس کا قانون یہ قوت رکھتا ہے کہ باطل کے ہر نظام کو خواہ وہ کتنے ہی محکم مستحکم سہاروں کے اوپر کیوں نہ استوار کیا ہو وہ تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ اس کا عزیز ہونا ہے اور یہ رحیم ہونا ہے کہ جو مظلوم اور ضعیف اور ناتواں ہیں' کہ جو کچلے جا رہے تھے' ان کو وہ مقامِ انسانیت عطا کر دیتا ہے۔ اس کے ایک ہی فیصلے کے اندر اس کا غلبہ بھی ہوتا ہے' اس کی رحمت بھی ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الشعرآء کی آیت 191 تک آ گئے' 192 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

---

[1] بہرحال وہ اس کی تکذیب کرتے رہے تا آنکہ ان کی غلط روش کے نتائج کے ظہور کا وقت آ گیا اور وہ ہر طرف سے ان پر چھا گئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 854)۔

[2] وہ عذاب بڑا ہی سخت تھا۔ اس قوم کی سرگزشت بھی اربابِ بصیرت کے لئے' ہمارے قانونِ مکافات کی صداقت کی نشانی ہے لیکن اس کے باوجود' ان میں سے اکثر لوگ ان قوانین پر ایمان نہیں لائیں گے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 854)۔

پندھرواں باب: **سورة الشعرآء** (آیات 192 تا 199)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1978ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 192 سے ہو رہا ہے: (26:192)۔

آپ کو یاد ہو گا کہ سابقہ آیات میں حضرت انبیائے کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ کا ذکر مسلسل چلا آ رہا تھا۔ حضرتِ نوح علیہ السلام سے حضرتِ شعیب علیہ السلام تک کی داستانیں ہمارے سامنے آئیں اور جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے کہا تھا کہ ان میں سے ہر رسول دین کے کسی ایسے گوشے کو نمایاں کرتا تھا جس کے خلاف اس زمانے کی' اس کی مخاطب قوم نے' انسان کے باطل نظام سے فساد برپا کر رکھا ہوتا تھا۔ وہ اس غلط باطل نظام کی جگہ نظامِ خداوندی کو رائج اور نافذ کرنا چاہتا تھا۔ یہ تھا وہ انقلاب جو وہ نبی لانا چاہتا تھا۔ نبی واعظ نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ انقلاب آفریں شخصیتیں ہوتی تھیں۔ حضرتِ شعیبؑ کا ذکر تو مسلسل سابقہ آیات میں آ گیا ہے اور اس کے بعد دوسرے مقامات پر دیگر انبیائے کرامؑ کا ذکر آئے گا تو انہیں ہم اس وقت لیں گے کیونکہ ہمارا درس تو مسلسل آیات کی رو سے سورتوں کی رو سے' چل رہا ہے تو اس لیے ہم یہاں اس سے اگلی آیت میں آتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ نبی

اکرم ﷺ یا قرآنِ کریم پر آ گیا ہے اور کہا کہ **وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (26:192) وہی دین جو حضرتِ نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کے انبیائے کرامؑ تک جستہ جستہ طور پر، متفرق طور پر، جزاً جزاً آتا رہا، یہاں پہنچنے پر وہ ایک مکمل شکل میں وحی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو دے دیا۔ مکمل شکل میں اس لیے کہ حضور ﷺ آخری نبی تھے، دین کو مکمل شکل میں قیامت تک محفوظ رہنا تھا۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ اس کے محفوظ رکھنے کے لیے خود خداوند تعالیٰ نے طریقہ کیا اختیار کیا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ **وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ**[1] (26:192)۔

علمِ انسانی اور علمِ وحی میں ایک بنیادی فرق ہے

یہاں (26:192) میں وحی کے لیے ''نزول'' کا لفظ آیا ہے ''نزول ہونا'' آیا ہے۔ اور اس کے ایک لفظ کے اندر وحی اور انسانی علم میں جو بنیادی فرق ہے اس کو نمایاں طور پر سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ انسانی علم انسان کے اپنے کسب و ہنر، کوشش، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے، باہر سے اس کو اطلاعات (Information) ملتی ہیں اور ان اطلاعات (Information) پر مبنی یہ اپنی فکر کی رو سے کسی نتیجے پر پہنچتا ہے اس لیے انسانی علم اس کے اندر سے باہر آتا ہے۔ یہ جو لفظ Education (تعلیم) ہے، خود اس لفظ کے معنی ہیں کہ اندر سے باہر لانے والی چیز۔ Education (تعلیم) کے معنی ہوتا ہے کہ انسان کی اندر کی صلاحیتوں کو برومند کر کے باہر لایا جائے۔ اطلاعات (Information) وہ ہوتی ہے جو باہر سے اس کو دی جاتی ہے۔ انسانی علم انسان کی اپنی فکر اور کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کی طرف جو وحی آتی تھی اس میں ان کی اپنی فکر، کاوش، کسب و ہنر، کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا، یہ خالصتاً Objectively یعنی خارج سے ان تک پہنچتی تھی۔ اور یہ خصوصیت تھی صرف وحی کی اور وحی انبیائے کرامؑ کی طرف نازل ہوتی تھی۔ اور ختمِ نبوت کے بعد علمِ انسانی کا یہ دوسرا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

کشف اور الہام کے تصورات خالصتاً عجمی تصورات ہیں

یہ جو آپ کشف اور الہام کی یہ سب چیزیں دیکھتے ہیں، یہ سب عجمی تصورات ہیں، غیر قرآنی ہیں، خلافِ اسلام ہیں۔ یہ تو ختمِ نبوت کو توڑنے کی سازشیں ہیں۔ اس کے لیے وحی کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے بلکہ کشف کا استعمال کر دیا ہے، الہام کا کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ خدا کی طرف سے انہیں علم ملتا ہے۔ خدا کی طرف سے تو ایک ہی علم ملتا تھا، اسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ کو ملتا تھا، غیرِ نبی کو ملتا نہیں تھا۔ ختمِ نبوت کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب یہ کہنا کہ اسی طرح سے ہمیں یہ علم ملتا ہے، اسے کشف کہا جاتا

---

[1] اسے اس خدا کی طرف سے بتدریج نازل کیا جا رہا ہے جو تمام نوعِ انسانی کا نشوونما دینے والا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 855)۔

ہے۔تو یہ نام کے بدل دینے سے اس کی نوعیت اور حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔

تنزیل کا قرآنی مفہوم

تنزیل، نزول، کسی چیز کا خارج سے (Objectively) نازل ہونا ہے، اوپر سے نیچے آنا ہے، نیچے سے اوپر جانا نہیں ہے۔ اور پھر آپ تنزیل کا یہ لفظ دیکھیے۔ ابھی عربی زبان کی بات آتی ہے لیکن یہیں وہ بات آئے گی کہ یہ عجیب وغریب زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ (Root) ہوتا ہے جیسے اس لفظ تنزیل یا نزول کے اندر ''ن ز ل'' ہے اور اس میں آگے جا کر مختلف ابواب یا اوزان ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق اس مادے (Root) میں ایک آدھ لفظ کا تغیر وتبدل کیا جاتا ہے اور معنی بدلتے چلے جاتے ہیں، لیکن بنیادی معنی وہی ہوتے ہیں، صرف نوعیتیں بدلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ عجیب زبان ہے۔ تنزیل کا وزن یا باب کہہ لیجیے: یہ ہے تفعیل کا باب۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ بھی اس وزن پہ آئے گا، اس کے مادے میں جو بنیادی معنی ہیں وہ اس میں موجود ہوں گے۔ لفظ تنزیل کے مادے ''ن ز ل'' کے بنیادی معنی ہوئے ''خارج سے آنا''۔ اب وہ لفظ جو اس مادے سے، اس تفعیل کے وزن پہ آئے گا جیسے ''تعلیم'' ہے، ''تکریم'' ہے، ''تعظیم'' ہے، ''تنزیل'' ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تمام الفاظ اسی وزن کے اوپر آتے چلے جارہے ہیں۔ تو اس وزن یا باب کے معنی ہوتے ہیں ''آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اس کام کا ہونا جو مادے میں بتایا گیا ہے''۔ تو لفظ تنزیل نے یہ بات بتا دی کہ قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہو گیا تھا بلکہ یہ جستہ جستہ رفتہ رفتہ بتدریج آیا، تئیس سال میں اس کی تکمیل ہوئی۔ تنزیل کا لفظ یہ بتاتا ہے: خارج سے وحی کے ذریعے ملنے والا علم جو بتدریج آغاز سے تکمیل تک پہنچا۔ آپ نے دیکھا کہ عربی زبان میں یہ مادہ اور مادے سے بننے والے الفاظ کس قدر معنی خیز ہوتے ہیں [1]۔ تنزیل، خارج سے ملا ہوا علم جو رفتہ رفتہ بتدریج تکمیل تک پہنچا۔ اس کو رب العالمین نے بھیجا۔ اس میں اس وحی کا مقصود بتا دیا۔ مقصود ہے ''ربوبیتِ عالمینی''۔ دین کا منتہیٰ یہ ہے۔ ربوبیت کے معنی انسان کے جسم کی پرورش، نشوونما اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔ ربوبیت میں دونوں چیزیں آتی ہیں تو رب ہے ایسی نشوونما بہم پہنچانے والا۔ اور کسی فرد کی نہیں، کسی گروہ کی نہیں، پارٹی کی نہیں، قبیلے کی نہیں، نسل کی نہیں بلکہ عالمین کی۔ عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچانے والا۔ قرآن خدا کی طرف سے رفتہ رفتہ تئیس سال میں تکمیل تک پہنچا۔ معنی یہ ہو گئے (26:192) کے [2]۔

---

[1] مادہ، باب، اور ان کی مزید تشریح وتبیین کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۃ انبیاء، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ لاہور، 2005، ص ص۔ 21-20؛ بالخصوص انہی صفحات کے فٹ نوٹ (1`2)20اور (4-3)21، نیز مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورہ الفاتحۃ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2007، ص ص۔ 61 تا 62

[2] نیز دیکھیے سورۃ الرحمٰن

غیر از نبی وحی کی لذت سے ہی محروم ہوتا ہے

وحی نبی کے سوا کسی کو نہیں مل سکتی تھی اس لیے غیر از نبی یہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس کی کیفیت کیا ہوتی تھی' کیسے ملتی تھی' اس کی نوعیت کیا تھی۔ ہمیں علم کا ایک ہی ذریعہ معلوم ہے کہ یہ اکتسابی طور پہ حاصل کیا جاتا ہے۔ علمِ وحی کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس لیے یہ سوال غلط ہے کہ وحی کی نوعیت کیا ہوتی تھی' کیسے ملتی تھی۔ اس پر ہمارے ہاں فلسفیوں نے بڑی بڑی بحثیں کیں۔ غیر از نبی تو وحی کو جان ہی نہیں سکتا تھا۔ قرآن نے اتنا ہی بتایا ہے کہ **نَـزَلَ بِـهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ** (26:193) روح الامین اس کو لے کر نازل ہوا۔ یہ روح الامین دو الفاظ ہیں۔ دوسری جگہ اس کو روح القدس (16:102) کہا گیا ہے۔ قدس کے ویسے تو معنی ''مقدس'' کے کیے جاتے ہیں یعنی پاکیزہ۔ اس میں پاکیزگی نہیں ہوتی۔ ''قدس'' کے معنی ہوتا ہے ''دور دور تک چلا جانے والا' وہ جس کی وسعتیں لاانتہا ہوں''۔

''روح'' کے مروجہ معانی و تصور غیر قرانی ہیں

میں ابھی عرض کروں گا کہ ''روح'' کیا ہے۔ ایک جگہ یعنی (2:97) میں اسے ''جبریل'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ''روح'' کے متعلق جو کچھ ہم عام سمجھتے ہیں' وہ عربی زبان میں' قرآن کریم میں' ان معنوں میں نہیں آیا۔ ہمارے ہاں تو جانتے ہیں کہ ایک جسم ہوتا ہے' ایک روح ہوتی ہے۔ پھر وہ جسم مردہ ہوجاتا ہے' اس میں سے روح نکل جاتی ہے' جسم باقی رہ جاتا ہے۔ اور پھر آگے جب وہ روح مولوی صاحب کے پلے میں پڑ جاتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ روح اس مردے کی قبر کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے تاوقتیکہ آپ تیسرے دن ''قل کا ختم'' دے کر اور مولوی صاحب کو کچھ نیاز دے کر اسے آگے نہ بھیجو۔ جب تک یہ کچھ نہ کرو' وہ آگے نہیں پہنچتی۔ قرآن کریم میں ''روح'' کا لفظ ان معنوں میں آیا ہی نہیں ہے۔ اب میں اس بحث میں نہیں جانا چاہتا بس اتنا کہتا ہوں کہ یہ یونان سے آیا ہے جنہوں نے Matter (مادہ) کے مقابلے میں Spirit (غیر مادی) کا ایک لفظ ایجاد کیا تھا تو Spirit (غیر مادی) کے معنی ہمارے ہاں روح کر دیا گیا۔ اور روح کا لفظ قرآن میں جہاں آیا ہے وہاں ہم نے اس کو Spirit بنایا اور اس سے Spiritual (روحانی) بنا جس سے روحانیت آ گئی۔ یہ سارے تصورات غیر قرآنی ہیں۔

''روح'' کے قرآنی معانی توانائی کے ہیں اور قرآن انسان کے لیے روح کا ذکر نہیں کرتا

قرآن ایک تو انسان کے جسم کا ذکر کرتا ہے اور ایک اس کے نفس یا اس کی ذات کا ذکر کرتا ہے' روح کا ذکر نہیں کرتا۔ ''روح'' کے معنی ''توانائی'' کے ہوتے ہیں' اس کو Energy (انرجی) کہتے ہیں۔ یہ کیا ہے ہم نہیں جان سکتے۔ روح خدا کی ہے'

انسان کی روح کا قرآن میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ یہ جو روحِ خداوندی ہے' میں اس کو الوہیاتی توانائی کہا کرتا ہوں' اس کا ترجمہ ہی یہ ہے' اس کو آپ Divine Energy کہہ سکتے ہیں۔ اور یاد رکھیے' خود یہ جو لفظ Energy (انرجی) ہے' یہ بھی بڑا گہرا لفظ ہے۔ انرجی کو آپ جان نہیں سکتے کہ وہ ہوتی کیا ہے۔ مثلاً Electricity (بجلی' برق) کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ یہ جو Electrified Object (برق بردار جسم) ہوتا ہے جس میں Electricity (برق' بجلی) ہوتی ہے وہاں سے تو کچھ معلوم ہوتا ہے۔ اسے Touch (مس) کیجیے تو پتہ لگتا ہے کہ کیا ہو گیا۔ خود اس Electricity (برق' بجلی) کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اگر وہ محسوس Object (جسم) کے اندر نہیں آتی تو ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ الیکٹرسٹی بڑے بڑے Power Houses (بجلی گھروں) کے اندر Emergent (نمودار) ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ وہ تار نہ لگایا جائے تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کیا پیدا ہو رہا ہے۔ وہ تو کسی Material Subject (مادی شے) کے ساتھ جب Touch (مس) کرے گی' جب وہ اس کے اندر سرایت کرے گی تو اس کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہو گا کہ یہ کیا ہے۔ آج کے جو سائنٹسٹ ہیں' وہ آپ کی اس Material World (مادی دنیا) کو پیچھے کھینچے چلے گئے ہیں' تو یہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ آخر الامر یہ مادہ Pure Energy (خالص توانائی) میں Convert (تبدیل) ہو جاتا ہے۔ ایک تو انرجی وہ شے ہے جس کو آپ Grip (پکڑ) میں نہیں لے سکتے' سمجھ سکتے ہیں۔ پھر وہ Pure Energy (خالص توانائی) اس انرجی کو کہتے ہیں جو کسی مادی جسم کے اندر نہ آئی ہوئی ہو[1]۔ فلاسفر آج یہاں تک ہی پہنچ سکے ہیں۔

---

[1] آج کا فلاسفر مشہور عالم ریاضیات سر جیمز جینس تو یہ کہتا ہے کہ یہ ''تمام مادی کائنات سوائے لہروں (Waves) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ محصور لہریں یعنی 'Bottled up waves' جنہیں ہم مادہ کہتے ہیں اور آزاد لہریں جنہیں روشنی کہا جاتا ہے۔ ان محصور لہروں کو اگر آزاد کر دیا جائے تو وہ فضا کی پہنائیوں میں منتشر ہو جائیں (The Mysterious Universe)''۔ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''مادہ درحقیقت مربوط حوادث (Inter- related Events) ہیں' یا شین (Sheen) کے الفاظ میں مادہ' اس خلا میں حوادث کی مجرد ریاضی خصوصیات کا نام ہے یعنی

"Matter is an abstract mathematical characteristics of events in empty space".

یا Quspensky کے الفاظ میں مادہ محض ایک Condition ہے:

"Materiality is the condition of existence in time and space".

(ماخوذ از پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1955' ص ص۔ 50 تا 51)۔

جبرائیل ❶، میکائیل ❷ الوہیاتی توانائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے

بہر حال میں ''روح'' انرجی کہہ رہا ہوں۔ اب زیادہ سے زیادہ ہم اس کے ترجمہ میں اپنے ہاں اسے الوہیاتی توانائی یا Divine Energy کہہ سکتے ہیں' اس لیے کہ خود لفظِ جبریل' جو قرآن نے استعمال کیا ہے' کے معنی بھی یہی ہیں۔ عبرانی زبان میں جو ''جبر یا جبر'' ہے یہ ایک توانائی کو کہتے ہیں اور ''ایل'' خدا کو کہتے ہیں۔ یہ جو میکائیل ❷ 'عزرائیل ❸ اور جبرایل الفاظ ہیں' ان میں یہ جو ''ایل'' ہے یہ عبرانی زبان میں ''الہٰ'' کے لیے آتا ہے' خدا کے لیے آتا ہے اور ''جبر'' کے معنی توانائی ہوتا ہے' تو جبرایل کے معنی بھی وہی ہوں گے جو روح الامین کے معنی ہو گئے۔ یہاں عربی زبان کا ''روح'' کہا ہے وہاں عبرانی کا ''جبر'' کہا ہے۔ یہ خدائی توانائی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ Pure Energy (خالص توانائی) کو ہم کیسے محسوس کرتے ہیں۔ **نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ** (26:193)۔ امین کہا ہے کہ جو خود اس میں کسی قسم کا دخل نہیں دیتا۔ وہ جو Medium (ذریعہ) ہے جس سے خدا کا یہ علم نبی کو ملتا ہے وہ Medium (ذریعہ) اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا' امانت دار ہے' وہ صرف امین ہے۔ نزل بہ ہے۔ وہ اس کو لے کر نازل کرتا ہے۔ **عَلٰى قَلْبِكَ** (26:194) تیرے قلب پر نازل کرتا ہے۔ تو ایک شے جو Pure Energy (خالص توانائی) ہو اور وہ خدا کی طرف سے آئے' کسی کے قلب کے اوپر نازل ہو' کوئی دوسرا تو اسے جان ہی نہیں سکتا۔ نازل ہونا تو چھوڑ دیجئے' ویسے نہیں جان سکتا۔ میری اپنی فکر' میرے خیالات' جو میرے دل کے اندر ہوتے ہیں' دوسرا جان نہیں سکتا۔ یہاں **عَلٰى قَلْبِكَ** (26:194) ہے۔ اسے دوسرا کوئی نہیں جان سکتا۔

تصوف تو سراپا غیر قرآنی تصور ہے

تصوف تو بالکل غیر قرآنی تصور ہے' اب اس میں اگلی بات یہ ہوئی کہ یہ جو سارے صوفیائے کرام ہیں' جنہیں ہمارے ہاں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے' میں عرض کروں گا کہ ان کا دعوٰی یہ ہے کہ ان کو بھی یہ علم حاصل ہوتا ہے لیکن یہ اسے کسی کو سمجھا نہیں سکتے' بتا نہیں سکتے۔ یہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو ان پہ طاری ہوتی ہے۔ جب پوچھا جائے کہ صاحب! ہمیں بھی اس کیفیت کے متعلق کچھ بتائیے تو وہ کہتے ہیں کہ

---

❶ جبرئیل کا لفظ قرآن میں ان تین مقامات پر آیا ہے: (2:97;2:98;66:4)۔

❷ یہ اسم قرآنِ کریم میں میکٰیل نام سے ہے اور صرف اِس ایک مقام پہ آیا ہے: (2:98)

❸ عزرائیل۔ یہ قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی

بھئی! یہ تو نشہ ہے' جو شراب پیئے گا اسے پتہ چلے گا کہ نشہ کیا ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ پیوں میں اور نشہ آپ کو آ جائے۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کے نشے کی کیفیت اسی کو معلوم ہو سکتی ہے جو اسے خود پیے۔ اگر ان کا یہ دعویٰ ٹھیک بھی ہے تو جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں' وہ غلط ہے کیوں کہ اگر کوئی چیز ان کو مستی اور کیف کے عالم میں ملتی بھی ہے تو پھر کیا؟ اس کا تعلق احساسات (Feelings) سے ہوتا ہے' ادراک سے نہیں۔ اگر یہ کوئی لوگ ہیں بھی' تو بہر حال یہ زیادہ سے زیادہ دریا میں گرے ہوئے' خود اپنے آپ کو بچا کے دوسرے کنارے تک لے جا سکتے ہیں' دوسروں کو نہیں۔ اس کی بنیادی خصوصیت اس کا نا قابل انتقال ہونا ہے۔ اس کی صداقتیں اس فرد تک محدود رہتی ہیں جو ان سے کیف اندوز ہوتا ہے اسی لیے ان کے دعاوی کسی کے لیے سند نہیں قرار پا سکتے[1]۔

مقامِ نبوت تو ایک انقلابی پروگرام کا داعی ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس کے برعکس نبی اپنے آپ کو بھی بچا کر لے جاتا ہے اور ڈوبنے والے کو بھی پکڑ کر لے جاتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ نبی ڈوبنے والوں کو بچانے کے لیے آتا ہے۔ آپ قرآن کا ایک لفظ دیکھیے' کس طرح انسانوں کے پیدا کردہ فکر اور خیالات اور صحیح قرآنی خیالات میں امتیاز کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ عَلٰی قَلْبِكَ (26:194) قلبِ نبوی کے اوپر اس کا نزول ہوتا ہے۔ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ[2] (26:194)۔ یہ نہیں ہوتا کہ اب تیرے قلب میں اس کا نزول ہو گیا ہے اور تُو اس کیف اور مستی کے اندر مست ہو جائے کہ صاحب! بس ٹھیک ہے' راوی عیش لکھتا ہے' موج ہو گئی' خانقاہ میں حجرے میں بیٹھے ہوئے ہیں' اللہ میاں کے ساتھ روز کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ کوئی پوچھے تو کہا جا رہا ہے کہ یہ تو اب ایسی ہے ہی نہیں' خود پیو تو پتہ چلے۔ یہاں تو ہے کہ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (26:194)۔ وحی یہ نہیں ہے کہ رسول کو ملی اور وہ نشہ چڑھا کے بیٹھ گیا۔ وہ تو بہت بڑا انقلابی پروگرام اس کی طرف دیا جاتا ہے' اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ پوری انسانیت کو ان خطرات سے آگاہ کرے جو غلط نظامِ زندگی کی رو سے پیدا ہونے والے ہیں۔ اس کا تو اول فریضہ یہ ہے۔ منذرین کا یہ پہلا فریضہ ہے کہ وہ ان کو وارن کر دے کہ

---

[1] ان نکات کی مزید وضاحت کے لیے مشہور امریکن عالمِ نفسیات' ولیم جیمس (William James) کی کتاب Varieties of Religious Experience بڑی حقائق کشا ہے۔ فلسفۂ نفسیات' مذہب اور تصوف کے گوشوں میں اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

[2] مقصد اس سے یہ ہے کہ تُو (بھی انبیائے سابقہ کی طرح) لوگوں کو' ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔855)۔

انسانوں کے خودساختہ نظام کی یہ تباہیاں ہوں گی۔ تو یہ بتا دیا کہ نبی کی طرف جو وحی بھیجی جاتی ہے وہ صرف اس کی ذات تک محدود رہنے کے لیے نہیں ہے کہ اس کیف کے اندر وہ بدمست ہو۔ وہ ایک بلند مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور بلند مقصد ہے انسانیت کو تباہیوں سے بچانا۔ یہ ہے **لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ** (26:194)۔

اب آئی وہ بات کہ وحی کا نزول ہوتا ہے۔ یہ ہوتا ہے جسے الوہیاتی انرجی کہا جاتا ہے' قلبِ نبوی کے اوپر وہ نازل ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ تو انرجی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو یہاں کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ان لوگوں نے لمبی چوڑی Discussion (بحث) کی ہے۔ وحی کی کیفیت غیر نبی جان ہی نہیں سکتا۔ اس کے متعلق فلسفیانہ Discussion (بحث) کے لیے ان کے پاس کیا ہے فراغت کا زمانہ تھا' وظیفے لگے ہوئے تھے ''ویلی جٹّی اون ویلے' اے اون ویلدے پئے سن''۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ لیکن قرآن نے تو بات صاف کر دی۔ سوال یہ ہے کہ کسی کے دل کے اوپر اگر یہ چیز نازل ہو تو کیا یہ محض خیالات ہوتے تھے جو نازل کیے جاتے تھے؟ کیا ایک خیال پیدا کیا تھا نبی کے دل میں؟ یہ بڑی گہری بات ہے۔ کیا وہ خیال پیدا ہوتا تھا؟ اور نبی خیال کو اپنے الفاظ میں پھر باہر ظاہر کرتا تھا؟ اس میں تو بڑا فرق پڑ جاتا ہے کہ خیال ہوں وہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے' اسے ظاہر کرے نبی اپنی زبان کے اندر' کیا معلوم کہ ان کو صحیح Express (بیان) کر سکا ہے یا نہیں؟ یہ بڑا ہی غور طلب سوال ہے۔

خیالات و الفاظ کا ایک دوسرے کو جنم دینے کا مسئلہ ایک پیچیدہ سوال ہے

اب اگلی بات آئی۔ اس زمانے میں تو ابھی یہ ایسی تحقیق نہیں ہوئی تھی' ہمارے زمانے میں یہ Semantics[1] (علم المعانی) ایک علم آیا ہے۔ اسے کہتے ہیں زبانوں کا علم۔ فلسفے کی رو سے یہ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ کوئی خیال پیدا نہیں ہو سکتا جس کے لیے لفظ موجود نہ ہو۔ اگر یہ پہلے سے موجود نہیں ہے تو آپ کو لفظ Coin (وضع) کرنا پڑے گا۔ کوئی خیال بغیر لفظ کے ذہن میں آ نہیں سکتا اور کوئی ایسا لفظ آپ کے ذہن میں نہیں آتا جس کا ایک تصور آپ کے ہاں پہلے سے موجود نہ ہو۔ اگر وہ لفظ آتا ہے تو مہمل ہوگا۔ جس لفظ کا کوئی تصور' جسے معنی کہتے ہیں' آپ کے ذہن میں نہیں آتا ہے' تو وہ مہمل ہوتا ہے۔ بامعنی لفظ وہ ہوتا ہے جس کا مفہوم ایک تصور کی شکل میں' ایک خیال کی شکل میں' آپ کے ذہن میں آئے۔ اور آپ کو کوئی ایسا خیال نہیں آ سکتا جس کے لیے آپ کے

---

[1] It is the study or science of meaning in language forms, particularly with regard to its historical change; it is the study of relationships between signs and symbols and what they represent.

ہاں ایک لفظ موجود نہ ہو۔ یہ اِس علم کا بڑا اہم گوشہ ہے۔اس دور میں اس پہ بڑی تحقیق ہوئی ہے کہ یہ نئے نئے الفاظ جو ذہن میں آتے ہیں' نئے نئے خیالات ہوتے ہیں' جن کو Express (بیان) کرنے کے لیے یہ الفاظ وضع کیے جاتے ہیں۔اب خیال اور لفظ جو ہے اس میں کیا تعلق ہے یہ بڑا ہی مشکل اور پیچیدہ سوال ہے۔یعنی ہم جب پانی کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ چیز پانی آتی ہے۔لفظِ پانی کے اندر یہ چیز تو موجود ہی نہیں ہے۔کہاں سے یہ چیز آ گئی؟ یہ تو پھر محسوس شے ہے جب آپ محبت کہتے ہیں تو آپ سوچیے تو سہی' بات تو ساری سمجھ میں آ سکتی ہے' آپ اس چیز کو بتا نہیں سکتے کہ یہ کیا ہے۔تو لفظ ہے اور اس کے اندر چھپا ہوا معنی ہے۔

الفاظ و معنی کے باہمی تعلق کا تجزیہ

کیا بتائیں یہ شخص اقبالؒ (1938-1877) بہت بڑا فلاسفر' یہاں اتنا بڑا قرآن جاننے والا تھا کہ اس دور کے بڑے بڑے چوٹی کے فلاسفرز میں اس کا شمار ہوتا ہے۔اس نے ذریعہ اظہار شاعری کا اختیار کیا اور ان چیزوں کو تشبیہات سے سمجھایا۔جسم اور جان کا تعلق کیا ہے؟ سارے جسم کی اناٹومی کیا ہے؟ کوئی جان کا بتا نہیں سکتا ہے مگر یہ ایسی اہم ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو جسم بیکار ہوتا ہے۔کیا یہ جسم کی پیدا کردہ ہے؟ یا کہیں اور سے آئی ہوئی ہے؟ یہ ہے کیا چیز؟ کتنا مشکل سوال ہے۔وہ کہتا ہے کہ جس طرح یہ سوال مشکل ہے' اسی طرح یہ سوال ہے کہ لفظ اور اس کے جو معنی ہیں ان کا معنوی تعلق کیا ہے؟ کہاں ہوتے ہیں وہ معنی؟ لفظ کا تجزیہ کیجیے تو چند ہی حروف ہوتے۔الگ الگ کر دیجیے تو اس کے معنی تو اس میں کہیں نظر نہیں آتے۔لیکن وہ جو لفظ ہے وہ آپ کو اپنے متعین معنی دیتا ہے۔ایسے متعین کہ جب میں پانی کہتا ہوں' شیخ صاحب[1] فوراً پانی لے آتے ہیں' کبھی نہیں ہوتا کہ اندر سے وہ قلم لے آئیں۔متعین اس قدر ہوتا ہے مفہوم' پوچھیے کہ صاحب! لفظ کے اندر پانی!! یہ چیز کہاں سے آ گئی تو کچھ معلوم نہیں۔موجود ہے اور ہم بتا نہیں سکتے کہ کیسے موجود ہے۔سنیے کس تشبیہ سے یہ بات کرتا ہے:

ارتباطِ حرف و معنیٰ' اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے![2]

بس یونہی سمجھ لیجیے کہ جیسے جسم اور جان کے اندر تعلق ہے۔کوئلے کے اوپر جو خود اس کی راکھ آ جاتی ہے' وہ کوئلے ہی کی راکھ ہوتی ہے

---

[1] یہ شیخ عبدالحمید مرحوم کی طرف اشارہ ہے جو دروس ٹیپ کیا کرتے تھے۔

[2] اقبالؒ: ضربِ کلیم' نظم ''جان وتن''

لیکن یہ راکھ اس حرارت سے الگ ایک شے ہوتی ہے جو کوئلے کے اندر ہوتی ہے۔ راکھ ایک محسوس شے ہوتی ہے۔ حرارت کو ہم اس طرح سے محسوس نہیں کر سکتے تاوقتیکہ وہ محسوس یا مادی شکل کے اندر ہمارے سامنے نہ آئے۔ اس نے کہا ہے کہ یہی ہے وہ جو حرارت کی طرح معانی ہوتے ہیں، جان ہوتی ہے۔ یہ جو لفظ یا جسم میں محسوس چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ یوں سمجھیے جیسے کہ ایک دہکتے ہوئے کوئلے کے اوپر اسی کی راکھ آتی ہے۔ یہ ہے بات کہ یہ اسی کی راکھ ہے، باہر سے نہیں آتی ہے [1]۔

قلبِ نبوی پر عربی مبین کے الفاظ کی شکل میں وحی کا نزول

میں یہ کہہ رہا تھا کہ وحی قلبِ نبوی پہ آتی ہے تو کیا یہ محض خیالات ہوتے ہیں؟ اگر محض خیالات ہوں تو پھر ایک بشر کے، ایک انسان کے الفاظ تو آ گئے مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ مفہوم بھی پوری طرح ادا کر سکے یا نہیں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے یہ واضح کیا ہے کہ **بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ** (26:195) محض خیالات ہی قلبِ نبوی میں نہیں ڈالے گئے بلکہ الفاظ ڈالے گئے۔ جب الفاظ کہیں گے تو کوئی زبان ہونی چاہیے۔ اس کے لیے عربی زبان کہہ دیا۔ عربی زبان کے الفاظ میں یہ وحی قلبِ نبوی پر نازل کی گئی۔ اب الفاظ بھی خداوندی ہیں۔ خود لفظِ عربی جو ہے اس کے معنی واضح کے ہیں۔ عرب اپنے آپ کو عرب کہتے تھے یعنی فصیح البیان اور اپنے سوا باقی ساری دنیا کو عجمی کہتے تھے۔ ان کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا۔ اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام اور حضرتِ اسحٰق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لیے تو شام اور فلسطین کی مملکت آئی، جسے قرآن نے ملکِ عظیم کہا ہے۔ ان کی ذریت میں یہ سارے بنی اسرائیل آئے ہیں، اتنی بڑی سطوتِ سلیمانی اور دبدبۂ داؤدی کے مالک ہوئے اور دوسرا بیٹا اسماعیل علیہ السلام وادیٔ غیر ذی زرع کے اندر بسا دیا کہ جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ جو خدا کا گھر بنایا اس کی تولیت ان کے ذمے آئی۔ صحرا کے اندر، کوئی مملکت نہیں ہے۔ وہاں کھانے پینے کے لیے کوئی پیداوار بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس قسم کی تفریق دونوں بیٹوں میں

---

[1] علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے اپنے خطبات میں کسی مفکر کے حوالے سے اسے یوں بیان کیا ہے:

Inarticulate feeling seeks to fulfil its destiny in idea which, in its turn, tends to develop out of itself its own visible garment. It is no mere metaphor to say that idea and word both simultaneously emerge out of the womb of feeling, though logical understanding cannot but take them in a temporal order and thus create its own difficulty by regarding them as mutually isolated. There is a sense in which the word is also revealed.

(Iqbal, Allama Muhammad: The Reconstruction of Religious Thought in Islam, in M. Saeed Sheikh (Ed & Annotated). Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1989,p.18)

دیکھیے اور اسماعیل علیہ السلام تو بڑے تھے' قاعدے کی رو سے وہ ساری مملکت ان کے حصے میں آنی چاہیے تھی لیکن وہ چھوٹے بیٹے کو دی اور بڑے کو یہاں بسا دیا۔ یہ جو وہاں کی ساری تاریخ ہے' حضرتِ اسحٰق علیہ السلام سے لے کر آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک' بنی اسرائیل کی تمام تاریخ موجود ہے۔ حضرتِ اسماعیلؑ اور ان کی ذریت اور تاریخ کا سوال ہی نہیں ہے' کہیں تاریخ میں ان کی کوئی بات ہی نہیں ہے' نظر ہی نہیں آتا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا؟ یہاں وہ زبان بن رہی تھی' جس کا متحمل قرآن نے ہونا تھا' جس زبان میں خدا نے بات کرنا تھی۔ وہ عربیٔ مبین کہتے تھے۔ اول تو عرب باقی سب کو عجمی کہتے تھے اور عرب میں بھی یہ جو قریش تھے' یہ کعبے کے متولی تھے اور جو اپنے آپ کو خالص اسماعیلی کہتے تھے۔ ان کی زبان' یہ عربی میں بھی' عربی مبین کہلاتی تھی۔ عربیٔ مبین کے اندر اسے خدا نے نازل کیا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم ایک نصابی تعلیم ہے

یا درکھیے! قرآن کے تصورات اور اس کی تعلیم ہی وحی نہیں ہے بلکہ اس کے الفاظ بھی وحی ہیں اور ان الفاظ کے اندر اعجاز ہے۔ یہ جو قرآنِ کریم کے اتنے عظیم' اہم' مشکل ترین مفاہیم' معانی' مضامین اور حقائق ہیں یہ زبان ان کی متحمل ہے۔ قیامت تک کے لیے یہ زبان محفوظ ہے۔ قرآن کو انہی الفاظ کے اندر قیامت تک کے لیے رکھا گیا ہے اور یہ اس زبان کا اعجاز ہے کہ اس کے الفاظ ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں کیا عرض کروں' میں نے کہا ہے کہ یہ تو نصاب Curriculum کی باتیں ہیں' نصاب ہو تو میں عرض کروں کہ عربی زبان کیا ہے' یہ زبان کیا کر رہی ہے' اس زبان کی کیفیت کیا ہے۔ یہ تمام موضوعات درسی (Academic) ہیں۔

بعد میں وحی کی دو قسمیں جنم لینے والے خود ساختہ غیر قرآنی عقائد وتصورات

پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ وحی الفاظ کے ساتھ آئی ہے' صرف خیالات وتصورات قلبِ نبوی کے اوپر القا نہیں ہوئے۔ یہ بعد میں ہمارے ہاں ایک عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ یہ بالکل خلافِ قرآن ہے کہ ایک وحی تو وہ ہے جو الفاظ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتی تھی' وہ قرآن میں آئی' ایک وحی وہ تھی جو الفاظ کے بغیر ملتی تھی۔ وحی تو ایک ہی تھی اور اس کے متعلق قرآن نے بلسان عربی مبین کہا ہے' اسے کلام اللہ کہا ہے یعنی خدا کا کلام۔ تو کلام تو الفاظ کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ میں اس بحث کو چھوڑتا ہوں کہ وحی الفاظ کے بغیر ملتی تھی۔

میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کی رو سے وحی کی کوئی قسمیں نہیں ہیں' یہ ایک ہی قسم ہے جو نبی کو ملی تھی اور الفاظ کے ساتھ ملی تھی' اسے

کلام اللہ کہا جاتا ہے' اسے بلسان عربی مبین کہا گیا ہے۔ تو پہلی بات یہ آ گئی کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا ذریعہ عربیٔ مبین ہے۔ اس لیے یہ عربی مبین کی کتاب ہے ورنہ غور کیجیے اس کے کہنے کی ضرورت کیا تھی۔ میری کتابیں اردو میں لکھی ہوئی ہیں' درجنوں کتابیں ہیں' کسی کتاب میں بھی آپ نے یہ لکھا ہوا نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے یہ کتاب اردو زبان میں لکھی ہے' ارے اردو زبان تو لکھی ہوئی ہے۔ یہ عربی کا دیا ہوا قرآن ہے ایک جگہ نہیں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی مبین میں ہے۔ ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی طرف خیالات ہی القا نہیں ہوئے بلکہ الفاظ بھی القا ہوئے۔ یہ قرآن بلفظہٖ وحی ہے۔ اور پھر وہ زبان عربی مبین کی ہے۔ اس لیے جس زبان میں کوئی کتاب ہوگی اس زبان کی رو سے اس کتاب کو سمجھا جائے گا۔

قرآن کی عربی کے علاوہ مختلف ممالک میں عربی زبان کی کیفیت

اب اس عربی زبان کی طرف آیئے۔ زبانوں کی کیفیت یہ ہے کہ سو سال کا عرصہ بھی نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی کم عرصے میں' ان میں اتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر آپ سو سال پہلے کی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھیں' تو وہ آپ کو عجیب وغریب زبان نظر آئے گی۔ آپ کوئی زبان بھی دیکھیے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بڑا ہی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر زبان ایک تو ادبی انداز کی ہوتی ہے (Academic) اور دوسری روزمرہ کی گفتگو کی زبان ہوتی ہے۔ آج عربی زبان کی کیفیت یہ ہے کہ عربی بولنے والے ممالک' سعودی عورب سے لے کر یمن' عراق' شام' فلسطین' مصر' شمالی افریقہ کے ممالک' لیبیا' مراکو' الجزائر یعنی یہ جتنے ممالک ہیں' یہ سب عربی بولتے ہیں' اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ سعودی عرب کا عرب جو عربی بولتا ہے' اس کو ہمسایہ ملک شام والے نہیں سمجھتے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں پنجابی میں بھی فرق پڑتا ہے' ضلعوں کی پنجابی مختلف ہو جاتی ہے لیکن وہ بڑا تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ایک تو لہجے کا فرق ہوتا ہے اور کچھ تھوڑا سا لفظوں کا فرق ہوتا ہے' لیکن یہ ہوتا ہی نہیں کہ سمجھ ہی نہ آئے۔ ان کے ہاں عربی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ آپ سوچیے کہ اگر یہ قرآنِ کریم بھی ان میں سے کسی ایک زبان میں ہوتا تو وہ انہی کی زبان ہوتی جن کی زبان میں وہ الفاظ تھے اور ساتھ والا نہ سمجھ سکتا کہ یہ عربی کیا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ Languages (زبانیں) تو ان تمام ممالک کی کتنی مختلف ہیں' لیکن ان کے ہاں کی کتابی زبان وہی ہے جو قرآنِ کریم کی ہے۔ مراکش میں بیٹھا ہوا جو شخص ایک کتاب لکھ رہا ہے وہ عرب تو ایک طرف رہے' ہم لوگ جو غیرِ عرب عربی سیکھتے ہیں' ساری دنیا میں جنہوں نے بھی عربی سیکھی ہوئی ہے' وہ اس کتاب کو سمجھتے ہیں جو مراکش میں بیٹھا ہوا ایک شخص لکھ رہا ہے حالانکہ اس کی زبان جو وہ بولتا ہے اس کے ساتھ ہی جو لیبیا ہے' وہ نہیں سمجھتے۔ علمی زبان ان کے ہاں یہی ہے جو قرآن کی زبان ہے۔ اور اس کے معنی میں

کوئی فرق نہیں آیا۔ لہٰذا قرآن کی جو زبان ہے' یہ زبان اور اس کے معنی محفوظ ہیں۔ یہ ساری چیزیں' جتنی میں آپ کو کہہ رہا ہوں' یہ تمام چیزیں' جب میں نے لغات القرآن لکھا تھا' اس زمانے میں مجھے پھر اس چیز کی یہ تحقیق کرنا پڑی۔

قرآنِ حکیم کو عربی زبان کی پہلی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے

اب اگلی بڑی اہم چیز ہمارے سامنے آئی۔ عربوں کے ہاں تو حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک یہ زبان بن رہی تھی۔ صدیوں میں یہ زبان بن کر' صاف ہو کر' یہاں تک پہنچی تھی۔ یہ جو عبرانی زبان ہے' جس میں یہ تورات وغیرہ یہودیوں کے صحیفے ہیں' اسی عربی کی ہی ایک شاخ ہے لیکن منجھی ہوئی عربی جو تھی وہ یہیں کی عربی تھی۔ کیفیت تو اس زبان کی یہ ہے اور تماشہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے پہلے عربی زبان کے اندر کوئی اور کتاب ہی نہیں تھی۔ قرآن عربی زبان کی پہلی کتاب ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اس زبان میں سمجھا جائے گا' جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں بولی جاتی تھی' بالخصوص عربوں کے ہاں کی جو علمی زبان تھی اور علمی زبان کتاب میں تو تھی نہیں۔ کتاب ہی کوئی نہیں تھی تو آگے پتہ کیسے چلے۔ یہ جو میں ایک ایک لفظ پہ کہا کرتا ہوں کہ عربوں کے ہاں اس کے معنی یہ ہیں' عرب اس کو یوں استعمال کرتے ہیں' سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کیسے پتہ چلا' وہاں کتاب تو کوئی تھی نہیں۔

قرآنی الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے معنی کو بھی محفوظ کرنا ضروری تھا

اس خدا کا عجیب اعجاز ہے جس نے کہا ہے کہ ہم نے قرآن کو محفوظ کیا ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ دیکھیے حفاظت کیسے اور کیا حفاظت ہے! اگر قرآن کے الفاظ محفوظ رہیں اور ان کے جو معنی ہیں وہ مرورِ زمانہ سے بدل جائیں تو یہ محفوظ رہنا کسی کام کا نہیں ہے۔ اگر یہ عربی Dead Language (مردہ زبان) ہو جائے جیسے سنسکرت وغیرہ ہو گئی ہے تو الفاظ تو اس کے باقی رہیں گے' ان الفاظ کے کچھ معانی ہی نہیں ہوں گے۔ قرآن اگر اس زبان میں محفوظ بھی رہے کہ جو زبان ہی اس وقت زندہ نہیں ہے' تو اس کی حفاظت ایسے ہی ہے جیسے ہم مقبروں کی حفاظت کرتے ہیں' جس طرح مصر کی ممیاں ہیں' ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ یادگاریں ہیں' ان کی ہم حفاظت کرتے ہیں۔ یہ عربی زبان زندہ ہے' اس زمانے میں کوئی کتاب نہیں اور میں کہتا ہوں کہ یہی اس کا اعجاز تھا کہ یہ آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ ایک بات آپ سوچیے' ہر جمعہ کو آپ درس سنتے ہیں' ڈیڑھ گھنٹے تک تقریباً میری باتیں سنتے ہیں' میرے خیالات آپ تک آتے ہیں' زبانی آتے ہیں۔ باہر جا کر آپ کسی سے بیان کیجیے: پرویز صاحب نے آج کیا

کہا تو اس کے بعد آپ دیکھیے گا کہ جو کچھ میں نے کہا اور جو کچھ آپ نے اسے Convey (پہنچایا) کیا ہے' اس میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اور پھر وہ آگے جا کر کسی سے کہے تو شہر تک پہنچتے پہنچتے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا سے کیا بن جائے۔ یہ کیا ہے؟ میرے خیالات آپ اپنی زبان میں Convey (پہنچا) کر رہے ہیں لیکن میں جو شعر پڑھتا ہوں' اسے آپ دیکھیے کہ اس میں آپ دس ہزار آدمیوں تک پھیلاتے چلے جائیے' اس میں ایک لفظ تک کا فرق نہیں کر سکتے۔ شعر' اس کے اپنے لفظوں میں Convey (پہنچایا) کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے تو اول تو اسی میں سکتہ پڑ جاتا ہے' پھر معانی میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ پھر جو دوسرے جانتے ہیں' وہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شعر غلط ہے' اصل میں یہ لفظ ہے' غالب [1] نے یہ کہا ہے' اقبالؒ [2] کے ہاں یہ لفظ آیا ہے۔ یعنی شعر میں ایک لفظ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تھا اعجاز جو خدا نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم قرآن کو محفوظ رکھیں گے۔ قرآن کی زبان جو ہم تک پہنچی ہے' عربوں کے شاعروں کے شعروں کے ذریعے سے پہنچی ہے۔

لغات القرآن مرتب کرنے کے دوران میری سعی و کاوش اور قرآن کی عربی زبان کے الفاظ و معانی کا تحفظ

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ اپنی لغات القرآن کے مرتب کرنے کے زمانے میں کیا کیا چیزیں میرے سامنے آئیں' ورنہ میرا یہ موضوع نہیں تھا۔ یہ دورِ حاضر کا علمِ انسان ہے۔ آپ یہ ساری چیزیں دیکھیں کہ یہ جو معنی ہیں اس کو عرب اس طرح استعمال کرتے تھے' تو یہ کہاں سے پتہ چلا؟ کوئی کتاب نہیں ہے' کتاب ہی نہیں ہے تو اس زمانے کی لغات کہاں ہوتی۔ اُس زمانے میں مجھ پر یہ راز کھلا کہ الفاظ اسی طرح سے شعر کی زبان کے اندر آگے Convey (پہنچتے) ہوتے ہیں' نثر میں کتاب تو آگے Convey (پہنچ) ہوتی ہے' اگر کسی سے نثر بیان کی جائے تو وہ نثر کی زبان اس کتاب میں نہیں ہوتی تاوقتیکہ آپ اس کا کوئی فقرہ حفظ کر لیں۔ کتنے فقرے ہوں گے جو آپ یاد کریں گے؟ ڈیڑھ گھنٹہ جو کچھ میں آپ سے کہتا ہوں' اس میں سے اگر کوئی چند حفظ بھی کریں گے تو چار لفظ ہوں گے اور تیئس سال میں جو کچھ کہا گیا ہے' وہ کیسے ہوگا؟ لیکن یہ تھا حفاظتِ قرآن کا طریق جو استعمال کیا گیا۔ یہ زبان ہوئی منجھی زبان اور اتنی Scientific Language (سائنسی زبان)۔

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے ہی نہیں بلکہ آج بھی' اس وقت تک' دنیا کی جتنی زبانیں ہیں' ان میں سے کوئی زبان ایسی سائنٹفک نہیں ہے' جتنی یہ عربی زبان ہے' جسے ہماری سازشوں نے اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ صاحب! دس دس سال تک ان مسجدوں

---

[1] مرزا اسد اللہ خان غالب (1797-1869ء)

[2] ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938ء)

میں دارالعلوموں کے اندر زندگی بسر کر دیتے ہیں اور چار فقرے بولنے نہیں آتے۔ یہ غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اور یہ صرف اس لیے ہے کہ یہ زبان عام نہ ہو جائے اور لوگ قرآن نہ سمجھنے لگ جائیں ورنہ سائنٹفک زبان تو بڑی آسان زبان ہوتی ہے۔ اس کے کچھ بنیادی قاعدے ہوتے ہیں' ان کو سمجھ لیا جائے تو اس کے اوپر تو ساری عمارت' اس نقشے کے مطابق' اٹھتی ہے جو Drafts Man (ڈرافٹس مین) نے بنا دیا ہوتا ہے۔ شعر کی زبان میں یہ عربی زبان آئی اور وہ جو اشعار ہیں' آپ حیران ہوں گے کہ وہ اس دور میں ہوئے تھے جب یہ عجمی اثر بہت سا آ چکا تھا۔ عام طور پر یہ عباسیوں کا دور (750-1258) ہے' یہ اس کے بعد کا زمانہ ہے۔ عام زبان عربی تھی۔ وہ گزرے ہوئے زمانے کے لحاظ سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس زمانے کی کتابیں' یہ جو ہمارے ہاں کے ایرانی مسلمان ہوئے تھے' ان کی کتابیں ہیں۔ عربی مصنف کہیں آپ کو بہت خال خال ملیں گے۔ اصل میں یہ عرب لکھنے پڑھنے والی قوم نہیں تھی' یہ کچھ کرنے والی قوم تھی۔ بہر حال عربی ان ایرانی مسلمان ہونے والے لوگوں کی لکھی ہوئی ہے اور جو لغت مرتب ہوئے ہیں' ان کی بنیاد شعرائے جاہلیت کے شعروں پر ہے۔ اور وہ اتنے زیادہ ہیں' اور وہ لوگ اس طرح سے یونہی ایک ایک شعر نہیں کہتے تھے بلکہ نظموں کی نظمیں اور قصیدوں کے قصیدے کہا کرتے تھے۔ تو یہ ہے اعجاز اس عربیٌ مبین کا جس میں قرآن آیا ہے۔ جتنے بھی مفردات الفاظ قرآن کے اندر آئے ہیں ان کے معنی ان اشعار کی رو سے' لغت کے اندر آئے۔ تو لغت والوں نے ایک تو وہ معنی دیئے ہیں کہ جن میں ان کے ہاں کے شعراء کی وہ سند ہے اور پھر وہ آگے معنی دیئے ہیں جو ان کے زمانے میں رائج تھے۔ یہ عربیٌ مبین جس میں قرآن نازل ہوا ہے' وہ ہو گی جس کے معنی شعرائے جاہلیہ کے کلام سے متعین کیے گئے ہوں۔ تو اس زمانے میں عربوں کی وہی زبان تھی اور جیسا میں نے عرض کیا ہے وہ اس قدر زیادہ افراط میں ہیں کہ قرآنِ کریم کے تمام الفاظ کے جو معنی ہیں' ان کی رو سے متعین ہو جاتے ہیں۔ میں نے جو لغت مرتب کیا ہے وہ اس بنیاد پہ کیا ہے۔ اب میں جو یہ کہتا ہوں اور کہہ دیا کرتا ہوں کہ عرب اس کو یوں استعمال کرتے تھے تو اس کی سند یہ ہوتی ہے کہ عربِ جاہلیت کے اندر ان کے جو شعراء تھے' ان کے ہاں آپ دیکھیے تو اس لفظ کے معنی اس طرح سے اپنے ہاں ادا کیے ہوئے تھے۔ اب یہ جو لسانِ عربیٌ مبین ہے' محفوظ ہو گئی۔ آج میں نے کہا ہے کہ عربی بولنے والوں کی عربی زبان تو ایک دوسرے سے ملتی نہیں' علمی اور کتابی زبان ملتی ہے تو وہ وہی زبان ہے جو قرآن میں استعمال ہوئی ہے۔ اس طرح زبان محفوظ ہو گئی۔ زبان کے صرف لفظ ہی محفوظ نہیں ہوئے' الفاظ کے معنی میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے' بہت سے الفاظ متروک ہی ہو جاتے ہیں لیکن جب ہمارے سامنے وہ معنی محفوظ ہیں جو زمانۂ نزولِ قرآن میں عرب ان الفاظ کے لیتے تھے تو اب اس کے بعد اور معنی جتنے جی چاہیں بڑھاتے چلے جایئے وہ معنی تو محفوظ ہیں اور یہ بڑی چیز ہے۔

قرآن کے مختلف تراجم اور تفاسیر میں تضاد کی وجہ الفاظ قرآن کے عجمی معنی ہیں

اب ایک اور بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی کہ یہ جو قرآنِ کریم کے ترجے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں' یہ جو اس کی تفسیریں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں' یہ اختلاف کیسے پیدا ہوا۔ انہیں چھوڑ دیجیے جنہوں نے کسی سازش کے تحت ایسا کیا۔ میں ان کا بھی ذکر نہیں کرتا' جنہوں نے دیانت داری سے ایسا کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہوا کیا؟ ہوا یہ ہے کہ یہ جو ان الفاظ کے بعد کے معنی تھے' یہ سب کچھ ان معنی کی رو سے لکھا گیا۔ اور ایک بات اور ہوئی اور وہ بڑی ہی اہم ہے۔ ایک دو آیتیں [1] چھوڑ کے قرآن نے کہا ہے کہ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ o فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ [2] (26:198-99)۔ یہ تو عربوں کی طرف نازل ہوئی اور عربوں کی زبان میں عربی مبین کے اندر یہ کتاب ہم نے دی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان عربوں نے کوئی ایک سوال بھی یہ نہیں کیا کہ حضورؐ اس آیت کے معنی کیا ہیں۔ سوالات بھی جو قرآن میں کیے ہیں وہ یوں دیئے ہیں کہ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں' تو وہ بعض مسائل یا احکام کے متعلق ہیں۔ کسی آیت کے متعلق جو بدو عرب تھے' انہوں نے بھی نہیں پوچھا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ وہ اسے یوں سمجھتے تھے۔ کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی' اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ ہم نے یہ قرآن نازل کیا ہے' ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ جسے ہم عجمی کہتے ہیں' غیرِ عرب کی زبان میں یہ بات آئے' تو وہ پھر قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ تو یہ بات سوچیے اور غور سے سنیے گا جو میں کہنے لگا ہوں کہ الفاظ تو قرآن کے رہیں' اور ان کے معنی اور ہو جائیں تو پھر قرآن کیسے سمجھ میں آئے گا؟ یہ جو ہمارے ساتھ ہوا وہ یہ ہوا۔ قرآن کی آیات قرآن کے الفاظ میں ہیں' لیکن ان کی تفسیریں' ان کے جو معانی ہیں' وہ عجمی ہیں' تو قرآن نے تو خود پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ عجمی زبان میں ہوتا تو نہ یہ ان کی سمجھ میں آتا اور نہ یہ ایمان لاتے۔ اس نکتے کو سمجھیے کہ الفاظ ہوں وہی' معانی ہوں عجمی' تو قرآن کیسے سمجھ میں آئے گا؟ جو لفظ ہے' وہ تو اپنی اہمیت ہی نہیں رکھتا' وہ تو اس کے معنی ہوتے ہیں جو اہمیت رکھتے ہیں اور وہ معنی اگر دوسرے ہو جائیں' لفظ وہی رہیں' تو قرآن اگر محفوظ بھی رہتا' الفاظ محفوظ رہیں اور معنی اس کے وہ نہ رہتے جو لسانِ عربی مبین میں تھے تو قرآن خود غیر محفوظ ہے۔ الفاظ تو محفوظ

---

[1] وہ آیات یہ ہیں: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ o اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26:196-197)

[2] (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' اس قرآن کو ہم نے' انہی قریش کی فصیح و بلیغ زبان میں نازل کیا ہے' جس سے یہ از خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتاب کسی انسان کی بنائی ہوئی ہے یا انسانوں سے بالاتر ہستی' خدا' کی نازل کردہ)۔ اگر ایسا ہوتا کہ ہم اسے کسی عجمی پر نازل کرتے (26:198) اور وہ اسے انہیں پڑھ کر سناتا (تو بھی ان کا اعتراض قابل فہم ہوتا لیکن اب ان کا انکار اس امر کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ یہ اپنی روش کو چھوڑ کر) صداقت کی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 855)۔

رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم سمجھ ہی نہ سکتے' ایمان ہی نہ لاتے۔ عزیزانِ من! ہم جو اتنا کچھ قرآن کے سمجھنے کے باوجود اس کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور اس کی اتنی اہمیت کے باوجود اس پہ ایمان نہیں رکھتے۔ وہ تو قرآن نے خود کہہ دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔

مصر کے سفیر عبدالوہاب عزامؒ کی علمی شخصیت سے ملاقاتوں کا ذکر

عزیزانِ من! میں اس کے لیے ایک ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں جہاں سے اس کی اہمیت میری سمجھ میں آتی ہے۔ شاید وہ پہلی بار سامنے آ رہا ہے' غور سے سنیے گا۔ یہ پاکستان کی تشکیل کے چند ہی[1] سال بعد کی بات ہے۔ مصر کے ایک سفیر عبدالوہاب عزامؒ کراچی۔ پاکستان تشریف لائے۔ ان کے علم اور اخلاق اور کردار کی پاکیزگی' کی مثال میری نظر میں نہیں' یہ عجیب وغریب شخصیت تھے۔ عربی زبان کا تو پوچھو ہی نہیں صاحب! کہ اتنا بڑا نامور Scholar (عالم) تھا۔ فارسی زبان کے اندر غالباً پی ایچ ڈی (Ph.D) کی ہوئی تھی' فرانسیسی بلا تکان لکھتے تھے' انگریزی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ پھر یہاں پہنچنے کے بعد جیسا کہ بعض لوگوں کو ملکہ ہوتا ہے' انہوں نے اردو بھی آہستہ آہستہ شروع کر دی۔ یہ صرف زبانیں نہیں بولتے تھے بلکہ علمی دنیا میں ان زبانوں میں ان کا مقام بہت عظیم ہے' بہت بڑے مصنف تھے۔ وہ یہاں آئے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے ساتھ انہیں عشق تھا۔ اقبالؒ کا کلام اردو اور فارسی میں ہے' فارسی تک تو وہ ٹھیک تھا' فارسی وہ جانتے تھے' اردو نہیں سمجھتے تھے' یہ ان کے ہاں دقت تھی۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے معلوم کیا تو پتہ نہیں کس طرح سے کسی نے میرا نام لے دیا کہ اقبالؒ سمجھنا ہے تو اس سے سمجھیے۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور یہ کہا کہ میں اقبالؒ سمجھنا ہی نہیں چاہتا' سمجھنے کے بعد اقبالؒ کو عربی زبان کے اندر منتقل کرنا چاہتا ہوں اور اس کو پھر میں عربوں کے ہاں پھیلانا چاہتا ہوں۔ یہ تو میری زندگی کا مشن تھا' جو میں پورا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اللہ دے اور کیا چاہیے! اس طرح سے وہ میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ بہت خوشی کی بات ہے۔ میں نے ہی Suggestion (تجویز) دی کہ ہم دو جو مل بیٹھ کر یہ کریں گے' کچھ اور دوست جو بہت اچھے اقبالی ہیں اور ہماری سطح کی بات سمجھ بھی سکیں گے اس

---

[1] یہ 1951ء کی بات ہے کہ مصر کے نامور دانش ور' صاحبِ قلم اور کلامِ اقبال کے شیدائی' ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ مملکتِ مصر کے نئے سفیر کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے اور سید عبدالواحد (سیکرٹری مجلس اقبال) کے توسط سے آپ نے پرویزؒ سے ملاقات کی۔ یہیں مجلس قلندرانِ اقبالؒ کی تاسیس ہوئی اور سفارت خانہ مصر میں اس کی نشستوں میں ضربِ کلیم' بالِ جبریل' ارمغانِ حجاز (حصہ اردو)' جاوید نامہ' اسرار و رموز' پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق اور بانگِ درا لفظاً لفظاً پڑھی گئیں اور ان کی تشریح کی گئی۔ یہ سلسلہ 4 سال تک جاری رہا اور اس مجلس کی آخری نشست 11 دسمبر 1959ء کو منعقد ہوئی جس میں مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کا آخری باب زیرِ مطالعہ رہا۔ اس کے بعد سفیر اقبالؒ پاکستان سے رخصت ہو کر سعودی عرب چلے گئے (حوالہ پرویزؒ: اقبالؒ اور قرآن' باب مجلس قلندرانِ اقبال' نیز پرویزؒ: مجلس اقبال شرح مثنوی اسرار وخودی درموز بے خودی' طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1996ء)۔

میں انہیں بھی شریک کرلیا جائے تو انہوں نے کہا بڑی خوشی کی بات ہے۔ سفارتخانے میں ہفتے میں کبھی دو بار' کبھی ایک بار ہم مل بیٹھتے تھے۔ انہوں نے اس مل بیٹھنے کا نام ''مجلسِ قلندرانِ اقبال'' رکھا۔ مجھے وہ شیخِ قلندران کہا کرتے تھے اور یہ ان کا علمی انکسار تھا کہ اپنے آپ کو خادمِ قلندران کہا کرتے تھے۔ ہم بیٹھ جاتے اور اقبالؒ کی کوئی اردو کی کتاب لیتے۔ میرا انداز آپ کو معلوم ہے کہ میں تو اقبالؒ کو قرآن سے سمجھتا ہوں' جہاں جہاں بھی کوئی کسی بھی قسم کی بات آتی ہے' میں قرآن کی آیت اس کے ساتھ لے آتا ہوں کہ یہ ہے جو اقبالؒ نے کہا۔ خود اقبالؒ کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے قرآن کو سمجھ کر اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ مصر کے یہ سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزّامؒ عربی زبان کے اتنے بڑے محدث ہیں۔ اقبالؒ کا شعر اور اس کی تائید میں مَیں قرآن کی کوئی آیت' اس کی کوئی اصطلاح' پیش کرتا تو وہ کہتے کہ یہ تم کیسے کہہ رہے ہو' اس کا یہ مفہوم تو نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی۔ پھر میں ان سے کہتا کہ دیکھیے! آپ تو اتنے بڑے ادیب ہیں' لغت کے عالم ہیں' یہ آیت کے الفاظ ہیں' تو آپ دیکھیے کہ لغت میں اس کے تو یہ معنی ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے کہ لغت کی رو سے نہیں بلکہ تفسیری زبان سے یہ معنی لیے جائیں گے اور وہ معنی یہ نہیں ہیں۔ میں نے شروع شروع میں اسے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی لیکن بار بار جب یہ چیز آنے لگی تو میں نے کہا کہ یہ تو بڑا سوچنے کا مقام آ گیا ہے۔ یہ اتنا بڑا عربی زبان کا ادیب اور فاضل ہے۔ اس کے سامنے جب میں آیتِ قرآن پیش کرتا ہوں تو وہ یہ نہیں کہتا ہے کہ تم لغت کے یہ معنی غلط کہتے ہو' صحیح نہیں سمجھے۔ وہ کہتے کہ یہ ٹھیک ہے لیکن قرآن کے معنی اس طرح سے نہیں سمجھ میں آ سکتے' قرآن کے معنی تفسیر کی رو سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جو ساری بات تھی وہ یہاں آ گئی کہ قرآن کے معنی لسانِ عربی مبین کی رو سے سمجھ میں نہیں آتے' قرآن کی آیتوں کا مفہوم جو تفاسیر میں بیان ہوا ہے' وہ ہے قرآن کا مفہوم اور وہ اس مفہوم سے مختلف ہے جو اس زبان کی رو سے ہوتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ مجھے اس میں خاصا وقت لگ گیا۔ قرآن کے ایسے طالب علم کو' عربی زبان کے ایسے ماہر ادیب کو' میں سمجھانا تو نہیں کہہ سکتا مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ واضح کرنے کے لیے کہ قرآنِ کریم عربیٔ مبین کی رو سے سمجھ میں آئے گا' مجھے خاصا وقت لگ گیا۔ اور جب وہ اس بات پر مجھ سے متفق ہوئے اور انہوں نے سمجھی تو پھر پوچھیے نہیں کہ یہ ندی کس طرح سے ایک بحرِ بیکراں بنی! اس لیے کہ وہ تو عربی ادب کے لغت کے علامہ تھے۔ جن اشعار کی رو سے قرآن کے الفاظ کا میرا لغت [1] مرتب ہوا' ان کو تو وہ اشعار ہزاروں کی تعداد میں ازبر تھے۔ وہ تو ان شعراء کے حافظ تھے۔ میں لغت میں ایک معنی کہیں ایک سند (Authority) سے بیان کرتا تھا وہ اس کے ساتھ دس سندیں بیان کر دیتے تھے' زبانی بیان کرتے چلے

----

❶ یہ اشارہ لغات القرآن کی طرف ہے جو چار جلدوں میں طبع ہوا ہے۔

جاتے تھے۔ وہ شخص بلا کا حافظ تھا۔ اور آپ سوچ لیجیے اس مجلس کا رنگ پھر اس کے بعد کیا ہو گیا۔ اقبالؒ (1938-1877ء) کا ایک شعر' قرآن کی ایک آیت میرے مفہوم کے رو سے اور عزّ ام کی سند۔ ہمارے عربی زبان میں محاورات کی کتابیں کہلاتی ہیں' جن میں یہ بڑے بڑے دانشور' بادشاہ' وزیر' کبیر' حکماء' فلاسفر' یہ جتنے بھی بڑے بڑے لوگ ہیں' جن کے کچھ اقوال' ان کے اشعار' ان کی تلمیحات' اصطلاحات' کہانیوں کے طریقے سے جمع کی ہوئی ہوتی ہیں' یہ محاورات کی کتابیں عربی زبان میں بہت ہوتی ہیں اور بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ انہیں محاورات کی کتابوں کے حوالے حفظ تھے اور جاہلیہ کے اشعار تو گویا سارے ہی ان کو یاد تھے۔ اور پھر وہ ایک ایک شعر میں' ایک ایک آیت میں بولتے تھے۔ میں نے ان سے بڑا ہی استفادہ کیا۔ بھلا مجھے بیک وقت اتنی سندیں کہاں سے مل سکتی تھیں! اس کے بعد انہوں نے کہا کہ میں اب مصر میں جا کر اس قسم کے لغت کی مجلس قائم کروں گا جو اس انداز کا لغت مرتب کرے' جو لسانِ عربیٍ مبین کی رو سے خالص ہو۔ کیا کہیں کہ ہماری محرومیاں کہاں کہاں جاتی ہیں!

اس کے بعد ایک واقعہ عرض کروں۔ ارمغانِ حجاز جو حضرتِ علامہؒ (ڈاکٹر محمد اقبالؒ) کی آخری کتاب ہے' وہ درس میں آنے سے رہ گئی تھی۔ انہوں نے اس کا ترجمہ کیا اور شائع کیا۔ انہوں نے مجلس قلندران کے متعلق اور میرے متعلق اس کے تعارف میں یہ سارا کچھ لکھا ہے۔ ہمارے یہاں سے تو پھر ان کی تبدیلی ہو گئی اور وہ سفیر ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔ یہاں انہوں نے پھر کہا اور لکھ کر دیا ہوا ہے کہ جو ارمغانِ حجاز ہے اس میں اقبالؒ (1938-1877) نے اپنی یہ تمنا ظاہر کی ہے' خدا کے ہاں دعا کی ہے کہ میرا انجام اس خاکِ پاک میں ہو۔ تو انہوں نے یہ جو ان کی ہمارے ساتھ آخری الوداعی تقریب تھی' اس میں کہا کہ میری تمنا یہ ہے کہ اب مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ کی یہ نشستیں حرمِ کعبہ میں ہوں' وہاں ہم ارمغانِ حجاز اس طرح سے شروع کریں لیکن وہاں جانے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان کا ہارٹ فیل ہوا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ کیا کہیں کہ ہماری محرومیاں کہاں کہاں جاتی ہیں! ضمناً یہ بات میں عرض کرتا ہوں۔ میں نے اس کو ریکارڈ کر دیا ہے کہ یہ چیز محفوظ ہو جائے' شاید کہیں اور نہ ملے۔ وہاں سے یہ اہم بات منکشف ہوئی کہ یہ جو ہمارے ہاں یہ قصہ ہے کہ قرآن سمجھ میں نہیں آتا' قرآن کے مختلف ترجمے ہو رہے ہیں' وہ الفاظ محفوظ ہیں اور ایک کا سمجھا ہوا قرآن دوسرے سے ملتا ہی نہیں ہے۔ یہ ہوا کیا ہمارے ساتھ؟ انہوں نے یہ بات کی کہ انہوں نے یوں قرآن سمجھا تھا۔

قرآنِ حکیم نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی خود قرآن کے اندر واضح کر رکھا ہے

عزیزانِ من! قرآن سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کے معنی متعین کیجیے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں عرب ان میں سے کیا معنی لیتا تھا۔ لسانِ عربیٍ مبین کا قرآن ہے حتیٰ کہ اس میں جو اصطلاحات (Terms) قرآن نے استعمال کی ہیں' ان کا مفہوم

بھی خود قرآن نے آپ واضح کر دیا ہے۔ یہ عجیب کتاب ہے۔ قرآن اسے نورِ مبین کہتا ہے۔ یہ روشنی ہے۔ سورج کسی چراغ کا محتاج نہیں ہوتا کہ ہم دیا لے کر جائیں کہ وہ دیکھو! سورج اس کی روشنی میں نظر آتا ہے تمہیں! روشنی اپنے دکھانے کے لیے کسی خارج کے سہارے کی محتاج ہی نہیں ہوتی۔ یہ محتاج ہی نہیں ہے کسی خارج کے سہارے کا۔ عربی مبین اور فکرِ انسانی! حضورؐ نے فرمایا تھا کہ **تتفکروا** (34:46) اور قرآن بولتا ہوا آپ کے سامنے آجاتا ہے کہ عرب اس کو یوں سمجھتے تھے۔ اب آپ نے سمجھا کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ اگر یہ کسی عجمیوں کی زبان میں ہم نازل کرتے تو ان کی سمجھ میں ہی قرآن نہ آتا۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں آج عربی بولنے والے بھی عجمی ہو چکے ہیں

عزیزانِ من! تو یہ ہو گیا ہے کہ ہم تو ایک طرف رہے' یہ سارے جو عربی بولنے والے' جتنے بھی ہیں' وہ سارے عجمی ہو چکے ہوئے ہیں۔ ان کی عربی زبان کے الفاظ کے معنی عجمی ہو گئے ہوئے ہیں۔ قرآن کی تفسیریں بھی اس عجمی زبان میں لکھی ہوئی ہیں' اور عجمی معنی میں لکھی ہوئی ہیں حالانکہ ان کی زبان تو عربی ہے۔

قرآنِ حکیم کا نہ تو ترجمہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے مرادفات کہیں مل سکتے ہیں

قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمے کے معنی ہوتے ہیں: عربی زبان کا لفظ' اس کا مرادف جو دوسری زبان میں ہو' وہ رکھا جائے۔ ہم اپنے ہاں پانی کہتے ہیں' فارسی والے آب کہتے ہیں' عربی والے ماٗ کہتے ہیں' انگریزی والے Water کہتے ہیں' یہ تو ہو جائے گا ترجمہ۔ اور جب قرآن ''الٰہ'' کہے گا اس کا مرادف تو دنیا کی کسی بھی زبان میں مل ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک لفظ ہے' ترجمہ اس کا کہتے ہیں کہ لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لگا دو۔ اس ''الٰہ'' کا دوسرا لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے الفاظ خدا کے الفاظ ہیں۔ ان لفظوں کا مرادف کہاں سے ملے گا؟ یہ میں ہی نہیں کہتا خود ہمارے ہاں کے بھی جو بڑے بڑے دانشور ہیں انہوں نے یہ بات کہی ہے۔ میں ان کو بھی سند میں پیش نہیں کرتا۔ ہمارے ہاں کی یہ اگلی نسل' ارے اگلی ہی نسل کیا' ہم موجودہ نسل بھی عربی زبان ہی نہیں جانتے' یہ تو آگے جا کے سوال پیدا ہونا تھا کہ عربی زبان میں بھی عربیٔ مبین ہونی چاہیے جس سے قرآن سمجھ میں آئے۔ ہم عربی ہی نہیں سمجھتے تو عربیٔ مبین کہاں سے آئے گا۔

قرآنِ حکیم کی انسانیت ساز تعلیم' فرقہ واریت کی اندھیری غار کی نذر ہو گئی ہے

آج ترجموں پہ ہی ہمارا مدار ہے اور ترجموں میں مثلاً اردو کے ترجموں میں بھی جو کچھ ہمارے ہاں کیا ہوا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک ترجمہ مولوی نذیر احمد (1912-1830) نے کیا۔ اس کے خلاف کچھ اعتراضات ہوئے' دیو بند میں ایک ترجمہ

شروع ہوا' تو اس کے دیباچے کے اندر انہوں نے لکھا کہ یہ جو ترجمہ تھا یہ کچھ وہابیوں کا سا تھا۔قرآن کا ترجمہ وہابیوں کا سا تھا!! یا للعجب!!!' ضرورت اس امر کی تھی کہ حنفی نقطۂ نگاہ سے قرآن کا ترجمہ کیا جائے۔تو ٹھیک ہے جب الفاظ اپنے ہی دینے ہیں تو وہ اپنے نکتہ خیال سے دیجیے۔جب یہاں تک نوبت پہنچ جائے تو پھر یہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ قرآن تو مسلمانوں کے اندر موجود ہے اس پہ یہ اتنا اختلاف کیوں ہے' اتنے فرقے کیوں ہیں' اتنا سر پھٹول کیوں ہے؟ اس کی تو یہ وجہ ہے۔اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔

قرآنِ حکیم کا ترجمہ نہیں ہوسکتا

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مجھ سے پوچھیے' میرے لغات القرآن کے دیباچے میں بھی یہ لکھا ہے۔ H.A.R Gibb ایک مستشرق ہے' عربی زبان کا علامہ ہے۔وہ کسی اپنے ہی کام سے کراچی میں آیا ہوگا' خاص طور پہ اس نے آ کر کہا تھا کہ یہاں ایک شخص قرآن کا نام لیتا ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں تو وہ مجھ سے ملا۔میں نے یہ دیکھا کہ اپنے ہاں کے جو بہر حال علمائے کرام میرے سامنے تھے بڑے بڑے فاضل ہیں' اس میں کوئی شبہ نہیں جسے آپ عربیٔ مبین کہتے ہیں' اس کے اوپر جتنی نگاہ اس کی وسیع تھی' میں نے اپنے ہاں ان کی طرح کا کسی کو نہیں پایا۔اور اس نے کہا کہ میں تم سے اس لیے ملنے آیا ہوں کہ تمہارے متعلق میں نے یہ سنا ہے کہ تم اس انداز سے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہو' مجھے بڑی خوشی ہوئی۔اور کہا میں نے یہ بھی سنا تھا کہ تم نے یہ کہا ہے کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔اس نے کہا کہ دیکھیے' میں نے کیا لکھا ہے۔یہ چیز اس کی ایک کتاب میں بھی ہے "Modern Trends in Islam" (اسلام میں جدید رجحانات) اس کی کتاب کا نام ہے' چھوٹی سی اوریجنل کتاب ہے۔اس میں آپ دیکھ لیجیے۔میں ترجمہ سناتا ہوں۔

یاد رکھیے انگریزی زبان میں بڑے اچھے ترجمے ہوتے تھے۔وہ شخص لکھتا ہے ''حقیقت یہ ہے یہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو نہیں سکتا' جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہوسکتا' وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے۔قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے مترجم اپنے وضع کردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیت کو مقید کر دیں گے۔ایسی آیات میں جن میں عام واقعات یا قوانین اور احکام مذکور ہوں ترجمے کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن بایں ہمہ جو مدو جزر' جو نشیب و فراز' جو بلندیاں اور گہرائیاں' جو لطافتیں اور باریکیاں اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش اس کتاب کے الفاظ میں جلوہ فرما ہے' وہ ترجمے میں آ سکتا ہے؟'' وہ اپنے ہاں کے انگریزی کے ترجمہ کرنے والوں کو چیلنج دیتا ہے کہ ''ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے'

آیت ہے: (50:43)۔اس میں چھ لفظ ہیں' وہ کہتا ہے کہ انگریزی ہی نہیں دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے' اس کے چھ الفاظ میں جو پانچ مرتبہ ''ہم بھی'' کی تکرار ہے' اسے کون سی زبان ادا کرسکتی ہے۔

ٹھیک کہا تھا اقبالؒ (1877-1938) نے کہ

فاش گویم آنچہ در دلِ مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است

گب (Gibb) یہ ایک چھوٹی سی آیت دیتا ہے۔ یہ جو بھی اس کے اندر' جس کو وہ کہتا ہے کہ چھ لفظوں میں سے پانچ دفعہ'' ہم بھی'' آیا ہے: انا ''میں'' نحن ''میں'' نحی ''میں'' نمیت ''میں'' اور الینا ''میں''۔وہ کہتا ہے کہ ذرا اس ہم کا ترجمہ کر کے بتایئے۔ وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

تفسیر جلالین کی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن کی زبان عربی مبین ہے جس کا ترجمہ ہی نہیں ہوسکتا۔کسی اردو زبان میں کیا' خود عربی میں بھی نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے اس کو تفسیرِ جلالین کہتے ہیں۔ وہ دو باپ بیٹے تھے یہ ان کی تفسیر ہے۔ انہوں نے کیا یہ ہے کہ قرآن کے لفظ کے آگے' قوسین میں' اپنے ذہن میں جو عربی زبان کا مرادف لفظ ہے وہ اس میں لکھ دیا ہے۔ اپنے ذہن میں جو ان کے نزدیک مرادف عربی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی میں ایک ایک چیز کے لیے ہزاروں الفاظ ہوتے ہیں' عربی زبان میں مرادف لفظ ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ Exactly وہی معنی ادا کرنے کے لیے دو لفظ زبان کا بڑا نقص ہے لیکن وہ باپ بیٹا ان کے مرادف اس کے اندر لکھتے چلے جاتے تھے۔ تو اب یوں ہوا کہ قرآن کے لفظ اور ان کے بعد اس کے مرادف انہوں نے لکھے ہیں۔ کیا ان کے الفاظ کو اکٹھا کر لینے سے وہ آیتیں بن جائیں گی؟ ذرا ان الفاظ کی آیتیں بنایئے اور قرآن کی آیتیں سامنے رکھیے۔ نظر آتا ہے کہ کس زبان میں یہ لکھا ہوا ہے۔ عربی زبان میں بھی اس کے مرادف نہیں ملتے' دوسری زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ ہی نہیں ہوسکتا ہے۔

قرآنی آیات کا مفہوم تو بیان کیا جاسکتا ہے لیکن ترجمہ نہیں کیا جاسکتا

یہ چیز ہے جس کی وجہ سے میں نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تفسیر میں اپنے خیالات آجاتے ہیں۔ میں نے اسے مفہوم القرآن کہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ میری پہلی کاوش ہے' جس کے لیے میں بطور تحدیثِ نعمت عرض کیا

کرتا ہوں کہ اس کا یہ فضل ہے کہ میں نے ترجمہ اور تفسیر ان معنوں میں نہیں لکھی۔ مفہوم القرآن میں نے لکھی' مطالب الفرقان میں نے لکھی۔ لسانِ عربی ٌمبین تو لسان عربی مبین ہے: **بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ** (26:195) اسے ایسی واضح' صاف اور نکھری ہوئی زبان میں نازل کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کا ابہام نہیں' کوئی الجھاؤ نہیں اور کہا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں جو اس میں کہی گئی ہے۔

قرآن مجید میں سابقہ انبیائے کرام کی پیش کردہ اصل تعلیم کو جمع کردیا گیا ہے

عزیزانِ من! اب وہ دو آیات لیتے ہیں جو پہلے چھوڑی تھیں۔ ان میں پہلی آیت یہ ہے کہ **وَاِنَّهٗ لَفِيۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ** ❶ (26:196)۔ انبیائے سابقہ کی کتابوں میں بھی دین کے یہی اصول دیئے گئے تھے۔ اور آپ کو یاد ہوگا جو میں نے اس موضوع کی ابتدا میں کہا ہے کہ جس نبی کی داستان آئے گی' اس میں دین ہی کے کسی نہ کسی گوشے کو نمایاں کیا ہوگا اور وہی الدین ہے جو قرآنِ کریم کے اندر آ کر مکمل ہوگیا ہے۔ اس لیے جب یہ کہا جائے گا یہ جو کچھ اس قرآن میں کہا گیا ہے انبیائے سابقہ ؑ کی اصلی کتابوں میں بھی وہ کچھ موجود تھا' تو یہ وہی حقیقت ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ الدین ہر نبی لاتا تھا۔ الدین ہی کے گوشے ان کی اصلی کتابوں میں تھے' وہی گوشے اکٹھے ہو کر اس کتاب کے اندر آ جاتے تھے۔ وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں' غیر محرف شکل میں' دنیا میں موجود نہیں رہیں۔ قرآن میں وہ سب کچھ لایا گیا' اسی لیے قرآن کو تمام کتب سابقہ کا **مُهَيۡمِنٌ** (5:48) کہا گیا ہے یعنی ان چیزوں کو محفوظ کر دینے والا جو پہلی کتابوں میں فراموش ہوگئی تھیں یا حوادثِ ارضی وسماوی کے ذریعے سے ناپید ہوگئی تھیں۔ وہ اس کتاب کے اندر آ گئی۔ یہ کتاب لسانِ عربی ٌمبین میں تھی۔ لسانِ عربی ٌمبین میں اس چیز کو محفوظ کر دیا۔ کتاب کے الفاظ کو محفوظ کر دیا۔ بلفظہٖ نثر کی کتاب ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہ شعر میں خوبی ہے کہ وہ الفاظ کے ذریعے سے یاد رکھا جاتا ہے اور آگے Convey (پہنچایا) کیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ کا محفوظ ہوجانا ہی قرآن کا اعجاز ہے

یہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ یہ کتاب ہزاروں کروڑوں افراد کے سینے میں بلفظہٖ ہوتی ہے' بلفظہٖ دہرائی جاتی ہے۔ آج اگر کوئی ایسی اسلام کی یا مسلمانوں کی دشمن قوت ہے کہ وہ چھپے ہوئے جو قرآن ہیں (معاذ اللہ)' وہ دنیا میں اس کا کوئی نسخہ بھی نہ رہنے دے تو بھی قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ان کروڑوں سینوں کو کہاں لے جاؤ گے جن کے اندر یہ بلفظہٖ محفوظ ہے۔ یہ بھی اعجاز ہے قرآن

---

❶ اور اس کی تعلیم اصولاً وہی ہے جو انبیائے سابقہ کے صحیفوں میں تھی (اور جو وہاں محفوظ نہ رہی)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 855)۔

کی حفاظت کا' ورنہ شعر ہی ہمیشہ اپنے الفاظ میں محفوظ رہتا ہے۔ یہ ساری کتاب' پوری کی پوری' بلفظہ محفوظ ہے اور اس کے الفاظ کے معانی' لسانِ عربی ٌمبین کے معنیٰ' شعرائے جاہلیہ کے کلام کی رو سے محفوظ ہیں: معانی محفوظ' الفاظ محفوظ لیکن جب مسلمان عجمی ہو جائے تو اسے یہ چیز کیا فائدہ دے گی!! الفاظ کے تعویذ لکھو اور معنی عجمی تفسیروں سے سمجھو۔ اسی لیے اس نے کہا کہ **فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ** ❶ (26:199)۔ یہ وجہ ہے جو وہ قرآن پہ ایمان نہیں لاتے۔ **اَوَلَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ اٰيَةً اَنۡ يَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ** ❷ (26:197)۔ قرآنِ کریم میں آپ کو ایک لفظ اُمی ملے گا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ اَن پڑھ (Unlettered) کیا جاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اُمی تھا' اَن پڑھ تھا اور پھر بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر اَن پڑھ رہے تھے تو کیا یہ قابلِ فخر بات ہے؟ کسی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ساری عمر اَن پڑھ رہے۔ کیا یہ قابل فخر ہے؟ جو ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم خود بیان کرتے ہیں کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین تک جانا پڑے' تو کیا وہ مکے میں بیٹھے ہوئے علم حاصل نہ کریں گے؟ قرآن اس کا شاہد ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے واقعی آپؐ کی کیفیت یہ تھی کہ نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے' نہ کچھ جانتے تھے۔ نبوت ملنے سے پہلے کی یہ بات ہے' بعد کی نہیں ہے۔ اتنا بڑا معلمِ عظیم ہو اور خود ان پڑھ رہے؟ یہ نا قابل فہم بات ہے۔ قرآن کی شہادت میرے پاس ہے' بات ختم ہو گئی۔

یہ لوگ اُمی تھے۔ ایک تو ام القریٰ مکے کو کہتے تھے تو جو مکی تھے ان کو بھی اُمی کہا جاتا تھا جیسے لاہور والوں کو لاہوری کہتے ہیں' اور ایک یہ کہ اہل کتاب انہیں طنزاً کہتے تھے۔ اہل کتاب اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے تھے کہ جن کی طرف خدا کی طرف سے کوئی نہ کوئی کتاب نازل ہوئی۔ یہ جو عرب تھے یہ اس باب میں اس کے مدعی ہی نہیں تھے کہ ہماری طرف بھی کوئی کتاب نازل ہوئی ہے تو پیغمبری میں حضرتِ اسماعیلؑ پہلے ہیں' جن کا ذکر آتا ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا اس قوم میں کوئی پیغمبر ہی نہیں آیا۔ اور یہ بھی اچھا ہی تھا اور نہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف آئے ہوئے جو پیغمبر تھے' ان کی محرف کتابوں کو' تعلیم کو' وہ بھی دین سمجھتے اور اس دین کی طرف توجہ ہی نہ کرتے اور کہتے کہ ہمارے پاس تو دین موجود ہے ہم تمہاری بات کیا سنیں۔ اب ان سے جب بات کی جاتی تھی تو ان کے پاس تو کوئی کتاب ہی نہیں تھی۔ یہ ان کو اُمی کہتے تھے۔ جیسے آج جب قرآن کی بات ان سے کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ کیا

---

❶ اور وہ اسے انہیں پڑھ کر سناتا (تو بھی ان کا اعتراض قابلِ فہم ہوتا لیکن اب ان کا انکار اس امر کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ یہ اپنی روش کو چھوڑ کر) صداقت کی راہ اختیار کرنا نہیں چاہتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔855)۔

❷ (یہ قریش عرب اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ تعلیم اصولاً وہی ہے جو انبیائے سابقہ کے صحیفوں میں تھی' کیونکہ ان کی طرف مدت سے کوئی رسول نہیں آیا (36:6) لیکن کیا یہ بات ان کے لیے نشانِ راہ نہیں بن سکتی کہ اس حقیقت کو علمائے بنی اسرائیل خوب جانتے ہیں (یہ چاہیں تو ان سے دریافت کر سکتے ہیں)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔855)۔

بات کہہ رہے ہو کیا قرآن ہمارے ہاں نہیں ہے۔ ایک رمضان میں دیکھیے کتنی مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ یہ اہلِ کتاب اپنے آپ کو تو اہلِ کتاب کہتے تھے اور ان کے ساتھ جو کتاب والے نہیں تھے ان کو وہ اُمی کہا کرتے تھے۔ تو یہ جو رسول اللہ ؐ کے متعلق ہے کہ یہ امی رسول آیا ہے تو وہ کہا ان کے لیے ہے' جو اس کے مدعی نہیں ہیں' ان کے پاس پہلے سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ کہا کہ تمہارے پاس تو پہلے کوئی کتاب موجود نہیں ہے یہ جو میں انبیائے سابقہ ؑ کا تذکرہ کرتا ہوں تمہیں تو اس کا علم نہیں ہوگا **اَوَلَمۡ یَکُنۡ لَّھُمۡ اٰیَۃً اَنۡ یَّعۡلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ** (26:197) یہ علمائے بنی اسرائیل تمہارے اندر موجود ہیں۔ ان سے جا کر پوچھو' جو میں نے تذکرے کیے ہیں کہ آیا یہ صحیح ہیں یا نہیں۔ یہ بھی ان کے لیے ایک سند بنی تھی۔ **لَّھُمۡ اٰیَۃً** (26:197)۔ آیت نشانِ راہ کو کہتے ہیں۔ ایک نشانِ راہ تمہارے لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے ہاں تو کوئی کتاب نہیں جس میں انبیائے سابقہ ؑ کے تذکرے ہوں' ان سے پوچھ لو جن کے پاس کتابیں ہیں کہ ہیں ان کے اندر یا نہیں؟ یہ الگ بات ہے کہ وہ تذکرے بھی محرف ہیں۔ اور میں ان کو نہایت معطر اور پاکیزہ شکل میں دے رہا ہوں۔ اور آگے وہ بات ہے **وَلَوۡ نَزَّلۡنٰہُ عَلٰی بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِیۡنَ o فَقَرَاَہٗ عَلَیۡھِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ مُؤۡمِنِیۡنَ** (26:198-99) اگر یہ غیرِ عرب یعنی عجمی زبان کے اندر قرآن آتا اور ان کے سامنے پیش ہوتا تو پھر یہ اس کو سمجھ ہی نہ سکتے۔ اور جب سمجھ ہی نہ سکتے تو ایمان کیا لاتے۔ بات تو یہ ہے لیکن سمجھ سکنا بھی' عزیزانِ من! ایک اور ہی چیز ہے وہ جو بات تھی کہ حضرتِ شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ شعیب علیہ السلام! جو باتیں تم ہم سے کرتے ہو' ہم تو انہیں سمجھ نہیں سکتے' حالانکہ وہ ان کی زبان میں باتیں کرتے تھے۔ وہ بات یہی نہیں ہے۔ سمجھ سکنے کی بات اور ہے۔ عرب اور عجم کا بھی اس میں امتیاز نہیں ہے۔ کیا کہا گیا ہے یہ شخص[1]!

تُو عرب ہو یا عجم ہو' ترا لا الہ الا

لغتِ غریب' جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یہ ہے ایمان۔ دل تو اس وقت گواہی دے گا' عزیزانِ من! جب یہ کتاب عظیم لسانِ عربی ٌمبین کی رو سے آپ کی سمجھ میں آئے گی۔

سورۃ الشعراء کی آیت 199 تک ہم آ گئے۔ 200 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938ء) کی طرف ہے۔

سترھواں باب: **سورۃ الشعرآء** (آیات 203 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1978ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الشعرآء کی آیت 203 سے ہو رہا ہے: (26:203)۔

سابقہ آیت (26:200) میں مجرمین کے متعلق بات ہو رہی تھی اور میں نے بتایا تھا کہ آج کی اصطلاح میں جنہیں Exploitation (استحصال) کرنے والے یعنی دوسروں کی محنت کا استحصال کرنے والے کہتے ہیں' عربی زبان میں بھی اور قرآنِ کریم میں بھی' جہاں یہ چیز آئی ہے' وہاں بنیادی طور پر اسے جرم کہا گیا ہے اور اس کا نتیجہ تباہی بتایا گیا۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے اس نظام کو تباہی سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کر لیتے ہیں لیکن **فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ** (26:202) ہوتا یہ ہے کہ پھر وہ تباہی اس طرح اچانک آ جاتی ہے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ کہاں سے آ گئی۔ جس نظام کی بنیاد میں خرابی مضمر ہو وہ تدبر کی فسوں سازی کی تدبیروں سے ٹل ہی نہیں سکتی۔

نظامِ کائنات میں مہلت کے وقفے کو بڑی اہمیت حاصل ہے

یہ ٹھیک ہے کہ اس میں مہلت کا وقفہ تو ہوتا ہے لیکن وہ تباہی ٹل نہیں سکتی' اسی لیے کہا کہ **فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ** (26:203) جب وہ اس طرح سے تباہی آتی ہے تو اس وقت پھر ان کو خیال ہوتا ہے کہ کیا ہمیں پھر تھوڑی سی مہلت دی جائے گی؟ آگے عجیب چیز کہی ہے۔ کہا ہے کہ اس وقت تو کہیں گے کہ تھوڑی سی مہلت ملے اور **اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ** (26:204) اب اس تباہی کے لیے اتنی کوششیں کر رہے ہیں کہ وہ جلدی سے جلدی آ جائے۔ اگر آج یہ کھڑے ہو کر سوچ لیں کہ جب تباہی کا وہ وقت آ جائے گا تو پھر مہلت نہیں ملے گی۔ پھر یہ آج جلدی کیوں مچا رہے ہیں؟ جب وہ عذاب آئے گا تو پھر اس وقت یہ سوچ ہو گی کہ ہمیں کچھ اور مہلت مل جائے' ہمیں ایک Turn (باری) اور مل جائے تو پھر دیکھیے کہ ہم کس قدر اصلاح کرتے ہیں۔ اس وقت

کہو گے کہ ہم اصلاح کرتے ہیں' تو آج کیوں نہیں شروع کرتے کہ وہ عذاب آئے ہی نہیں۔ یہ عجیب نفسیاتی کیفیت ہے۔ کہا کہ **اَفَرَاَیۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰهُمۡ سِنِیۡنَ ۝ ثُمَّ جَآءَهُمۡ مَّا كَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ۝ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا یُمَتَّعُوۡنَ** (26:205-7) انہیں یہ پتہ نہیں کہ یہ جو اس عذاب کی محسوس نمود ہے' وہ اچانک ہوتی ہے۔ وہ عذاب ایک دن میں نہیں آجاتا۔ یہ تو ان کے غلط نظام کا Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہے' وہ تو ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جب وہ یوں سامنے آجاتا ہے تو پھر جو کچھ انہوں نے ساز و براق اکٹھا کر لیا ہوتا ہے' وہ ان کے کسی کام نہیں آتا' وہ سیلابِ بے پناہ ہوتا ہے' وہ ان تمام چیزوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ سازوسامان ان کے کسی کام نہیں آتا۔

ذاتِ خداوندی کسی کو بھی آگاہی کے بغیر تباہ نہیں کرتی

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ **وَمَاۤ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَرۡیَةٍ اِلَّا لَهَا مُنۡذِرُوۡنَ** (26:208) ہم کسی قوم کو بھی تباہ نہیں کرتے' کسی بستی کو بھی برباد نہیں کرتے تاآنکہ پہلے وہاں ہم ان لوگوں کو نہ بھیج دیں جو ان کو وارن کر دیں' آگاہ کر دیں کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہے۔ یعنی یہ جو تباہی آئی ہے وہ یونہی اچانک نہیں آگئی۔ یہ اچانک کی بات نہیں ہے۔ پہلے تو یہی چیز کہی گئی کہ ان کا جو اتنے لمبے عرصے پر مستقل تخریبی نظام تھا' یہ اس کا Accumulative Effect (مجموعی اثر) تھا جو نمود میں آیا اور دوسرے یہ کہا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ ہمیں اب مہلت ملے تو سنو' ہم کسی کو تباہ نہیں کرتے تاوقتیکہ ہم پہلے اس میں وارننگ دینے والا' آگاہ کرنے والا' نہ بھیج دیں' کہ تمہارے اس نظام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ جب وہ بتانے والا آتا ہے تو اس کے خلاف یہ لٹھ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں' مخالفتوں کا ہجوم اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے' تکذیب کرتے ہیں' استہزاء کرتے ہیں' میدانِ جنگ تک میں اتر آتے ہیں۔ اس کے خلاف تو یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور جب وہ تباہی آجاتی ہے تو اس وقت پھر چیخنا چلانا شروع کرتے ہیں اور پھر مہلت مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ چیز بھی کس قدر انصاف اور عدل پر مبنی ہے کہ تباہ ہونے والے کو پہلے وارن کر دیا جائے' آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ تباہی ہے۔ اگلی ہی آیت میں **ذِكۡرٰی** (26:209) آیا ہے۔ یہ ذکر اور ذکریٰ جہاں بھی آتا ہے' ایسی چیز کے لیے آتا ہے جسے سامنے رکھنے سے انسان بہت سا سبق حاصل کر سکتا ہے۔ کہا کہ اس بات میں بہت بڑا سبق مضمر ہے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ پہلے ان کو وارننگ دی جاتی ہے' یہ وہ چیز ہے۔ یہ بات ہے کہ **وَمَا كُنَّا ظٰلِمِیۡنَ** (26:209) جس کے لیے ہم کہتے ہیں کہ ہم کسی

پہ ظلم نہیں کرتے' بغیر آگاہ کیے ہوئے اگر کسی پہ اس طرح تباہی آ جائے تو اس میں کہا جاسکتا ہے کہ صاحب! ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا گیا' بتایا ہوتا تو ہم اپنی روش میں تبدیلی کر لیتے۔قرآن کہتا ہے کہ ٹھیک ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ واقعی ظلم ہوگا لیکن ہم تو کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ اسی لیے ہم پہلے وارن کرنے والے بھیج دیتے ہیں اور اس کے باوجود جب یہ اپنی روش میں تبدیلی نہیں کرتے تو اس کا فطری نتیجہ ان کے سامنے آجاتا ہے۔

توحید یہ ہے کہ خارجی کائنات کی طرح انسانی دنیا میں بھی خدا کا ہی قانون رائج ہو

اس سے آگے تین آیات آتی ہے کہ **وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ o وَمَا يَنْبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ o اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ** [1] (26:210-12)۔عام بات تو یہ ہے کہ جو کچھ یہ رسول کہہ رہا ہے' جسے یہ وحی کہہ کر پکارتا ہے' یہ جتنے بھی ان لوگوں کے ہاں کے کاہن اور ساحر اور شاعر ہیں' وہ لوگ جو اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں کشف اور الہام ہوتا ہے' یہ وحی وہ چیز نہیں ہے' یہ کچھ اور ہی چیز ہے۔عزیزانِ من! اس کی میں مزید تشریح اٹھا رکھتا ہوں۔ کچھ آیات کے بعد ایک چیز آئے گی جہاں کہا ہے کہ **وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ** (26:224)۔ وہاں بھی یہی موضوع ہے اور یہ ذرا تفصیل طلب ہے' بات سمجھنے کی ہے تو میں ان آیات کو ان کے ساتھ ملا کر وہاں اس کی وضاحت کرونگا۔ یہاں اسے چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔

وہ اہم بات جو توحید کی ہے اس کے لیے کہا کہ **فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ** (26:213) یہ تباہی آتی اس طرح سے ہے کہ ایک تو روشِ زندگی یہ ہے کہ قانون اور اقتدار صرف ایک الہ کا ہے' وہی صاحبِ اقتدار ہے' اسی کا قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے اور وہی قوانین انسانی زندگی کے اندر بھی کارفرما ہونے چاہئیں۔ اگر یہ روش اختیار کی جائے تو پھر تباہی نہیں آتی لیکن اگر اوروں کو بھی صاحبِ اقتدار تسلیم کر لیا جائے' اور ان کے بنائے ہوئے قوانین اور احکام اور اصول شروع کر دیئے جائیں' نظام ان کے مطابق اپنے ہاں متشکل کر لیا جائے' تو پھر تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔

---

[1] (ہاں تو جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے' اس قرآن کو' خدا کی طرف سے ''روح الامین'' لے کر نازل ہوا ہے) یہ اس قسم کی چیز نہیں ہے جسے ان کے کاہن اور نجومی پیش کیا کرتے ہیں (وہ انسانی شعبدہ بازیوں کے کرشمے ہیں۔ وحی اس سے بالکل الگ چیز ہے (26:210)۔
(وہ باتیں جس کا جی چاہے' کسب و ہنر سے حاصل کر سکتا ہے) لیکن وحی اس طرح حاصل نہیں کی جاسکتی۔ (وہ خدا کی طرف سے صرف اسے مل سکتی ہے' جسے اس کا اہل سمجھا جاتا ہے) کاہن اور ساحر وغیرہ اس کے اہل نہیں ہو سکتے (26:211) (وحی کا پانا اور اس کا ''آسمانوں'' سے لے آنا تو ایک طرف' یہ لوگ) اس مقام کی بھنک بھی نہیں پا سکتے جو وحی کا سرچشمہ ہے (15:17-18;26;212,37:78;67:5:72:8-9)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 856 تا 857)۔

ہمارے ہاں دین مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے

ہمارے ہاں تو دین کو مذہب بنا دیا ہے' شرک کے معنی بت پرستی ہوگئی اور وہ بت بھی خاص قسم کا ہوتا ہے یعنی وہی جو ہندوؤں کے ہاں کا بت ہوتا تھا' ہمارے ہاں کا بت نہیں۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ ہندوؤں کا بت کھڑا ہوتا ہے ہمارے بت لیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ تہہ خاک ہوتے ہیں۔ وہاں بھی وہی پتھر' وہی چونا ہوتا ہے۔ ہم سے تو وہ ہندو اچھے' کم از کم کسی کھڑے کے سامنے تو جھکتے ہیں۔ ہم تو لیٹے ہوئے کے سامنے جو تہہ خاک ہیں' جھکتے ہیں۔ بس شرک یہی ہے اور بہت خوش ہوتے ہیں کہ اللہ کا احسان ہے صاحب! ہمارے ہاں شرک نہیں ہے۔

ہزار برس سے عبادت کی جگہ پرستش کے فریب میں اسیر قوم کی حالت

قرآن کہتا ہے کہ فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (26:213). یہ ہے جو شرک ہے۔ اب ہمارے ہاں الہ کے معنی معبود کیے جس کی پرستش کی جائے' عبادت کے معنی پرستش کر لیے' ہندوؤں کا بت معبود ٹھہرایا اور کہا کہ ہم ان کی پرستش نہیں کرتے اور یہ یہاں بھی جو ہمارے ہاں الگ فرقے ہیں' ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ قبروں پہ نہیں جانا چاہیے' دعائیں نہیں مانگنی چاہئیں تو وہ ان سے یہ کہتے ہیں کہ صاحب! پرستش کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ہم ان کی پرستش تو نہیں کرتے' یہ بت نہیں ہیں اور جو الہ ہیں وہ ایک ساتھ دوسرا نہیں' سینکڑوں الہ ہیں جو تجویز کیے ہوئے ہیں اور قدم قدم کے اوپر ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور اس کا نام توحید ہے۔ شرک نہیں ہے کیونکہ ہم عبادت صرف خدا کی کرتے ہیں۔ بہرحال اپنے آپ کو اس طرح فریب دے لینے سے تو غلط نظام کی تباہ کاریوں سے نہیں بچ سکتے۔ ہزار برس سے یہ قوم اس تباہی میں آئی ہوئی ہے لیکن بہت خوش ہے۔ اس کو فریب میں رکھا جاتا ہے کہ کوئی بات نہیں' اللہ کے مقرب بندوں کی حالت اس دنیا میں یہی ہوا کرتی ہے: ذلیل و خوار' ہر جگہ سے ان کو دھکے ملتے ہیں اور عجیب قسم کی پھر وضعی روایات ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہونگے کہ کوئی شخص اپنے پاس ان کو کھڑا نہ ہونے دے لیکن اللہ کے ہاں وہ سب سے قریب تر بیٹھے ہوئے ہونگے۔ بہرحال یہ فریبِ نفس ہے کہ جو قیامتِ موجود کو نہ دیکھے تو اس کا علاج کیا ہے. فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ [1] (26:213). کتنا حتمی ہے کہ یہ کیا

---

[1] لہٰذا یہ سمجھنا کہ انسان اپنی محنت اور کوشش سے وہی بات پیدا کر سکتا ہے جو خدا کی وحی کی ہوتی ہے' خدا کے ساتھ انسان کو الٰہ تسلیم کر لینے کے مرادف ہے۔ (وحی کا تعلق خالصۃً علم و اقتدارِ خداوندی سے ہے جس میں کسی انسان کو دخل نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی کوئی انسان اس کی کوئی مثل بنا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی قبیل سے ہیں' وہ سخت گمراہی میں ہیں)۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا......تم ایسا نہ سمجھ لینا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 857)۔

اور تباہی تمہارے اوپر آئی!

نبوت کا فریضہ نظامِ زندگی میں عملی طور پر ایک انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے

اب آگے ایک نبی کا فریضہ آتا ہے۔ خدا کی طرف سے وحی ملنے کا جو منصب ہے وہ تو نبوت ہوتی ہے لیکن نبوت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے ملے وہ اپنی ذات تک ہی رکھیں۔ میں ذرا آگے چل کر جب کاہن اور ساحر پہ آؤنگا تو وہاں اس فرق کو بھی بتاؤنگا۔ اس کا اگلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے کہا گیا ہے' اس کے لیے اسے حکم ہوتا ہے کہ **بلغ ما انزل الیک** (5:17) اسے دوسروں تک پہنچاؤ اور پہنچانے میں بھی' یہ نہیں کہ وعظ کی طرح سے پہنچاؤ۔ ان کے غلط نظام کی مخالفت کرو' ان کو وارن کرو' قدم قدم کے اوپر روکو' کوشش کرو کہ وہ اس سے باز آجائیں۔ یہ جو پیغامِ خداوندی کو آگے پہنچانا اور اس کے مطابق ایک نظام قائم کرنا ہے' یہ فریضہء رسالت کہلاتا ہے۔ ضمناً نبوت تو نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر ختم ہوگئی یعنی خدا کی طرف سے وحی پانا ختم ہوگیا۔ یہ جو فریضۂ رسالت تھا کہ اس وحی کو آگے پہنچانا اور اس کے مطابق نظام قائم کرنا' یہ اس امت کے ذمے عائد ہوگیا۔ اسی لیے اسے قرآن میں وارثِ قرآن کہا گیا ہے۔ یہ اب اس امت کا فریضہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ جو اس نظام کو متشکل کرنا' مستحکم کرنا' آگے بڑھانا تھا' یہ اس امت کا فریضہ تھا۔ پہلی بات رسول اللہ ﷺ سے کہی گئی کہ **یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ** ❶ (2-74:1). یہ ہے وہ چیز جہاں رسالت شروع ہوتی ہے' وحی ملی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب اسی طرح سے' پہلی زندگی کی طرح' اپنے کاروبار کرتے تھے' یہ نہیں ہے بلکہ ''قم'' کہا ہے کہ کھڑے ہو جاؤ' یہ وہ فریضہ ہے جہاں پہنچ کر ایک رسول کی مخالفت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس وحی کو اپنی ذات تک رکھے کہ قرآن مجھ سے یہ کہتا ہے اور مجھ سے وہ کہتا ہے' تو اس کو پھر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو یہ غلط ہے اور اس کا نتیجہ تباہی ہے اور میرا فریضہ ہے کہ میں تمہیں اس سے روکوں' تو یہاں سے مخالفت شروع ہوتی ہے۔

اپنے اپنے گھروں کو قبلہ بنا لینے کا حکم

اب سوال یہ ہے کہ جو پہلی ہی تبلیغِ رسالت تھی یا جو اس پروگرام کی ابتدا تھی' وہ کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَکَ الْاَقْرَبِيْنَ** (26:214) پہلے اپنے گھر سے بات شروع کرو۔ ان کو دعوت دو جو تجھ سے قریب ہیں اور یہی

---

❶ اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر' ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر نظام باطل پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے (74:1) اٹھ! (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1379)۔

ہے وہ پروگرام جو شروع سے آ رہا ہے' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' یہی وہ پہلی چیز اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں ۔ اُدھر جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مصر میں تشریف لے گئے' فرعون اس کی اجازت تو نہیں دے سکتا تھا کہ کھلے بندوں میٹنگ کیا کریں' اجتماعات کیا کریں اور وہ اس کے خلاف جو اتنی بڑی تدبیر اور اسکیم بنا رہا تھا تو وہ تو اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا' وہاں یہ کہا گیا کہ کوئی بات نہیں' ان سے کہو کہ اپنے گھروں کو قبلہ بنا لیں ۔ قبلے کا لفظ بڑا عجیب ہے ۔ اجتماعی طور پر تو قبلہ اور آنا ہے لیکن سرِ دست ابتدائے کار کے لیے اپنے اپنے گھروں کو قبلہ بنالو۔ یہ جو غلط نظام کے اندر اس پروگرام کی ابتدا ہوتی ہے تو وہ اپنے گھر سے ہوتی ہے ۔

خطرے کے وقت رسولؐ خدا کا مومنین کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کا انداز

گھر اور معاشرے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ رات کو جب ہم گھروں میں سو رہے ہوتے ہیں تو گھر میں ہوتے ہیں اور صبح ہی ہم ان دروازوں کو کھول کر جب باہر نکلتے ہیں تو ہم معاشرے کے فرد ہوتے ہیں ۔ معاشرہ تو انہی گھروں کی اجتماعی شکل کا نام ہے ۔ اگر گھر درست ہو جائیں' تو معاشرہ درست ہو جاتا ہے۔ گھر سے مراد House (مکان) نہیں ہے' بلکہ Home ہے ۔ یعنی گھر کے افراد ہیں۔ یہ جو ایک ایک گھر کے افراد ہیں' اگر ان کے اندر یہ جسے قرآن نفسیاتی تبدیلی کہتا ہے' آ جائے تو معاشرہ تو خود بخود درست ہو جائے گا ۔ یہ وجہ ہے کہ ابتدائے کار جب بھی رسالت کی ہوتی ہے وہ ہمیشہ گھر سے ہوتی ہے ۔ یہاں کہا ہے کہ **وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ** (26:214) یہ تمہارے اہلِ خاندان' جو تمہارے قریبی ہیں' اقربا ہیں' ان سے بات شروع کرو ۔ اور وہیں سے وہ مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ ابتداً سب سے بڑی مخالفت تو یہ گھر والوں نے کی تھی ۔ یہاں سے پھر آگے بات چلی تھی اور بیشتر ان میں سے وہ تھے جو نبی اکرمؐ کے رشتہ دار تھے' عزیز تھے۔ مخالفت کی یہ بات وہاں سے چلی تھی ۔ ان میں سے جو لوگ ساتھ ملتے چلے جاتے تھے' اس دعوت کی صداقت پر ایمان لے آتے تھے' وہ اس جماعت کے افراد بن جاتے تھے اور اسے امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جاتا تھا' یعنی ایمان لانے والے' ان کے متعلق قرآنِ کریم میں رسول اللہؐ سے بھی کہا گیا ہے کہ ان کی تربیت و تعلیم کا خاص طور پر انتظام کرو اور ان کو اپنی Protection (حفاظت) کے اندر بھی رکھو۔ **وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ** (26:215) ان میں سے جو لوگ بھی ایمان لے آئیں اور تمہارا اتباع و پیروی کریں' ان کی حفاظت کر یعنی یہ **وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ** (26:215) ہے۔ قرآن یہ بڑا عجیب تصور سامنے لاتا ہے ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مرغی اپنے بچوں کو' چوزوں کو' لیے لیے کڑ کڑ کرتی پھرتی رہتی ہے' ان کو دانہ دنکا چگنا وغیرہ سکھاتی ہے' اگر کہیں بلی کی میاؤں کی آواز آ جائے یا چیل کا سایہ بھی پڑ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ سارے بچے سمٹ کر اس کے پروں کے نیچے آ جاتے ہیں اور وہ پروں کو پھیلا کر

ان کو Cover (ڈھانپ) دیدیتی ہے۔ یہ جو اس قسم کی Protection (حفاظت) دینا ہے' آپ دیکھیے کہ اس حفاظت (Protection) دینے میں' بہت سے الفاظ اور بھی استعمال کیے جاسکتے تھے لیکن یہ ایک حفاظت جو ماں اپنے بچوں کو دیتی ہے' اس حفاظت کے ساتھ بڑے ہی' شفقت' اخوت' محبت اور مودّت کے جذبات ہوتے ہیں' اس میں بڑی نرمی کی چیز آ جاتی ہے۔ یہ ماں کے پروں کے نیچے کی حفاظت بڑی عجیب چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے۔ رسول اپنی جماعت کے افراد کے ساتھ یہ تعلق بتاتا ہے اور یہی وہ تعلق ہے جو منزل کے حصول کے لیے ایک بنیاد ہے۔ سربراہ کوئی جماعت بھی بنائے اگر اس میں یہ کیفیت ہے کہ ذرا سا کہیں خطرے کی آہٹ بھی نظر آئے' اس خطرے کو اپنے اوپر لے اور ان کو اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے' سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے اور اس میں اس کے بدن کی حرارت بھی ہوتی ہے' گرمی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں **وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ** (26:215) کی اس ایک تشبیہ کے اندر قرآن نے بیان کردیں۔ قرآن عجیب انداز اختیار کرتا ہے۔ یہ بات کہنے کے لیے عربی زبان میں سینکڑوں الفاظ تھے کہ ان کو اپنی حفاظت میں رکھا کرو لیکن یہ بات کہ ان کو اس طرح اپنے پروں کے نیچے سمٹا لیا کرو جیسے مرغی اپنے بچوں کو سمٹاتی ہے' اب اس کے اندر سارا تعلق جو رسول کا امت کے ساتھ ہے' ہویدا ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

رسولِ خدا کی بارگاہ میں صاحبِ ایمان کا فریضہ اور ان کی کیفیت

کہا ہے کہ **وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** ❶ (26:215)۔ چلتے چلتے ایک بات یہ کہدوں۔ بعض لوگ اس میں یہ کہا کرتے ہیں کہ کہا یہ ہے کہ **لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (26:215) مومنین میں سے جو تمہارا اتباع کریں بس ان کے ساتھ یہ کرو' گویا مومنین ایسے بھی ہوتے تھے کہ جو مومن ہوتے تھے اور رسول کا اتباع نہیں کرتے تھے۔ تو یہ مومن کس طرح ہو سکتے تھے؟ قرآنِ کریم میں یہ تو اتباع کی بات ہے۔ اتباع کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کو کہتے ہیں' کسی کو Follow (پیروی) کرنے کو کہتے ہیں۔ مومن کے متعلق' ایمان کے متعلق' تو قرآن میں رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا گیا ہے۔ دیکھیے ایمان کی شرط یہ ہے کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ** (4:65)۔ یہ وہ ہے جسے قسم کہتے ہیں' جسے شہادت کہتے ہیں کہ تیرے خدا کی قسم' ہماری عام زبان میں اسے یوں کہیں گے۔ یہ خدا خود کہہ رہا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے یہ یوں ہے کہ تمہارا خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ **لا یؤمنون** (4:65) یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتے' انہیں مومن نہیں کہا جاسکتا **حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ**

---

❶ پھر ان میں سے جو ایمان لے آئے' اور اس مقصد کے حصول کے لیے تیرا اتباع کرے' اسے اپنے دامنِ حفاظت و سایۂ عاطفت میں لے لے۔ اس طرح ان کی ایک جماعت متشکل ہوتی جائے گی جو اس انقلاب کی سب سے پہلی داعی ہوگی (15:88)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 857)۔

(4:65) تاوقتیکہ اپنے ہر اختلافی معاملے میں یہ تمہیں اپنا حاکم نہ بنائیں' آ کر تم سے فیصلہ نہ لیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہر اختلافی معاملے میں اس مرکز سے جا کے' اس نظام کے سربراہ سے جا کے' رسول سے جا کے' فیصلہ لیں۔ چلیے یہ تو بات ہوگئی' عدالتوں میں لوگ فیصلہ لینے کے لیے جاتے ہی ہیں ' رسول کے پاس جائیں گے تو وہاں کیا فرق ہے؟ کہا کہ **ثُمَّ لَايَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ** (4:65) پھر ان کی کیفیت یہ ہو کہ جو فیصلہ تُو دے' یہی نہیں کہ اس فیصلے کے سامنے طوعاً و کرہاً سر تسلیم خم کردیا جائے' جیسے کہ عدالت کے سامنے کرنا ہوتا ہے' اگر آپ وہ فیصلہ نہیں مانتے ہیں تو اس کی سزا اور ملتی ہے' نہیں اس طرح سے نہیں ماننا' بلکہ اس طرح کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی تمہارے فیصلے کے خلاف ذرا سی بھی کبیدگی پیدا نہ ہو۔ ایمان کی یہ شرط ہے۔ فیصلہ رسول اللہؐ سے آ کے لیں اور اس فیصلے کے خلاف دل کے اندر بھی کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہ ہو۔ **وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** (4:65) یوں اس فیصلے کو تسلیم کریں ۔ اگر یہ نہیں ہے تو **فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (4:65) تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ اگر ان کی یہ کیفیت نہیں ہے تو انہیں مومن نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن تو مومنین کی یہ شرط بتاتا ہے۔ اگر یہ کہنا ہو کہ صاحب! مومنین میں سے جو تیرا اتباع کریں تو انہیں یہ کہو تو گویا مان لیا کہ ایسے مومن تھے' جو مومنین میں سے شامل تھے لیکن رسول اللہ کا اتباع نہیں کیا کرتے تھے۔ کیا بات ہے ان مومنین کی!! یاللعجب

میں اسمیں زیادہ تفصیل سے نہیں جانا چاہتا' اس لیے کہ میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ اپنے درس میں فرقہ وارانہ چیزیں نہ آنے پائیں ورنہ انہی چیزوں کے غلط مفہوم کے لینے سے ایسا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ کے بتایا جاتا ہے کہ نگاہیں جھک جاتی ہیں کہ کیا یہ رسول' یہ خدا کا آخری نبی' جس کے بعد کوئی نبی نہیں آنا' تئیس سال کی اس کی جدوجہد اور اس کا ماحصل جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ پانچ آدمی سارے تھے جو مومن تھے؟ اب سوچ لیجیے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ (معاذ اللہ) جوش[1] نے' اس دریدہ[2] دہن نے' یہ کہدیا:

جس خدا کی ضربِ آخر بھی الٹ کر رہ گئی

یہ وہ مومنین ہیں جن کے متعلق' جن کی ستائش میں' جن کی تحسین میں قرآن کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابہ کرام کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! ان مومنین کی تائید و نصرت کے لیے تو یہاں تک کہا ہے کہ **وَ اِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ** (8:62) یہ مخالفین اگر تمہیں میدانِ جنگ میں دھوکا دیں' **فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ** (8:62) تو تم غم نہ کرو' خدا تیرے لیے کافی ہے۔ **هُوَ**

---

[1] جوش ملیح آبادی (1898-1982)۔ ان کا نام شبیر حسین خان تھا۔

[2] دریدہ دہن۔ گستاخ بدزبان۔

الَّذِیٓ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ (8:62) وہ خدا جس نے تمہیں اپنی نصرت دی' اور اس جماعتِ مومنین کے ذریعے اس قدر سامانِ تقویت بہم پہنچایا۔ خدا کی نصرت تو کافی ہے جسے وہ کہہ دے کہ ہم تمہیں اپنی نصرت' اپنی تائید' اپنی مدد دیتے ہیں تو پھر اور کیا چاہیے۔ یہاں کہا ہے کہ **ھُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (8:62) خدا اپنی نصرت اور ان مومنین کی نصرت سے تمہارے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ ہے مقام ان کا جو ساتھی تھے۔ اپنی نصرت اور مومنین کی نصرت بلکہ دو ہی آیات اور آگے کہا کہ **یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰہُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ** (8:64) اے نبی! تیرے لیے خدا کافی ہے' نہیں بلکہ کہا کہ خدا اور مومنین یہ دو مل کر تیرے لیے کافی ہیں۔ یہ تھا مومنین کا مقام۔ خدا جن کی شہادت دے رہا ہے کہ اکیلا خدا تیرے لیے کافی نہیں ہے خدا اور یہ جماعتِ مومنین مل کے یہ تمہارے لیے دونوں کافی ہونگے اور ان کی نصرت سے تمہیں یہ کامیابی حاصل ہوگی اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں قرآنِ کریم نے کتنی جامعیت سے کہا ہے کہ وہ اس پوری کی پوری جماعت پر محیط ہوگئے۔ قرآن کے یہ الفاظ اسی سورۃ کی 74 ویں آیت کے ہیں کہ **وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (8:74) دو ہی جماعتیں تھیں: ایک مہاجر جو مکے سے گئے تھے اور ایک مدینے والے جنہوں نے ان مہاجرین کی مدد کی تھی جنہیں انصار کہتے تھے' ان کو ملا لیا جائے تو یہ جماعتِ مومنین بن جاتی ہے۔ سب ہجرت کرنے والے اور تمام یہ نصرت دینے والے انصار جنہیں کہا جاتا ہے ان کے لیے کہا کہ **وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (8:74) یہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور پھر اللہ کے راستے میں جہاد کیا' ایک یہ اور دوسرا یہ کہ **وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا** (8:74) یہ لوگ جنہوں نے ان مہاجرین کی مدد کی' جو انصار کہلائے۔ تو دونوں گروہ ہوگئے۔ اس دور کی پوری کی پوری جماعتِ مومنین میں یہ دونوں مہاجر اور انصار آ گئے۔ یہ کیا ہیں؟ ان کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا کہ **ھُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا** (8:74) یہ سب پکے اور سچے مومن ہیں۔ مومنِ حقا کہہ کر قرآن شہادت دے رہا ہے کہ **لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ** (8:74) ان کی مغفرت ہوچکی ہے' خدا کے ہاں ان کے لیے نہایت باعزت رزق ہے۔ یہ تو وہ ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ جی ٹھیک ہے جنہوں نے پہلے ہجرت کرلی اور جنہو ں نے بعد میں ہجرت کی ان کا کیا ہے؟ ان کے متعلق کہا کہ **وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ ھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا مَعَکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ مِنۡکُمۡ** (8:75) اور بعد میں بھی جنہوں نے ہجرت کی ہے تمہارے ساتھ یہاں آ کے ملے ہیں وہ بھی تم میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ہمارا یہی وعدہ ہے۔ اب کون باقی رہ جاتا ہے؟ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ تاریخ کی رو سے ہم فہرستیں مرتب کرتے پھریں۔ ایمان ہمارا یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے ساتھ جتنے ساتھی تھے' اس جماعتِ مومنین میں جسے قرآن نے امتِ مسلمہ کہا ہے' قرآن نے امۃ وسطاً کہا ہے' یہ پوری کی پوری امت ہیں' جن کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے: مہاجر انصار' پہلے ہجرت

کرنے والے' بعد میں ہجرت کرنے والے' سارے کے سارے اس میں شامل ہیں اور انہی کے متعلق آگے کہا کہ **وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ** (9:100) مہاجر' انصار جنہوں نے اس بات میں پہل کی' اس بات میں سبقت کی اور دوسری بات یہ کہ **وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ** (9:100) اور پھر جو ان کے بعد بھی مخلصانہ طور پر ان کے ساتھ آکے ملے۔ یہ سارے آگئے۔ ان کے لیے کہا کہ **رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** (9:100) اللہ ان سے راضی ہو گیا' یہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یعنی سب کے متعلق یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ **وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا** (9:100) ان کے لیے وہ جنتوں کا وعدہ کیا گیا ہے جو اس طرح سے دائمی جنتیں ہیں۔ **ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** (9:100) یہ بہت بڑی Achievement (فوز) ہے جسکو خدا دے۔ یعنی اس میں جتنے بھی گروہ ہیں' سارے آ رہے ہیں: مہاجر' انصار' بعد میں ہجرت کرنے والے' بعد میں آ کے ملنے والے' سب کے ساتھ' رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ہے۔ ان میں کسی طرح سے اب خود استثنا کرنا کہ جی' یہ ان میں سے مومن تھے اور یہ مومن نہیں تھے' ہمیں کیا حق پہنچتا ہے۔ یہ تو خدا کے خلاف چیلنج ہے کہ تم کہتے ہو کہ مہاجر انصار پہلے دوسرے سارے کے سارے مومن حقا تھے' اللہ ان سے راضی ہو گیا' ان کے لیے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور ہم یہاں بیٹھیں کہ نہیں نہیں اللہ میاں کو (معاذ اللہ) غلطی لگی' ان کو اس فہرست سے نکالو' خوامخوہ تمہاری جنت کو خراب کر دیں گے۔ کیا کہہ رہے ہیں؟ مگر چلی آ رہی ہے امت یہ کچھ کرتی ہوئی۔ اور پھر سورۃ فتح کی وہ آیت ہے' اسمیں تو ایسا نظر آتا ہے جیسے جھوم جھوم کے کہنے کے لیے اللہ کے فرشتے یہ کہہ رہے ہیں کہ **مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ** [1] (48:29) ۔ محمد رسول اللہؐ والذین معہٗ بات ختم ہو گئی۔ محمد اللہ کا رسول اور اس کے جتنے بھی ساتھی ہیں قرآن ان کے متعلق یہ کچھ بتا رہا ہے۔

---

[1] اور یہ ہو گا محمدؐ رسول اللہ اور اس کے رفقاءِ کار کی جماعت کے ہاتھوں۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم اور ہمدرد (5:54) تو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے جھک جاتے ہیں' اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ قانونِ خداوندی کے مطابق' سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت' صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے۔ اس سے انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے' اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1202 تا 1203)۔

ہماری تاریخ ہی تو قرآنِ حکیم کی بڑی حد تک نقیض ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ہم آج بیٹھے ہوئے یہ فہرست بنائیں' ہم تو اس میں ایک کا بھی استثنا نہیں کر سکتے۔ جن کے متعلق بھی یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ تھے وہ سارے کے سارے قرآن کی شہادت کی رو سے مومنِ حقہ تھے' رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ہیں۔ جنتوں کا ان کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد جناب ہم تاریخیں پھیلانی شروع کر دیتے ہیں' تاریخوں نے ہی تو اس قوم اور اسلام کو تباہ کیا ہے۔ اس تاریخ کی حیثیت کیا ہے' جو دو سو اڑھائی سو سال بعد' زبانی روایتوں کو جمع کر کے' واقعات کو جمع کر کے لکھی گئی؟ آپ آج اورنگزیب (1618-1707) کے زمانے کی تاریخ زبانی لکھنی شروع کیجیے پھر دیکھیے کہ وہ کیا ہوتی ہے۔

صحابہ کرام کا تذکرہ تاریخ کے آئینہ میں

ہمارے ہاں پہلے سے کوئی تحریر تو نہیں تھی۔ آپ کے ہاں وہ تاریخ مرتب ہوئی جس میں مومنوں کو گروہ در گروہ الگ کیا جاتا ہے' ایک دوسرے کے خلاف جنگیں ہو رہی ہیں' لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر کسی ایک مومن نے دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دیا تو سیدھا جہنم میں جائے گا۔ یہاں بتایا یہ جاتا ہے کہ سارے مومن جتنے بھی تھے' آدھے ایک طرف حضرت علیؓ ❶ کی طرف ہو گئے تھے' اور آدھے حضرت معاویہؓ ❷ کی طرف تھے یا حضرت عائشہؓ کی طرف تھے' یہ سارے مومن ہیں' جو محمد رسول اللہؐ کے ساتھی تھے۔ ایک جنگ میں کہتے ہیں دس ہزار قتل ہوئے اور دوسری میں ستر ہزار قتل ہوئے۔ ایک مومن کو عمداً قتل کرنے والا قرآن کہتا ہے جہنم میں چلا جائے گا۔ یہاں آپ کی تاریخ یہ بتا رہی ہے۔ یہ تاریخ بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ کیا یہ تاریخ قابلِ اعتماد ہے؟ کیا ہے یہ تاریخ؟ دو اڑھائی سو سال کے بعد طبرستان سے اٹھ کر ایک شخص چلا آتا ہے اور آپ کی تاریخ مرتب کر دیتا ہے۔ یہاں سے آپ نکلتے ہیں کہ صاحب! قرآن سے دیکھیں تو قرآن کی تفسیر بھی لکھ دیتے ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری چلی آ رہی ہے اور اس قوم کی عجیب چیز ہے' طبری ❸ سنیوں کا امام ہے اور یہ شیعہ تھا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے فرقوں سے امتیاز نہیں

---

❶ حضرت علیؓ لقب ابوتراب بن ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف' پیدائش سالِ فیل 570ء کے 30 سال بعد۔ دورِ خلافت (656-661AD)

❷ حضرت معاویہؓ بن ابوسفیان بن حرب۔ دورِ خلافت (661-680AD) امیر معاویہؓ کا نام عتبہ بن ربیعہ تھا۔

❸ ابن جریر طبری (224-310ھ) امام طبری کے ان مکمل کوائف و تشریحات کے لیے ملاحظہ کیجیے: حضرت علامہ تمنا عمادی اور دیگر علمائے کرام: امام زہری (حدیث و سیرت کے مدونِ اول) اور امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدوّن اول)' الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' کراچی' (مکان نمبر 3-7' اے بلاک نمبر 1' ناظم آباد' کراچی 74600)۔

ہے لیکن یہ جو بات نظر آ رہی ہے یعنی یہ اس تاریخ میں یہ چیزیں ہیں جو آپ کو نظر آ رہی ہیں: یہ بھی مومن نہیں رہا' یہ بھی مومن نہیں رہا' چھانٹ چھانٹ کر بتا رہے ہیں۔قرآن کی یہ جو ساری آیات ہیں' کوئی منسوخ ہیں' کوئی متروک ہیں' کوئی محرف ہیں' قرآن کے متعلق یہ عقیدہ ان لوگوں کا تو ہے۔

عزیزانِ من! میں بات لمبی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ لوگ' جن کو وارننگ دے رہے ہو' اگر یہ ایمان لائیں اور اس کے بعد تمہارا اتباع کریں تو ان پہ جو تباہی آنے والی تھی وہ اس طرح سے ٹل سکتی ہے۔کہا کہ **فَاِنْ عَصَوْکَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ** (26:216) اس کے باوجود اگر پھر بھی یہ لوگ سرکشی برتیں' تیری یہ بات نہ مانیں' تو پھر ان سے کہو کہ بھئی! جو کچھ تم کرتے ہو' تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا' میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ میں نے اپنا فریضہ ادا کر دیا' تمہیں وارننگ دیدی ہے' سمجھا دیا ہے' اگر تم اس کے باوجود سرکشی اختیار کرتے ہو تو پھر تم بھگتو۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوگی' میں نے تم تک خدا کی بات پہنچا دی۔

حضور ﷺ کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد

حضور ﷺ کے متعلق کہا کہ آپؐ اس بات سے ذرا خائف نہ ہوں کہ یہ اتنی بڑی مخالفت کا ہجوم ہے' پوری کی پوری قوم اس طرح سے مخالفت پہ اتری ہوئی ہے' اس کے مقابلے میں ایک تو یہ ہے کہ یہ تعداد کے اعتبار سے اس زمانے میں اتنے تھوڑے تھے اور پھر یہ کہ بے ساز و ویراق پناہ گزیں تھے' جیسا کہ ہم آج کی اصطلاح میں کہتے ہیں' وہ اس حیثیت سے مدینے میں ہیں۔ مدینے کے جو مومن بھی تھے' وہ بھی وہاں کچھ ایسی پوزیشن نہیں رکھتے تھے کہ ان کی مملکت ہو یا ان کے پاس فوجیں ہوں۔ یہ کیفیت تھی تو کہا کہ اس سے گھبراؤ نہیں بلکہ **وَتَوَکَّلْ عَلَی الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ** (26:217)۔وہی الفاظ ہیں' جو پہلے انبیاء کے ساتھ آئے ہیں۔ ''کوئی بات نہیں' بھروسہ کرو خدا کے قانون کے اوپر' وہ کہ جس میں قوت اور غلبہ بھی ہے اور اس کا غلبہ محکوموں اور مظلوموں کے لیے خون چوسنے اور ہڈیاں توڑنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ان کے لیے رحمت کا باعث ہے۔ یہ ہے وہ خدا کا نظام اور قانون''۔اس پہ بھروسہ رکھو۔اپنے پروگرام میں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ **الَّذِیْ یَرٰکَ حِیْنَ تَقُوْمُ o وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ** (26:218-19) ہماری نگاہ ہے تمہارے اوپر' ہم دیکھتے ہیں' جب تم اس کام کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہو' ہم دیکھتے ہیں' جو لوگ اس کی اطاعت کے اندر گھلتے چلے جاتے ہیں تم ان کے ساتھ بھی ہوتے ہو' ہم ہر بات کو دیکھتے ہیں' ہماری نگاہوں کے سامنے ہو تم اور تمہارا پورا پروگرام۔ **اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ** (26:220) یہ وہ خدا ہے جو سننے والا بھی ہے اور دیکھنے والا بھی ہے۔

انسان کے بچے اور حیوان کے بچے میں فرق

اب آگے وہ آیات آ گئیں' عزیزانِ من! جن کے متعلق میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ان کی مزید تشریح اور وضاحت بعد میں کروں گا۔ یہ ہیں کہ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ○ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ○ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ○ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (26:221-25)۔ قرآن بات یہ کہہ گیا ہے کہ انسانی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں اور حیوانی بچے میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ انسانی بچے کو بھی پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا' ایک ایم اے' پی ایچ ڈی باپ کا بیٹا بھی اسی طرح سے الف ب سیکھتا ہے' جس طرح سے ایک جاہل کا بیٹا سیکھتا ہے۔ اسے اس باپ کے علم میں سے کوئی حصہ پیدائشی طور پر نہیں ملتا' حیوان کے بچے کو بھی علم نہیں ہوتا۔ حیوان کا بچہ بلکہ انسانی بچے کے اوپر کچھ افضلیت رکھتا ہے۔ وہ جو میں اکثر مثال کے طور پہ بتایا کرتا ہوں کہ ایک مرغی کے نیچے بطخ کے اور مرغی کے انڈے سینے کے لیے رکھ دیجیے۔ اس میں سے جب چوزے نکلیں گے تو بطخ کے بچے تو بھاگتے ہوئے پانی کی طرف چلے جائیں گے' مرغی کے چوزوں کو اگر تم پانی کی طرف لے بھی جاؤ تو وہ بھاگتے ہوئے پیچھے لوٹیں گے۔ انہی مرغی کے چوزوں کو یہ کس نے سکھایا ہے کہ ادھر پانی کی طرف نہ جانا' وہاں سے بچ کے رہنا' حالانکہ انہی کے ساتھی دوسرے انڈوں میں سے نکلے ہیں اسی آشیانے کے یہ افراد ہیں' وہ اُدھر پانی کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں' یہ واپس چلے آ رہے ہیں۔ کس نے ان کو یہ سکھایا ہے؟ اور یہ حضرتِ انسان کے میاں صاحب ہیں کہ کبھی وہ پانی میں ڈبکیاں لے رہا ہے' کبھی آگ میں ہاتھ ڈال رہا ہے' کبھی مرچیں آنکھوں کو مل رہا ہے اور چیخ رہا ہے۔ جب یہ بچہ گھٹنوں چلتا ہے تو ماں بیچاری کے لیے مصیبت ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگی بھاگی پھرتی ہے: او دیکھنا نھا پانی میں ڈوب گیا' آگ میں ہاتھ ڈال لیا' او دیکھو یہ آنکھوں میں مرچیں لگا لیں' کیا کروں میں' کچھ کھا گیا۔ نکال رہی ہے اس کے منہ سے انگلی ڈال کے۔ کبھی کسی حیوان کا بچہ غلط چیز نہیں کھاتا۔ یہ اسی کا ہے جسے یہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہہ رہا ہے' اسی کا یہ صاحبزادہ ہے جس کی یہ کیفیت ہے۔ دیکھتا ہی نہیں کہ منہ میں کیا ڈال رہا ہوں میں!

میں کہہ یہ رہا تھا کہ علم کے اعتبار سے تو دونوں یکساں ہوتے ہیں لیکن اس اعتبار سے حیوان کا بچہ اس سے کچھ افضلیت رکھتا ہے۔ ان چیزوں کو Instinct (جبلت) کہتے ہیں' جبلی طور پہ یہ چیزیں حیوانات کے اندر ہوتی ہیں' اسے علم نہیں کہا جاتا بلکہ فطرت نے اس کے اندر یہ انتظام کر رکھا ہے۔

انسانی بچے کو علم حاصل کرنے کی نعمت سے نوازا گیا ہے

آگے ہم آتے ہیں جہاں انسان کے بچے کی افضلیت شروع ہوتی ہے' اسے علم حاصل کرنے کی استعداد دی۔ کہا کہ **عَلَّمَهُ الْبَيَانَ** ❶ (55:4) اظہارِ خیال یعنی قوتِ گویائی کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا۔ ایسا ہے جیسے خدا خود اسے بٹھا کے دیتا ہے۔ علمہ البیان بھی ہے اور **عَلَّمَ بِالْقَلَمِ** (96:4) بھی ہے۔ جیسے اس کو تختی دے کے اللہ میاں بیٹھے سکھا رہے ہیں۔ انداز یہ ہے کہ ہم نے انسان کے اندر اس قسم کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ جو اس صلاحیت سے کام لے گا' اسے علم حاصل ہوتا چلا جائے گا۔ تقریر و تحریر کی بنیاد یہی ہے اور قرآن نے دونوں کو ''بیان'' بھی کہا ہے اور ''بالقلم'' بھی کہا ہے بلکہ ایک جگہ تو **نٓ وَالْقَلَمِ** ❷ (68:1) بھی کہا ہے۔ قلم دوات دونوں چیزیں آجاتی ہیں۔ تو جو ذرائع علم ہیں' ان کا ذکر کر کے کہا کہ یہ وہ کچھ سیکھ سکتا ہے جس کا پہلے اس کو بالکل علم نہیں ہے۔ یہ علم کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ یہی بات تو ہم شروع کریں گے کہ صاحب! تعلیم سے' تدریس سے۔ تعلیم کیا چیز ہوتی ہے؟ کتاب میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ کتاب میں کیسے لکھا ہوتا ہے؟ اصل چیز یہ ہے کہ یہ زندگی کے مشاہدات' مطالعہ' تجربہ' یہ ساری چیزیں ہیں' جس سے علم حاصل ہوتا ہے اور سب سے بڑی چیز جو حیوانات کو نہیں دی گئی ہے' وہ تاریخ ہے یعنی انسان کی ایک نسل اپنے حاصل کردہ علم کو آگے منتقل کر دیتی ہے' جہاں اُن کا اختتام ہوتا ہے یہاں سے اس اگلی نسل کی ابتدا ہوتی ہے اور اس طرح ہر Generation (نسل) آگے بڑھتی جاتی ہے۔ پچھلا علم Snowball (برف گولے) کی طرح اپنے ساتھ لیتے ہوئے آگے چلی جاتی ہے اور علم بڑھتا چلا جاتا ہے۔ علم کی سطح بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو انسان کو حاصل ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ ابھی تو یہ چاند مریخ تک پہنچا ہے۔

انسانی علم کا تمام تر دارومدار حواس خمسہ کا رہین منت ہے

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ انسان **سماوات و الارض** سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جسے ہر انسان' ہر شخص حاصل کر سکتا ہے' اس میں کفر اور ایمان کی کوئی شرط نہیں ہے' جو کوشش اور محنت کرے اس طریقے سے حاصل کرنا چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ علم حاصل کیسے ہوتا ہے؟ بنیادی طور پہ یہ بات صحیح ہے کہ انسان اپنے حواسِ خمسہ (Five Senses) یعنی دیکھنا' سننا' چکھنا'

---

❶ اسے اظہارِ خیالات (قوتِ گویائی) عطا کی۔

❷ ان نکات کی تشریح کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان' پارہ 29 مکمل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص۔ 97 تا 113 (پانچواں باب)

سونگھنا' چھونا یہ پانچ حواس کہے جاتے ہیں۔ یہ جو Five Senses (حواسہ خمسہ) ہیں' ان کے ذریعے سے' اسے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے وہاں سے ایک آواز آتی ہے' ہماری طرف ایک انفرمیشن ہے جو کان تک پہنچتی ہے۔ آگے یہ بات ہے کہ ہمارے اندر ایک قوت ہے جو کچھ فیصلہ کرتی ہے کہ یہ آواز کس چیز کی ہو سکتی ہے۔ قرآن نے ان چیزوں کے لیے تین ہی الفاظ کہے ہیں اور وہ جامع (Comprehensive) ہیں: سمع' بصر اور فواد۔ **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ** (17:36) جس بات کا علم نہ ہوا کرے اس کے پیچھے یونہی نہ لگ جایا کرو۔ **اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا** (17:36) علم کی جو بات بھی تم کہو گے ہم پوچھیں گے کہ تمہاری سماعت' تمہاری بصارت' تمہارا فواد' اس کی شہادت دیتا ہے' اگر نہیں دیتا تو تم اسے علم نہیں کہہ سکتے۔ عدالت میں بھی اگر آپ جا کر گواہی دینا چاہیں اور یہ کہیں کہ صاحب! یہ واقعہ میرے سامنے تو نہیں ہوا میں نے فلاں شخص سے سنا تو آپ کی وہ گواہی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔

دل و دماغ کے ذریعے فیصلہ کرنے والی قوت کو قرآنِ حکیم فواد سے تعبیر کرتا ہے

وہ کہتے ہیں کہ یہ علم نہیں ہے۔ علم وہ ہے جو Sense Perception (حسی ادراک) سے حاصل ہو یعنی حواس کے ذریعے معلومات اکٹھی کرنا اور وہ جو اندر قوتِ فیصلہ ہے' ابھی تک سائنسدان اس کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ کونسی قوت ہے' وہ دماغ ہے یا دل ہے یا کچھ اور ہے' جو بھی ہے' قرآن نے اسے فواد کہہ کر یا قلب کہہ کر پکارا ہے' اس سے فیصلہ لینا' یہ علم ہے۔ بہر حال یہ تین چیزیں ہیں' ان سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اسے علم بالحواس (Perceptual Knowledge)' علم بالادراک' ادراک کے طور پہ علم کہتے ہیں یا یہ وہ علم ہے جسے Conceptual Knowledge (تصورات کا علم) کہتے ہیں لیکن اس کے ذرائع یہی ہیں اور یہ پھر یاد رکھیے کہ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے جس کا جی چاہے اس کو حاصل کر سکتا ہے۔

حواسِ خمسہ کے تحت حاصل کردہ علم کے علاوہ ایک اور خاص علم بھی ہے

اس کے برعکس ایک علم اور ہے جس میں نہ انسان کی کسی حس (Senses) کا دخل ہوتا ہے' نہ خیال کا دخل ہوتا ہے' اور نہ فکر کا دخل ہوتا ہے' نہ وہ فیصلہ کرنے والی قوت کا دخل ہوتا ہے' ان چیزوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** ❶ (53:3) ہے۔ یہ علم خدا کی طرف سے اس کی برگزیدہ شخصیت کو براہِ راست ملتا تھا اور اسی لیے اس کے لیے قرآن نے ''نزول'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نزول کے معنی ہیں'' Objectively یعنی کسی چیز کا خارج سے اندر آنا''۔ یہ ایک علم ہے جو نہ کوشش سے

---

❶ وہ جو کچھ تم سے بہ حیثیت رسول کہتا ہے' اپنی طرف سے نہیں کہتا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1238)۔

حاصل ہوسکتا تھا' نہ کاوش سے' نہ مطالعہ سے' نہ مشاہدہ سے' نہ تجربہ سے' نہ Sense Percepection (ادراک کی حس) کی رو سے' قطعاً نہیں۔ اس علم کی ایک الگ نوع تھی اور اسے وحی کہتے ہیں' اور یہ صرف انبیائے کرام کو ملتا تھا' غیرِ نبی کو وحی نہیں ملتی تھی۔ نبی کے سوا کسی کو بھی وحی نہیں ملتی۔ یعنی یوں کہیے کہ اس قسم کا علم خدا کی طرف سے کسی بھی غیر نبی کو نہیں ملتا۔ وہ علم کہ جس میں انسان کی اپنی سعی و کاوش' خیالات وفکر کا دخل نہ ہو' خدا کی طرف سے بیٹھے بٹھائے کسی طرح مل جائے' یہ نبی کے سوا کسی کو نہیں مل سکتا۔ نبوت نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوئی لہٰذا یہ ذریعہ علم اس کے بعد ختم ہو گیا۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ وحی کے ذریعے ملا تھا اسے ابدی طور پہ قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا تو وہ جو براہِ راست ملا ہوا علم تھا' وہ تو قرآن میں آ گیا اور اس طرح علم ملنے کا جو یہ طریقہ تھا اس کو ختم کر دیا۔

عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کا انجام جہنم ہے

اب ختمِ نبوت کے بعد کونسا علم رہ گیا؟ صرف وہ جو خدا کی طرف سے دیا ہوا علم قرآن میں ہے اور انسانی حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم جو عقل وفکر اور کاوش و دانش پر مبنی ہے۔ اس کے لیے قرآن نے خود بار بار کہا ہے کہ یہ علم بھی جو خدا نے تمہیں قرآن میں دیا ہے' اس کو عقل اور فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو قرآن کو سمجھنے میں یا ویسے بھی عقل وفکر سے کام نہیں لیتے قرآن انہیں اہلِ جہنم کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَ لَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ** (7:179) یہ مخلوق جو پھر رہی ہے' دیہاتی ہوں یا شہری ہوں' ان کی اکثریت کو تم دیکھو گے تو نظر آ جائے گا کہ یہ جہنمی ہیں' پھر رہے ہیں۔ ارے کیسے پتہ چل گیا کہ یہ جہنمی ہیں؟ کہنے لگے' بات صاف ہے کہ **لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا** (7:179) ہم نے سینے میں ان کے دل دیا کہ اس سے سمجھنے کا کام لیں لیکن سمجھنے کا کام ہی نہیں لیتے **وَ لَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا** (7:179) آنکھیں رکھتے ہیں لیکن دیکھنے کا کام ہی نہیں لیتے۔ **وَ لَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا** (7:179) ان کے کان تو ہیں لیکن سننے کا کام ہی نہیں لیتے۔ **اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ** (7:179) یہ تو انسان نہیں حیوان ہیں' **بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ** (7:179) نہیں' بلکہ انسانوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہ ہیں اہلِ جہنم۔ یہ جو حواس ہیں' جن کے ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے' یہ لوگ انہیں استعمال نہیں کرتے اور اس لیے علم حاصل نہیں کرتے' انہیں اہلِ جہنم کہا ہے اور کہا ہے کہ یہ حیوانات سے بھی بدتر ہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد دو ہی چیزیں انسانیت کے لیے باقی رہ گئیں: وحی کا علم جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد کسی کو یہ علم قرآن کے علاوہ کہیں سے نہیں مل سکتا اور دوسرا علم جو ان ذرائع سے حاصل ہوتا ہے جسے ہم نے Perceptual Knowledge (علم بالحواس) کہا ہے' حواس کے ذریعے سے' فکر کے

ذریعے سے۔اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم نہیں ہے۔

علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں انسان کے مختلف دعوے اور پھر نبی کے متعلق ان کے تصورات

انسانوں نے کچھ عجیب عجیب دعوے کیے۔ یہودیوں کے مندروں میں اور عیسائیوں کی خانقاہوں میں قسمتیں بتانے والے' کاہن ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چیزیں' اس طرح سے' تعلیم کے ذریعے سے' سکھانے سے' سیکھنے سے' نہیں آتیں بلکہ خدا کی طرف سے ہمیں ملتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے' جو وحی نے کی تھی۔ ہم اس سے قسمتوں کا حال بتاتے ہیں۔قسمتیں تو بیچاری یہ عورتیں پوچھنے جاتی ہیں جن کی قسمت ہی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔کیا موضوع سامنے آ گیا ہے' کیا کہوں کہ زخموں کو چھیڑنے سے بھی پھر وہ مندمل نہیں ہوا کرتے۔ پتہ نہیں ان کے ساتھ شروع سے ہی ایسا کیوں ہوا ہے' کہ وہ آدمی کی پسلی سے نکلی' پھر اس نے پسلی کی' سلائی نہیں کی۔

قسمتیں بتانے والوں کا بھی دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں خدا کی طرف سے یہ علم ملتا ہے۔دوسرے ان کے ہاں ساحر ہوتے تھے: جادو کرنے والے۔ جادو کا علم بھی یہ تھا کہ وہ کتابوں میں پڑھنے سے نہیں آتا تھا' وہ اسی طرح سے حاصل ہوتا تھا اور تیسرے ان کے ہاں شاعر ہوتے تھے' ان کا بھی یہ دعویٰ ہوتا تھا بلکہ وہ تو شروع سے یونان کی وہ جو دیوی تھی' اس سے تعلق تھا۔اور پھر ایران میں جب یہ چیز آئی تو جسے سروش کہا جاتا ہے' یہ نوائے سروش بنی:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غیب سے یہ خیال آتے ہیں۔ یہ تھے گروہ جو اس زمانے میں تھے جن کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ انہیں خدا کی طرف سے یا غیب سے براہِ راست علم ملتا ہے۔جب رسول اللہؐ نے یہ دعویٰ کیا کہ مجھے خدا کیطرف سے براہِ راست علم ملتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے یہ کاہن ہوگا' کیونکہ کاہنوں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ انہیں علم ملتا ہے۔کسی نے کہا کہ نہیں' وہ صرف قسمت ہی بتاتے ہیں یہ تو کچھ یوں بھی کر کے دکھا دینے والا ہے' یہ ساحر ہوگا۔کسی نے کہا کہ اس کا جو کلام ہے' اس کو دیکھیے' یہ شاعر ہوگا حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ نظم نہیں ہے۔

وحی کی زبان منفرد انداز کی حامل ہے

یہ جو وحی کی زبان ہے' یہ عجیب بات ہے' آپ سن کر حیران ہونگے کہ یہ زبان بھی منفرد ہوتی ہے' یہ نہ نثر ہوتی ہے' نہ نظم ہوتی

ہے' اس زبان کی نقل بھی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ شاعر ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ تم کیا کہتے ہو جن کا تم نام لیتے ہو؟ کیا ان کی طرف جو تم کہتے ہو غیب کا علم ہے؟ اب یہاں بات آ گئی کہ **وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ o وَمَا يَنْبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ** (26:210-211)۔ یہ اس قسم کے مدعی ہیں کہ ہمیں علم ہوتا ہے۔ اس کے لیے لفظ شیاطین آیا ہے کہ یہ تو ان کو شیاطین کی طرف سے علم ملتا ہے تو اب یوں نظر آ گیا کہ خدا نے خود ایک اور Source of Knowledge (ذریعہ علم) بتا دیا' ایک تو خدا ہوا' جو وحی دیتا ہے اور ایک شیطان ہوتا ہے' جو ان کو دیتا ہے۔

لفظ شیطان اور ابلیس کا قرآنی مفہوم

شیطان کے متعلق ہم نے یہ مفہوم لیا کہ کوئی ایک ہے اور وہ یہ کچھ کرتا پھرتا ہے۔ وہ ایک نہیں ہے وہ ہر انسان کا شیطان ہے۔ شیطان کے معنی ہیں ''انسان کے وہ جذبات جو اس کی عقل او روحی کے تابع نہ رہیں: بیباک جذبات' بھڑک اٹھنے والے''۔ ہر انسان کا اپنا اپنا شیطان ہوتا ہے۔ اپنا اپنا ہوتا کیا ہے وہ خود ہی اپنے اندر ایک انداز سے سوچتا اور کام کرتا ہے' یہ شیطان ہوتا ہے۔ وہ خود ہی ہوتا ہے لیکن اس کا سب سے بڑا فریبِ نفس یہ ہے کہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لیتا:

کارِ بد تو خود کرے' لعنت کرے شیطان پر

''جے اے اک واری وی اے کہہ لوے نا کہ میرے تے ہزار لعنت' میں کی کر بیٹھا آں' تے اگلی واری نہ کرے فیر۔ کردا آپ اے تے کیندا اے شیطان نے کرایا: دیکھو جی' کی کردا پھردا اے' میرے نال او کردا اے''[1]۔ اور جب یہ غلط کام کر چکتا ہے' الزام خواہ دوسرے کو دیدے' اس کے بعد اس کے اوپر ایک قسم کی افسردگی چھا جاتی ہے' اس کے بعد وہ اس کام پر Regret (نادم) ہوتا ہے' اس کے اوپر مایوسی چھا جاتی ہے۔ عربی زبان میں اسے ابلیس کہتے ہیں۔ قرآن نے اسی لیے شیطان اور ابلیس دو الگ الگ نہیں کہے بلکہ انہیں ایک ہی سکے کے دو رخ (Two aspects of the same coin) بتایا ہے' کبھی اسے شیطان کہتا ہے' کبھی اسے ابلیس کہتا ہے۔ جب ابتدا ہوتی ہے' تو وہ بھڑکتا ہے' اسے غصہ آتا ہے۔ یہ شیطنت ہے۔ غصہ فرو ہونے کے بعد' جب پھر افسردگی چھا جاتی ہے' افسوس ہوتا ہے' مایوسی ہوتی ہے۔ یہ ابلیسیت ہے۔ یہ آپ خود ہی ہوتا ہے۔ یہ جو اس قسم کے خیالات ہیں ان کا نام شیطان ہے' بات اب سمجھ میں آئی۔ یہ کہا کہ جن کو تم ساحر کہتے ہو' کاہن کہتے ہو' شاعر کہتے ہو اور کہتے ہو کہ انہیں اس

---

[1] اگر یہ ایک دفعہ بھی یہ کہہ دے کہ مجھ پر ہزار لعنت' یہ میں کیا کر بیٹھا تو پھر وہ اگلی بار یہ نہیں کرے گا۔ کرتا خود ہے اور کہتا یہ ہے کہ یہ شیطان نے کرایا ہے: ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ یہ کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے! میرے ساتھ یہ کر رہا ہے۔

قسم کا کوئی علم ملتا ہے ۔سنو' یہ کہیں سے علم نہیں ملتا ہے' یہ ان کے اپنے ہی خیالات ہیں' جو اس طرح سے علم بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ عجیب چیز کہہ گیا ہے' قرآن' عزیزانِ من! چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہی کہ انسان کے اپنے ہی یہ غلط خیالات ہیں' جو اس کو فریب دیدیتے ہیں کہ تمہیں یہ خدا کی طرف سے علم ملتا ہے' یہ وحی ملتی ہے ۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صرف اپنے ہی غلط خیالات ہیں ۔ آج اس دور میں آ کر ہمارے ہاں Psychology (علم نفسیات) نے یہ بات ثابت کی ہے کہ انسان اگر خاص طریق سے قوتِ ارادی کو مرتکز کر دے' Crystalize (ارتکاز) کرنا شروع کر دے' تو اس سے اس کے خیالات کے اندر عجیب عجیب قسم کی قوتیں' پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ مجھ پہ وحی ہو رہی ہے ۔ یہ جتنے پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے ہیں' وہ سارے اس فریبِ نفس میں مبتلا ہوتے ہیں ۔

علامہ اقبالؒ کا مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق تجزیہ

یہی بات تھی جو علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کے متعلق کہی تھی کہ ابھی تو میرے دور میں نہیں ہیں' شاید بعد میں کوئی ایسے Psycho Analysts (تحلیل نفسی تجزیہ نگار) آ جائیں' جو اس کا نفسیاتی تجزیہ کریں' تو وہ بتا سکیں گے کہ Psychologically (نفسیاتی طور پر) یہ کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے ۔ کیا بات ہے قرآن کی' صاحب! کہ اس نے ان کے وجود سے انکار نہیں کیا۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے' یہ ہیں' یہ کچھ کرتے ہیں' لیکن یہ وحی نہیں ہے ۔ وحی حقائق سے گفتگو کرتی ہے' Realities (حقائق) کے متعلق علم دیتی ہے' جبکہ یہ سب لطائف کے متعلق گفتگو کرتے ہیں' ان کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اور یہ وجہ ہے کہ انہوں نے حضورؐ کے متعلق یہ کچھ کہا۔ قرآنِ کریم نے بار بار اس کی تردید کی ہے کہ حضورؐ نہ کاہن ہیں' نہ ساحر ہیں' وہ یہ کہتے تھے کہ کسی نے ان پہ جادو کر دیا ہے' یہ پاگل یا دیوانہ بھی ہو گئے ہیں' مجنون بھی ہیں۔ قرآن نے بیشتر مقامات پر ان تمام کی تردید کی ہے کہ نبی یہ کچھ نہیں ہوتا۔ **فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٌ** (52:29) یہ بات تو ان کے سامنے پیش کیے جا' یہ تیرے متعلق یہ کچھ کہتے ہیں۔ یہ خدا کی نعمت ہے' خدا کی نعمت کی بنا پہ یقین مانو کہ تم نہ کاہن ہو' نہ مجنون ہو۔ **اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ** (52:30) یہ کہتے ہیں کہ تُو شاعر ہے ۔قرآن نے اس کی بھی تردید کی ہے۔

عربوں کے ہاں شاعری کی اہمیت

عربوں کے ہاں شاعر کا بڑا مقام ہوتا تھا' ایک تو وہ اسے مانتے ہی صاحبِ وحی تھے اور پھر عربوں کے شاعر آج بھی ان کے قصیدے پڑھ کے دیکھیے تو اچھے بھلے آدمی کو جنگ کے اوپر آمادہ کر دیتے تھے ۔ ان کی شاعری کا یہ جذبہ جنگ' اتنی تیزی سے

آج بھی بڑی سے بڑی فوج میں پیدا نہیں کیا جا سکتا' جو ان کی ایک نظم پیدا کر دیتی تھی۔ اور پھر وہاں سے جو اپنی پارٹی کو چھوڑ کے غداری کرتا تھا' اس کے متعلق جو یہ چار شعر کہہ دیتے تھے تو سو سال کی نسلیں ان سے منہ چھپاتی پھرتی تھیں۔ یہ شاعر اس زمانے میں بلا تھے لیکن اس کے باوجود شعراء کے متعلق آپ دیکھیے کہ یہ جو عرب تھے تو گو ہم تو اسے زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں ان کی نگاہ کتنی دور تک تھی۔

شاعری کو زمانے کی گردشیں خود ہی مٹا دیتی ہیں

کہتے تھے کہ **اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ** (52:30)۔ شاعر ہے۔ کہہ لینے دو' دو باتیں۔ شاعر کا کیا ہے' زمانے کی گردشیں خود ہی شاعری کو مٹا دیا کرتی ہیں۔ شاعر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی عظمتیں بیان کرتے ہیں اور حقیقت پر نگاہ ایسی کہ شاعری کو ابدیت نصیب نہیں ہوتی۔ کہا کہ اس کے متعلق کچھ فکر نہ کرو' زمانے کی گردشیں شاعری کو مٹا دیا کرتی ہیں' یہ بھی چند دن کی بات ہے' کر لینے دو شاعری' خود بخود مٹ جائے گا۔ ذرا غور کیجیے تو میں اپنے دور کے شاعروں کے اوپر آ ؤنگا' مشاعرے میں نظم پڑھتے ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ انسان ان کے اوپر کھڑا ہو جائے گا' دس دن کے بعد دیکھیے تو کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہاں کوئی شاعر بھی تھا' اس کا کوئی شعر بھی ہے۔ اور ساری تاریخ میں سو سال میں بھی آپ دیکھیے تو دو چار شاعر ایسے ہیں' جن کے کچھ شعر لوگوں کے ذہن میں ہیں' ورنہ سب کے سب آپ دیکھتے ہیں کہ وقتی تماشا' لذت' لطیفہ ہیں۔ وہ عرب جانتے تھے کہ یہ شاعری کوئی بات ہی نہیں ہے' زمانے کی گردش اسے مٹا دے گی۔

رسول ﷺ اکرم کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

قرآن کہتا ہے کہ **قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِیۡنَ** (52:31) ان سے کہہ دو کہ بہت اچھا' جو تم نے کہا تو ذرا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں' **سوف یعلمون** (6:136) نتائج خود بتا دیں گے کہ کون شاعری کرتا تھا۔ قرآن نے یہاں کہا کہ تم نہ کاہن ہو نہ مجنون ہو اور نہ شاعر ہو۔ دوسری جگہ ہے **قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ** (10:2) یہ بھی تمہارے متعلق کہتے تھے کہ ساحر بھی ہے۔ ایک جگہ اور کہا ہے کہ **وَیَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجۡنُوۡنٍ** (37:36) کہتے ہیں کہ کیا ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں ایک شاعر کے کہنے پہ' ایک پاگل کے کہنے پہ؟ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ کیا کچھ کہا کرتے تھے' صرف اس بنا پہ کہ دعویٰ وحی کا تھا۔ وہ اپنے تصور کے مطابق اس سے آگے جا نہیں سکتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی یہی کچھ ہے۔ قرآنِ کریم نے بار بار نبی اکرمؐ کے متعلق کہا کہ یہ نہ شاعر ہے۔ نہ مجنون ہے' شاعری کے متعلق خاص طور پہ

اس نے کہا **وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ** (36:69) ہم نے اس رسول کو شاعری نہیں سکھائی' شاعری رسول کے شایانِ شان ہی نہیں ۔ رسول ایک انقلابی شخصیت ہوتا ہے' انقلابی شخصیت کو شاعری سے کیا واسطہ' وہ تو زندگی کے حقائق بیان کرتا ہے' باطل کے نظام کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح نظام قائم کرتا ہے ۔کبھی کوئی شاعر بھی ایسا کچھ کرسکتا ہے' کر کے دکھایا ہے آج تک کبھی کسی شاعر نے ایسا؟ کتنا بڑا انقلابِ عظیم تھا۔

اس زمانے کی مہذب دنیا میں دو ہی تہذیبیں تھیں: ایران کی تہذیب اور روما کی تہذیب ۔عرب جیسے ایک اتنے سے خطے سے اُٹھے ہوئے ایک شخص نے' چند ہی دنوں کے اندر اندر ہزاروں سال سے متمکن چلی آئی' ان دونوں تہذیبوں کا تختہ الٹ کے رکھ دیا اور اس دنیا کے اندر ایک نئی تہذیب کو متمکن کردیا۔ کیا ایک شاعر یہ کچھ کرسکتا ہے [1]؟

قرآن کی نظر میں شاعروں کی کیفیت

قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے رسول کو شاعری نہیں دی ۔اب یہ جو چیز ہے کہ ایک انقلابی فرد کے یہ شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ شاعری کرے تو سوال یہ ہے کہ شاعروں کی کیفیت کیا ہے؟ سنیئے عزیزانِ من! **وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ٥ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ** (26:224-25) ۔اگر آپ عربی زبان کے یہ الفاظ دیکھیں کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ **یھیمون**. یہ اونٹوں کو ایک بیماری لگ جاتی تھی جسے جھوٹی پیاس کہتے تھے۔ جھوٹی پیاس تو عام بیماری ہوتی ہے کہ پانی پیے جاتا ہے' پیاس بجھتی نہیں' وہ سچی پیاس نہیں ہوتی' جھوٹی پیاس لگی ہوئی ہوتی ہے ۔کہا کہ تم شاعروں کو دیکھتے ہو۔ایک تو یہ کہ یہ نہیں ہے کہ کوئی خاص نصب العین

---

[1] اس پر برفو یہ لکھتا ہے:

The light from which civilization was once more re-kindled did not arise from any embers of Graeco - Roman culture smouldering amid the ruins of Europe, not from the living death on the bosporus.It did not come from the Northern but from the Southern invaders of the empire, from the Saracens. (Briffault, Robert (1928). The Making of Humanity, London: George Allen of Unwin LTD. p.1813).

اردو قارئین کے لیے اس کا رواں ترجمہ کچھ یوں ہے:

وہ روشنی جس سے شمع تہذیب دوبارہ جلائی گئی' یونانی اور رومی ثقافت کی ان چنگاریوں سے نہیں لی گئی جو یورپ کے کھنڈرات میں سلگ رہی تھیں اور نہ ہی باسفورس کے کنارے زندہ موت سے۔ یہ روشنی شمال کی طرف سے نہیں بلکہ جنوبی جانب کے حملہ آوروں سے لی گئی۔ یہ روشنی عرب سے اُٹھی۔

ہے جس کی طرف انہوں نے جانا ہے' کوئی خاص وادی ہے جس میں انہوں نے رہنا ہے' جذبات کی ایک جھوٹی پیاس ہوتی ہے اور ان کو ہر ایک وادی میں سرگرداں لیے لیے پھر رہی ہے۔ ابھی یہ ہجر کے نالے رو رہے ہوتے ہیں اور اگلا ہی شعر غزل میں دیکھیے تو وصال کی لذتوں سے لذت یاب ہو رہے ہیں:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہجر کے نالے' وصال کی لذتیں' کبھی خوشخبریاں' کبھی آسمان پہ چڑھ رہے ہیں کبھی زمین پہ۔ یہ ہے **فِیۡ كُلِّ وَادٍ يَّهِيۡمُوۡنَ** (26:225) جھوٹی پیاس ہے اور انہیں ہر وادی میں لیے لیے پھرتی ہے۔ عزیزانِ من! دو الفاظ میں اس سے بہتر نقشہ کھینچ ہی نہیں سکتے۔ یہ جو باتی سننے والے ہوتے ہیں' نظر آتا ہے کہ صاحب! آپ وعظ کا ڈھنڈورا دیجیے آپ کے ہاں کسی شاعر کے متعلق کوئی اچھا لیکچرار ہو' پھر دیکھیے کہ اس طرح ہزاروں کی تعداد کے اندر سامعین چلے جا رہے ہیں۔ نظر آ رہا ہے کہ صاحب! اس کے Followers (متبعین) تو بہت زیادہ ہیں۔ کہنے لگے کہ **وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ** (26:224) ٹڈی دل ہیں' دیکھنے کو دیکھیے تو پوچھو نہیں کتنے ہیں! جب یہ اٹھ کر چلے جائیں تو کہیں ہریاول کی ذرا سی پتی بھی نظر نہیں آئے گی' چاٹ کے چلے جائیں گے کمبخت۔ خود یہ جھوٹی پیاس کے مارے ہوئے ہیں' ہر وادی کے اندر پھر رہے ہیں' کوئی نہ دین' نہ ایمان' نہ مذہب' کچھ بھی نہیں ہے۔ ساری عمر یہی کچھ کرتے گزر گئی اور یہ فریب ہے کہ صاحب! اتنے لوگ ہیں جوان کے Followers (پیروکار) ہیں۔ کہا کہ شاعروں کی تو یہ کیفیت ہے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ **وَاَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ** (26:226) یہ باتیں ہی باتیں ہیں۔ جو کہتے ہیں کبھی کر کے نہیں دکھاتے۔ کہا کہ یہ کیفیت شاعروں کی ہے۔

ایمان والوں کی معاشرتی زندگی

نبی تو ایک طرف رہا' نبی کے ماننے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ **اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّانْتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا** (26:227) ان ایمان والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے' پھر ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو انسانوں کی صلاحیتیں بیدار کرتا ہے اور پھر خدا کے قوانین کو عام کرتے چلے جاتے ہیں' انہیں ہر وقت سامنے رکھتے ہیں' ان کا چرچا عام کرتے ہیں اور پھر ان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ دو چار جوتے بھی مار دے تو کہا کہ کوئی بات نہیں۔ اگر آپ مشاعرے میں پھر بلا لیں تو ہم بھول جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ اتنی قوت رکھتے ہیں کہ کوئی شخص

بھی جوان کے اوپر ظلم کی نگاہ بھی کرے تو اس کی کلائی مروڑ کے رکھ دیتے ہیں ۔ یہ شاعر تو اس کے خلاف صرف ایک قصیدہ ہی لکھیں گے یا وہ ایک نظم ہی لکھیں گے یہ تو یہیں تک سوچتے ہیں ۔ کہا کہ جماعتِ مومنین کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے اوپر اگر کہیں بھی زیادتی ہوتو وہ زیادتیوں کا یوں بدلہ لیتے ہیں کہ ظالم کی کلائی مروڑ کے رکھ دیتے ہیں ۔ **وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ** (26:227) اور ظلم کرنے والوں کو معلوم ہوجاتا ہے کہ بالآخران کا ٹھکانہ کونسا ہے ۔ کہا کہ کیا شاعر یہ کیا کرتے ہیں؟ اب ہمارے ہاں جوان سے پوچھا جائے کہ صاحب! شاعر ہیں' یہ کچھ آپ کر رہے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ نہیں الا الذین اٰمنوا نہیں' جو مسلمان شاعر ہیں' وہ اس میں داخل نہیں ہیں ۔ یہ سارا کچھ جو غیر مسلم کہہ رہے ہیں' یہ ان کے لیے ہے' مسلمان شاعروں کے لیے نہیں ہے ۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک شاعری کی تعریف

قرآن نے یہ دو الگ نوعیتیں بتائی ہیں' الگ ذہنیتیں (Mentalities) بتائی ہیں ۔ یاد رکھیے! شاعری کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کسی بات کو اگر نظم میں بیان کریں تو وہ شاعری ہوجائے گی' نثر میں لکھیں تو وہ نثر ہوجائے گی ۔ یہ شاعری اور نثر نگاری نہیں ہے ۔ قرآن نے شاعری ایک ذہنیت کو بتایا' اسلوبِ بیان (Style of Expression) کو نہیں بتایا ۔ یعنی اگر آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور وہ نظم میں کہہ دیتے ہیں' تو یہ تو کفر نہیں ہوگیا' اس کی تو قرآن مذمت نہیں کرے گا ۔ وہ ایک ذہنیت بتا رہا ہے کہ دعویٰ ہے وجدان کا' Intuition کا کہ علم براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ جھوٹی پیاس ہے' ہر وادی کے اندر چلے جا رہے ہیں' نہ زندگی کا نصب العین' نہ زاویہ نگاہ' نہ کوئی پختہ پروگرام' ساتھ دینے والے جتنے بھی ہیں وہ ٹڈی دَل کی طرح چر چگ کر اڑ جانے والے ہیں ۔ یہ ایک ذہنیت ہے' قرآن نے جس کی تردید کی ہے ۔ اس کے برعکس جو دوسری ذہنیت ہے کہ خدا کی طرف سے دی ہوئی صداقتوں کے اوپر یقینِ کامل ہو اور پھر خدا کا دیا ہوا اس کا ایک پروگرام ہو' اس پہ عملِ پیہم ہو' جہاں ظلم ہوتا ہے اس کے خلاف شمشیرِ برہنہ ہو اور اس انداز کی شمشیر ہو کہ ظالم کو پتہ چل جائے کہ میرا آخری ٹھکانہ کونسا ہے ۔ یہ دو متضاد ذہن ہیں ۔

حیاتِ انسانی کی حقیقتوں کو نثر (Prose) کے انداز میں ہی بیان کرنا چاہیے

یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اگرچہ جو میں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ اگر ایک سچائی کو شعر میں بیان کر دیا جائے تو وہ چیز مذموم نہیں ہوجاتی لیکن اس کے باوجود میں یہی عرض کرونگا' اور تجربے کی بنا پہ بھی عرض کرونگا کہ سچائیوں کو نثر (Prose) ہی میں بیان کرنا چاہیے' شعر میں نہیں بیان کرنا چاہیے کیونکہ پھر ہمارے جیسی قوم میں رفتہ رفتہ شعر ڈھولک کی تھاپ پہ بجنے لگتا ہے ۔ West

(مغرب) میں شعر ایسا کچھ نہیں کرتا' ہمارے ہاں مشرقی قوم کے اندر شعر تو ایک افیون ہے' آہستہ آہستہ قوم وہ صداقتیں تو بھول جاتی ہے اور اس کی جو شاعری ہے وہ ڈھولک کے اوپر بجائے چلی جاتی ہے۔

علامہ اقبالؒ اپنے آپ کو شاعر کہلوانا اپنی توہین سمجھتے تھے

علامہ اقبالؒ (1938-1877) جیسا قرآنی انقلابی تو کم از کم میری بصیرت کے مطابق ہزار برس میں کہیں جا کر پیدا ہوا' اس کا بڑا احسان ہے۔ ساری عمر وہ یہ کہتا ہوا' چلاتا ہوا' مر گیا کہ بابا! میں شاعر نہیں ہوں' مجھے شاعر مت کہو۔ دو شعر میں عرض کرتا ہوں کہ کیا کہتا ہے یعنی کس انداز میں اس نے کہا کہ میں شاعر نہیں ہوں:

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم

(زبورِ عجم)

یہ نہ خیال کرنا کہ میں بغیر بادہ ہی کے مست ہوں اور میری یہ کیفیت ہے کہ میں نے بھی شاعروں کی طرح افسانے دیئے ہیں:

نہ بینی خیرازاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست

(زبورِ عجم)

یہ یہاں گالی دے گیا ہے۔ کہتا ہے کہ اس شخص سے' کمینے کے ہاتھ سے' کوئی نیک کام تمہیں نظر نہ آئے گا جس نے میرے خلاف شعر وسخن کی تہمت لگا دی۔ اس سے کوئی خیر کا کام ہی نہیں ہوگا جو میرے خلاف تہمت لگاتا ہے اور پھر ایک جگہ تو چلا کر کہہ رہا ہے:

بآں رازے کہ گفتم' پے نبردند
زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند

(ارمغانِ حجاز)

جو میں نے راز کی بات کہی تھی اس کو تو کسی نے پہچانا نہیں' انہوں نے میرے درخت کی شاخ سے کھجور نہیں کھائی (میرے کلام سے استفادہ نہیں کیا)۔

اقبالؒ بارگاہِ رسالت میں

اقبالؒ (1877-1938) بارگاہِ رسالت میں کہتا ہے کہ

من اے میر اممؐ! داداز تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

(ارمغانِ حجاز)

اے رسولِ اکرمؐ! میں تیری بارگاہ میں فریاد کرنے آیا ہوں کہ وہ مجھے شاعر کہہ رہے ہیں' میں شاعر نہیں ہوں[1] ۔ساری عمر وہ یہی چلاّ تا ہوا مر گیا۔اس کے بعد پتہ ہے کہ کیا ہوا؟

اقبالؒ جیسے مفکرِ قرآن اور انقلابی شخصیت کو قوم نے شاعری کے قبرستان میں دفن کر دیا

وہ اتنا بڑا فلاسفر ہے کہ یورپ اس کا سکہ مان رہا ہے۔ وہ اتنے سے سارے[2] چھ لیکچر نثر میں ان کے سامنے گئے۔تو یورپ میں ان کے تصور اسلامی فکر کی جو انہوں نے قرآنِ کریم سے لیا تھا' وسیع پیمانے پر تشہیر ہوئی۔قرآن کا اتنا بڑا جاننے والا ہے کہ ہزار برس میں یہ مفکر پہلا بتانے والا ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور قرآن ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ہزار برس میں میری نگاہ میں پہلا شخص ہے جس نے اس طرح بتایا ہے۔اتنا بڑا انقلابی ہے کہ آپ کو اتنی بڑی مملکت کا تصور دے گیا۔ یہ سب کچھ اس نے کیا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا تعارف صرف شاعرِ مشرق کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ ستیاناس!! وہ چیختا ہوا مر گیا' وہ ایسا کہنے والوں کو ''مردِ فرودست'' کہہ رہا ہے۔رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں جا کے چیخ رہا ہے کہ دیکھنا! یہ مجھ پہ کیا الزام دھر رہے ہیں۔لیکن قوم نے نہ اسے فلاسفر کہا' نہ اسے مفسرِ قرآن کہا' نہ حکیم کہا' بلکہ شاعرِ مشرق کہا اور ساری دنیا میں شاعرِ مشرق ہے۔آج اس کا نتیجہ یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جس قدر انقلابی پروگرام وہ شخص دے کر گیا' وہ سارے کا سارا قوم نے نظر انداز کر دیا' پسِ پشت ڈال دیا اور اسکی وہ چند غزلیں باقی رہ گئیں جو ڈھولک کے اوپر گائی جاتی ہیں اور ریڈیو پہ سنائی جاتی ہیں۔

---

[1] حضرت علامہ اقبالؒ نے خود سید سلیمان ندوی مرحوم کو ایک خط میں لکھا تھا:
''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔فنِ شاعری سے مجھے کبھی دل چسپی نہیں رہی۔ ہاں......بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے (حوالہ: طلوعِ اسلام' مئی' 1985ء' ص۔63)۔

[2] پہلے یہ خطبات چھ تھے۔علاّمہ نے ان میں ساتویں خطبہ کا بعد میں اضافہ فرمایا۔اس خطبہ کا عنوان ہے:
Is Religion Possible?(کیا مذہب کا امکان ہے؟)

قرآن حکیم کے سلسلہ میں اقبالؒ کا مجھ پہ ذاتی احسان بھی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اتنی احتیاط جو برتی اور اپنے متعلق یہ کچھ کہا۔ میں پھر عرض کرونگا' آپ کو پتہ ہے کہ میرے دل میں ان کا کتنا احترام ہے' مجھ پہ تو ذاتی طور پہ بھی ان کا احسان ہے کہ میں نے قرآن سمجھنا ان سے سیکھا اور اس کے باوجود میں یہ عرض کرونگا اور میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اگر وہ شاعری کو اپنا ذریعہ ابلاغ نہ اختیار کرتے تو بہت بہتر ہوتا۔

ذاتِ اقبالؒ کا پروگرام ایک کتاب لکھنے کا بھی تھا جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا

عزیزانِ من! خطبات کے علاوہ اگر ایک اور کتاب بھی نثر میں لکھ کر دے جاتے جوان کے ذہن میں لکھنے کا تصور [1] اور نقشہ تھا' اس کتاب کا نام تھا: "Introduction to the Study of Quran" تو ایک انقلابی پروگرام مل جاتا۔ دراصل قرآن کے مطالعہ کے لیے وہ ایک پروگرام دینا چاہتے تھے۔ اگر وہ یہ ایک کتاب بھی نثر میں دے جاتے تو وہ ان کا بہت بڑا کام تھا جو کر جاتے۔ جو شاعری ہے' وہ واقعی مٹ جاتی ہے۔ آج اقبالؒ (1877-1938ء) کا پیغام نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ لطائف میں جوان کے شعر آ گئے ہیں بس وہی ہیں جو گائے جاتے ہیں:

بھری بزم میں راز کی بات کہدی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

عزیزانِ من! سورۃ الشعرآء آج ختم ہوگئی۔ آئندہ ہم سورۃ النمل 27 ویں سورۃ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اس سے دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ذیل کا مطالعہ پُر از معلومات ہوگا: ادارہ طلوع اسلام ''وہ کتاب جسے اقبالؒ لکھنا چاہتے تھے'' مجلّہ طلوعِ اسلام 22 اکتوبر 1955ء ص ص۔ 11 تا 13۔

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)